پاکستانی اَسفار پر مبنی اُردو سَفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

نازیہ کنول

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون 2022ء

پاکستانی اَسفار پر مبنی اُردو سَفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

نازیہ کنول

یہ مقالہ

پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان واَدب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون 2022ء

بسم الله الرحمن الرحيم

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ اُنھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: پاکستانی اَسفار پر مبنی اُردو سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی

پیش کار: نازیہ کنول رجسٹریشن نمبر: 623-PhD/URD/S16

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان وادب اردو

ڈاکٹر صائمہ نذیر ____________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________

ڈین: فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) ____________

ریکٹر

تاریخ ____________

اقرار نامہ

میں نازیہ کنول حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی۔ایچ۔ڈی اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

نازیہ کنول

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	IV
اقرار نامہ	V
Abstract	XII
اظہارِ تشکّر	XIII
باب اوّل۔ تعارف و تمہید	**1**
الف۔ تمہید	**1**
i. موضوع کا تعارف	1
ii. بیانِ مسئلہ	2
iii. مقاصدِ تحقیق	2
iv. تحقیقی سوالات	2
v. نظری دائرہ کار	3
vi. تحقیقی طریقہ کار	3
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	3
viii. تحدید	4
ix. پس منظری مطالعہ	4
x. تحقیق کی اہمیت	4
ب۔ اُردو سفر نامہ کیا ہے؟	**6**
i. سفر نامے کا آغاز وارتقا اور روایت	17
ii. اُردو سفر نامے کی روایت	18
iii. سفر نامے کا فن	23
د۔ ثقافت کیا ہے؟	31

i.	ثقافت کے عناصر	40
	آب وہوا	40
	لباس	41
	خوراک	42
	طرزِ رہائش	42
	پیشے /روزگار	43
	زبان	43
	مذہب	44
	عادات واطوار	44
	رَسوم ورَواج	44
	عورت کا مقام	45
	طلاق	45
	شادی بیاہ کی رسومات	45
	پیدائش اور رموت کی رسومات	46
حوالہ جات		47
بابِ دوّم: اُردو سفر ناموں میں صوبہ بلوچستان کی علاقائی ثقافت کی پیش کش		**52**
i.	آب وہوا	58
ii.	زبان	68
iii.	خوراک	74
iv.	مذہب	84
v.	توہم پرستی	90
vi.	رہائش گاہیں	91
vii.	پیشے	95
viii.	معدنیات	103

ix.	لباس	105
x.	بلوچیوں کی عادات واطوار	111
	مہمان نوازی	111
	وعدے کی پابندی	114
	ہمسائے کے ساتھ حُسن سلوک	115
	رسم بجار / ایک دوسرے کی مدد کرنے کی رسم	116
xi.	بَلوچوں کی خصوصیات	117
xii.	خوشی وغمی کی رسومات	117
xiii.	تفریحات، تہوار اور کھیل	121
xiv.	علاج کے عجیب وغریب طریقے	123
xv.	شادی بیاہ کے رسوم ورواج	125
xvi.	عورت کا مقام	136
xvii.	میراث	139
xviii.	سیاہ کاری کی سزائیں	140
xix.	طلاق	142
	حوالہ جات	146
	باب سوّم: اُردو سفر ناموں میں صوبہ سندھ کی علاقائی ثقافت کی پیش کش	**156**
i.	آب وہوا	172
ii.	زبان	177
iii.	خوراک / خوردونوش	181
iv.	لباس	186
v.	پیشے	192
vi.	رہائش گاہیں	197
vii.	سندھیوں کا طرزِ زندگی، لوگوں کی عادات واطوار	204

viii.	طرزِ زندگی	208
ix.	مہمان نوازی	209
x.	حال کی رَسم	211
xi.	توہم پرستی / علاج کے طریقے	212
xii.	کشتی کو دریا میں اُتارنے کی رسم	213
xiii.	تفریحات (کھیل / موسیقی)	214
xiv.	مسلمانی رسوم ورواج	217
xv.	رسوم ورواج	219
	حوالہ جات	229
	باب چہارم: اُردو سفرناموں میں صوبہ پنجاب کی علاقائی ثقافت کی پیش کش	**236**
i.	آب وہوا	242
ii.	زبان	248
iii.	خوراک	254
iv.	طرزِ رہائش	264
v.	پیشے	274
vi.	لباس	282
vii.	پنجابیوں کا طرزِ زندگی / لوگوں کی خصوصیات	291
viii.	مہمان نوازی	296
ix.	تفریحات / کھیل، موسیقی، تہوار	300
x.	لوک گیت	307
xi.	پیدائش کی رسومات	308
xii.	توہم پرستی / وہمات	311
xiii.	رسمِ فوتگی	311

xiv. عورت کی حیثیت

312

xv. شادی بیاہ کی رَسومات 313

حوالہ جات 324

باب پنجم: اُردُو سفرناموں میں صوبہ خیبر پختونخوا کی علاقائی ثقافت کی پیش کش 333

i. آب وہوا 348

ii. زبان 356

iii. خوراک 362

iv. مذہب 379

v. توہم پرستی یا ضعیف الاعتقادی 384

vi. لباس 388

vii. پیشے / ذریعہ معاش 396

viii. طرزِ رہائش 409

ix. پختونوں کی خصوصیات / عادات واطوار 420

x. پشتون کا کردار ومزاج 429

xi. پشتون معاشرے کے مختلف رسوم ورواج 430

xii. عورت کا مقام 433

xiii. طرزِ زندگی 439

xiv. مہمان نوازی (میلستیا) 440

xv. علاج کے عجب طریقے 448

xvi. ثقافتی کھیل 452

xvii. تہوار و جشن 460

xviii. میلے اور تہوار 465

xix. کافرستان کی عجیب وغریب رسمیں 467

xx. پیدائش کی رسومات	472
xxi. تدفین کی رسومات	477
xxii. شادی بیاہ کی رسومات	482
حوالہ جات	497
باب ششم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات	**513**
الف۔ مجموعی جائزہ	513
ب۔ نتائج	531
ج۔ سفارشات	538
کتابیات	**538**

Abstract

Title: Reflection of regional cultures in Pakistani Urdu travelogues

Travelogue is a fascinating kind of narrative genre of literature which becomes more appealing by the literary style of its writer. Man has predilection for diversity by nature. He feels boredom and restlessness for being consistently at the same place. Such a nature that avoids monotony tempts him to move on to some other place.

Travelogue is an ancient genre of narrative literature which arose because of the fickle nature of man. It is a kind of writing in which a writer presents his personal experiences, observations and feelings by sequencing them. All this stuff is derived from the landscapes and the events of a traveler's journey.

A travelogue writer observes his age with an inquisitive view point. He narrates the way he finds his age. With the help of keen observation, he also brings to the pages what does not happen before his eyes. He accomplishes this complicated task when he is aware of the creative and artistic demand of literature and able to present. The experiences and observation in a stunning manner. Any inadequacy in this regard relation to ability will deprive the writer to produce a good travelogue despite his keen observation.

In the travelogue of the past, the trend of history and geography was common. The travelogues in the present times, not only contain information but also the diversity of topics. Besides information, geography, history, culture, civilization, religion, economic and social facts have become part of travelogues.

The culture of all provinces of Pakistan is very lively. Every province is a bearer of its own unique culture which is complete in itself as well as different from other provincial cultures. Urdu travel writers not only took interest in the cultures of these territories but also expressed these fully. Study of Urdu travelogue reveals that they contain rich expression of all cultural elements. In this thesis, an effort has been made to look at all those cultural elements which have remained as the manifestation of interests of these travel writers. Moreover, the current study encompasses all such elements as have never been studied in travelogues.

اظہارِ تشکّر

سب سے پہلے میں اللہ پاک جل جلالہ اور آقائے دو جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکر گزار ہوں کہ مجھے اس کام کی تکمیل کی توفیق اور ہمت عطا فرمائی۔اس کے بعد میں اپنے تمام اساتذہ کرام کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں ،جن کی محنت اور توجہ نے دورانِ مطالعہ ہر قدم پر میری راہ نمائی کی اور اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔جس سے آج میں اس قابل ہوئی کہ اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کو مکمل کر سکی ہوں۔میں اپنے والد محترم کی شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے ہمیشہ مجھے اپنی نیک دُعاؤں سے نوازا اور ہر لمحہ میرے لیے آسانیاں پیدا کیں کہ میں اپنے تحقیق کے کام کو بآسانی کر سکوں۔میری والدہ محترمہ (مرحومہ) کو اللہ پاک جل جلالہ جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے کہ انھیں میرے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔اگرچہ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر ان کی حوصلہ افزائی اور محنت کرنے کے درس نے آج مجھے اس قابل بنایا کہ میں اس عظیم کام کو کرنے کے قابل بنی۔میرے بھائی حیدر علی نے میری ڈگری کے مکمل ہونے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس نے ہر قدم میری مدد کی اور میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔جس کی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔میں اپنی بھابھی کی بھی شکر گزار ہوں ، جنھوں نے انٹرنیٹ سے استفادہ حاصل کرنے میں میری بھرپور مدد کی۔

میں اپنی مشفق اُستاد اور مقالے کی نگران ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ کی بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے محنت ، مُشقت اور جان فشانی سے ہر لمحہ میری راہ نمائی کی اور ہر قدم پر نہ صرف مجھے سمجھایا بلکہ میری کوتاہیوں اور اغلاط کی تصحیح فرمائی۔جس کی بدولت آج یہ مقالہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔اس کے ساتھ ساتھ میں پروفیسر روبینہ شہناز (سابقہ صدرِ شعبہ اُردُو)، ڈاکٹر عابد سیال (سابقہ صدرِ شعبہ اُردُو) ،پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم (صدرِ شعبہ اُردُو) ، ڈاکٹر شفیق انجم اور دیگر اَساتذہ کرام کی بھی ممنون ہوں کہ مقالے کی تسوید و تحقیق میں ہر صورت میری راہ نمائی فرمائی اور مجھے اس منزل تک پہنچایا۔

اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہر صورت مجھ پر فرض ہے کہ ان کے بغیر یہ سپاس نامہ اَدھورا ہے۔سب سے پہلے میں اپنے کالج کے صدر شعبہ اُردُو پروفیسر اختر شاہ کی ممنوں

ہوں ،جنھوں نے دورانِ ملازمت میرے لیے آسانیاں پیدا کیں تا کہ میں اپنے تحقیقی کام کو بآسانی پورا کر سکوں۔میں اپنی کزن کائنات کی بھی ممنون ہوں ، جس نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔میں تحقیق کے کام کے لیے وقت بے وقت جہاں گئی اس نے اپنا قیمتی وقت میرے ساتھ صرف کیا۔ڈاکٹر ماجد بلگرام ڈاکٹر رحمت اللہ بھٹی کی بھی بے حد شکر گزار ہوں ،جنھوں نے علامہ اقبال اُوپن یونی ورسٹی سے مجھے کتب فراہم کیں اور میرے تحقیقی کام میں میری معاونت کی۔میرے چند شاگرد جن میں فرحان ،جواد ،حنیف شامل ہیں ،جنھوں نے کتب کی تلاش میں میری مدد کی ، میں ان کی بھی شکر گزار ہوں۔مہر محمد مظہر کاٹھیا کی بھی شکر گزار ہوں ، جس نے میرے مقالے کی کمپوزنگ کا کام نہایت محنت سے کیا۔اس کے علاوہ میں ہر اس شخص کی ممنونِ احسان ہوں ،جس نے کسی بھی طرح میری مدد کی۔

ادارۂ فروغِ قومی زبان کی لائبریری ، نذیر لائبریری نمل ، لائبریری علامہ اقبال اُوپن یونی ورسٹی ،میونسپل لائبریری لیاقت آباد ،گورڈن کالج کی لائبریری ،آن لائن کتاب خزانہ لائبریری سے میں نے مقدور بھر استفادہ کیا۔اس لیے ان اداروں اور ان کے سربراہان کی بھی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے ہر کتاب اور حوالے کے لیے مجھ سے تعاون فرمایا۔

آخر میں ان تین ہستیو ں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ جنھوں نے کرونا وبا کے دوران میری خدمت کی اور حوصلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔میرے والد محترم ، میرا بھائی حیدر علی اور میری کزن کائنات ،جنھوں نے نہ صرف میری خدمت کی بلکہ ساتھ ساتھ مقالے کی تکمیل کی طرف توجہ بھی دلاتے رہے ،بلکہ آسانیاں بھی پیدا کرتے رہے۔

نازیہ کنول

باب اوّل۔ تعارف و تمہید:

الف۔ تمہید

i. موضوع کا تعارف:

سماجی زندگی کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔انسان اور سماج مختلف عنوانات کے تحت اس وقت سے زیرِ بحث ہیں ،جب سے انسان نے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔مصنف سماج میں جو واقعات رونما ہوتے دیکھتا ہے۔ان سے متاثر ہو کر انھیں تصنیف کا روپ دے دیتا ہے۔جن کی مصنوعات میں اضافہ کرنے کے لیے بعض تخلیق کار مبالغہ آمیزی ، تخیل اور زبان و بیان کی لطافتیں شامل کر دیتا ہے جو سفر نامے کو افسانے کے نزدیک کر دیتی ہے۔

سفر نامہ اَدب میں سفر کے حالات و واقعات ، سفر کے مشاہدات و تجربات کا اظہار ہے۔سفر نامے قدیم ترین تاریخی و تہذیبی ماخذ ہیں۔یہ ایک ہمہ جہت صنف ادب ہے۔جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو زیرِ بحث لاتی ہیں۔سفر نامے کی بدولت انسان نئی نئی وادیوں سے متعارف ہوتا ہے۔کسی بھی خطے کے تہذیبی ، معاشرتی اور سیاسی حالات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے سفر نامے سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔سفر نامہ صداقتوں کا مرقع ہوتا ہے ،اس میں سفر نامہ نگار اپنے دلی جذبات و کیفیات کو بیان کر کے دوسروں کو اپنے سفر میں شامل کرتا ہے۔ایسا کرنے سے اگر کوئی لالچ نہ ہو تو سچ کے سوا کچھ بیان نہیں کیا جاتا۔یوں کسی بھی خطے کے سفر نامے میں اس خطے کی صحیح تاریخ بھی شامل ہوتی ہے۔سفر نامہ تاریخ و جغرافیہ کے لیے ابتدائی اور حقیقی مواد مہیا کرتا ہے۔اس میں مختلف اقوام کے معاشرتی و معاشی ،مسائل ، عملی و اَدبی مباحث ،سیاسی صورتِ حال ،معیشت ، معاشرت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ تمام اُمور پر بات کی جاتی ہے۔

- پاکستان ایک وسیع اور متنوع ثقافت رکھنے والا ملک ہے۔یہاں کی ثقافت مختلف ثقافتوں کا مرقع ہے ۔ثقافت کسی معاشرے کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ثقافت کسی خطے کے رہنے والوں کے درمیان اتحاد کی علامت بھی ہے۔اردو سفر نامہ پاکستانی علاقائی ثقافت کے بیان کے حوالے سے اپنے اندر ایک وسیع ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔قدرتی مناظر کی خوبصورتی سے مالامال یہ خطہ نہ صرف سیاحوں

کی توجہ کا باعث بنتا نظر آتا ہے بلکہ سفر نامہ نگاروں نے بھی ان خطوں کو موضوعِ تحریر بنایا ہے۔ ان سفر ناموں کے مطالعے سے ادب کے قاری کو معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ بھی میسر ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگاروں کے اس عمل سے پاکستانی علاقوں کی ثقافت کے وہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن کا ان علاقوں میں جائے بنا جاننا مشکل ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان ثقافتی عناصر کی جانچ کی سعی کی گئی ہے جنھیں سفر نامہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔

ii. بیانِ مسئلہ:

اُردو سفر نامے کے آغاز سے عہدِ حاضر تک کسی بھی خطے کے علاقائی، ثقافتی عناصر کسی نہ کسی صورت میں بیش تر سفر ناموں میں موجود رہے ہیں۔ یہ عناصر افراد معاشرہ کے رہن سہن، بودوباش، تہذیبی، سیاسی، ثقافتی روایات کے ترجمان ہیں۔ کیوں کہ سفر نامہ نگار جس ملک میں جاتا ہے تو اس ملک کی ثقافت سفر نامے کا جزو بن جاتی ہے اور دورانِ سفر وہاں کی ثقافتی روایات سے بھی اس کا واسطہ پڑتا ہے جس کی وجہ سے اُردو سفر نامے میں ثقافت، فکری جہات کے ساتھ سامنے آئی ہے۔

iii. مقاصدِ تحقیق:

زیرِ نظر تحقیق کے لیے درج ذیل مقاصد پیشِ نظر رہے:

1. اُردُو سفر ناموں میں علاقائی ثقافت سے شناسائی حاصل کرنا۔
2. اُردُو سفر ناموں میں موجود علاقائی ثقافت کے مختلف عناصر کی نشان دہی کرنا۔
3. اُردُو سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کے تناسب کو جاننا۔

iv. تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیق کے دوران درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے جائیں گے:

i. سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے؟
ii. سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کے کن عناصر کو زیادہ برتا گیا ہے؟
iii. علاقائی ثقافت کے کون سے پہلو سفر نامہ نگار کی توجہ کا باعث بنے اور کیوں؟

v. نظری دائرہ کار:

علاقائی ثقافت کا تصور بنیادی طور پر علاقے سے ہے۔ ہر علاقے کی اپنی مخصوص ثقافت ہوتی ہے جو دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا تعلق ہر فرد اور معاشرے سے بھی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔ پاکستان مختلف ثقافتوں کا مرقع ہے اُردُو سفر نامے میں بھی مختلف ثقافتی عناصر پائے جاتے ہیں یہ ثقافتی عناصر سفر نامہ نگاروں کی دلچسپی کا باعث بنتے نظر آتے ہیں۔ سفر نامہ نگاروں کے ہاں ان عناصر کا بیان ایک فطری عمل ہونے کے ساتھ ساتھ شعوری بھی نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان کی نشان دہی کرنے کی سعی کی گئی ہے اور علاقائی ثقافت کے حوالے سے درج ذیل عناصر کی تلاش کے ساتھ ان کا تجزیہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

آب وہوا، خوراک، طرزِ رہائش، پیشے رہن سہن، رسم ورواج وغیرہ

vi. تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق کا موضوع چوں کہ "پاکستانی اسفار پر مبنی سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی" کے تجزیے پر مشتمل ہے۔اس موضوع کی تکمیل ، اس حوالے سے مواد کی جمع آوری اور ترتیب نیز سفر ناموں میں علاقائی ثقافتی عناصر کی نشان دہی ناقدانہ جائزے کی متقاضی ہے۔اس امر کے لیے دستاویزی اور تاریخی طریقہ ہائے تحقیق اختیار کیا جائے گا۔تاہم بیانیہ ہائے تحقیق کا بھی استعمال کیا جائے گا۔

بنیادی ماخذات کے ضمن میں زیادہ تر انحصار سفر ناموں کی کتب اور رسائل وجرائد سے کیا جائے گا۔ثانوی مآخذات میں زیادہ انحصار ثقافتی کتب ،سفر نامے پر لکھی گئی مختلف تحریروں اور مضامین اور اس کے علاوہ سفر ناموں پر تحقیقی وتنقیدی کتب ، تحقیقی مقالات اور انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

مجوزوہ موضوع پاکستانی اَسفار پر مبنی سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی پر تادم تحریر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا بلاشبہ کسی علاقے کی ثقافت کو ایک موضوع کے تحت سامنے لانا ایک کٹھن کام ہے

تاہم پھر بھی ضروری ہے کہ اس کام کو سرانجام دیا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے ضروری ہے کہ اس پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھا جائے اور تحقیقی رویوں کو بروئے کار لا کر اس پر فکر انگیز تجزیہ کیا جائے تا کہ سفر نامے کے ذریعے سے علاقائی ثقافت کی تفہیم میں آسانی ہو اور یہ تحقیق مابعد محققین کے لیے آسانی فراہم کر سکے۔

viii. تحدید:

زیر نظر موضوع بہت وسعت اور ہمہ گیریت کا حامل ہے۔اس مقالے کو ان سفر ناموں تک محدود رکھا جائے گا جو پاکستان کے مختلف علاقوں کے سفر پر مشتمل ہیں۔

ix. پس منظری مطالعہ:

کسی بھی تنقیدی اور تخلیقی کام کے لیے پس منظری مطالعے کا ہونا از حد ضروری ہے۔مجوزہ موضوع تحقیق کے لیے ان تمام کتب و مضامین کا مطالعہ کیا گیا جن سے سفر ناموں میں دل چسپی بڑھی اور اس نے مجھے اس کام کو کرنے کی طرف راغب کیا۔سفر ناموں کے ذریعے ہی اس بات سے آگاہی ہو سکتی ہے کہ سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کو کس حد تک مدِ نظر رکھا گیا ہے اور کسی علاقے کی ثقافت میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور اُردُو سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کا تناسب کس حد تک نظر آتا ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت:

جس طرح اَدب زندگی کا عکاس ہے ،اسی طرح زندگی سفر سے عبارت ہے۔زندہ لوگ سفر ہی کے سبب اپنے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔کائنات کی ابتدا بھی سفر سے ہے اور انتہا بھی۔یہ حقیقت میں ایک نئے سفر کی ابتدا ہے۔انسان نے ہمیشہ سے نئے نئے خطوں تک اپنی رسائی کو ممکن بنایا ہے۔سفر کی بدولت انسان اپنی ذات کی تکمیل کر رہا ہے۔

انسان جب سے ہے سفر اس کا نصیب ہے۔سفر کے بغیر زندگی ناممکن ہے ،حرکت کو برکت کہا گیا ہے اور جمود موت کی علامت ہے۔زندگی سفر سے عبارت ہے۔سفر وسیلہ ظفر ہے اور کامیابی کا دوسرا نام ہے۔کسی بھی سفر سے واپسی پر روداد سفر کو کہنے اور سننے کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ

انسان۔پہلے پہل روداد سفر زبانی کہی جاتی تھی ، پھر جیسے جیسے انسان نے قلم و قرطاس سے اپنا رابطہ بڑھایا تو اس کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جانے لگا۔یوں سفر نامے لکھنے کی روایت قائم ہوئی۔اب ہمیں ہر بڑی زبان میں اس صنف پر تحریریں ملتی ہیں۔

سفر نامے لکھنے کی بدولت انسان نئی نئی دُنیاؤں سے متعارف ہو تا ہے۔کسی بھی خطے کی تہذیبی ، معاشرتی ،سیاسی اور علاقائی صورتِ حال کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے سفر نامے سے رجوع کرنا پڑتا ہے چوں کہ سفر نامے کا نمونہ اور حقیقتوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔اسفار کسی بھی خطے کی علاقائی ثقافت کے عکاس ہوتے ہیں۔اسفار واحد ذریعہ ہیں جو کسی بھی خطے کی ثقافت و معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔اُردو اَدب بالخصوص اُردوسفر نامے کے طریقے ،زبان و لہجے ، مذہب و سیاست اور زندگی کے بارے میں ہر سفر نامہ نگار نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے۔اس کے علاوہ یہاں کے رہنے والوں کی طرزِ زندگی ان کے رویوں اوران کی فکر کی عکاسی کرتی ہے۔

ب۔ اُردو سفر نامہ کیا ہے؟

سفر نامے کا شمار اُردو کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ سفر نامے میں تین چیزیں اہم ہوتی ہیں:

1. جغرافیہ
2. تاریخ
3. ثقافت (جو کہ موجودہ زِندگی سے تعلق رکھتی ہے)

سفر ناموں میں سفر کی اہمیت تو مسلمہ ہے، سفر کریں گے تو یہ تینوں چیزیں سامنے آئیں گی، کوئی تاریخ کو اہمیت دیتا ہے، کوئی جغرافیے میں دل چسپی لیتا ہے کوئی ثقافت کو دیکھتا ہے۔ کوئی صرف خوب صورت مناظر پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے اور اپنے سفر کو اپنی دل چسپی کے پیشِ نظر بامقصد بناتا ہے۔ موجودہ دور میں سب سے زیادہ سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ لوگوں نے سفر کرنا شروع کیا۔ سفر زندگی سے عبارت ہے اور زندگی اور حرکت کا استعارہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان اَزل سے اَبد تک ایک مسلسل اور کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف عمل ہے۔ سفر کرنا انسان کی فطری جبلت کا حصّہ ہے اور یہ انسان کی فطرت ہی ہے جو اسے سفر کرنے پر اکساتی ہے۔ نئی نئی جگہوں اور مناظر کو دیکھنے سے اس کے جذبہ تجسس کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور یہی تجسس اسے نت نئے خطوں کو دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ کائنات کو تسخیر کرنے کا جذبہ اسے ان دیکھی دُنیاؤں تک پہنچنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ سفر کی نوعیت خواہ کیسی ہی ہو سیاح یا مسافر کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ سفر کے تجربات سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کر لے۔ سفر نامے قاری کے لیے دل چسپی کا باعث اس لیے بنتے ہیں کیوں کہ اس کی جستجو اسے یہ معلوم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ مسافر نے کیا دیکھا، سفر کیسے گزرا اور اس میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ چناں چہ جو لوگ خود سفر نہیں کر پاتے رودادِ سفر سن کر ہی ان کے ذوقِ سفر کو تسکین ملتی ہے یا بہم پہنچتی ہے۔ چوں کہ سفر کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سفر کے انسانی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سفر نامہ بلحاظ مزاج خط، روز نامچے، داستان، افسانے اور رپورتاژ وغیرہ کے قریب کی چیز نظر آتا ہے۔ سفر نامہ چوں کہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اور سفر نامہ نگار ان واقعات، مشاہدات اور مناظر کو من

وعن اس طرح پیش کرتا ہے، جس طرح اس نے ان کو دیکھا اور محسوس کیا ہوتا ہے۔ انسان کو فطرت سے متعلق ہمیشہ سے تجسس رہا اور جب اس کی یہ حس بیدار ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر کی نامعلوم چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرلے تو وہ سفر کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ انسان اجنبی علاقوں، زمینوں، شہروں اور ملکوں کا سفر اپنی اسی تسکین کے لیے کرتا ہے۔ وہ سراغ لگاتا ہے، کھوج کرتا ہے تو زندگی کے نئے رُوپ نئے ڈھنگ دیکھتا اور سیکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ دُنیا کے ہر کونے، نئی زمینوں، نئی طرزِ زندگی، نئے رسم و رواج کا مشاہدہ کرلے۔ وہ ان نئے مقامات کی تاریخ اور جغرافیے کے بارے میں بھی معلومات جمع کرتا ہے، انھیں قلم بند بھی کرتا ہے وہ وہاں کے باشندوں اور ان کی زندگی گزارنے کے ڈھب پر بھی توجہ دیتا ہے اور ان تمام معلومات و تجربات کو خوب صورت، موثر اور جاذبیت کی مٹھاس کے ساتھ صفحہ قِرطاس پر مُنتقل کرتا ہے اور بناکسی تامل کے مَن و عَن پیش کردیتا ہے۔ ان تمام معلومات و مُشاہدات کو تحریری شکل میں لانا ہی دَراصل اَدبی اصطلاح میں سفر نامہ نگاری ہے۔

بقول رحمٰن مذنب:

> "دیکھیں تو ہر اِنسان ایک چلتا پھرتا سفر نامہ ہے کوئی چھوٹا، کوئی بڑا اپنے اندر سَفر کرتا ہے کوئی باہر، کوئی دونوں طرف ذات وصفات کے انکشاف کے لیے یہ بہت بڑا ذریعہ ہے۔"(1)

سَفر کے ذریعے نہ صرف دوسرے ممالک کی سیر ہوتی ہے بلکہ دوسری اقوام کے اَفراد کی عادات و اطوار اور مشاغل سے بھی آگہی حاصل ہوتی ہے اور مختلف اَقوام کی تہذیب و مُعاشرت، رسم و رواج، اور رہن سہن سے مختلف معلومات ملتی ہیں۔ وہاں کے لوگوں کے جَذبات و اَحساسات بھی سَفر ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ سفر کے ذریعے ہی لوگوں کی محبت و نفرت کی کیفیات پتہ چل سکتی ہیں۔ ملک یا شہر کے حالات و واقعات، تعمیرات و عمارات، تہذیب و تمدن، اَحساسات و جَذبات، زَبان پر عبور، مُشاہدات و تجربات کُھل کر سَفر نامے کی بدولت ہی سامنے آتے ہیں۔

سفر نامے کی تعریف میں ابوالاعجاز صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> "اجنبی شہروں اور غیر ممالک کے جغرافیائی اور سماجی حالات سے انسان نے ہمیشہ گہری دل چسپی لی ہے۔ ایک سیاح جب اپنے جغرافیائی و سماجی گردوپیش سے نکل کر کسی دوسرے مقام پر پہنچتا ہے تو اسے وہ تمام چیزیں جو اس کے

اپنے مولد و منشا کے مانوس ماحول سے مختلف ہوتی ہیں۔ اختلافِ ماحول اور اختلافِ معاشرت کے باعث دل چسپ اور استعجاب انگیز نظر آتی ہیں اور وہ باتیں جو مشترک معلوم ہوتی ہیں اور وہ اِنھیں دوسروں (بالخصوص اپنے ہم وَطنوں) کے لیے قلم بند کرلیتا ہے۔ ایسی تحریر کو ہم اَدبی اصطلاح میں سَفر نامہ کہتے ہیں۔"[(2)]

سفر نامہ کسی مصنف کے سفری مشاہدات کی ایسی تصویر ہوتا ہے، جس میں وہ اس مخصوص علاقے کے اہم مقامات، جغرافیائی گردوپیش، تاریخی حالات ونوادرات کے ساتھ ساتھ لوگوں کا عمیق مشاہدہ اپنے نکتہ نگاہ سے کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے اور اس کی یہ محسوسات سفر نامے میں نظر آتی ہیں۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح سفر بھی انسان مختلف مقاصد کے تحت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامے کئی اِقسام کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم تو روایتی سفر نامے کی ہے۔ اس قسم کے سفر نامے میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔ موسم کا حال میدانی اور پہاڑی مناظر، آداب معاشرت، حاکم وقت کے خدوخال تک محدود ہوتا ہے۔ جب کہ بیسویں صدی کا سفر نامہ نگار ہوٹلوں کا حال، مشروبات کی قلت یا زیادتی اور ہر قسم کی تفصیلات اپنے سفر ناموں میں سمیٹ لیتے ہیں۔

دوسری قسم اس سفر نامے کی ہے۔ جس میں سفر نامہ نگار جغرافیہ سے نہیں بلکہ صرف ملک کی تاریخ سے غرض رکھتا ہے۔

سفر ناموں کا اندازِ تحریر عموماً سادہ اور بیانیہ ہوتا ہے۔ سفر کا مواد عُمدہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ عُمدہ مواد کو اگر سادہ اَنداز میں پیش کر دیا جائے تو وہ قاری کی توجہ فوراً اپنی طرف مبذول کرالیتا ہے۔ کیوں کہ موثر اور دل فریب اندازِ بیان اس صنفِ اَدب کی اہمیت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سفر نامے اپنے اُسلوب کے لحاظ سے داستان کے قریب اور ناول کے پیش رُو ہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفر نامے کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

"سفر نامے کے معنی داستان سفر، رودادِ سفر کے قصّے ہیں۔ جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو انگریزی میں ایسے سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصّور تقاریر بتایا گیا ہے۔"[(3)]

سفر نامے لکھنے کے لیے سفر نامہ نویس کے پاس گہرے تخلیقی شعور کا ہونا بہت ضروری ہے۔ سفر نامہ نگار کو اتنی علمی بصیرت کا حامل ہونا چاہیے کہ وہ علمی اور تنقیدی نثر کے مقابلے میں سفر ناموں کی نثر کو آسان شگفتہ اور عام فہم بنا کر پیش کر سکے۔ چوں کہ سفر نامہ نگار مختلف ممالک کا سفر اختیار کرتا ہے اور یوں وہاں بولی جانے والی زبان کے الفاظ سیکھنے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح سفر نامے اُردو زبان کے ارتقا میں اضافے کا باعث بنے۔ چناں چہ اُردو نثر کو آسان اور عام فہم بنانے میں سفر ناموں کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔

شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> "جدید سفر نامے میں اُسلوب اور طرزِ بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ سفر مانے میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ جو خوب صورت زبان اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہوں۔ لیکن اس نوع کے سفر ناموں میں ایک عیب یہ ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار سفر نامے کو افسانہ بنا دیتا ہے اور ایسی صورت اختیار کرتا ہے، جسے وہ افسانے کا ہیرو ہو اور سیاحت کے دوران ہر ملنے والی غیر ملکی لڑکی اس کی عاشق۔"(4)

دیگر اَصنافِ اَدب کی طرح سَفر نامے کی باقاعدہ تعریف، اُسلوب، ہیئت اور تنقید کے اُصول و ضوابط تاحال متعین نہیں تاہم مختلف ناقدین اپنی ذاتی آرا کی روشنی میں اسے جانچنے اور اس کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اُردو زبان و اَدب میں لفظ "سفر نامہ" کا استعمال انگریزی زبان کے لفظ "Travelogue" یا "Travel book" کے معنوں میں ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قومی انگریزی لغت میں "Travelogue" کے معنی و مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> Travelogue: Travelog
>
> "سفر داستان، سفر نامہ، سفر کی رُوداد پر مشتمل لیکچر، جس میں عموماً سلائیڈیں یا متحرک فلم دکھائی جاتی ہے۔"(5)

"سفر" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی "مُسافت طے کرنے یا قطع مسافت" کے ہیں۔ جب کہ "نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی "تحریر شدہ عبارت" کے ہیں۔ یوں عربی اور فارسی الفاظ سے سفر نامہ کی اصطلاح وضع ہوئی۔

سفر نامہ دو فارسی الفاظ "سفر" اور "نامہ" کا مُرکب ہے۔ سفر کی روداد اور سیاحت کے بیان کے لیے یہ مرکب استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں سفر نامہ "سفر کی رُوداد" یا دورانِ سفر پیش آنے والے تجربات و مُشاہدات کو تحریری شکل میں لکھنے کو کہتے ہیں۔ سفر نامے کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"سفر کے حالات پر مُشتمل کتاب۔"(6)

سفر نامہ کی تعریف فیروز اللغات کے مطابق یہ ہے:

"سفر کے حالات پر کتاب، سیاحت نامہ" (7)

"انسائیکلو پیڈیا ورلڈ ڈکشنری" کے مطابق سفر نامہ کے معنی و مفہوم درج ذیل ہیں:

"Travelogue:

a: A documentary film describing a country, travels etc.

b: A lecture describing travel, usually illustrated as with photographs, slides etc."(8)

"نور اللغات" میں سفر نامہ کے معنی لکھے ہیں:

"سفر کے حالات اور سر گزشت۔"(9)

"فرہنگِ آصفیہ" میں مولوی سید احمد دہلوی نے سفر نامے کے لغوی معنی بیان کیے ہیں:

"سفر نامہ: اسمِ مذکر: سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روز نامچہ سفر، حالات و سر گزشت سفر۔"(10)

"سفر نامہ" جدید اصطلاح ہے۔ عربی میں "رحلتہ" اور انگریزی میں "Travelogue" کی اصطلاحات بھی موجود ہیں۔

سفر نامہ کا سب سے قیمتی جزو اس کا افسانوی عنصر ہے۔ قدرت نے جب انسان کو بنایا تو اس کے وجود کو تراشتے وقت اس کے سینے میں چپکے سے داستان کی دیوی کی محبت کو بھی بٹھا دیا۔ داستان کے اس حصے نے جس

میں کہانی بیان کی جاتی تھی۔ افسانے کا رُوپ دَھار لیا اور دوسرے حصّے نے جس میں حالاتِ سفر بیان ہوتے تھے ، سفر کی شکل اختیار کر لی اور اُردو میں ایک ایسی صنف کا اضافہ ہوا جس میں آنکھوں دیکھے مُشاہدات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ہماری تاریخ میں سفر نامے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سفر نامے قدیم ترین تاریخی و تہذیبی مآخذ کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیوں کہ دُنیا کی ابتدا و انتہا سفر ہی کی مَرہونِ منت ہے۔ کسی قوم یا خطہ کی تہذیب سفر ہی بدولت آشکار ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کا اَحاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر مظفر عباس رقم طراز ہیں:

> "سفر نامے ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ انتہائی علوم و فنون اور تاریخ کے چشمے سفر ناموں ہی سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے سفر ناموں کو قدیم ترین تاریخی و تہذیبی مآخذ قرار دیا گیا ہے۔ سفر ناموں کی صنف ہمہ گیر ہے اور گو ناگوں علوم و فنون کا احاطہ کرتی ہے۔ تاریخ کے علاوہ جغرافیہ ، نفسیات ، نباتات، علم الانسان ، نیچرل اور سوشل سائنسز جیسے قدیم علوم سے سفر ناموں کا قریبی تعلق ہے۔"(11)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سفر نامے ہی کسی بھی خطے کی تاریخ کو اُجاگر کرنے کا موجب بنے ہیں ۔ سفر نامہ اگرچہ ایک غیر افسانوی صنفِ سخن ہے جس میں داستان طرازی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ رپور تاژ کی قوتِ متخیلہ ، آپ بیتی کی ذاتیت اور مورخ کی تخلیقی بصیرت بھی شامل ہوتی ہے ۔ انسان کی فطرت کا تجسس ہی اسے نامعلوم کو معلوم کرنے پر اُکساتا ہے ۔ انسان کے اسی فطری تجسس کا نتیجہ سفر نامہ ہے ۔

> " اچھا سفر نامہ وہ جس میں داستان کی سی داستان طرازی، ناول کی سی افسانہ سازی، ڈراما کی سی منظر کشی، کچھ آپ بیتی کا سا مزہ، کچھ جگ بیتی کا سا لُطف اور پھر سفر کرنے والا جزو تماشا ہو کر اپنے تاثرات کو کچھ اس طرح سے پیش کرے کہ اس کی تحریر پر لُطف بھی ہو اور معلومات افزا بھی۔"(12)

سفر نامے مختلف طرز کے حامل ہیں ۔ بعض سفر نامے افسانوی طرز کے ہیں ،کچھ میں ناول کی سی خصوصیات نظر آتی ہیں ،کچھ افسانے کے رنگ میں رنگے ہیں ،کچھ ڈرامائی اور منظر کشی کا اظہاریہ ہیں جب کہ سفر نامے آپ بیتی کی طرز کے ہیں ۔

اگرچہ سفر نامہ ایک ایسی غیر افسانوی صنفِ سُخن ہے جس میں داستان طرازی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ رپورتاژ کی قوتِ متخیلہ، آپ بیتی کی ذاتیت اور مورخ کی تحقیقی بصیرت بھی شامل ہوتی ہے۔انسان فطری طور پر تجسس پسند ہے۔سیاحت کا شوق اسے نامعلوم کو معلوم کرنے پر اُکساتی ہے۔انسان کے اسی فطری تجسس کا نتیجہ سفر نامہ ہے۔

بعض سفر نامے آپ بیتی کی طرز کے دکھائی دیتے ہیں۔سفر نامے اور آپ بیتی بظاہر تو ایک دوسرے کے مماثل نظر آتے ہیں۔لیکن سفر نامہ مکمل طور پر آپ بیتی نہیں بن سکتا۔

سفر نامہ آپ بیتی سے قطعی طور پر مختلف ہے۔وہ صرف ایک حصّے کی ترجمانی کرتا ہے جب کہ آپ بیتی کسی بھی شخصیت کی پوری زندگی کا احاطہ پیش کرتی ہے۔اِسی طرح ہمارے ہاں سفر نامے اور رپورتاژ میں فرق نہیں سمجھا جاتا۔جب کہ دونوں بالکل الگ الگ موضوع اور ہیئت کے مالک ہیں۔سفر نامے کی لازمی شرط سفر ہے۔جب کہ رپورتاژ کے لیے یہ شرط لازمی نہیں۔

> ”جہاں تک رپورتاژ کی صِنف کا تعلق ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ رپورتاژ (Reportage) میں سفر کو بنیاد تو بنایا جاسکتا ہے البتہ اس میں تخیل کی رَنگ آمیزی اور خارج سے متعلق اپنے نقطہ نظر کی تشریح و توضیح اسے سفر نامے سے الگ کر دیتی ہے۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ سفر نامہ واقعات کی تفصیل و تشریح پیش کرتا ہے اور رپورتاژ میں پیش آنے والے واقعات سے لیا گیا تاثر۔۔۔“(13)

ہر صنف کی زبان و اَسلوب کا اپنا مُنفرد انداز ہوتا ہے۔جس کی بدولت وہ دوسری اصناف سے الگ نظر آتی ہے۔جیسا کہ ناول کی زبان اور داستان کے اُسلوب و زبان میں فرق ہوتا ہے۔افسانے اور انشائیے کے اپنے اپنے اَسلوب و انداز بیان ہیں۔اسی طرح سفر نامے کی زبان و اَسلوب بالکل مختلف ہے۔سفر نامے کی فنی مہارتیں اسے باقی اَصناف نثر سے جدا کرتی ہیں اور منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔سفر نامہ نگار مناظرِ فطرت اور زمانی واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات اور اَحساسات کو بھی دل فریب انداز میں پیش کرتا ہے۔سفر

نامے میں کہیں سادہ اُسلوب بیان، کہیں تاریخی، کہیں جغرافیائی و شماریاتی اور تشبیہاتی اور استعاراتی اُسلوب بیان ہیں۔ مختلف مناظرات کو ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صِنفِ اَدب انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو زیرِ بحث لاتی ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ”زندگی چوں کہ ایک مسلسل حرکت ہے، اس لیے سفر بھی زندگی ہی کا استعارہ ہے۔ حکمائے قدیم نے زندگی کو ایک ایسا سفر قرار دیا ہے جو اَزل سے جاری ہے اور اَبد تک جاری رہے گا۔“(14)

سفر نامہ تخلیق کرنے کے لیے سفر نامہ نگار کے لیے سیاح ہونا اولین شرط ہے۔ سیاح کو انسان کا صحیح عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ طرح طرح کے لوگوں سے ملتا ہے۔ ہر چیز کو مُشاہدے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مشاہدے کے بغیر کوئی سفر نامہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ سفر نامہ نگار اپنے گرد و پیش کے گہرے مشاہدے سے سفر نامے کی ساکھ کو بڑھا دیتا ہے۔ سیاح لوگوں سے ملتا ہے تو وہ انسان کو سمجھنے اور جاننے کے بہت سے مدارج طے کر لیتا ہے۔ سیاح کی جذباتی دُنیا وسعت پذیر ہوتی ہے۔ اس کی آنکھ سے تعصبات کا پردہ اُتر جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے تو اس پر وہاں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز عیاں ہو جاتی ہے اور اس تجربے کے بعد اسے جو نئی جلا عطا ہوتی ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حساس اور نازک ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو سیاحت کو ایک روحانی سفر میں بدل دیتی ہے۔ سیاح کے لیے دُنیا کی حقیقت ایک آئینہ خانہ کی طرح ہے۔ وہ فطرت کے حسین رنگوں سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور دورانِ سیاحت پیش آنے والی مشکلات کو شوق کی نظر سے دیکھتا ہے اوران بیش قیمت لمحات سے فرحت اَنبساط کَشید کرنے کی کوشش میں مشغول رہتا ہے۔

بقول ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد:

> ”سفر نامہ نثری اَدب کی ایک ایسی صنف ہے جو سفر کے حالات و واقعات، مشاہداتی کوائف اور تجرباتی کیفیات کا اظہاریہ ہے۔ یہ وہ بیانیہ ہے، جو مسافر کے ذوق سفر اور احوال سفر کا غماز ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں مسافر کے عرصہ سفر کے روز و شب جگمگاتے ہیں۔“(15)

سفر ایک قدیم ترین عمل ہے۔ سفر نامے میں تخلیقی احساس زیادہ پُر زور ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے اس مُشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ سفر نامے کی بدولت انسان کو نئی نئی دُنیاؤں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ کسی بھی خطے یا علاقے کی تہذیبی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی خیالات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سفر نامہ کی طرف راغب ہونا پڑتا ہے۔ سفر نامہ صداقتوں کا مُرقع ہے یعنی حقیقتوں کا منبع ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "اب جو سفر نامے معرض تخلیق میں آئے ان میں تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی معلومات کے علاوہ تاثرات کو اَدبی اُسلوب میں پیش کرنے کی کاوش بھی کی گئی۔ اس دور کا سفر نامہ نگار چوں کہ زیورِ علم سے بھی آراستہ تھا۔ اس لیے اس نے بیرونی ممالک میں زندگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھا اور سفر نامے میں اپنے موقف کی وضاحت بھی کی۔"(16)

سفر ناموں کا تعلق خارجی عناصر اور مظاہر فطرت سے ہے، جو ان سفر ناموں میں دکھائی نہیں دیتی۔ بعض سیاح ایسے ہوتے ہیں جو کسی مقام پر ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتے۔ تو ایسا سفر نامہ نگار اس مقام پر رہنے والے انسانوں کے مزاج، رسم و رواج سے نا آشنا ہی رہے گی۔ کیوں کہ ان سب چیزوں کو سمجھنے کے لیے وقت اور مُشاہدہ درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے سفر نامے جو ان لوازم سے عاری ہوتے ہیں ان میں مُشاہدے کی وہ بوُقلمونی دکھائی نہیں دیتی جو سفر نامے کے لیے لازم سمجھی جاتی ہیں۔

سَفر نامہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا مشاہدہ وسیع اور گہرا ہو۔ کسی خطے کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اِنسانیت کی تلاش بھی اس کا مقصد ہو دُرست اور سچائی پر مُبنی معلومات اور ان کی فراہمی کے لیے کوشاں رہے۔ اندازِ بیان سادہ، دل چسپ، اُسلوب کی تازگی اور شگفتگی سے مَزین ہو۔ مصنف صرف بیرونی دُنیا کے کوائف ہی پیش نہ کرے بلکہ اپنے ذاتی احساسات اور انفرادی نقطہ نظر کو بھی بیان کرے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی مقام ہو یا شخصیت فوری طور پر عَیاں نہیں ہوتے بلکہ یہ اسرار و رموز وہاں کے رہنے والوں سے گھلنے ملنے کے بعد ہی ظاہر ہوتے ہیں اور سیاح جو نگر نگر گھومتے ہیں۔ ان کے سفر نامے ہی حقیقی سفر نامے کہلانے کے حق دار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے سفر نامے سیاح کے ذاتی تجربات و

مُشاہدات کو حقیقت کا رُوپ دیتے ہیں۔ جس سے اِسے دورانِ سفر سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے سفر نامے قاری کے لیے تجربات، مُشاہدات اور معلومات کا انمول خزانہ ہوتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

"ابنِ بطوطہ اور مارکو پولو کے سفر ناموں میں حقیقی زندگی کے نقوش اس لیے زیادہ ہیں کہ ان سیاحوں نے ممالک غیر میں نہ صرف بود وباش اختیار کی بلکہ وہاں شادیاں بھی کر لیں۔ جدید سفر نامے میں بعض سیاحوں کے ہاں زمین کو زیادہ طویل عرصے تک مَس کرنے، ممالک غیر کے لوگوں سے ملنے اور ان سے ہر سطح پر تعلقات بڑھانے کا رُجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں وقت کا پھیلاؤ بھی خاصا زیادہ ہے اور قیامِ طویل۔"(17)

سفر نامہ ایک ایسی ہمہ جہت صنف ہے۔ جس میں نہ صرف نئے موجود کو دریافت کیا جاتا ہے بلکہ اس میں نامعلوم کی تلاش کا عمل بھی سرگرداں ہوتا ہے۔ یہی چیزیں سفر نامے کی جاذبیت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

سفر نامہ دورانِ سفر بہت سی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ جس میں سے کچھ پسندیدہ اور کچھ ناپسندیدہ اور ان کا اثر اس کے دِل ودماغ پر ضرور ہوتا ہے۔ کچھ واقعات کا تعلق اس کے احساساتِ قلب سے جُڑا ہوتا ہے۔ جنھیں وہ محسوساتی زاویے سے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ واقعات کو وہ مَن وعَن بیان کر دیتا ہے۔ قدیم سفر نامہ نگاروں کے مقابلے میں آج کے سفر نامہ نگاروں کی تحریروں میں احساسات قلب کا اظہار جگہ پاتا نظر آرہاہے، جو ایک خوش آئند عمل ہے۔

اگر سفر نامے کی مقبولیت کی بات کی جائے تو فنی لحاظ سے اُردو سفر نامہ اپنی ارتقائی منازل کو طے کر کے اُردو اَدب میں اب ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔ جدید اُردو سفر نامے میں اب کہانی و داستان کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ناول وافسانے کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ مذہب۔ سیاست و تاریخ ، ثقافت جیسے سنجیدہ موضوعات کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کی چاشنی بھی قاری کے حصّے میں آتی ہے۔

سفر نامے کی تعریف میں بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"اب زمانہ تنوع کا ہے۔ رفتار سے وابستہ ہے۔ اب قاری ایک زندگی میں کئی ذائقے اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ دور سفر نامے، روزنامچے، آپ بیتی اور جگ بیتی کا ہے۔"(18)

اَدب کی تمام اَصناف اپنی ضروریات، تقاضوں، زبان و بیان کے حوالے سے دیگر اَصناف سے ذرا مختلف ہیں۔ داستان، ناول، انشائیے، افسانے زبان و اُسلوب کے حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سفر نامہ مختلف مقامات و مناظر کا چشم دید بیانیہ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامے کی صنف اِنفرادی اُسلوب کی مالک ہے۔

سفر نامہ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ مختلف شخصیات یا واقعات کے بیان میں زبان و اُسلوب کا خیال موقع محل کی مناسب سے رکھے:

"کہیں سادہ، سلیس اور شگفتہ نثر کی ضرورت ہو گی تو کہیں رمزیت و ایمائیت والی زبان کی، کہیں سفر نامہ انشائیہ کی زبان کا طالب ہو گا تو بعض مقامات پر اس میں مزاح کے عناصر کی شمولیت کی بھی ضرورت محسوس ہو گی گویا سفر نامہ نگار منظر اور موضوع کے اِعتبار زبان و اُسلوب برتنے کی کوشش کرے گا۔"(19)

سفر نامہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا مُشاہدہ وسیع اور گہرا ہو کسی خطے کی اِنفرادیت کے ساتھ ساتھ اِنسانیت کی تلاش بھی اِس کا مقصد ہو، دُرست اور سچائی پر مُبنی معلومات اور ان کی فراہمی کے لیے کوشاں رہے۔ اَنداز ِبیان سادہ اور دل چسپ اُسلوب کی تازگی اور شگفتگی سے مَزین ہو۔ مصنف بیرونی دُنیا کے کوائف ہی پیش نہ کرے بلکہ اپنے ذاتی احساسات اور انفرادی نقطہ نظر کو بھی بیان کرے۔

سفر نامہ آج اَدب کا قابل قَدر اثاثہ ہے۔ سفر نامے کے ذریعے تاریخ و جغرافیے کے لیے مواد اکٹھا کیا جا سکتا ہے، جو حقیقت پر مُبنی ہوتا ہے۔ سفر نامے کے ذریعے مختلف اقوام کے معاشرتی، معاشی مسائل، علمی و اَدبی مباحث، سیاسی مسائل سب پر بات کی جاتی ہے۔ سفر نامہ اس اعتبار سے اَدبیات کی ایک مُفید صنف ہے۔ جو معلومات کا خزینہ ہے۔ سفر نامہ اُردو اَدب کی دوسری اَصناف سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے اور ہر صنف کی مٹھاس اپنے اندر سموئے ہوئے دُنیائے اَدب کے آسمان پر چمک رہا ہے۔

i. سفر نامے کا آغاز وار تقا اور روایت:

سفر نامہ اِنسان کی جبلت میں ہے۔ سکون سے بیٹھنا اِنسان کی فطرت نہیں ہے۔ ہر لمحہ کسی نہ کسی کھوج میں سر گراں رہنا ہی اِنسان کی زِندگی ہے۔ حرکت میں بَرکت ہے۔ جَمود یعنی ٹھہر جانا موت ہے۔ سفر انسان کی سرشت کا حصّہ ہے اور انسان کی اسی خصلت کی وجہ سے نئی نئی چیزوں کو سامنے لانے کا مُوجب بنا ہے۔ سفر اور اِنسان لازم و ملزوم کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب انسان کسی سفر نامے کے لیے نکلتا ہے تو سفر اور اس کے درمیان آنے والے مراحل کو بڑے ذوق و شوق اور افہام و تفہیم سے طے کرتا ہے۔ دورانِ سفر وہ جس ذوق و شوق کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اس کے سفر نامے کی زینت بنتا ہے۔ اس کا مُشاہدہ، اس کا تجربہ، اس کے سفر نامے میں اس کی شخصیت کا عکس بن کر جھلکتا ہے۔ کیوں کہ سفر نامہ نگار اپنی خُوبیوں اور خامیوں کے ساتھ خُود کو آمادہ سفر کرتا ہے۔ یوں مُسافر کا مسافت کے ساتھ ایک بندھن بندھ جاتا ہے اور پھر مقررہ وقت پر سفر شروع کرتا ہے۔ سفر کرنے والے کو نئے منظروں، نئے راستوں، نئے لوگوں اور نئی دُنیاؤں سے واسطہ پڑتا ہے اور اس کے اَندر کا اِنسان ان تمام چیزوں کو جو اس نے دورانِ سفر دیکھی، محسوس کیں، ان سب کو باہر لانے پر اُکساتا ہے اور اس طرح سے سفر نامہ وجود میں آتا ہے اور یوں سفر نامہ نگار سفر کی رُوداد کو صفحہ قِرطاس پر مُنتقل کرتا ہے۔ اُردو زبان میں یہ روایت عربی و فارسی اور انگریزی زبان سے وجود میں آئی۔ اُردو سفر نامہ نَت نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا رہا۔ زبان و بیان کا ہر نیا اُسلوب اسے اَدب سے قریب تر کرتا رہا اور اس طرح سفر نامہ تاریخ اَدب اُردو میں اپنا صحیح مقام متعین کرا سکا۔

بقول رحمٰن مذنب:

> "اُردو میں سفر نامہ بتدریج وقت کے تقاضوں اور زبان و بیان کے نت نئے اُسلوبوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا اَدب میں مستحکم صنفِ اَدب بن چکا ہے۔"(20)

یوں تو اُردو اَدب میں سفر نامہ 1857ء سے پہلے بھی لکھا جا رہا تھا۔ مگر اَولیت کی بحث نے یوسف خان کمبل کو اُردو کا پہلا سفر نامہ نگار کا درجہ دیا۔ ان کا سفر نامہ "عجائباتِ فرنگ" اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار پایا۔ کیوں کہ "عجائباتِ فرنگ" سے پہلے تا حال کوئی ایسا سفر نامہ منظر عام پر نہیں آیا، جس میں رُودادِ سفر اُردو میں لکھی گئی ہو اور سفر بھی، مصنف نے خود اختیار کیا ہو۔ سفر نامہ "عجائباتِ فرنگ" جس کا ایک عنوان "تاریخ یوسفی" بھی ہے بجا طور پر اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار پایا۔ مصنف کا اُسلوب تحریر انیسویں صدی کا اچھا نمونہ ہے۔ اس

میں پڑھے جانے کی صلاحیت موجود ہے۔ محاوروں اور ضرب المثال کا استعمال بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔ اپنے ماضی الضمیر کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ سفر نامے کے دل چسپ واقعات اور ذاتی تاثرات کی وجہ سے اس میں افسانے اور ناول کا سا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ فنی اعتبار سے سفر نامہ میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں سفر کرنے والا براہِ راست کسی واقعہ یا کسی فطری مناظر سے مُتاثر بغیر کسی لگی پٹی کے لکھتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر میں بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

محمد خاور نوازش لکھتے ہیں:

> "فنی اعتبار سے سفر نامہ اُردو زبان کی ایک ایسی بیانیہ صنف ہے۔ جس کا سارا مواد سفر نامہ نگار کے چشم دید واقعات اور تاثرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ سفر نامہ ایک سیاح کے وہ تصورات ہیں جنھیں فطرت کے دل فریب مَناظر دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعے ہمارے سامنے لاتا ہے۔"(21)

مصنف، چشم دید واقعات کے اظہار سے ہی قاری کو پوری طرح مُتاثر کر سکتا ہے۔ کیوں کہ چشم دید واقعات میں جو کیفیت ہوتی ہے وہ تصنع یا بناوٹ میں نہیں ہو سکتی۔ اُردو اَدب میں پہلے سفر نامہ نگار تو "یوسف خان کمبل پوش" ہیں۔ ان کے بعد نواب کریم خان، نبی بخش، سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، نواب محمد عمر خان، منشی محبوب عالم، قاضی عبد الغفار، پنڈت شیو نرائن، سید سلیمان ندوی اور خواجہ حسن نظامی کے نام شامل ہیں۔ یہ قدیم سفر نامہ نگار ہیں۔ جنھوں نے اُردو سفر نامہ نگاری میں شہرت حاصل کی۔ بعد میں جدید دور کے سفر نامہ نگاروں نے اس صنف میں قابلِ قدر خدمات سر انجام دے کر اس صنف کو مزید جلا بخشی۔

ii. اُردو سفر نامے کی روایت:

پہلا مطبوعہ سفر نامہ "عجائباتِ فرنگ" یوسف خان کمبل کا تحریر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ 1847ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سفر نامے میں ہندوستان اور یورپ کی معاشرت کے امتیازات کو بیان کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے یورپ کی معاشرت کے بارے میں ناگوار جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یوسف خان کمبل سادہ طبعیت کا مالک تھا۔ اس نے واقعات کو جُوں کا تُوں پیش کر دیا۔ اَس نے تصنع و بناوٹ سے سفر کی رُوداد کو پاک رکھا۔ واقعات کو اسی طرح لکھ دیا جس طرح سے دیکھا۔ اپنے دور کے لحاظ سے یہ نثر پڑھنے اور پسندیدگی کے قابل ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

"یوسف خان کا اُسلوب اُنیسویں صدی کی نثر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں پڑھے جانے کی عُمدہ صلاحیت موجود ہے۔ سفر نامے کے دل چسپ واقعات اور ذاتی تاثر کے سبب سے اَفسانہ و ناول کا سا لُطف پیدا ہو گیا ہے اور کمبل پوش صاحب نے سفر اور سفر نامہ دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔"[22]

سفر نامے میں اَدبی چاشنی نے قاری کی اس میں دل چسپی کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اسے سفر نامے کی صورت میں اَدب کی ایک ایسی صنف کو پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ جس میں بیک وقت کئی رنگ جھلکتے ہیں اور ڈرامہ کی طرح مختلف کرداروں کی آمد و رفت اور مکالموں کی بازگشت بھی سُنائی دیتی ہے۔

بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

"سفر نگاری گزرے وقتوں کی بازیافت کا عمل ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر بیانیہ، افسانوی اور کہانی کاری ہی ہو گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سفر نامے دورِ قدیم کے ہوں یا دورِ جدید کے ان میں کہانی، داستان اور افسانے کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔"[23]

اس صنف میں مسافر یا سیاح گزرے ہوئے لمحات کے واقعات کو یاد کر کے اپنی رُودادِ سفر سُناتا ہے۔ جس میں کہانی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے اور اگر کہانی کار ادیب ہو تو افسانوی اور ڈرامائی انداز اس کے بیان کو اور نکھار دیتے ہیں۔

سفر نامے کسی معاشرے یا خطے کی ثقافت کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے اہم مواد مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ کیوں کہ مُسافر جس خطے میں جاتا ہے وہاں کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے حالات و واقعات آنکھوں سے دیکھتا ہے اور انھیں اپنی یاداشت میں محفوظ کر لیتا ہے اور پھر سفر نامے کی شکل میں تحریری طور پر لے آتا ہے۔

اُردو اَدب میں لکھے گئے سفر ناموں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ سفر نامہ نگاروں نے سفر نامے کے اس پہلو کو خوب اُجاگر کیا ہے۔ اس میں یوسف خان کمبل پوش سے شبلی نعمانی و حسن نظامی تک چیدہ چیدہ سفر ناموں میں ثقافتی رَنگ موجود ہے۔

جدید سفر نامہ نگاروں کے ہاں یہ پہلو بدرجہ اَتم پایا جاتا ہے۔ان میں رضا علی عابدی، مستنصر حسین تارڑ، عطاالحق قاسمی، مرزا ادیب، اشفاق احمد، ابنِ انشا، بیگم اختر ریاض الدین، اے حمید، قمر علی عباس، حکیم محمد سعید کے اسمائے۔گرامی شامل ہیں۔

یوسف کمبل پوش کے سفر نامے میں جدید دور کے سفر ناموں کا سا تاثر موجود ہے۔اس میں یورپ کی تہذیب وثقافت اور معیشت و معاشرت کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر مظفر عباس:

> ”کمبل پوش کا یہ سفر نامہ ہر پہلو سے ہمارے اپنے عہد کا سفر نامہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سفر نامے کے تمام تر پہلو جدید اُصولوں کو برتا گیا ہے۔یوسف خان کمبل پوش پہلا ایشیائی باشندہ ہے، جس نے محض سیاحت کے نقطہ نظر سے یورپ کا دورہ نہیں کیا بلکہ وہاں کے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا نہ صرف یہ بلکہ اپنے مشاہدات و تجربات کو دل چسپ اور پر لطف انداز میں رقم کر کے اُردو سفر نامے کی داغ بیل ڈالی۔“(24)

اُردو سفر نامے کی روایت پر نظر ڈالی جائے تو کمبل پوش کا سفر نامہ ”عجائباتِ فرنگ“ جدید اُصولوں پر مُبنی سفر نامہ ہے۔اس کے بعد اُردو کا دوسرا قدیم سفر نامہ ”سیاحت نامہ“ ہے جو نواب کریم خان کا لکھا ہوا ہے۔1839ء میں مغل حکم ران بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے لندن گئے۔وہاں اُنھیں ایک مقدمے کی پیروی کرنی تھی۔اُنھوں نے وہاں گزرے تمام معاملات کو ڈائری میں محفوظ کر لیا اور ان کی یہی تحریر سفر نامہ ”سیاحت نامہ“ کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔سید فدا حسین عرف بنی بخش کے سفر کا آغاز 25 شعبان یعنی 3 نومبر 1939ء کو شاہ جہان آباد سے کابل کی طرف چڑھائی کے ذکر سے ہوتا ہے۔یہ سفر نامہ میر ٹھ سے غزنی تک اور پھر غزنی سے میر ٹھ کی روداد بیان کرتا ہے۔حقیقت نگاری اس سفر نامے کا سب سے بڑا وصف ہے۔

”مُسافرانِ لندن“ سر سید کا سفر نامہ ہے۔سر سید نے 1869ء میں لندن کا سفر کیا یہ سفر مقصدی تھا یہ سفر سر سید کے سفر انگلستان کی رُوداد ہے۔سر سید انگلستان کی ترقی کا راز جان چکے تھے اور علم کی اہمیت ان

کے سامنے واضح تھی۔ وہ اپنی قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے اور اس راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ اُردو سفر نامہ نگاری میں اس سفر نامے کو ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

"سفر نامہ پنجاب" یہ سفر نامہ سر سید کے سفر پنجاب کی رُوداد ہے۔ جو 1884ء میں شائع ہوا۔ سر سید کا یہ سفر نامہ بھی مقصدی تھا۔ یہ سفر نامہ حقیقتاً بر صغیر کے مسلمانوں کی کاوشوں کا عکاس ہے۔

بقول حمید اللہ خان:

"سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب محض ایک سفر نامہ نہیں ہے بلکہ 1857 کی تباہی کے بعد مسلمانانِ بر عظیم کی جہد للبقا کا ایک اہم باب ہے۔"[25]

نثار علی بیگ سیاحت کے شوقین تھے۔ وہ اَودھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدراس تھے۔ آپ کو خانہ کعبہ جانے کا شوق ہوا، اسی دوران یورپ کا سفر بھی کیا اور ہر روز کی مصروفیات کو "سفر نامہ یورپ" کی شکل میں مرتب کرتے گئے جو بعد میں سفر نامہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں یورپ کی تہذیب و تمدن، ان کی معاشرت اور دیگر زندگی گزارنے کے طور طریقے شامل ہیں۔

محمد حسین آزاد کے دو سفر نامے "اُنیسویں صدی کے وسط ایشیا کی سیاحت" اور "سیر ایران" یادگار ہیں۔ آزاد کے روزنامچے کے اَنداز میں حالاتِ سفر لکھے۔ یہ دونوں سفر نامے سر سید کے عہد کے ہیں۔ 1885ء میں ایران کا سفر کیا۔

شبلی نعمانی کے سفر نامے کا آغاز 26 اپریل 1892ء کو علی گڑھ سے ہوا۔ "سفر نامہ روم، مصر اور شام" 1894ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سفر کا مقصد عَرب دُنیا کے کتب خانوں اور دَرس گاہوں کی سیر تھا۔

نواب محمد عمر خان ریاست باسودہ کے رئیس تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کی نصف صدی سیر و سیاحت میں گزاری۔ اندرون اور بیرون ممالک کے سفر کیے۔ ان کی تفصیلات اپنے سفر ناموں میں شامل کی ہیں۔ عہدِ سر سید میں یہ وہ شخصیت ہیں۔ جنھوں نے سب سے زیادہ سفر نامے لکھے۔ 8 سفر نامے ان کے اندرون اور بیرونِ ممالک دونوں پر مشتمل ہیں۔ مگر ان کے سفر نامے تفصیلات سے خالی ہیں۔

1883ء میں نواب حامد علی خان والئی ریاست رام پور نے ہندوستان سے مشرق بعید کا سفر کیا۔ 10 ماہ کے بعد جاپان، ہوائی، امریکہ، انگلستان اور مصر سے ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔ اپنے سفر کے حالات کو "سیر حامدی" میں قلم بند کیا۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

"ان کا سفر نامہ "سیر حامدی" اُردو کا پہلا سفر نامہ ہے جو پوری دُنیا پر محیط ہے۔"(26)

"سیر دریا" کے نام سے سری لنکا اور مال دیپ کا سفر نامہ منظرِ عام پر آیا۔ خطے کا تعارف اور یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، معاشرت کو پہلی بار اس سفر نامے کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے موسم، تہذیب و ثقافت، رویوں اور دیگر معاملات پر گفتگو کی گئی ہے۔

بقول ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد:

"سیر دریا" اُردو میں لکھے گئے سری لنکا اور مال دیپ کے اولین سفر ناموں میں شامل ہے۔ یہ سفر نامہ اپنے مواد، تکنیک اور اُسلوب کے اعتبار سے اُردو کے اچھے سفر ناموں میں شمار کیے جانے کا سزاوار ہے۔ تاہم احباب تحقیق کی کم گوشی اور مورخین اَدب کی بے مفاحمتی کے باعث یہ سفر نامہ نظر انداز ہوا۔ سفر ناموں کے حوالے سے کیے جانے والے کاموں میں بھی سرسری طور پر اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اہم سفر نامہ قارئین میں قبولِ عام حاصل نہ کر سکا۔"(27)

جس دور میں یہ سفر نامے لکھے گئے وہ ارتقائی دور ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں اُردو زبان اپنے ارتقائی منازل کو طے کر رہی ہے۔ یہ سفر نامہ انیسویں صدی کے آخر میں منظرِ عام پر آیا۔ "سیر دریا" ڈاکٹر شفیق انجم اس سفر نامے کی زبان و بیان پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرزا احمد قاسم برلاس کا سفر نامہ "سیر دریا" ایسے دور میں لکھا گیا۔ جب اُردو نثر اپنے ارتقا کی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کی زبان وہی ہے جو اس وقت مروج تھی اور عام بول چال میں اس کا چلن تھا تاہم اس میں کچھ خوبیاں ایسی بھی ہیں۔ جو ایک طرف تو سفر نامے کے حُسن میں اضافہ کرتی ہیں اور دوسری طرف مرزا قاسم برلاس کی لفظ شناسی اور ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔"(28)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے سفر نامے اس ابتدائی صدی میں لکھے گئے۔ جنھوں نے اُردو اَدب کی شان میں قابل قدر اضافہ کیا۔ یہ اَنیسویں صدی کا زمانہ تھا اور یہ اُردو اَدب میں سفر نامے کی ابتدائی کڑی ہے اور یہاں سے اُردو سفر نامے کی روایت شروع ہوتی ہے۔ جو بیسویں صدی تک جاری ہے۔

اس روایت کے بعد اُردو اَدب میں سفر نامے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد اُردو سفر نامے کا عَبوری دور اور عہدِ زریں آتا ہے۔ جس نے اُردو سفر نامے کو جدید سفر نامے تک پہنچنے کے قابل بنایا۔ قیامِ پاکستان سے قبل اُردو سفر نامہ ایک روایت بن چکا تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ روایت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود رہی۔ بلکہ اس میں بہت ترقی ہوئی۔ آج پاکستان کی 72 سالہ اَدبی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں پاکستان کے اُدبا کے ہاں نہ صرف دوسرے ممالک بلکہ اپنے ملک کے خوب صورت تصاویر بھی مختلف تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ صرف پاکستانی سفر ناموں ہی کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ جنھوں نے اپنے اپنے فن سے اُردو اَدب کی تاریخ کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی مصنفین نے بھی سفر نامے لکھے ہیں۔ جنھوں نے اُردو اَدب کی ترقی و ترویج کے لیے بہت کام کیا ہے۔

iii. سفر نامے کا فن:

تاریخ انسانی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سفر ہر دور میں انسانی تفریح کے اولین مشاغل میں شامل رہا ہے۔ خود ساری تہذیب سفر اور خانہ بدوشی کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا باب ہے۔ یہ تہذیبیں افراد کے ساتھ ساتھ دُنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سر گرم رہیں۔

سفر نامہ نگاری کا آغاز چوں کہ اس مقصد کے تحت ہوا تھا کہ لوگوں کو ان ممالک کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں جن کو اُنھوں نے نہیں دیکھا جن کا سفر نہیں کیا۔ اس لیے اُردو کے ابتدائی دور کے تمام سفر ناموں میں یہی مقصد دکھائی دیتا ہے۔ اُردو اَدب کے ابتدائی دور کے سفر ناموں میں معلومات کو بے پناہ اہمیت حاصل تھی۔ ان سفر ناموں کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ سفر نامہ ماحول سے زیادہ اشیا کو اہمیت دیتا ہے۔ جب کہ انسان اور اس کی فطرت کا مطالعہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ چوں کہ انسان کی ذہنی پختگی اور ابتدا سے اب تک اس کے ذہنی رُجحانات میں تبدیلی کو بیان کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ”سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر

پر اپنے مشاہدات ، کیفیات اور اکثر اوقات ، قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔اس صنف ادب کا تمام تر مواد موجود منظر کے گردوپیش میں بکھرا ہوتا ہے۔لیکن واضح رہے کہ سفر نامہ نگار صرف خارجی ماحول کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیے کو مدلل اور ہمہ جہت بنانے کے لیے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سیمٹتا ہے۔"(29)

سفر نامہ نگاروں نے جن جن ممالک کا سفر کیا وہاں کی تہذیب و ثقافت کا عمیق مطالعہ کیا۔دریارِ غیر کے لوگوں کے رہن سہن ، تہوار ،میلے ٹھیلے ،خوشی و غمی کے مواقع کی تفصیلات ان کے سفر ناموں میں ملتی ہیں۔اسی طرح سفر ناموں میں سیاحوں نے عمارتوں ، مکانات کی طرز تعمیر اور ان کی آرائش و زیبائش کے بارے میں معلومات کو پوری جزئیات سمیت اپنے سفر ناموں کی زینت بنایا ہے۔اس طرح سفر نامہ سیاحت کے حوالے سے معلومات کا بہترین مآخذ ثابت ہوتا ہے۔

اگر سفر نامے کے فن پر بات کی جائے توفنی لحاظ سے اُردو سفر نامہ اپنی ارتقائی منازل کو طے کر کے اب اُردواَدب میں ایک مستحکم مقام پر پہنچ چکا ہے۔اُردو میں لکھنے والے عام سیاح سے لے کر اعلیٰ درجے کے ادبا نے اسے برتا اور اچھے سفر نامے تخلیق ہوئے۔

سفر نامے کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی عنصر مشاہد ہ ہے۔مشاہدے کے بغیر سفر نامے بے معنی ہے۔کسی بھی سفر نامے کی کام یابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ سیاح کا مشاہدہ کتنا عمیق ہے۔مواد سفر نامہ نگار کے چاروں اطراف بکھرا ہوا ہے۔اب یہ سفر نامہ نگار پر ہے کہ وہ کس کس کا انتخاب اپنے اپنے سفر نامے کے لیے کرتا ہے:

" اچھا سفر نامہ وہ ہے جس میں مشاہدے کی گہرائی ،ثقافتی ،مطالعے کا سلیقہ ،اختلافات کے باوجود بنی نوع انسان کی اساسی وحدت کا شعور اوراجنبی دیار ومعیار کی زندگی کا ایسا صحیح تعارف شامل ہوجو صداقت پر مبنی ہونے کے علاوہ قارئین کے لیے دل چسپ ،خیال انگیز اور بصیرت افروز ہو۔"(30)

سفر کا شمار لازمہ زندگی میں ہوتا ہے جس میں بے پناہ تجسس و تحیر کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔حرکت اصولِ فطرت ہے۔کائنات کی ہر شے اپنے مدار کے گرد حرکت پر مجبور ہے۔

سفر کا رویہ بنیادی طور پر زندگی کا رویہ ہے کہ زندگی حرکت اور عمل سے عبارت ہے۔دُنیا انسان کے لیے ایک عارضی قیام گاہ اور پڑاؤ کی جگہ ہے۔جہاں انسان کو چند گھڑیاں گزار کر آگے بڑھ جانا ہے۔کیوں کہ:

ے موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر[31]

انسان کی زندگی بھی اپنے نقطہ آغاز سے انجام تک عالم مسافرت ہی سے متعلق ہے۔انور سدید اپنے سفر نامے کی فنی بحث میں لکھتے ہیں :

"زندگی چوں کہ خود ایک مسلسل حرکت ہے۔اس لیے سفر بھی زندگی ہی کا استعارہ ہے۔"[32]

سفر حرکت اور عمل ہی کا علامتی روپ ہے۔سفر نامہ مناظر اور عناصر سے معمور ہے۔ہر سفر نامہ نگار مخصوص ،رُجحانات اور معیارات کا حاصل ہوتا ہے۔لیکن کام یاب سفر نامہ نگار وہ ہوتا ہے جو زمین ، ماحول اور انسان کے ساتھ اپنا ناطہ نہ ٹوٹنے دے اور قارئین کو اپنے نظریات سے آگاہ کرے۔

سفر کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔پیغمبروں اور اولیا اللہ کے ساتھ حکمائے قدیم کے نزدیک زندگی ایک ایسا سفر ہے۔جو ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔حضرت آدمؑ وحوا کے اس عرش سے فرش تک کے سفر سے لے کر آج تک انسان عالم مسافرت میں ہیں۔سفر صرف ضرورت کے تحت ہی نہیں کیا جاتا ،سفر کبھی کبھی شوق و تحیر کی وجہ سے بھی کیا جاتا ہے۔جو سیاح کو کشاں کشاں اپنے پسندیدہ مقامات کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔سفر نامہ نگار کا بنیادی طور پر سیاح ہونا ضروری ہے۔

بقول وزیر آغا:

"گھر کی چار دیوارو ں اور منزل کے دھاگوں سے اسے کوئی سروکار نہیں اور سیاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے اور مسافر حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے۔"[33]

موجودہ عہد میں سفر نامہ افسانے اور حقیقت کا سنگم نظر آتا ہے۔لیکن دونوں الگ الگ اصناف ہیں۔افسانہ تخیل ہے ،جب کہ سفر نامے کے لیے کھلی آنکھ سے مشاہدے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔سیاح کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے گھر ،وطن ،نام اور پیسے سے قطعاً منقطع اور بے نیاز ہو اور اپنے اندر جمود کی بجائے حرکت کا مادہ رکھتا ہو اور جن گزر گاہوں سے گزرے انھیں اپنے اندر جذب

کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے۔اپنے مشاہدے کو آنے والے زمانے کی تحقیق کا راستہ استوار کرنے میں معاون بناتا ہے۔سیاح کے لیے یہ بھی ضروری عنصر ہے کہ جس ملک میں وہ سفر کرے وہاں کی رسم و رواج سے شناسائی حاصل کرے۔کیوں کہ سفر نامے کو کام یاب اور سچے حقائق پر مبنی سفر نامہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ سیاح اس ملک کی زبان ، رسم و رواج ، تہذیب ، مذہب ، سیاست کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔سفر نامے کی اولین غرض و غایت اگرچہ اس کائنات میں بسنے والی مختلف اقوام کے درمیان پائی جانے والی تاریخی ، جغرافیائی ، سماجی ، سیاسی ، معاشی اور معاشرتی حالات سے آگاہی ہے۔دورِ جدید میں سفر نامہ تخلیقی صورت میں ایک نہ صرف حرکت کا باعث بنتا ہے۔بلکہ افراد کی ذاتی زندگی میں خوش گوار اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔

سفر نامہ وہ صنف سخن ہے جو جاری و ساری رہے گی۔

ایک اچھا سفر نامہ لکھنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ سفر نامہ نگار ادیب ہو ، ایک اچھا سفر نامہ صرف ادیب نہیں لکھتا بلکہ اچھے سفر نامہ نگار کے لیے جن داخلی خواص کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ اگر کسی لکھنے والے میں موجود ہیں تو ایک اچھا سفر نامہ تخلیق ہوتا ہے۔

اُردو کے قدیم سفر ناموں میں ہمیں یہ روش عام نظر آتی ہے کہ سفر نامہ نگار اشیا کی خارجی اور سطحی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔جب کہ جدید سفر نامہ نگار قدرت کے ان رازوں سے بھی پردہ اُٹھاتا ہے جو کسی بھی منظر یا واقع کے پیچھے سربستہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا سفر نامے کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”سفر نامے کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ایک قسم تو اس روایتی سفر نامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔موسم کا حال ، میدانی اور پہاڑی مناظر ، آداب معاشرت ، حاکمِ وقت کے خدوخال اور اگر وہ بیسویں صدی کا سفر نامہ نگار ہے تو غسل خانوں اور ہوٹلوں کا حال ، مشروبات کی قلت یا فراوانی اور ہر قسم کے شکار کی جملہ تفاصیل اپنے سفر نامہ میں سمیٹ لیتا ہے۔جس میں سفر نامہ نویس جغرافیہ کی بجائے صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا

ہے اور سنے سنائے قصوں کے اظہار فکر میں لطف محسوس کرتا ہے۔"(34)

ایک اچھا تخلیق کار جب سفر نامہ لکھتا ہے تو اس کے تخلیقی تجربات سفر نامے کے لیے ایک ایسا اسلوب وضع کر لیتے ہیں۔جن کی سفر نامے میں ضرورت ہوتی ہے یا وہ سفر نامے کے مطالبات کو اپنے مخصوص طرزِ نگارش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔گویا سفر نامہ نگار آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے تجربات سفر بیان کرے۔مگر اس بات کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ سفر نامے کو سفر نامہ ہی رہنے دے ،اسے داستان ، ناول یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔سفر نامے سچائی اور حقیقت پر مبنی ہونے چاہئیں ،خواہ مخواہ کی رنگین بیانی ،افسانویت ،مبالغہ آرائی ،پُراسرار بنانے کی شعوری کاوش یا بے موقع لطائف ، غیر ضروری باتیں سفر نامے کی رُوح کو مجروح کر دیتے ہیں۔ایسے سفر نامے معتبر نہیں سمجھے جاتے۔

فنی اعتبار سے سفر نامہ ایک ایسی صنف اَدب ہے جس کا انداز بیانیہ ہے اور اس میں اسلوب کے نئے تجربات کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔قدیم سفر ناموں کا انداز بیانیہ ہوا کرتا تھا۔آج بھی اس کے فن میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔متفرق اسالیب اور مختلف سفر نامہ نگاروں کے طرزِ بیان کے اختلاف کے باوجود نئے دور کا سفر نامہ بھی بیانیہ انداز میں ہی لکھا جارہا ہے۔سفر نامہ ایک طرح کی آپ بیتی ہے ،کیوں کہ اس میں سفر نامہ نگار اپنے مشاہدات و تجربات خود بیان کرتا ہے۔ خالد محمود لکھتے ہیں :

"سفر نامے میں ایک سیاح اپنے تجربات و مشاہدات خود بیان کرتا ہے۔اس لیے سفر نامہ ایک قسم کی آپ بیتی بھی بن جاتا ہے۔سفر نامے کا مرکزی کردار سفر نامہ نگار کے علاوہ او ر کوئی نہیں ہوتا۔یہی شخص واحد متکلم ہے جو اپنی روداد سفر بیان کرتا ہے۔" (35)

روداد سفر کو محفوظ کرنے کے لیے سفر نامہ نگار مختلف طریقے اختیار کرتا ہے :

پہلا طریقہ:

ذہن میں محفوظ کر کے ڈائری یا روزنامچے میں لکھ لینا۔

دوسرا طریقہ :

خطوط کی تکنیک دوران سفر جو کچھ دیکھتا ہے اپنے کسی دوست کو لکھ دیتا ہے اور سفر کے بعد ان خطوط کی مدد سے سفر نامہ ترتیب دے لیتا ہے۔ دورانِ سفر وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے جہاں جہاں سے گزرتا ہے ،جہاں جہاں قیام کرتا ہے۔اپنے کسی دوست یا عزیز کو خط میں مفصل لکھ کر مکتوب الیہ کو بالواسطہ طور پر اپنا ہم سفر بنالیتا ہے۔

سفر کے بعد ان خطوط کی مدد سے وہ اپنے سفر کی باز آفرینی کرتا ہے اور خطوط و یاداشت کے حوالے سے سفر کے ان تاثرات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو سفر کے دوران اس کے دل و دماغ پر طاری تھے۔اس طریقہ کار میں یہ خاصی ہے کہ خط لکھنے کے زمانے سے سفر نامہ لکھنے کے زمانے تک تاثرات میں وہ تازگی باقی نہیں رہتی جو کسی شے کو دیکھ کر فوراًدل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔خطوط کی تکنیک سے مرتب کیے جانے والے سفر نامے عام طور پر واقعات پر چھاجاتے ہیں۔خطوط کی تکنیک سے مرتب کیے جانے والے سفر نامے عام طور پر واقعات کے منطقی ربط و تسلسل سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔سفر نامہ نگارواقعات کے درمیان کی کڑیوں کو جوڑنے اور ربط پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔اس کوشش میں بے ساختگی ، سچائی اور تازگی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ان تمام باتوں کے باوجود روداد سفر محفوظ رکھنے کا خطوط ایک بہتر ذریعہ ہیں۔

سیاح جب یہ سوچ کر سفر کرتا ہے کہ سفر کے ساتھ ساتھ اسے ایک سفر نامہ بھی لکھنا ہے تو اپنی پسند اور سہولت کے مطابق تکنیک بھی وضع کرلیتا ہے۔اس کی قوت باصرہ جس قدر زیادہ تیز ہو تی ہے۔اسی قدر وہ تیزی کے ساتھ اپنے گردو پیش کا جائزہ لے کر کام کی چیزوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔مناظر اور واقعات کا یہی چناؤ اس کی بصیرت کا امتحان ہوتا ہے۔وہ عمیق مشاہدے کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ کس چیز پر زیادہ توجہ دے اور کس چیز کو نظر انداز کرے۔کون سی بات اہم ہے اور کون سی غیر اہم یہ فیصلہ وہ اپنی پسند ونا پسند کے مطابق کرتا ہے اور اس فیصلے پر سفر نامے کے عمومی تاثر کا انحصار ہوتا ہے۔سفر میں پیش آنے والے بہترین واقعات کا انتخاب ہو جانے کے بعد واقعات کی پیش کش دوسرا اہم ترین مرحلہ ہے۔

سفر نامہ نگار جب یہ دونوں مراحل بآسانی طے کرلیتا ہے تو ایک بہترین سفر نامہ لکھنے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی :

"سفر نامے میں ایسے ایک دو نہیں کئی مقام آتے ہیں۔ کبھی یہ سفر خارج سے داخل کا سفر ہے۔۔۔ یا پھر داخل سے خارج کا سفر۔"(36)

سفر نامہ تخلیق کرنے کے لیے سفر نامہ نگار کے لیے سیاح ہونا اولین شرط ہے۔ کیوں کہ مسافر دوران سفر آنے والی مشکلات سے بہت پریشان ہوتا ہے۔ دوران سفر پیش آنے والی مشکلات اسے ذہنی و جسمانی طور پر بہت ناگوار گزرتی ہیں۔ جب کہ سیاح کے لیے یہ دُنیا ایک آئینہ خانہ ہے اور اس میں پھیلے ہوئے مظاہر اسے دعوت فکر دیتے ہیں۔ وہ فطرت کے حسین رنگوں سے حظ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور دورانِ سیاحت پیش آنے والی مشکلات کو شوق کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ در حقیقت وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ عطیہ خداوندی سمجھ کر گزارتا ہے اور ان انمول لمحوں سے فرحت و انبساط کشید کرنے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے:

"سیاح کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشے سے قطعاً منقطع ہو کر کسی غیر مادی شے کی طرح سبک اور لطیف ہو جاتا ہے اور بندھنوں اور حد بندیوں کو تج کر ایک آوارہ جھونکے کی سی آزاد روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے۔ جو مکڑی کے جالے میں قید ہو کر جالے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا بڑھتا چلا جائے۔۔۔ سیاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔۔۔ جب کہ مسافر تو حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے۔"(37)

ایک اچھے سفر نامے کی اہم خصوصیت اس کا اَدبی حُسن ہے۔ سفر نامہ نگار جو کچھ رقم کرے، اس میں اَدبیت ضرور ہونا چاہیے۔ اگر کوئی سفر نامہ اَدبی حُسن سے عاری ہے تو اس کا مقام وحیثیت سفر بیان سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سفر نامہ نگار جب ادب سے دور ہو جاتا ہے تو قاری بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ قاری کی دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے اَدبی چاشنی ایک کام یاب سفر نامے کا جزو ہے۔

ایک ادیب کا دل و دماغ اور نظر رکھنے والا سفر نامہ نگار ہی سفر کی جزئیات کو کام یابی سے سمیٹ کر حسین، دل کش اور جاذب توجہ اسلوب میں اس طرح پیش کر سکتا ہے کہ واقعات کے تمام مناظر قاری کے سامنے رقص کرنے لگیں۔ غیر تخلیقی انداز میں تحریر کیا ہوا سفر نامہ اپنی اہمیت اور

افادیت کھو دیتا ہے اور اس نوع کے سفر نامے کے دائرے سے خارج کر دیئے جاتے ہیں۔ایسے سفر نامے جو غیر تخلیقی ہوں وہ اپنا مقام نہیں رکھ پاتے۔اسلوب ایسا ہونا چاہیے جو سچائی پر مبنی اور شگفتہ ہو ،سفر نامے کی سنجیدگی اور وقار کو قائم رکھے۔سفر نامے کی کشش میں اضافہ اور کام یابی شگفتہ اُسلوب کے وسیلے سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

خالد محمود لکھتے ہیں:

> "غیر تخلیقی انداز میں تحریر کیاہوا سفر نامہ اپنی اہمیت اور افادیت سے محروم ہوجاتا ہے۔اس قبیل کے سفر نامے ادب کے دائرے سے خارج کر دیئے جاتے ہیں۔غیر تخلیقی انداز میں مرتب کیے ہوئے سفر ناموں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ایسے سفر نامے جلد فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔سفر نامہ نگار اپنی عرق ریزی کو نتیجہ خیز ،مفید اور پسندیدہ بنانے کا خواہش مند ہے تو ادیبت کے ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے سفر نامے کی کشش میں اضافہ ہو اور یہ کام یابی شگفتہ ادبی اسلوب کے وسیلے ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔"(38)

اُردو کے مشہور و معروف ادیبوں کے سفر ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بڑی خوبی سے دوران سفر پیش آنے والے واقعات کو اَدب بنادیا ہے۔اُردو کے مشہور معروف ادیبوں کے سفر ناموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بڑی خوبی سے دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات کو اَدب بنا دیا ہے۔سر سید ، شبلی ، مولانا محمد حسین آزاد اپنا اپنا رنگ لیے ہوئے ہیں۔سفر نامہ لکھنے کے لیے سفر نامہ نگار کا ادیب ہونا ضروری نہیں ہے۔بہت سے ایسے سفر نامہ نگار بھی ہیں ، جنھوں نے سفر ناموں سے پہلے کسی دوسری صنف میں کچھ نہیں لکھا مگر جب سفر نامہ لکھا تو بڑے بڑے ناقدین فن داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔پاکستان کے مستنصر حسین تارڑ اس کی زندہ مثال ہیں۔مگر اتنا ضرور ہے کہ سفر نگار میں اگر ادیب کے خواص بھی موجود ہوں تو وہ اس کام کو زیادہ بہتر انداز میں انجام دے سکے گا۔

ایک اچھی تحریر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ قاری کی توجہ اور التفات جلد حاصل کر لے۔جن سفر ناموں میں یہ خوبی نہ ہو قاری ان کو پڑھنا پسند نہیں کرتا۔اور جب قاری پڑھنے پر آمادہ نہ ہو گا تو لکھنے کا کیا فائدہ ؟ لہٰذا تحریر کی دل چسپی بڑھانے کی طرف سفر نامہ نگار کی توجہ ہونا چاہیے۔

مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"سیاحت کے ثمرات اور تجربات اپنا انعام آپ ہیں۔اس لیے سفر ناموں کا بیان بھی منہ بسور نے اور آہ زاری کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تخلیقی سفرناموں کی شگفتہ بیانی راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔فطری سیاح اپنے منتخب کردہ پر صعوبت سفر کے حال پر راضی بہ رضا ہی ہوتا ہے۔سو طے پایا کہ اس کے لیے شگفتہ اور سُبک انداز تحریر مناسب ہے لیکن نہ اتنا کہ پھکڑ بازی کی حدود کو چھونے لگے۔"(39)

قاری کی دل چسپی تب بڑھتی ہے جب سفر نامہ نگار اجنبی واقعات اور پُر کشش مناظر کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کو بھی تازگی دیتا ہے۔اسلوب کا پُر کشش ہونا بہت اہمیت کا حامل ہے۔ایک اچھے سفر نامہ نگار کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس کا اسلوب بہترین ہو ،اس کی تحریر میں ربط ہو۔غیر ضروری طوالت اور غیر مہذب قسم کے الفاظوں سے پرہیز ضروری ہے۔تحریر میں شگفتگی ، شستگی اور ربط بہت اہمیت کا حامل ہے۔

د۔ ثقافت کیا ہے ؟

ثقافت صدیوں سے انسانی زندگی کا حصّہ رہی ہے۔ہر قوم کی ایک ثقافتی شخصیت ہوتی ہے اور اپنی ایک مخصوص ثقافت ہوتی ہے۔اس شخصیت کے بعض پہلو دوسری ثقافتوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں۔جو ایک قوم کی ثقافت کو دوسری قوم کی ثقافتوں سے مختلف اور ممتاز کرتی ہیں۔ہر خطے کی ثقافت اپنی انہی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔گویا ثقافت کسی قوم کے مجموعی طرزِ حیات کا نام ہے۔تہذیب و ثقافت کو کسی بھی قوم کے فکر و عمل اور طرزِ حیات کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔یوں کسی بھی قوم سے تعلق رکھنے والے افراد کسی نہ کسی کلچر کا حصّہ ہوتے ہیں۔کلچر اور تہذیب ہی ایک ایسی شے ہے جس سے زندگی کا اسلوب متعین ہوتا ہے اور قومیں دیگر قوموں سے خود کو ممتاز کرتی ہیں۔فکر وعادات اور افراد

کے ذوق کا نام ہی ثقافت ہے۔ کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں ”الثقافۃ“، اُردو میں تہذیب، ثقافت، تمدن کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔ یہ سب الفاظ عام طور پر مترادف معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے لغوی معنی اور اصطلاحی مفاہیم پر نظر ڈالی جائے تو صورتِ حال یک سر مختلف نظر آتی ہے۔ ثقافت کے تسلسل و اِستحکام کا انحصار اس کے نظام اقدار پر ہوتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں اقدار کا مکمل نظام موجود نہ ہو تو اس میں تیزی سے تغیرات صورت پذیر ہوتے رہتے ہیں اور اس ثقافت کے لوگ شناخت کے زوال کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں۔ تہذیب و کلچر کی تشکیل میں مذہب اور عقیدہ وہ عناصر ہیں جو کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اُردو اَدب کے حوالے سے اگر غور کیا جائے تو اس میں تہذیب و ثقافت کے مباحث کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے:

بقول خلیفہ عبدالحکیم:

> ”ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اور اب اُردو میں یہ لفظ پچیس تیس سال سے استعمال ہونے لگا ہے۔ ابھی اس کا استعمال عام نہیں۔“[40]

ہر لفظ کے ایک سے زیادہ معنی بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بھی لفظ بطور اصطلاح استعمال ہونے لگے تو اس کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی حال اُردو میں لفظ ”ثقافت“ کا بھی ہے۔

سلطان محمد صابر لفظ ”ثقافت“ کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”ثقافت عربی زبان کا لفظ اور اس کا مادہ ”ث ق ف“ ہے۔“[41]

”اُردو لغت (تاریخی اُصول پر)“ میں ”ثقافت“ کے معنی یہ ہیں:

> ”کسی قوم یا گروہِ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظام اخلاق، علم واَدب اور فنون میں نظر آتے ہیں۔“[42]

”فیروز اللغات“ طبع ششم 1976ء میں اس لفظ کے معنی ”تہذیب، کلچر“ بیان کیے گئے ہیں۔ ”فیروز اللغات“ میں ”ثقافت“ کے معنی ”عقل و سمجھ، تعلیم و تربیت اور کلچر“ لکھے گئے ہیں۔

> ”عربی لفظ ”ثقافت“ کا لغوی مفہوم زیک، سبک، چالاک ہونا ہے۔ اس کا مادہ ثَ قَ فَ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں: سیدھا کرنا، مہذب بنانا، تعلیم دینا۔“[43]

اُردو میں کلچر کے لیے ”تہذیب“ اور ”ثقافت“ دونوں استعمال کیے جاتے ہیں اور کلچر کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ”پاکستانی کلچر“ میں ڈاکٹر جمیل لکھتے ہیں:

”کلچر معاشرے کے مجموعی طرزِ عمل میں ظاہر ہوتا ہے اور طرزِ عمل معاشرے کے ان بنیادی اداروں سے متعین ہوتا ہے۔ جنھیں ہم مذہب، معیشت، فنون وہنر، سیاست، زبان، علم اور سائنس وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔“(44)

اُردو میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ طویل عرصے تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ اور اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ثقافت کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے، جو ثقافت کو تخلیق کرتی ہے۔

فیض احمد فیض کلچر کی تاریخ اس طرح پیش کرتے ہیں:

”آج کلچر کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے۔ وہ آج سے دو سو برس پہلے کسی کے ذہن میں نہ تھا ایک دھندلا خاکہ اگر کسی نے پیش کیا تو وہ ابنِ خلدون یا ابن مقدوم ہیں۔“(45)

ثقافت کسی بھی معاشرے کے طرز فکر و احساس کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس لیے پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رسوم و روایات، علم و اَدب، عقائد و رسوم اور خاندانی تعلقات وغیرہ سب ثقافت کی مختلف جہتیں ہیں۔ ثقافت درحقیقت کسی گروہ کے اقدار کا ایسا شعور ہے جس کے مطابق وہ اپنی زندگی کی ترتیب دے رہے ہوتے ہیں۔ ان اقدار کی ہم آہنگی کی وجہ سے کلچر یا تہذیب کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ خیال ہے:

”کلچر کے آسان معنی ہیں۔ طرزِ زندگی جو کسی قانونی جبر کے بغیر رضاکارانہ معاشرے کے سب افراد میں کم و بیش مشترک حیثیت رکھتی ہے اور حسن کی شان رکھتی ہے۔ جس سے زندگی زیادہ با معنی اور پر راحت بن جاتی ہے۔“(46)

ڈاکٹر سید عبداللہ کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں:

"اس میں فنون و تفریحات ، انفرادی و مجلسی آداب اور ذوقیات کی دیگر شکلوں کو بھی شامل قرار دیا ہے، جو جبری نہیں۔"(47)

جب کوئی معاشرہ دُنیا کو دیکھتا ہے تو وہ وہاں کے ثقافتی عوامل کو سامنے لانے کی سعی کرتا ہے۔ اس علاقے کی آب و ہوا، رہن سہن، خوراک، طرزِ رہائش، پیشے، رسوم و رواج وغیرہ کو جانچتا ہے۔ ان سے متعلق معلومات اکٹھا کرتا ہے۔ تب وہ ان ثقافتی عوامل سے متعلق جان کاری حاصل کر پاتا ہے۔ کیوں کہ یہی وہ ثقافتی عوامل ہیں۔ جو اس علاقے کی انفرادیت کو سامنے لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ممتاز ایرانی اسکالر ڈاکٹر غلام علی خداداد عادل اپنی کتاب "تمدنِ برہنگی اور برہنگی تمدن" میں کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"کلچر وہ مجموعہ نقطہ نظر ہے۔ جس کی رو سے کوئی معاشرہ دُنیا کو دیکھتا ہے اور یہ نقطہ نظر انہی معنی میں ہے۔ جس اعتبار سے وہ معاشرہ انسانی وجود اور اس کی ہستی کا قائل ہے۔ نیز بطور کلی پوری دُنیا پر حاوی ہے اور تمام انفرادی و اجتماعی اقدار و اطوار کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔"(48)

شائستہ، تعلیم یافتہ افراد کو مہذب یعنی کلچرڈ سمجھا جاتا ہے۔ یہ انگریزی زبان کے ان چند الفاظ میں شامل ہے۔ جن کا مفہوم بیان کرنا بہت مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ریمنڈ ولیمز نے لکھا ہے:

"لفظ کلچر انگریزی زبان کے چند پیچیدہ ترین الفاظ میں سے ایک ہے۔"(49)

وقت کے ساتھ ساتھ کلچر کے مفہوم میں وسعت آتی گئی اور اس وسعت و گہرائی میں اضافہ جاری رہا اور پھر اسے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جس سے یہ نئے مفاہیم سے آشنا ہوا۔ فلپ بیگ بی (Philip Bag By) نے کلچر انڈسٹری (1958ء) میں لکھا ہے:

"اس لفظ کا استعمال اٹھارویں صدی میں فرانسیسی مصنفین Voltair اور Vanvenargues نے کیا۔ ان کے نزدیک ذہنی تربیت و تہذیب کا نام کلچر تھا۔ جلد ہی اچھے آداب، آرٹ، سائنس اور تعلیم وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔"(50)

ثقافت سے مراد لوگوں کا طرزِ زندگی ہے۔ ثقافت کی بے شمار تعریفیں ہیں اور مختلف ماہرینِ بشریات (Anthropologists) نے ان تعریفوں کے مجموعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: "ثقافت سیکھی جا سکتی ہے۔"

یعنی یہ کوئی جبلی چیز نہیں ہے۔ یہ انسان کو اپنے قدرتی ماحول اور معاشرے سے مطابقت حاصل کرنے میں مدد گار ثابت ہوتی ہے۔ ثقافت میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ثقافت رویوں اور کرداروں کا مجموعہ ہے جو نہ صرف انسان نے سیکھے ہوں بلکہ وہ کسی معاشرے کے لوگوں کی مشترکہ میراث ہو۔

کلچر کا لفظ بطور اصطلاح انیسویں صدی کے وسط میں ماہرین بشریات کی تحریروں سے اُبھر کر سامنے آیا۔ برطانوی بشریات ایڈورڈ برنٹ ٹائلر (Edward Burnett Tylor)(1917ء – 1832ء) نے پہلی بار 1871ء میں اپنی کتاب "Primilitve Culture" میں ایک اصطلاح کی حیثیت سے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اور اس کی تعریف بھی بیان کی۔ ان کی تعریف کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کیوں کہ اس سے بشریات کے علم کی بنیاد پری۔ ٹائلر کی تعریف کو دو وجوہات کی بنا پر اہمیت حاصل ہے۔ ایک تو یہ تعریف ایک طویل عرصے تک رائج رہی اور دوسری یہ کہ اسی سے بشریات کے علم کی بنیاد پڑی ہے۔ 1930ء کے عشرے میں روتھ بنی ڈکٹ نے کلچر کو فکر و عمل کا ایسا نمونہ قرار دیا جو کسی قوم کے لوگوں کی سرگرمیوں میں جاری و ساری رہتا ہے اور انھیں دوسری قوموں کے لوگوں سے انفرادیت بخشتا ہے۔ اس کے بعد کلچر کے اصطلاحی معنی جو سمجھے جانے لگے۔ وہ ماحول سے مطابقت پذیری یا فطرت کو انسانی خواہشات و مقاصد کے مطابق ڈھالنے کے لیے استعمال ہونے لگے۔

برطانوی انتھر و پولو جسٹ ٹائلر نے 1871ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب " Primative Culture" میں کلچر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> "وسیع بشریاتی مفہوم میں تہذیب یا تمدن ایسا پیچیدہ کُل ہے جس میں معلومات، عقائد، فن، اخلاقیات، قوانین، رسوم و رواج اور ایسی کوئی بھی استعداد اور عادات پائی جائیں۔ جو فرد نے بطور رُکن معاشرہ حاصل کی ہوں۔"(51)

ثقافت ماحول کا وہ حصہ ہے جو انسان نے خود تخلیق کیا ہو۔ ہر معاشرے کی کوئی نہ کوئی ثقافت ضرور ہوتی ہے۔ تاہم علاقائی یا مقامی اثرات کی وجہ سے یہ مختلف نظر آتی ہے۔ ثقافت رہن سہن کا وہ طریقہ کار ہے۔ جو اس مخصوص طرز معاشرت رکھنے والے گروہ کو باقی گروہوں سے ممتاز کرتا ہے۔ معاشرتی کردار انسانی ثقافت سے وابستہ ہیں۔ انسان معاشرے میں جو افعال سر انجام دیتا ہے وہ اس کی ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

کلچر (ثقافت) کی تعریف بیان کرتے ہوئے۔ٹی ایس ایلیٹ (1965ء– 1888ء) نے لکھا ہے:

"کلچر آداب کی شائستگی کا نام ہے یعنی مدنیت اور انسانیت۔"(52)

ثقافت کلچر کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"ایک خاص مقام پر رہنے والے مخصوص افراد کا طرزِ حیات۔"(53)

ایلیٹ کا کہنا ہے کہ:

"لوگ آرٹ، معاشرتی نظام، رسوم، مذہب وغیرہ کو کلچر سمجھتے ہیں۔حالاں کہ یہ چیزیں کلچر نہیں بلکہ وہ کچھ ہیں جن سے کلچر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"(54)

ہر وہ عمل جو ایک فرد ورثے کے طور پر نسل در نسل سیکھتا اور سکھاتا چلا آ رہا ہے، وہ ثقافت کے دائرے میں آتا ہے۔

برونسلا میلی نوفسکی (Bronsilaw Malinowski)(1942ء– 1884ء) کے مطابق:

"زندہ رہنے کے مجموعی سلیقے کا نام ثقافت ہے جو ہر قسم کے ذہنی معاشرتی اور مادی آلات پر مشتمل ہے۔"(55)

ٹالکوٹ پارسنز نے کلچر کو وراثت میں ملنے والی خاصیت قرار دیا ہے۔لیکن یہ ثقافت جینز کے ذریعے منتقل ہونے والی نہیں بلکہ ایک نسل اپنی اگلی نسل کو سکھاتی ہے اور اس طرح یہ منتقلی عمل میں آتی ہے۔تاہم کلچر کی منتقلی ماحول سے بھی ہوتی ہے۔جس میں بعض اوقات والدین کے کلچر اپنانے کے بجائے ماحول کے زیرِ اثر ایک نیا کلچر اپنا لیا جاتا ہے۔خاص طور پر ایسے لوگ اس صورتِ حال سے دو چار ہوتے ہیں۔جو اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں آباد ہوتے ہیں۔

کلائیڈ کلک ہون کے مطابق کلچر:

"وہ نظام حیات ہے جو ایک گروپ کے لوگوں میں نظام اقدار کی شکل میں مشترک طور پر موجود ہوتا ہے۔"(56)

ثقافت (کلچر) کی گروہ کے مشترکہ طرزِ عمل سے مشروط ہوتی ہے۔کلچر سے مراد صرف مشاہدے میں آنے والا طرزِ عمل نہیں ہے۔بلکہ اسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔کیوں کہ یہی اعمال کسی کی ثقافت کی نشان دہی کرتے ہیں۔جیسے آداب و تعظیم کے لیے انگریزوں کا سر سے ہیٹ اتارنا، جاپانیوں کا جھک

جانا، ہندوؤں کا ہاتھ جوڑنا وغیرہ۔ ایسے افعال ہیں جو اپنے معاشرے میں خاص مقام رکھتے ہیں اور ارکانِ معاشرہ سے قبولیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ کلچر کسی گروہ کے مجموعی طرزِ عمل سے وجود میں آتا ہے کیوں کہ ثقافت کسی جگہ کی اسی وقت سامنے آتی ہے جب کہ اس معاشرے کے سبھی لوگ اس طرزِ عمل کو اپنائے ہوئے ہوں۔ مجموعی طور پر کلچر کی مختلف تعریفوں سے جو تصویر اُبھرتی ہے۔اس کے مطابق کلچر آداب کی شائستگی اور زندگی گزارنے کا طریقہ ہے جو ہر قسم کے ذہنی، معاشرتی اور مادی آلات پر مشتمل ہوتا ہے۔ کلچر چوں کہ کسی گروہ کے مجموعی طرزِ عمل سے وجود میں آتا ہے۔ جس میں باقاعدگی ہوتی ہے۔ معلومات، عقائد، فن، اخلاقیات، قواعد وضوابط، رسومات، رواج، قوانین، اقدار اور روایات سے کلچر کی تشکیل ہوتی ہے۔

ثقافت تین چیزوں سے عبارت ہے:

1. مذہب
2. تاریخ
3. جغرافیہ

پاکستان کی ثقافت کی بھی تین ہی بنیادیں ہیں۔ لیکن اس ملک کی ساخت ایسی ہے کہ اس کی ثقافت کو تمام وکمال جغرافیائی حدود کے اندر مقید کرنا مناسب نہیں۔ ثقافت کی مختلف تعریفیں کی جاتی رہی ہیں۔ ایک طرف ثقافت قومی مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ثقافت کے جغرافیائی عوامل میں سب سے نمایاں آب وہوا اور موسمی تغیرات ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے لے کر ابنِ خلدون سے ہوتے المیس ورتھ، ہنٹنگٹن تک بے شمار دانش ور قوموں کے اجتماعی کردار اور ان کے ثقافتی عمل میں آب وہوا اور موسموں کی کارفرمائی کے قائل رہے ہیں۔ انسانوں کے طرزِ بود وباش، ان کے مکانات کی ساخت، ان کے لباس کی تراش خراش اور ان کی خورد ونوش کی عادتوں پر ان کے گہرے اثرات بالکل بدیہی اَمر ہیں۔

جغرافیائی عوامل کی تہذیبی وثقافتی اہمیت کے موضوع پر علمی تحقیق کے سفر کی روئداد بہت بصیرت افروز ہے۔ کیوں کہ علم جغرافیہ اور علم تاریخ کے ارتقا کی داستان اسی موضوع کے ساتھ وابستہ ہے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے۔ آب وہوا اور موسمی تغیرات ہماری ثقافت میں کثرت کا عنصر ثابت ہوئے ہیں۔

ہمارا ملک ایک طویل اور مستطیل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طول کی وجہ سے یہاں کی آب وہوا میں غیر معمولی تنوع ہے اور اس تنوع نے ہماری ثقافت میں بے حد رنگا رنگی پیدا کر دی ہے۔ ہماری ثقافت میں وحدت کا عنصر ہمارے ملک کی طبعی خصوصیات ہیں۔ کسی معاشرے میں روابط سلوک، اخلاق وعادات، طرز

بود و باش، رسم و رواج، حسن و جمال اور فن و اظہار فن کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کے سماجی اقدار کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ معاشرے کے خد و خال ہی ثقافت کے علم بردار ہیں۔ ایک علاقے کی ثقافت دوسرے علاقے کی ثقافت سے جو مختلف نظر آتی ہے۔ وہ انہی عوامل کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ثقافت گلی کوچوں ، بازاروں، گھروں کی ساخت اور ڈیزائن، زبان و اسلوب بیان، لباس اور لباس کے ڈیزائن، فنون اور اہلِ فنون کی تخلیقات، گھروں، بازاروں اور شہروں میں موجود کھانا کھانے اور سجانے کے اندازِ جن کا تعلق انسان کی حسِ جمالیات سے ہے ثقافت کے زُمرے میں آتے ہیں۔ تہذیب کُل ہے اور ثقافت اس کا جزو ہے۔ جیسے مسلم تہذیب ہے۔ جب ہم اسے پاکستان کے مختلف علاقوں میں دیکھتے ہیں تو یہ ہمیں جزوی طور پر الگ الگ خصوصیات کی حامل نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف علاقوں میں ثقافت بدل جاتی ہے۔

صنفِ سفر نامہ جہاں اَدب ، مذہب ، معاشرت ، سیاست اور تاریخ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ثقافت کا تعلق ذہن سے ہے۔ اسی لیے ثقافت معاشرے کی ذاتی یا داخلی طرزِ عمل سے واسطہ رکھتی ہے۔ ثقافت دراصل ایک تخلیقی رخ ہے۔ ثقافت فنون لطیفہ، سائنس کی دریافتوں اور ایجادات کے علاوہ عام زندگی میں اپچ، تنوع اور روحانی یافت کی صورت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

نصیر احمد ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ثقافت شعور کی تاریخ دراصل جمالیاتی شعور کی تاریخ ہے اور جمالیاتی شعور حقیقت میں انسان کی آرزوئے حسن کا شعور ہے۔"(57)

ایک تاریخ دان اپنے ملک کی تاریخ یا دیگر ممالک کی تاریخ لکھتے وقت کم زور روایات کا سہارا بھی لیتا ہے اور کسی ایک جگہ بیٹھ کر دُنیا بھر کی تاریخ وسیاست پر اپنی رائے دے سکتا ہے۔ ایک مسافر جس خطے کا سفر کرتا ہے وہاں کے لوگوں کو دیکھتا ہے۔ چوں کہ وہاں کے لوگ اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان سے وہ براہِ راست بغیر کسی وسیلے کے مخاطب ہوتا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ ان کی خوشیاں ان کے غم اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان کی بود و باش کو سنورتے بگڑتے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ سفر نامہ لکھتا ہے تو یہ ساری باتیں اس کی تحریر میں سما جاتی ہیں۔ یوں ایک قوم کی ثقافت ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہے جس کا ہر پنا ہمیں کسی قوم یا ملک کی ثقافت کو سمجھنے میں مدد گار ثابت ہوتا ہے۔

ثقافت کو طرزِ زندگی کانام دیا جاسکتا ہے۔کیوں کہ ثقافت ہی وہ عنصر ہے جس کا تعلق ایک اعلیٰ معاشرے سے ہے۔جس نے ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہوں۔طرزِ زندگی کی عکاسی تمدن کے زمرے میں آتی ہے۔کیوں کہ اس کا تعلق رہن سہن ،بودوباش کے ساتھ ہوتا ہے :

"کلچر کو اگر طرزِ زندگی کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو تمدن کہنا چاہیے۔"(58)

کسی خطے کے سفر نامے میں اگر اس خطے یا ملک کی ثقافت کی جھلک موجود نہیں تو وہ ایک مکمل سفر نامہ نہیں ہو سکتا۔اُردو اَدب میں لکھے گئے سفر ناموں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ سفر نامہ نگاروں نے اس پہلو کو خوب اُجاگر کیا ہے۔اس میں یوسف خان کمبل پوش سے شبلی نعمانی تک چیدہ چیدہ سفر ناموں میں ثقافتی رنگ موجود ہے۔جدید سفر نامہ نگاروں کے ہاں یہ پہلو موجود ہے۔ان میں رضا علی عابدی ،مستنصر حسین تارڑ ، عطاالحق قاسمی ،مرزاادیب ،اشفاق احمد ، ابنِ انشا ،بیگم اختر ریاض الدین ، اے حمید ، قمر علی عباس ،حکیم محمد سعید کے نام شامل ہیں۔

ہمارا ہر عمل اور فعل کسی فکر اور عقیدے کا نتیجہ ہوتا ہے۔کلچر یا ثقافت ہر گروہ انسانی کا خاصہ ہوتی ہے۔تمدن کا تعلق خاص طور پر سلطنت اور شہرت کے ساتھ ہے۔جب کہ تہذیب و ثقافت میں روایات اور اقدار کی پاس داری تو کی جاتی ہے۔تہذیب گویا کلچر کی رُوح ہے اور ثقافت اس کا جسم۔ثقافت کسی معاشرے ،نسل یا عہد کا مجموعی تاثر ہوتا ہے۔جس قوم کا جو بھی کلچر ہو ،وہ اسی کو بہتر سمجھتا ہے جب کہ دوسری ثقافتوں کو اپنے سے کم تر خیال کیا جاتا ہے۔ثقافت سے تمدنی سلیقہ اور معاشرتی قرینہ مراد لیا جاتا ہے۔ثقافت کے زمرے میں کسی قوم کی شائستگی ،پختہ عادات وروایات ، سماجی رسومات ، اخلاقی اقدار اور معاشرتی معاملات وغیرہ آتے ہیں۔ثقافت دست کاریوں ،مصنوعات ، رسوم ،خیالات ،عادات اور اقدار پر مشتمل ہے۔

حسنین کاظمی "ہماری قومی ثقافت " میں لکھتے ہیں :

"کلچر کا لفظ بھی اب اُردو میں استعمال ہونے لگا ہے لیکن اُردو میں اس لفظ کے ہم معنی الفاظ ثقافت یا تمدن سمجھے جاتے ہیں۔"(59)

ثقافت کی حیثیت ایسے ہے جیسے انسانی جسم کے اعضا ہیں۔یعنی ثقافت انسانی جسم کے اعضا ہیں۔تہذیب جڑ ہے اور ثقافت اس کے برگ بار فکر ،عقیدے ، سوچ ،خیالات اور تصورات کا اور اس

کا بنیادی فکر اور تصور کے تحت جو اعمال وافعال ظہو ر پذیر ہوتے ہیں اور جو کردار اور سیرت تشکیل پاتی ہے ،اسے ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔اسی طرح تہذیب و ثقافت لازم و ملزوم ہیں۔ثقافت ہر گروہ انسانی کا خاصہ ہوتی ہے۔ثقافت سے تمدنی سلیقہ اور معاشرتی قرینہ مراد لیاجاتا ہے۔یہ ایک ایسا نظام ہے جو کسی قوم کی معاشرت سے اَخذ کیاجاتاہے۔حیات کے وہ تمام نقوش جو معاشرے میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں اس کے دائرے میں آتے ہیں۔یعنی ثقافت کے ضمن میں زبان ،اندازِ فکر ، توہمات ،علوم وفنون ،موسیقی و مصوری ،رَسوم ، رواج ،روایات ،خاندانی تعلقات ،اخلاقی و مذہبی اقدار ، رہن سہن ، عادات و خصلتیں ،طور طریقے ،ذہنی اورمادی طرز عمل اوراس کے علاوہ ایسے تمام محرکات جو تصوراتِ حیات اور اقدار کی بنیاد بنتے ہیں ،ثقافت میں شامل ہیں۔ہر وہ چیز جو فرد یا معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے مفید نظر آئے،ثقافت میں شامل ہے۔

کسی بھی علاقے کے ثقافتی عناصر یعنی آب وہوا ، طرزِ رہائش ، فکرواحساس کو سامنے لاتے ہیں۔فکر واحساس سے ہی معاشرتی عوامل سامنے آتے ہیں۔لوگوں کی سوچ سامنے آتی ہے۔ان کے زندگی گزارنے کے انوکھے ڈھب سامنے آتے ہیں اوران کی خوراک ،لباس ،پیشے ،طور طریقے ،رسوم ورواج ، عادات واطوار وغیرہ نمایاں ہوتے ہیں۔ثقافت ہی کی بدولت کوئی بھی خطہ یا علاقہ اپنے نقوش کے ساتھ واضح طور پر اُبھرتا ہے۔ان ثقافتی عناصر کو سامنے لانے میں ایک اہم کردار اُردو سفر نامہ نگاروں کا بھی ہے۔اُنھوں نے اپنے ملک کی ثقافت کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کیاہے۔زیرِ نظر مقالے میں ثقافت کا جائزہ ان ثقافتی عوامل کو مدِ نظر رکھ کرلیاگیاہے۔

i. ثقافت کے عناصر:

آب وہوا :

آب وہوا وہ ثقافتی عنصر ہے جس کا تمام عوامل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔آب وہوا کسی علاقے کی ثقافت کا تعین کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُردو سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں آب وہوا کو سب سے زیادہ اُبھارا ہے۔کیوں کہ جیسی آب وہوا ہوگی ویسا ہی طرزِ زندگی لوگوں کو اپنانا پڑتا ہے۔سرد علاقوں کی ثقافت کے رنگ مختلف ہیں اور گرم آب وہوا کے علاقے

الگ نوعیت کے ہیں۔ آب وہوا ہی وہ سب سے اہم عنصر ہے جو کسی علاقے کی ثقافت کو اُبھارنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

امتیاز علی قریشی پاڑہ چنار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سنا ہے کہ یہاں کی ہوائیں اجنبی لوگوں کو جلد قبول نہیں کرتیں۔ گھل مل جانے سے شرماتی ہیں۔ یہی حال موسم کا بھی ہے جو اتنی آسانی سے کسی کو راس نہیں آتا۔ پہاڑوں کے سینوں سے پھوٹنے والے چشموں کا آب یخ موسم گرما میں روح تک کو ٹھنڈا کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔"(60)

اُردو سفر نامہ نگاروں نے اسی عنصر کو اپنے سفر ناموں میں پیش کر کے وہاں کی ثقافت کو اُبھارا ہے۔ آب و ہوا ہی سب سے زیادہ طرزِ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

لباس :

آب و ہوا ہی وہ سب سے اہم ثقافتی عنصر ہے جو باقی دوسرے عناصر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ آب و ہوا ہی کسی علاقے کے رہنے والوں کے لباس کا تعین کرتی ہے۔ جس علاقے کی آب و ہوا گرم ہوتی ہے وہاں اسی آب وہوا کو مدِ نظر رکھ کر لباس زیب تن کیا جاتا ہے جب کہ سرد علاقوں کی آب وہوا کے مطابق گرم کپڑوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جیسے ملتان، ڈیرہ غازی خان، سبّی، جیکب آباد، رحیم یار خان، بھاول پور، سندھ کے اندرونی علاقے، تھر کا ریگستان گرم ترین علاقے ہیں۔ اس لیے یہاں کے باشندے وہ لباس زیب تن کرتے ہیں جو اس گرمی میں ان کے لیے باعث سکون ہوتا ہے۔ سرد علاقے جہاں برف پڑتی ہے، وہاں کے لوگوں کا کلچر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ لوگ گرم کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ لباس کسی علاقے کی ثقافت کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان کے تمام صوبوں کا اپنا اپنا روایتی لباس ہے۔ جو اس کی پہچان بنتا ہے اور ان کی ثقافت کو نمایاں کر کے انھیں ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی، تہذیب وثقافت کے معانی ومفاہیم کو یک جا کر کے ان کے لیے لفظ "کلچر" استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی ،خارجی ہو ں یا داخلی ،احاطہ کرلیتا ہے۔"[61]

کلچر یا ثقافت وہ عنصر ہے جو انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور تمام ثقافتی عناصر سے انسان پوری طرح متاثر ہوتا ہے۔

خوراک:

خوارک کا تعین بھی آب وہوا کرتی ہے۔ایسے علاقے جہاں کی آب و ہوا سرد ہے ،وہاں کے لوگ جسم کو گرم رکھنے اور اس ٹھنڈ سے بچنے کے لیے گرم غذائیں کھاتے ہیں۔جیسے انڈے ، میوہ جات ،جڑی بوٹیاں ،قہوہ ،چائے ،کافی وغیرہ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔پہاڑی علاقوں میں جگہ جگہ چائے کے ہوٹل نظر آتے ہیں۔شمالی علاقہ جات جیسے مری ،سوات ،کاغا ن ،ناران ، مٹلتان ،مالم جبہ ،چترال ، گلگت ،بلتستان ،ہنزہ وغیرہ ہیں۔ان سرد علاقوں کے لوگ سردیوں کے لیے خوراک ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں۔دیسی گھی ان کے ہاں بکثرت پایا جاتا ہے۔یہاں کے لوگ ایسی خوراک کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں جو جسم کو طاقت دیتی ہے ،گرم رکھتی ہے اور سردی سے بچاتی ہے۔اسی طرح گرم اور معتدل آب وہوا والے علاقوں کے لوگ اپنے ماحول اور آب و ہوا کے مطابق اپنی خوراک کا انتخاب کرتے ہیں۔جیسے مشروبات ، دہی ، لسّی ، سردائی ، پھل (تربوز ، آڑو ،لوکاٹ ،آلوبخارا ،فالسہ وغیرہ) ،سبزیاں وغیرہ صحت بخش غذائیں ہیں۔

طرزِ رہائش:

طرزِ رہائش پر موسم بھی اَثر انداز ہوتے ہیں۔موسم کے مطابق گھر تعمیر کیے جاتے ہیں۔پاکستان کی زیادہ آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔گرم اور خشک علاقے جہاں بارشیں کم ہوتی ہیں۔اس کے برعکس وہ علاقے جہاں برف باری ہوتی ہے وہاں گھروں کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔وہاں لکڑی کے مکانات بھی نظر آتے ہیں۔موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے مختلف طرز کے مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں۔پہاڑوں پر زیادہ تر پتھروں کے مکانات بنے دکھائی دیتے تھے مگر موجودہ دور میں پہاڑوں پر بنگلے تعمیر ہوئے نظر آتے ہیں۔دیہاتوں اور شہروں کا کلچر قدرے مختلف ہے۔جہاں بارشیں کم ہوتی ہیں وہاں کے لوگ مٹی کی لپائی کر کے گھر تعمیر کرلیتے ہیں۔جیسے لوگ دیہاتوں میں رہائش

اختیار کرتے ہیں۔بلوچستان میں لوگ جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں کیوں کہ وہاں بارشیں کم ہوتی ہیں۔اسی طرح اندرونِ سندھ بھی جھونپڑیاں نظر آتی ہیں۔

ثقافت کسی قوم کے تمام افراد کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہوتا ہے۔پاکستان کے تمام صوبوں میں طرزِ رہائش ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے اور اس کا اظہار ہمیں اُردو سفر ناموں میں ملتا ہے۔

پیشے /روزگار:

روزگار سے بھی کسی ملک کی ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔لوگوں کی بودوباش ،طرزِ زندگی کا پتہ چلتا ہے۔کیوں کہ سفر نامہ نگار جس ملک میں جاتا ہے۔تو اس ملک کی ثقافت سفر نامے کا جزو بن جاتی ہے۔ہر علاقے کے لوگ مختلف پیشوں سے منسلک ہیں۔جیسے دریا کے کنارے رہنے والے لوگ ماہی گیری اور کشتی رانی جیسے پیشوں سے منسلک ہو جاتے ہیں۔زراعت پیشہ دیہاتوں کا حصّہ ہیں۔کھیتی باڑی ان کا روزگار ہے۔کسی علاقے میں لوگ صنعتوں سے وابستہ ہیں۔کہیں گلہ بانی مویشی چرانا ،کوئی معمار ہے توکوئی کمہار۔کوئی کسی پیشے سے اور کوئی کسی پیشے سے وابستہ ہے۔ہمارے ملک کے ہر علاقے کے لوگ مختلف پیشوں میں بٹے ہوئے ہیں۔کلچر یعنی ثقافت میں بہت سے عناصر موجود ہوتے ہیں۔لوگ آب وہوا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے لیے پیشے کا انتخاب کرتے ہیں۔

زبان:

زبان کسی بھی علاقے میں رہنے والے کے خیالات ،جذبات ،احساسات ،عادات واطوار ، سوچنے کا انداز غرض سب کو سامنے لانے میں معاون کردار ادا کرتی ہے۔خیالات ،جذبات کے سنگم سے ہی وہاں کے لوگوں کو اس علاقے کی ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔زبان ہی وہ ذریعہ ہے جو کسی علاقے کی ثقافت کو سامنے لاتی ہے پاکستان کے ہر صوبے میں الگ الگ اور کئی ایک مادری زبانیں بولی جاتی ہیں۔سفر نامے ان ثقافتی عوامل کو سامنے لانے کا موجب بنے ہیں۔

مذہب:

یوں تو پاکستان اسلامی ملک ہے اور یہاں بسنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔لیکن پاکستان کے ہر صوبے میں دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی بسے ہوئے ہیں۔جو اقلیت میں ہیں۔اس کے علاوہ پاکستان کے ہر صوبے میں لوگ مختلف توہمات کا شکار ہیں۔ضعیف الاعتقاد ہیں۔ان سب کو سامنے لانے میں اہم کردار سفر نامہ نگاروں کا ہے۔اُنھو ں نے دور افتادہ علاقوں کی ثقافت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ پاکستان کا چپہ چپہ صفحہ قرطاس کی زینت بن گیا۔کلچر (ثقافت) کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> "اب کلچر کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ کلچر اس کل کا نام ہے۔جس میں مذہب و عقائد ، علوم اور اخلاقیات ، معاملات اور معاشرت ،فنون وہنر ،رسم ورواج ، افعالِ ارادی اور قانون صرفِ اوقات اوروہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسا ن معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔"(62)

عادات واطوار:

ہر علاقے میں بسنے والے لوگوں کی عادات واطوار ،طرزِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔سندھی ،بلوچی ، پٹھان ،پنجابی سب ایک دوسرے سے الگ عادات واطوار اور طرزِ زندگی رکھتے ہیں۔ان کی اسی انفرادیت کو سفر نامہ نگاروں نے اُجاگر کیا ہے۔ہر صوبے کے لوگوں کی اپنی اپنی عادات ہیں۔ان کی یہ عادات انفرادیت کی حامل ہیں۔

رَسوم ورَواج :

تمام صوبوں میں بسنے والوں کے رسوم ورواج ایک دوسرے سے نہ صرف الگ ہیں بلکہ منفرد ہیں۔جیسے شادی بیاہ کی رسوم ،خوشی وغمی کی رسومات ،علاج کے عجیب وغریب طریقے رائج ہیں۔ملک کے تمام صوبوں کے رسو م ورواج ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ان کی یہی انفرادیت

انھیں ایک دوسرے سے منفرد بناتی ہے اور یہ رسوم ورواج اُردو سفر نامہ نگاروں کی مرہون منت منظرِعام پر آئے ہیں۔

عورت کا مقام:

اسلام نے عورت کو بہت بلند مقام عطا کیا ہے؛لیکن ہمارے معاشرے میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں جو اسے ملنا چاہیے تھا۔عورت بلوچستان کی ہو یا خیبر پختونخوا کی اپنی کم مائیگی اور بے بسی کی تصویر کشی کرتی ہے۔پنجاب کی ہو یا سندھ کی اپنی مظلومیت کی داستان سناتی نظر آتی ہے۔عورت کی زندگی کی یہ تصویر اُردو سفر ناموں کی بدولت ہی عیاں ہوئی ہے۔سیاہ کاری کی سزائیں ، وراثت سے محرومی ، غیر اسلامی حرکات ، ہمارے ملک کے صوبوں میں پائی جاتی ہیں۔جہاں عورت کا آج بھی استحصال ہو رہا ہے اور یہ صورتِ حال اُردو سفر ناموں کی بدولت ہی کُھل کر عیاں ہوئی ہے۔

طلاق:

طلاق کے طور طریقے پاکستان کے صوبوں میں الگ الگ ہیں۔سندھی،پنجابی، پٹھان اور بلوچی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔تمام صوبوں کے ان طور طریقوں کو اُجاگر کرنے میں اُردو سفر نامہ نگاروں نے مثبت کردار ادا کیے ہیں۔کہنے کو تو سب مسلمان ہیں مگر اس شرعی فعل کو ادا کرنے میں وہ مذہب سے زیادہ اپنی روایات کے پابند ہیں۔گویا روایات ہر چیز پر حاوی ہیں چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔

شادی بیاہ کی رسومات:

شادی بیاہ بھی ہماری ثقافت کا ایک اہم حصّہ ہیں۔پاکستان کے چاروں صوبوں میں اور شمالی علاقہ جات میں شادی بیاہ کی رسومات منفرد ہیں۔ہر صوبے میں موجود اضلاع میں شادی کے طور طریقے ،رسومات کچھ نہ کچھ ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ہر صوبے کی رسومات دوسرے صوبوں سے الگ ہیں ان میں بہت زیادہ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ان کی یہی انفرادیت انھیں دوسرے صوبوں سے مختلف بناتی ہے۔

پیدائش اور رموت کی رسومات:

ہر قوم ، ہر خطے کے اپنے اپنے رسوم و رواج ہوتے ہیں جو ان کی ثقافت کے امین ہوتے ہیں۔پاکستان کے صوبوں میں پائے جانے والے تمام اضلاع منفرد ثقافت رکھتے ہیں۔ان کی رسوم و رواج ،طرزِزندگی ،عادات واطوار ، رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔خوشی اور غمی کی رسومات منفرد ہیں۔بچے کی پیدائش پر ہر علاقے میں خوشیاں منانے کارواج ہے اور ہر علاقے کی انوکھی اور دل کش رسومات ہیں۔اسی طرح موت کے موقع پر بھی رسوم ہیں۔تدفین کی رسومات اوراس کے بعد چالیسویں تک کی رسومات ہر علاقے میں ادا کی جاتی ہیں۔ہر صوبے میں ان رسومات کی ادئیگی مختلف ہے۔یہی چیز ہر صوبے کوانفرادیت بخشتی ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے توپاکستان کے تمام صوبوں میں بسنے والوں کے طور طریقے ، طرزِزندگی ،رسوم ورواج ، مختلف و منفرد ہیں۔ان کی یہی انفرادیت انھیں ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہے اور ان سب کا سہرا اُردوسفرنامہ نگاروں کے سر ہے۔ان کی عظیم کاوشوں نے پاکستان کے چپے چپے سے قاری کو آشنا کردیا ہے اور پاکستان کی منفرد ثقافت کھل کرسامنے آگئی ہے۔

حوالہ جات

1. انورسدید ، ڈاکٹر ، اُردو اَدب میں سفر نامہ ، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ،لاہور ، 1987ء،ص:4
2. حفیظ صدیقی ،ابو الاعجاز ،(مرتب) کشاف تنقیدی اصطلاحات ، مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ، 1987ء،ص:100
3. قدسیہ قریشی ،ڈاکٹر ،اُردو سفر نامے انیسویں صدی میں ، نصرت پبلشرز ،لکھنو ، 1987ء،ص: 382
4. شہزاد منظر ،سفر نامہ نگاری ایک اَدبی صنف ، مشمولہ:سہ ماہی الزبیر سفر نامہ نمبر،جلد: 37 – 36 ،شمارہ : 4 – 3 ،بہاول پور اکیڈمی
5. جمیل جالبی ،ڈاکٹر ،قومی انگریزی اُردو لغت ، مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد ،ص: 1752
6. وارث سرہندی ، علمی اُردو لغت جامع ،علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، 2007ء،ص:444
7. الحاج مولوی فیروز الدین ،(مرتب) رنگین فیروز اللغات اُردو جامع ، فیروز سنز پرائیوٹ لمٹڈ ، لاہور ، 2005ء،ص: 312
8. Encyclopedia World Dictiondary, Hamlyn P.1669
9. مولوی نورالحسن نیر ،نوراللغات ، نیشنل بک فاؤنڈیشن ،اسلام آباد ، 2006ء،ص: 449
10. مولوی سید احمد دہلوی ،فرہنگ آصفیہ ،اُردو سائنس بورڈ ، لاہور ، 1987ء،ص: 43
11. مظفر عباس ،ڈاکٹر ، (پیش لفظ)عجائبات فرنگ از یوسف خان کمبل پوش ،گوہر پبلی کیشنز ، لاہور ، 2010ء،ص:8
12. ظہیر احمد صدیقی ، (نسخے چند) دیکھ لیا ایران ،ص:52
13. مرزا حامد بیگ ،ڈاکٹر ،اُردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ، مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ،1987ء،ص:10

14. انور سدید ،ڈاکٹر ،اُردواَدب میں سفر نامہ ،مغربی پاکستان اُردواکیڈمی ،لاہور ، 1987ء،ص:
28
15. ارشد محمود ناشاد ،ڈاکٹر،(فلیپ) فرصتِ نگاہ از محمد اعظم خالد ،سرمد اکادمی ، 2010ء اٹک،
ص:37
16. انور سدید ، ڈاکٹر ، اُردو اَدب میں سفر نامہ ، مغربی پاکستا ن اُردو اکیڈمی ، لاہور ،
1987ء،ص:48 – 47
17. ایضاً،ص:73
18. بانو قدسیہ ، (اندرونی فلیپ) انجمن آرزو از انیس الرحمٰن ، ماورا پبلشرز ، لاہور ،
2005ء،ص:20
19. محمد شہاب الدین ، ڈاکٹر ، اُردو میں حج کے سفر نامے ، یونی ورسل بک ہاؤس ، علی گڑھ ،
2002ء،ص:29
20. رحمٰن مذنب ،(مقدمہ)اُردو اَدب میں سفر نامہ از انور سدید ، 1987ء،ص:11
21. محمد خاور نوازش، اُردو سفر نامہ ، فن اور روایت ، مطبوعہ : اخبارِ اُردو ، اسلام آباد ، جو ن
2008ء،ص:17
22. انور سدید ، ڈاکٹر ، اُردو اَدب میں سفر نامہ ، مغربی پاکستا ن اُردو اکیڈمی ، لاہور ،
1987ء،ص:128
23. رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر ،جدید سفر نامہ ،چند تناظر ، مطبوعہ : بازیافت ،شمارہ : 9،پنجاب یونی ورسٹی ، لاہور ،جولائی تا دسمبر 2006ء،ص:9
24. مظفر عباس ،ڈاکٹر ، (پیش لفظ)عجائبات فرنگ ازیوسف خان کمبل پوش ، 2010ء،ص:13
25. حمید احمد خان، تعارف، مشمولہ: سر سید کا سفر نامہ پنجاب ، مجلسِ ترقی اَدب، لاہور ،اپریل 1991ء
،ص ن
26. انور سدید ، ڈاکٹر ، اُردو اَدب میں سفر نامہ ، مغربی پاکستا ن اُردو اکیڈمی ، لاہور ،
1987ء،ص:165
27. ارشد محمود ناشاد ،ڈاکٹر ،اطراف تحقیق ،الفتح پبلی کیشنز ، راولپنڈی ، 2012ء،ص: 184

28. شفیق انجم ،ڈاکٹر ،جائزے ، اسلوب ،اسلام آباد ، 2007ء،ص:24
29. انور سدید ، ڈاکٹر ، اُردو اَدب میں سفر نامہ ، مغربی پاکستا ن اُردو اکیڈمی ، لاہور ، 1987ء،ص:165
30. حفیظ صدیقی ،ابو الاعجاز ،(مرتب) کشاف تنقیدی اصطلاحات ، مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ، 1985ء،ص:100
31. www.rekhta.org
32. انور سدید ،ڈاکٹر ،اُردواَدب میں سفر نامہ ،مغربی پاکستان اُردواکیڈمی ،لاہور ، 1987ء،ص:48
33. وزیر آغا ،چوری سے یاری تک ، مکتبہ اُردوزبان ریلوے روڑ سرگودھا ، 1966ء،ص: 48
34. ایضاً،ص: 60
35. خالد محمود ،اُردوسفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ ، بک ٹاک میاں چیمبرز 3 ٹیمپل روڑ ،لاہور ،ص:24
36. وحید قریشی ،ڈاکٹر ، (تبصرہ) اے آب رودگنگا از رفیق ڈوگر ، معاصر (2)، ص: 599
37. انورسدید ،ڈاکٹر ،اُردواَدب میں سفر نامہ ،مغربی پاکستان اُردواکیڈمی ،لاہور ، 1987ء،ص:60
38. خالد محمود ،اُردوسفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ ، بک ٹاک میاں چیمبرز 3 ٹیمپل روڑ ،لاہور ،ص:59
39. مرزاحامد بیگ ،ڈاکٹر ،اُردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ، مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ، 1987ء،ص:14
40. خلیفہ عبدالحکیم،مقالات حکیم،جلد:سوم،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،1969ء،ص:219
41. سلطان محمد صابر ،تاریخ قدیم پشتو اور پشتون ، پشتو اکیڈمی ، کوئٹہ ، 1977ء،ص:827
42. اُردولغت(تاریخی اُصول پر) ، جلد: ششم ، اُردوڈکشنری بورڈ ، کراچی ،1983ء،ص: 86
43. وحی البعلبکی ،الدکتور ، المورد ، قاموس عربی ، انکلیزی ، دار العلمی للملایین، بیروت لبنان ، طبع ہفتم ، 1995ء،ص:400
44. جمیل جالبی ،پاکستانی کلچر ، الیٹ پبلشرز لمیٹڈ ، کراچی ، 1973ء،ص:50
45. فیض احمد فیض ،پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش ،مرتبہ : شیما مجید ، فیروز سنز ، لاہور ، 1988ء،ص:114
46. سید عبداللہ ،ڈاکٹر ، کلچر کا مسئلہ ، سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2001ء،ص:9

47. ایضاً
48. غلام علی خداداد عادل ،ڈاکٹر ، تمدنِ برہنگی اور برہنگی تمدن ، مترجم :یونس جعفری ،ڈاکٹر ، مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد ، طبع دوّم،2008ء،ص:9
49. Raymond Williams, Keyword: A Vocabulary of Culture and Society, New York, Oxford University Press, Revises Edition, 1983, P.87
50. Philip Bagby, Culture and History, Berkeley and California: University of Colifornia Press, 1959, P.73
51. Edward B. Tylor, Primative Culture, Vol.1, London, John Murray, Sixth Edition, June 1920, P.13
52. T.S. Eliot, Notes Towards the Difition of Culture, Lonon, Faber and Faber,1961, P.13
53. Ditto, P.120
54. Ditto, P.120
55. Ditto
56. Clyde Kluckhohn, The Science of man in the world crisis, ed. R. Linton, Concept of Culture, Columbia University Press, 1945, P.14
57. نصیر احمد ،ڈاکٹر ،اسلامی ثقافت ،فیروز سنز ، لاہور ، س -ن ،ص:17
58. فیض احمد فیض ، تہذیب کیا ہے ، مشمولہ: ہماری قومی ثقافت ، مرزا ظفر الحسن ، ادارہ یادگار غالب، کراچی ،فروری 1976ء،ص:8
59. حسنین کاظمی ،اوراق فیض ، مشمولہ : ہماری ثقافت ،مرزا ظفرالحسن ، ادارہ یادگارِغالب ،فروری 1976ء،ص:121
60. امتیاز اے قریشی ،گڈبائی شہر نو ،ریز پبلی کیشنز ،راولپنڈی ،2002ء،ص:4
61. جمیل جالبی ،ڈاکٹر ،پاکستانی کلچر ، طبع پنجم ، نیشنل بک فاؤنڈیشن ، اسلام آباد ، 1992ء،ص:49
62. ایضاً،ص:49

باب دوّم:

اُردو سَفر ناموں میں صوبہ بَلوچستان کی علاقائی ثقافت کی پیش کَش

تعارف:

بَلوچستان پاکستان کا ایک دور اَفتادہ اور قدیم صوبہ ہے،جو یکم جولائی 1970ء کو ون یونٹ کے خاتمے کے بعدوجود میں آیا تھا جس میں سابقہ ریاستیں قلات ،لسبیلا ،خاران اور مکران ، علاوہ سلطنت آف عمان سے خریدا ہواشہر گوادر کو بھی شامل کیا گیا تھا۔1952ء میں صوبے میں سوئی گیس کی دریافت نے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔بلوچستان رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑاصوبہ کہلاتا ہے۔اس کا کل رَقبہ 131855 مربع میل ہے ،جو پاکستان کے کل رقبے کا 4365 فیصد حصہ بنتا ہے۔یہ صوبہ محل وقوع کے لحاظ سے بھی پاکستان کا اہم ترین صوبہ شمار ہوتا ہے۔اس کے شمال میں افغانستان ،صوبہ خیبر پختونخوا ،جنوب میں بحیرہ عرب ،مشرق میں سندھ اور پنجاب اور جب کہ مغرب میں ایران جیسا ملک واقع ہے۔اس کا 832 کلومیٹر رقبہ ایران کی سرحد کے ساتھ ملا ہوا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ بلوچستان میں پتھروں کے دور سے بھی آبادی تھی اور بلوچستان کی قدیم تاریخ کا اندازہ آثارِ قدیمہ کی دریافتوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے کیوں کہ سات ہزار قبل از مسیح کے زمانے کی آبادی اور ثقافت کے نشانات ملے ہیں۔سکندر اعظم سے پہلے اس خطے پر مکمل طور پر ایران کے حکم ران قابض تھے اور ان کی سلطنت کے دوران بلوچستان کو ”ماکا“ (Maka) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

ملک سعید دھوار لکھتے ہیں :

”یہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔اس کا رقبہ 131855 مربع
میل ہے۔جو انگلستان یا پاکستان کے دوسرے صوبوں کے مجموعی
رقبے سے کہیں زیادہ ہے۔“[1]

بلوچ زمانہ قدیم سے آج تک ایشیا کی ایک خانہ بدوش قوم چلی آرہی ہے۔عہدِ قدیم میں لفظ بلوچ کو بلوش اور بے لوچ لکھا جاتا تھا۔ایرانی اسے بلوچ لکھتے اور بولتے ہیں۔ہمارے ہاں ایرانی لفظ

بلوچ رائج ہے۔اصل میں یہ بلوچ ہی ہے۔صرف عربی اسے بلوش کہتے ہیں کیوں کہ ان کے ہاں لفظ "چ" موجود نہیں ہے۔

قدیم تاریخ ادب میں بلوچوں کی تاریخ کو کھوجنا بہت مشکل ہے کیوں کہ ان کی سماجی ثقافتی زندگی میں ایک تصوراتی اور بے قاعدگی کی صورت پائی جاتی ہے۔بلوچ درحقیقت ایک قوم کی حیثیت رکھتی ہے جسے Ethnosymbolist تھیوری سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔بلوچ مختلف رنگ نسل ، نسلی اور لسانی بنیادوں پر مشتمل ایک کثیر الجہتی قوم ہے۔

مختلف مصنفین جیسے دشتی ، رسیوپر ، سلیکن ، ٹیم اور دیگر لکھتے ہیں کہ بلوچوں کی تاریخ تقریباً تین ہزار سال پرانی ہے۔اس سے بیش تر بلوچستان کی تاریخ سکندرِ اعظم کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی بلوچستان میں تہذیبی ترقی کی ابتدا 3500 ق م سے لے کر 3200ق م کے لگ بھگ ہوئی تھی۔

سید شوکت علی شاہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اس خطہ زمین پر جسے بلوچستان کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ انسانی زندگی کے آثار تین ہزار قبل مسیح میں بھی پائے جاتے ہیں۔"(2)

جب سے بے شمار قبائل ہجرت کر کے اپنے آبائی علاقے کو چھوڑ کر وسطی ایشیا سے شمال مغربی ، مغرب اور مشرق کی طرف راغب ہوئے اور ان کی نئی آبادی بلوچستان یعنی بلوچوں کی سر زمین بن گئی اور جب ان کی علاقائی زبان اور ثقافت اردگرد کے علاقوں میں پھیلنے لگی۔اس طرح ایک بااختیار متحدہ قبائلی ریاست بنادی گئی اور بلوچ ریاست مختلف عروج وزوال کے ساتھ آخر کار 1939ء میں برطانوی راج کا حصّہ بن گئی۔مختلف خانہ بدوش وسطی ایشیا سے ایرانی سرزمین پر جاکر آباد ہوگئے۔بلوچوں کے آباؤاجداد عربی،ترکی ، قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔جب کہ پوٹنگر لکھتے ہیں کہ : بلوچ ترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔جب رالینس کے مطابق: یہ عربی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔بقول بیلیو بلوچ ہندی راجپوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹیم کے مطابق آریائی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ پوٹنگر لکھتے ہیں:

"رالینس 1873 بلوچوں کی نسل کو عرب (سیمیٹک) سے جوڑتے ہیں جب کہ بیلیو 1874ء کے مطابق اصل میں راجپوت ہیں اور انڈیا سے ہیں۔بلوچ نام کو پالیمہ کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ چوہان

راجپوتوں کے خاندان سے ہیں پوٹنگر 1972ء بلوچوں کو ترکی نسل سے
ملاتا ہے۔ٹیم 1904ء بلوچوں کی جسمانی ساخت کو مدِ نظر رکھے ہوئے
اسے انڈین اور آرائی قبیلے سے منسلک کرتا ہے۔"(3)

15 ویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے دو قبیلوں رند اور لاشار ساتھ ساتھ وسطی ایشیا کی طرف بڑھے جو لوگ ان کے مقابلے پر تھے یا تو قتل کر دیئے گئے یا اُنھوں نے اطاعت قبول کر لی آخر میر چاکر خاں کے دور میں سارا بلوچستان بلوچوں کے قبضے میں آگیا اور وہاں ان کی حکومت قائم ہوگئی۔میر چاکر خان ایک عظیم بلوچ تھا۔ایک اندازے کے مطابق 70 فیصد بلوچ پاکستان میں آباد ہیں۔پاکستان کے علاوہ بلوچ قوم ایران ،افغانستان ، متحدہ عرب امارات ،ترکمنستان ،بھارت میں بھی آباد ہیں۔بلوچی بولنے والو ں کی تعداد کا اندازاً ڈیڑھ سے دو کروڑ کے درمیان ہے۔بلوچستان کی آبادی قبائل میں تقسیم ہے۔لوگ عموماً موسمی حالات کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں :

"بلوچستا ن کی آبادی قبائل میں تقسیم ہے۔زیادہ تر لوگوں کی بسر
اوقات تا حال گلہ بانی پر ہی رہی ہے۔مستقل آبادی کم ہے۔موسم
کے لحاظ سے قبائل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے
ہیں۔یہ نقل مکانی اکثر اپنے ہی علاقے میں جاری رہتی ہے۔"(4)

بلوچستان کے قبائل کے رہن سہن ، زبان اور ان کی تاریخ میں بھی خاصا تفاوت ہے۔جغرافیائی لحاظ سے بھی علاقوں میں رہن سہن کا فرق ہے۔بلوچستان میں بڑے بڑے سلسلہ ہائے کوہ مثلاً کوہ سلیمان ،کوہ توبہ کاکڑی ،کوہ بروہی ،وسطی کوہ کیر تھر ،کوہ پب ،کوہ سیاہان ، کوہ چاغی ، سلسلہ راسی کوہ ،کوہ وسطی کوہ ساحلی مکران ہیں۔بلوچستان میں درہ خوجک ، درہ بولان اور درہ مولا واقع ہیں۔یہاں پانچ بندر گاہیں ہیں۔یہاں دریاؤں میں دریائے ژوب ،ناڑی ،بولان ، لوہڑہ ، پشین ، مولا ، حب ہنگول ، بورالی ، رخشان اور دشت مشہور ہیں۔یہ دریا صرف بارش کے موسم میں بہتے ہیں۔بلوچستان میں سارا سال بہنے والے دریا نہیں ہیں۔

"بلوچستان کا ساحلی علاقہ 741 میل یا 752 کلو میٹر ہے۔یہاں پانچ
بندر گاہیں ہیں۔گوادر ،پسنی اور ماڑہ جیونی اور سونمیانی واقع ہیں۔"(5)

بلوچستان 30 اضلاع پر مشتمل پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔قلات ،ژوب ،گوادر ،خاران ، لسبیلہ ، آوران ،بولان ، ڈیرہ بگٹی ، کوہلو ، سبّی، موسیٰ خیل ،کوئٹہ اور چاغی سر فہرست ہیں۔بلوچستان زمانہ قدیم سے قدرتی وسائل وذخائر سے مالامال خطہ ہے۔جہاں تیل ،گیس او ر دیگر معدنیات کی فراوانی ہے۔کوئٹہ بلوچستان کا صدر مقام اور سب سے بڑا تاریخی شہر ہے۔یہ شہر پھلوں کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔دیگر صوبے کی نسبت یہاں برف باری ہونے کی وجہ سے سخت سردی پڑتی ہے۔بلوچستان کی تاریخ ، جغرافیہ ثقافت کوعیاں کرنے میں تاریخ نویسوں کے ساتھ ساتھ اُردوسفرنامہ نگاروں نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اُردوسفر نامہ نگاروں نے بلوچستان جسے دور افتادہ اور پس ماندہ خطے کواس طرح سے اُبھارا ہے کہ عقل محوِ حیرت ہے کہ پاکستان کا یہ خطہ منفرد ثقافت کا امیں ہے۔اس باب کا مقصد اُردو سفر ناموں میں صوبہ بلوچستان کی علاقائی ثقافت کی پیش کش ہے۔آب وہوا ،خوراک ،طرزِرہائش ،رہن سہن ،پیشے ،زبان ،رسم ورواج یہ تمام ثقافتی عوامل اُردوسفر نامہ نگاروں کی بدولت سامنے آئے ہیں۔اُردو سفر نامے صوبہ بلوچستان کی ثقافت کو سامنے لانے کا موجب بنے ہیں۔

بَلوچستان ایک پس ماندہ اور دوافتادہ خطہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر قدیم تہذیب وثقافت کا ایک جہاں سموئے ہوئے ہے۔جسے کھوجنے کی صحیح معنوں میں سعی ہمارے اُردوسَفر نامہ نگاروں نے کی ہے۔اُردو سَفر نامہ نگاروں نے اس دوافتادہ خطے کی تہذیب وثقافت، بُودوباش، طرِحیات کی ایسی دل کش تصویر پیش کی ہے، جس نے بَلوچستان کے تمام ثقافتی پہلوؤں کو پوری طرح واضح کر دیاہے اور ان کے یہ کارنامے اُردواَدب کے قَد میں اِضافے کا مُوجب ثابت ہوئے ہیں۔اُردوسَفر نامہ نگاروں نے بَلوچستان کی ثقافت کے ہر پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

اس باب کا مقصد صوبہ بَلوچستان کی علاقائی ثقافت کو اُجاگر کرنا ہے۔چوں کہ زیرِ نظر مقالے کا موضوع ”اُردوسَفر ناموں میں صوبہ بَلوچستان کی علاقائی ثقافت کی پیش کَش “ ہے۔اس لیے اس باب میں اُردو سَفر ناموں کے تناظر میں ثقافت کو سامنے لاناہی اصل مقصد ہے۔

اس باب میں شامل سَفر ناموں میں صرف منظر کشی نہیں کی گئی ہے بلکہ سَفر نامہ نگار نے خارجیت کے ساتھ اپنے جذبات واحساسات کو بھی شامل کیاہے۔وہ جس بھی علاقے کی سیاحت کو نکلے۔اُنھوں نے رودادِ سَفر بیان کرتے ہوئے اس علاقے کے خارجی مَناظر کو اس طرح صفحہ قِرطاس پر اُتاراہے کہ مَناظر کے حُسن و

جمال کے ساتھ ساتھ وہاں کی ثقافت ،معاشرت ومعیشت اور مذہب وسیاست کی تمام جُزیات بھی سامنے آگئی ہیں۔ سَفر نامے افسانے کی سی چاشنی، ناول جیسی حیرت اور داستان گو جیسے انداز بیان اور ڈرامے کی طرح مکالمے کا گُماں پیش کرتے ہیں۔اس ایک صنف میں کئی اصناف کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔اس باب میں موضوع کی مناسبت کے مطابق سَفر نامہ ”اَجنبی اپنے دیس میں “، سَفر نامہ ”آئینہ بَلوچستان “، سَفر نامہ ” بَلوچستان وسندھ “، ” سَفر نامہ قلات “،سفر نامہ ”پشاور سے کوئٹہ تک “ کوشامل کیا گیا ہے۔ان سَفر نامہ نگاروں نے بَلوچستان کی ثقافت کو سادہ اُسلوب میں پیش کیا ہے۔یہ سَفر نامے بَلوچستان کی ثقافت کو عَیاں کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

”آئینہ بَلوچستان “ اسماعیل صدیقی نے بَلوچستان کی مختصر تاریخ اور ثقافتی عوامل تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ سَفر نامہ نہیں انسائیکلوپیڈیا ہے۔ان سَفر ناموں نے بلوچستان کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔یہ سَفر نامے ہیں، جنھوں نے خطہ بَلوچستان کے چپے چپے سے مانوس کرا دیا ہے۔”اجنبی اپنے دیس میں “سید شوکت علی شاہ نے اپنی ملازمت کے دوران یہ سَفر نامہ لکھا۔اُنھوں نے وہاں کے تہذیب و تمدن ، مذہب ، تعلیم ، ثقافت سب کو پوری طرح اُجاگر کیا ہے۔ان کا اندازِ بیاں شریں ہے۔

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ”میں سمجھتا ہوں کہ شوکت علی شاہ کی یہ تصنیف ”اَجنبی اپنے دیس میں “ نہ صرف سَفر نامہ نگاری کی دُنیا میں ایک مُنفرد اضافہ ہے۔بلکہ پاکستانیات میں بھی اسے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے ساتھ ہی ہماری سیاسی اور تہذیبی دُنیا کے لیے یہ ایک ایسی دستاویز ہے۔ جسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا ان اصحاب کے لیے ناممکن ہو گا۔جو ہماری سیاست و تہذیب میں صداقت و دیانت کا بول بالا دیکھنا چاہتے ہیں۔“[(6)]

سید شوکت علی شاہ نے ”اَجنبی اپنے دیس میں “ بَلوچستان کی ثقافت کو سامنے لانے کی سَعی کی ہے۔ جس سے وہاں کی آب و ہوا، پیشے ، رَسوم و رواج ، تہذیب و بُود و باش سامنے آئی ہیں۔وہاں کے تمام خدوخال واضح طور پر عیاں ہوئے ہیں۔بَلوچستان کا ہر باشندہ بذاتِ خُود ایک داستان ہے۔ آج کا بَلوچستان ماضی کی محرومیوں اور ناعاقبت اندیش حکم رانوں کی ملک دُشمنی اور بلوچ سرداروں کی جھوٹی اِنا اور جہالت نے اس خطہ نظیر کو بے آب و گیاہ صحرا کا روپ دے دیا ہے۔

سَفر نامہ " بلوچستان و سندھ "لیفٹینٹ ہنری پوٹنگر کا تحریر کردہ ہے۔ جس کا ترجمہ پروفیسر ایم رُومان نے کیا ہے۔ ایم رُومان ترجمے کی دُنیا میں کسی تعارف کے مُحتاج نہیں ہیں۔ پوٹنگر نے اس کتاب میں جغرافیے اور تاریخ کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اس سَفر مانے میں ثقافتی پہلو انتہائی مُختصر ہیں۔ چوں کہ ہمارے مقالے کا موضوع ثقافت ہے۔ اس لیے ہم نے سَفر نامہ " بلوچستان و سندھ " کے ثقافتی پہلوؤں سے مُستفید ہونے کی کوشش کی ہے۔

"پشاور سے کوئٹہ تک " اسی سَفر نامے کے مصنف الحاج ایم زمان کھوکھر ایڈووکیٹ ہیں۔ اُنھوں نے بھی تاریخ، جغرافیے کو ہی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُنھوں نے ان علاقوں کی ثقافت کو بھی اُجاگر کیا ہے اور یہ ثقافتی پہلو ہمارے علم میں اِضافے کا موجب بنے ہیں۔

شوکت علی شاہ نے اس علاقے کی تہذیب و تمدن، مذہب، ثقافت اور دیگر شعبہ ہائے زِندگی کا گہری نظر سے مُشاہدہ کیا۔ اِن مُشاہدات کو قاری تک پہنچانے کے لیے اپنی تحریری کاوش "اَجنبی اپنے دیس میں " کے نام سے شائع کرائی۔ اُنھوں نے اس سَفر نانے میں ایسے خطے کے لیے قلم اُٹھایا جس کی طرف کسی نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ اس سَفر نامے میں شوکت علی شاہ نے اس خطے کے مسائل کو بھی اُجاگر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سَفر نامے کی صورت میں ہمیں ایک اچھا دل چسپ اور معیاری اَدب پڑھنے کو ملا ہے۔

بقول غور شاہ قاسم:

> "شاید ہی ان کے سَفر نامے کا کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں اِن کی خوش طبعی اور زندہ دلی کا عکس موجود نہ ہو، ان کے سَفر ناموں میں جابجا اُردو اور فارسی شعرا کے شعر اور مصرعے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جو نہایت بر موقع اور بَر محل ہوتے ہیں۔ ان کے سَفر ناموں کی دوسری نَمایاں خوبیوں میں خاکہ نگاری، تمثیل نگاری اور ڈرامائیت کے اَوصاف نمایاں ہیں۔ "(7)

سید شوکت علی شاہ بات کو سلیقے اور حُسن سے بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ یہ وہ صلاحیت ہے، جس سے پڑھنے والے پر ایک پُر کیف کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انور رُومان ترجمے کی دُنیا کا ایک اہم نام ہیں۔ "سَفر نامہ قلات " چارلس میسن کی تحریر ہے۔ جسے انور رُومان نے ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ " سَفر نامہ قلات " چارلس میسن کی ذاتی دل چسپی کا مظہر ہے۔ اس نے جن خطوں کا مُشاہدہ کیا، اِنھیں وہ مَن و عَن بیان کرتا چلا گیا۔ اِس کی تحریر میں تصنع و بناوٹ نہیں ہے۔ اس نے جس خطے کی سیاحت کا انتخاب کیا صرف سیر و سیاحت

کے لیے وہاں کا سَفر نہیں کیا۔اس سَفر کے پیچھے اس کی یہ تخلیقی اور مُثبت سوچ تھی کہ وہ اپنے سَفر کو با مقصد بنائے ان سَفر نامہ نگاروں نے دورانِ سَفر اپنی آنکھ اور ذہن میں محفوظ کیے گئے۔ان تمام مَناظر کو سَفر سے واپسی پر دائرہ تحریر میں منتقل کیا۔جو اس نے دورانِ سَفر دیکھے اس نے دورانِ سَفر جو دیکھا، سُنا، محسوس کیا، سب کو احاطہ تحریر میں لے کر اس طرح پیش کیا کہ یہ سَفر نامے معلومات کا چلتا پھرتا مجسم بن گئے۔اُنھوں نے ایسا اُسلوب اختیار کیا۔جس نے تحریر کو دل چسپ اور اَثر انگیز بنا دیا۔ایک کام یاب سَفر نامہ نگار کا یہی وصف ہے کہ وہ اپنی تحریر کو ایسی چاشنی اور جاذبیت بخشے کہ جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

انور رُومان نے ”سَفر نامہ قلات“ کا انتہائی معیاری ترجمہ پیش کیا ہے۔ترجمے کا انحصار بہت حد تک اصل نمونے پر ہوتا ہے۔مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ ذوق ہو اور دونوں زبانوں کے آہنگ اور مزاج کو بخوبی سمجھتا ہو اور ”سَفر نامہ قلات“ ترجمہ نگاری کے اسی فن کا مظہر ہے۔

> ”صنفِ کی نفسیات فکری، نظری اور ذہنی فضا سے اچھی طرح آگاہی حاصل کر سکے، اسے ترجمے میں سمونے کی کوشش کر کے مطالب سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ترجمے میں صرف زبان ہی منتقل نہ کرے بلکہ وحدت کلی کو بھی قائم رکھے۔“(8)

انگریزوں کے ترکے میں چارلس میسن کی تحریر ایک گوہرِ شب کی طرح رُوشن ہے۔اس نے کتاب کو مختلف ابوب میں تقسیم کیا ہے۔مگر چوں کہ ہمارا موضوع ثقافت ہے۔اس لیے کتاب کا یہ سارا مواد ہمارے زیرِ نظر مقالے کا حصہ نہیں ہے۔ہمارا مقصد صرف ضلع کی ثقافت کو سامنے لانا ہے۔”سَفر نامہ قلات“ ترجمہ ہونے کے باوجود زبان وبیان کے عمل میں بہترین ہے۔

i. آب وہوا:

آب وہوا کسی علاقے کی ثقافت پر اَثر انداز ہونے والے عوامل میں سے ہے۔بَلوچستان کی آب وہوا ہر علاقے کی ایک دوسرے علاقے سے مختلف ہے۔بَلوچستان کے مختلف علاقوں میں کئی قسم کے موسم ملتے ہیں۔ایک علاقے کا موسم اگر سَرد ہے تو دوسرے کا سَرد تَرین ہو سکتا ہے۔کسی علاقے کی آب وہوا گرم ہے کہیں سخت سَرد ہے تو کہیں معتدل ہے۔بَلوچستان کے علاقے لَس بیِلا کو ہی لیجیے ان علاقوں میں کہیں کہیں

پہاڑ بھی ہیں۔ وادیٔ ہب کا موسم گرم ہے، اگرچہ وہاں سرسبز درخت اور جھاڑیاں ہیں لیکن پھر بھی گرمیوں میں آب و ہوا گرم ہوتی ہے۔

بقول میسن:

"گرمی شدید ترین تھی اور ایک ٹھگنے سے بیر کے درخت کے برائے نام سائے نے ہمیں پناہ دی جو اس غلیظ تالاب کے حاشیے پر کھڑا تھا۔"(9)

اسماعیل صدیقی نے بلوچستان کی آب و ہوا کو اپنے سفر نامہ "آئینہ بلوچستان" میں موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ موسم ثقافت کا سب سے موثر عنصر ہے۔ آب و ہوا کے مطابق ہی انسان اپنا طرزِ زندگی ترتیب دیتا ہے، کیوں کہ موسم کی شِدت انسان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ آب و ہوا یعنی موسم کے مطابق خوراک، رہائش، طرزِ زندگی اختیار کیا جاتا ہے تا کہ زندگی سہل ہو۔

بلوچستان میں بارش کم ہوتی ہے۔ یہاں کے پہاڑ درختوں سے محروم ہیں۔ یہاں کی وادیوں کا بھی یہی حال ہے۔ چٹیل اور ویران، جہاں کہیں آبادی ہے، وہاں کچھ کچھ سبزہ نظر آتا ہے۔ کئی مقامات پر تو صحرا ہیں موسم کی شِدت اور کمی نے بلوچستان کو آب و گیاہ صحرا کی شکل میں بدل دیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ بارش کبھی کبھار ہوتی ہے، مگر جب ہوتی ہے تو اس طرح کہ کوئی کسر باقی نہیں رہتی بارش کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علاقہ مون سون ہواؤں کی زد سے باہر ہے لیکن سردیوں میں پہاڑوں پر برف باری کی وجہ سے سخت سردی پڑتی ہے اور سردی ایسی کہ اللہ اَمان دے۔

انسان تو انسان بے جان چیزیں بھی سردی سے اکڑ جاتی ہیں۔ سردی اتنی شدید ہوتی ہے کہ دانت بجتے ہیں۔ ہوا اتنی ٹھنڈی کہ انسان تو انسان دُھوپ سکھانے کے لیے کپڑے ڈالے جائیں تو وہ بھی اکڑ جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ہوا سائبریا سے چلتی ہے اور اس کا آخری مقام کراچی ہے۔ مگر جہاں جہاں سے گزرتی ہے وہاں کے لوگوں کو بے حال کر دیتی ہے۔ سردی کی یہ لہر بلوچستان کو بُری طرح مُتاثر کرتی ہے۔ وہاں کی زندگی اُلٹ پُلٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہاں پانی رات کو جم جاتا ہے اور دن کو پگھلتا ہے۔ یہاں کی بیش تر زمین ناقابل کاشت ہو جاتی ہے۔ بلوچستان کی اکثر وادیاں اسی صورتِ حال کی غماز ہیں۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"سُنتے ہیں کہ ہوا کی ایک سرد لہر سائبریا سے چلتی ہے۔ جب افغانستان پہنچتی ہے تو روسی ہوا کہلاتی ہے، قندھار پہنچتی ہے تو کابلی کے نام سے پہچانی

جاتی ہے، کوئٹے پہنچتی ہے تو لوگ کہتے ہیں قندھاری آگئی ہے اور جب اپنے سَفر کی آخری حد کراچی کو چھوتی ہے تو وہاں کے رہنے والے کوئٹہ ونڈ کی خوشی میں ڈولیز نکالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہرِ کیف یہ ہوائے سرد لہر جہاں جہاں سے خراماں گزرتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کو سردی سے بے حال بلکہ بدحال چھوڑ جاتی ہے۔"(10)

اسماعیل صدیقی نے بَلوچستان کی آب و ہوا کا نقشہ بہت خوب کھینچا ہے۔ اُنھوں نے موسم کی شِدت کو بخوبی بیان کیا ہے۔ سردی کے آتے ہی گرم لباس نکل آتے ہیں۔ آب و ہوا سے کسی علاقے کی ثقافت نظر آتی ہے کہ وہاں کے لوگ کس مزاج کے ہیں کس طرح کے لباس کو زیب تن کرتے ہیں۔ یہ سب کسی علاقے کے ثقافتی مظاہر ہیں۔ بَلوچستان آب و ہوا کے لحاظ سے انتہائی موسموں کا خطہ ہے۔ سردی جب آتی ہے تو اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ برف پڑتی ہے۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے 25 درجے نیچے گر جاتا ہے۔ پانی کا جمنا تو معمولی بات ہے، کپڑے تک لکڑی بن جاتے ہیں۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"جب آپ کپڑے دھو کر خوب صورت چمک دار دھوپ میں خشک ہونے کو ٹانگ دیں اور تھوڑی دیر بعد آپ آکر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آپ کا لباس اُون یا سوت کا بنا ہوا نہیں بلکہ کھردری لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس میں سے ٹپک کر گرنے والا پانی بُوندیں جم کر موتیوں کی جھالریں بن گئی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے سردی کا عالم۔"(11)

مستونگ، قلات کا سب ڈویژن ہے، مستونگ سے قلات اٹھاون میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ تمام شہر بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ موسم کے لحاظ سے سردیوں میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے اور گرمیوں میں موسم خوش گوار رہتا ہے۔ قلات سے سراب تک جانے میں تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ سراب کی آب و ہوا کوئٹہ سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہے۔ ضلع قلات میں سردی شدید پڑتی ہے اور وہاں پر آبادی کے نقل مکانی کرنے کا رواج ہے۔ بَلوچستان کے تمام علاقوں کی آب و ہوا اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ خضدار ، بولان، قلات، کوئٹہ، سب کی آب و ہوا ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بَلوچستان کی آب و ہوا خوش گوار ہوتی ہے۔

سید شوکت علی شاہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”بلوچستان ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے کئی قدرتی حصے ہیں ۔ اسی لیے یہاں سخت سرد ، معتدل اور سخت گرم آب و ہوا کے خطے ملتے ہیں۔ بالائی پہاڑی علاقوں کی آب و ہوا سخت سرد ہوتی ہے ۔ یہاں برف پڑتی ہے اور سرد ہوائیں چلتی ہیں جس کی وجہ سے سردیوں میں عموماً درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے یہاں گرمی کا موسم بڑا خوش گوار ہوتا ہے ۔ نشیبی پہاڑی علاقوں کی آب و ہوا سندھ سے ملتی جلتی ہے ۔ یہاں گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے اور باد سموم چلتی ہے ؛لیکن بعض علاقوں میں جن میں خضدار ،پنجگوار اور لورالائی کے کچھ حصے شامل ہیں۔ متعدل قسم کی آب وہوا پائی جاتی ہے۔“(12)

بَلوچستان کے ضلع مکران کی آب وہوا بالکل مختلف ہے۔ یہاں نہ زیادہ گرمی نہ زیادہ سردی خوش گوار آب وہوا ہے۔ اسی طرح ضلع کچھی کی آب وہوا بالکل مختلف ہے۔

ضلع بولان کی آب و ہوا میں ٹھنڈک کا تاثر ملتا ہے۔ اسی طرح ضلع سبّی بَلوچستان کا گرم ترین علاقہ ہے۔ سبّی سے میدانی علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور پیداوار کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کے تمام پہاڑ آب و گیاہ اور خشک ہیں یہاں کا درجہ حرارت 50 سینٹی گریڈ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ حد سے زیادہ گرمی ہوتی ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

> ”سبّی کا علاقہ بَلوچستان اور سندھ میں حدِ فاصل ہے۔ یہ شہر پاکستان کے گرم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔“(13)

موسم کی تیزی کا اَثر یہاں کے لوگوں کی شخصیت پر بھی پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بَلوچستان کی اکثریت کے مزاج میں تیزی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی علاقے کی آب وہوا وہاں کے رہنے والے افراد کی ثقافت پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ لوگوں کی شخصیت میں کسی علاقے کی ثقافت کے گہرے رنگ نظر آتے ہیں۔

ستمبر سے کوئٹے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے۔ سردی کا یہ زاویہ مارچ کے بعد ختم ہوتا ہے۔ بَلوچستان کے لوگ وہاں کی آب وہوا کی طرح سخت ہیں۔ موسم کی سختیوں نے انھیں بھی سخت دل اور سخت جان بنادیا ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

" بَلوچستان کی آب ہوا اور وہاں کے لوگ بھی ایسے ہی لگتے ہیں موسم کی سختیوں اور حالات کی مجبوریوں نے انھیں بھی سخت کوش، جنگ جو اور تُند خو بنادیا تھا۔"(14)

ضلع جھالاوان ان علاقوں پر مشتمل ہے جو جنوبی سمت میں قلات اور ساحلی صوبہ لَس بیلا کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں اس کے بنجر علاقے ہیں۔ جن کے صوبے مشکے، خاران اور کولواہ ہیں۔ مشرق میں سراوانی سلسلہ ہائے کوہ کا تسلسل اسے سندھ اور وادی سندھ کے علاقوں سے الگ کر دیتا ہے۔ اس طویل علاقے میں آب وہوا مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی پیداوار متنوع ہے۔ آب وہوا کی وجہ سے پیداوار بھی متاثر ہوتی ہے۔ ایک علاقہ باغوان ہے۔ جس کا مزاج سراوان جیسا معتدل ہے۔ جب کہ اس کے جنوب میں گرمی زیادہ پڑتی ہے اور طبعی حالات یہاں کے زیادہ تر استوائی خطے کے ہیں۔ مشرقی حصہ دیکھا جائے تو یہ صوبہ کیچ گنداوہ دریائے سندھ کے اُوپر ہے۔ یہ حصہ سراوان کا عرض بلد ہے۔ قلات کے مغرب میں باغ ہے۔ نشیب کی وجہ سے یہ علاقہ مختلف آب وہوا کا مالک ہے۔ یہاں کی نَباتات بھی اِسی وجہ سے مختلف ہیں۔

چارلس میسن لکھتے ہیں:

"اس صوبے کے اِمتیازی خصائص یہ ہیں کہ اس کی سطح بیش تر ہموار ہے۔ اس کی انتہائی گرم آب وہوا جو ضرب المثل بن چکی ہے۔ زراعت و فلاحت کے لیے پانی کی کم یابی جس کی وجہ سے کاشت بھی محدود ہوتی ہے۔ اور غیر متنوع بھی اور خان قلات کے دیگر علاقوں کے بر عکس نسبتاً زیادہ آبادی اور کثیر التعداد دیہات وقصبات ہیں۔"(15)

میسن نے اپنے سَفر نامے " سَفر نامہ قلات " میں قلات کے مشرق و مغرب، جنوب، شمال کے علاقوں کی آب وہوا بیان کی ہے جو کہ مختلف اور اس کے اثرات یہاں کے رہنے والوں کے مزاج، بُودوباش، رہن

سہن اور ثقافت کو بھی مُتاثر کرتے ہیں۔ آب و ہوا کسی بھی علاقے کے رہنے والوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

کچھ قبائل تو سردی کے موسم میں نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں میں اپنے ریوڑ سمیت چلے جاتے تھے کیوں کہ وہ موسم سرما میں سراوان کے برف پوش جنگلوں میں گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا کچھی کے گرم اور ہموار میدان ان کی آماجگاہ بن جاتے تھے۔

میسن کا اندازِ بیان بہت سادہ ہے۔ ان کے اُسلوب کی سادگی نے اس سَفر نامے کو جاذبیت بخشی ہے۔ "میسن" نے بہت وضاحت سے یہاں کی آب و ہوا کو بیان کیا ہے جو کہ قاری کے لیے معلومات کا قیمتی سرمایہ ہے۔

بَلوچستان تمام شہر بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کے پہاڑ چٹیل ہیں۔ درختوں سے محروم ہیں۔ بَلوچستان میں بارش کم ہوتی ہے۔ اسی لیے یہاں خشک سالی اور بد حالی ہے۔ سخت سردی پڑتی ہے اور درجہ حرارت نقطہ انجاد سے بھی گر جاتا ہے۔ پہاڑوں سے ٹکرا کر ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں۔

بقول مصنفہ لیفٹنٹ ہنری پوٹنگر:

> "یہاں شدید ترین سردی ہوتی ہے اور اواخر نومبر سے لے کر فروری تک وادیوں میں بھی بَرف باری ہوتی ہے۔ چاول اور دیگر سبزیات جو گرم آب و ہوا کے طلب گار ہیں یہاں پیدا نہیں ہو سکتے اور گندم اور باجرہ جزائر برطانیہ سے پہلے نہیں پکتے۔ ان بہم متفق کوائف کے فلسفیانہ تجزیئے سے یہ ثابت ہوتا ہے کے براہوی پہاڑوں کی انتہائی بلندی یورپ کی بعض مشہور اور بلند ترین چوٹیوں سے کم نہیں۔"(16)

خضدار میں بھی موسم سرد ہی رہتا ہے۔ کوئٹہ میں گرمیوں میں بھی موسم خوش گوار ہی رہتا ہے۔ یہاں اپریل سے اکتوبر تک موسم خوش گوار اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جو سیاحوں کی توجہ کا مَرکز بنتا ہے۔ سراب تو کوئٹہ سے بھی ٹھنڈا علاقہ ہے۔ گرمیوں میں کمبل کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔ ضلع قلات میں شدید سردی پڑتی ہے اور اکثر آبادی موسم سرما میں نقل مکانی کر جاتی ہے۔ بَلوچستان کی یہ صورتِ حال ہے کہ تمام اضلاع کی آب و ہوا مختلف ہے۔ پنجگور کی راتیں اکثر خوش گوار ہوتی ہیں۔ رات کو فضا میں خنکی

محسوس ہوتی ہے۔ بَلوچستان کی آب و ہوا کو دیکھتے ہوئے یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ ایشیائے روئے زمین پر عظیم و جلیل ترین پہاڑوں کا مستقر (یعنی مَسکن) ہے۔

شوکت علی شاہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ہر سب ڈویژن کی آب و ہوا مختلف ہے۔ پنجگور سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں معتدل ہے۔ تربت سب ڈویژن نہایت گرم ہے۔ درجہ حرارت بسا اوقات 120 درجے تک چلا جاتا ہے۔ بلوچی میں ایک مثل مشہور ہے کہ: اگر تربت میں انڈا اُبالنا ہو تو اس کو کھلی دھوپ میں رکھ دیں، خود بخود اُبل جائے گا۔"(17)

ساحلی علاقوں کی آب و ہوا معتدل ہے۔ مکران کی آب و ہوا باقی علاقوں سے مختلف ہے۔ جھالاوان حیران کن طور پر پہاڑی ہے۔ تاہم اس میں دو تین چھوٹے چھوٹے میدان ہیں جیسے وڈھ، سوراب اور خضدار۔ بَلوچستان میں بارشیں کم ہوتی ہیں۔ اسی لیے شاید خشک سالی اور بدحالی سے یہاں کے عوام دوچار رہتے ہیں۔ جِدھر نظر اُٹھاؤ خشک، سیاہ، سبزے سے عاری پہاڑ، آسمان کی جانب خشک اور ترسی نگاہوں سے تکتے لوگ نظر آتے ہیں۔ اب تو پھر کچھ وقت سے موسم میں تبدیلی آئی ہے اور بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ بادل آتے ہیں اور برس کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ تو ہر طرف درختوں سے محروم خشک پہاڑ نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں آبادی ہے وہاں کچھ کچھ سبزہ نظر آتا ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا جہاں کچھ سبزہ ہے وہاں آبادی ہے۔ موسم کی شکست و ریخت نے پہاڑوں کو گنجا اور وادیوں کو پتھروں اور چٹانوں سے آلودہ کر دیا ہے۔

"سطح کی بے حد نشیب و فراز کی بدولت بلوچستان کی آب و ہوا میں غیر معمولی متنوع پایا جاتا ہے۔"(18)

اگرچہ بارش بہت کم ہوتی ہے مگر جب ہوتی ہے تو بہت خوب ہوتی ہے اور اس کا بہتا ہوا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ ضلع قلات کی آب و ہوا سرد اور خشک ہے۔ گرمیوں میں تھوڑی بہت گرمی ہو جاتی ہے۔ بارشیں زیادہ تر جنوری سے مارچ تک ہوتی ہیں۔ اُونچے علاقوں میں یعنی قلات کے آس پاس اچھی خاصی برف باری ہوتی ہے۔ تقریباً سارا بَلوچستان مون سون کی زَد سے باہر ہے۔ لیکن گرمیوں میں کچھ بارش ہو جاتی ہے۔ برف باری اور بارش کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ۔ سردیوں میں بَلوچستان میں شدید سردی پڑتی ہے۔

مصنفہ لیفٹننٹ ہنری پوٹنگر لکھتی ہیں:

”جھالاوان کی آب و ہوا زیادہ معتدل ہے۔ بارشیں اکثر ہوتی ہیں جو یہاں کی بنجر اور پتھریلی زمین کو زیادہ قابلِ کاشت اور پیداوار کے قابل بنا دیتی ہیں۔ اس کے باوجود سراوان کی آبادی جھالاوان سے دوگنی ہے اور اس میں ضلع قلات کی آبادی شامل نہیں ہے۔“(19)

پہاڑوں پر برف باری ہوتی ہے اور سردی کی شِدت اتنی شدید ہوتی ہے کہ اگر کپکپی چڑھ جائے تو جانے کا نام نہیں لیتی۔ یہ وہاں کے لوگوں کو سردی سے بے حال کر دیتی ہیں۔ بَلوچستان بُری طرح سے اس کی زَد میں آتا ہے اور وہاں زندگی اُلٹ پلٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے لباس، شخصیت، رہائش گاہیں، طرزِ زندگی، خوراک سب پر موسم کے اَثرات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بَلوچستان کے اَفراد الگ نظر آتے ہیں۔ ان کے طور طریقے، طرزِ زندگی، بود و باش، ثقافت الگ سے نظر آتی ہے۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

”آب و ہوا کے لحاظ سے یہ علاقہ انتہائی موسموں کا علاقہ ہے۔ خاص طور پر سردی کے معاملے میں موسم سرما آتا ہے تو خوب آتا ہے۔ جی بھر کے آتا ہے، جی کھول کر آتا ہے۔ سرد خانوں کے پیٹ کھول کر آتا ہے۔ سائبریا کی یخ بستہ ہوائیں بَلوچستان کو اپنی زَد میں لے لیتی ہیں۔ بَلوچستان میں انھیں قندھاری ہوا کہا جاتا ہے اور جب یہ سرد ہوائیں کراچی میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو اپنے اُونی مَلبوسات نکالنے پر اُکساتی ہیں تو اُنھیں کوئٹہ کی ہوائیں کہا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس علاقے میں سردی پڑتی ہے تو سردی پڑنے کا حق ادا کر دیتی ہے۔“(20)

بَلوچستان کی اس آب و ہوا کا اثر وہاں کے رہنے والوں پر بھی پڑتا ہے اور یہی وہ اثرات ہیں۔ جو خطہ بَلوچستان کی ثقافت کو دوسروں سے مختلف بناتے ہیں۔ بَلوچستان میں موسمی ہجرت کا بھی رواج ہے۔ لوگ موسم کی شِدت کی وجہ سے نقل مکانی بھی کرتے ہیں۔ پورے بَلوچستان میں موسم اگرچہ سردیوں میں ٹھنڈا ہی رہتا ہے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ فرق نظر آتا ہی ہے۔ ہر علاقے کی آب و ہوا میں کچھ نہ کچھ ایک دوسرے سے فرق ہے۔ ضلع ژوب کا علاقہ اگرچہ خُشک ہے مگر سردیوں میں تو یہاں بھی اچھی خاصی ٹھنڈ پڑتی ہے۔ جھگڑ بھی

خوب چلتے ہیں۔ بارشیں بھی ہوتی ہیں۔ میدانی علاقوں میں تو خیر گرمی بھی بہت پڑتی ہے۔ شمالی علاقے گرمی کی ان شدتوں سے دور ہیں کیوں کہ ان علاقوں میں موسم خوش گوار رہتا ہے۔

> ”آب وہوا کے لحاظ سے یہ علاقہ خُشک ہے۔ سردیوں میں اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں جولائی ستمبر تک خوب جھکڑ چلتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بسا اوقات گرج چمک سے بارش بھی ہو جاتی ہے۔ میدانی علاقوں میں تو گرمی اچھی پڑتی ہے۔ مگر شمالی علاقے میں موسم خوش گوار رہتا ہے۔“(21)

موسم کا اَثر کسی خطے میں بسنے والے کے رہن سہن، شخصیت اور ماحول کو بھرپور متاثر کرتا ہے۔ موسم کی شِدت کا اَثر انسان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ بنجر زمینوں اور سخت موسم کے ساتھ رہنے سے یہ لوگ سخت محنتی اور جفاکش ہو جاتے ہیں۔ کوئٹہ سے باہر نکلیں تو تاحد نظر چٹیل پہاڑ اور بنجر اراضی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں کہیں کہیں صحرا بھی ہیں۔ اس خطے کی حالت دیکھ کر یہاں کے رہنے والوں کے طرز بود و باش اور زندگی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ضلع کچھی کا ایک چھوٹا سا شہر مچھ جو کہ اب مچھ کہلاتا ہے۔ ضلع کوئٹہ کے جنوب مشرق میں پتھریلے پہاڑوں کے درمیان بسا ہوا شہر ہے مچھ میں داخل ہوتے ہی کوئلے کی کانیں اور کوئلے کے ڈھیر نظر آئیں گے۔ کوئلے کے وسیع ذخائر اور جیل اس علاقے کی شہرت کا سبب ہیں۔ یہاں سارا سال موسم خُشک رہتا ہے۔ سال میں 3 یا 4 دفعہ بارش ہوتی ہے۔ سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ درہ بولان میں سرنگیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ہر سرنگ کی اپنی اہمیت ہے۔ سرنگ نمبر 15 ایسی مُنفرد سرنگ ہے۔ جس میں ہر وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہاں کے معماروں نے اسے Windy Corner کا نام دیا ہے۔ صوبہ بَلوچستان اپنے ثقافتی رنگ کی وجہ سے انفرادیت کا حامل ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی علاقے کی آب وہوا رہنے والے افراد کی ثقافت پر اَثر انداز ہوتی ہے۔ لوگوں کی شخصیت میں کسی علاقے کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ بَلوچستان کے ہر علاقے کی آب وہوا مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی پیداوار متنوع ہے۔ آب و ہوا کی وجہ سے پیداوار بھی مُتاثر ہوتی ہے۔ قلات کے مغرب میں باغ ہے۔ نشیب کی وجہ سے یہ علاقہ مختلف آب وہوا کا مالک ہے۔ یہاں کی نباتات بھی اسی وجہ سے مختلف ہیں۔

چارلس میسن لکھتے ہیں:

"اس صوبے کے امتیازی خصائص یہ ہیں۔ اس کی سطح بیش تر ہموار ہے۔ اس کی انتہائی گرم آب و ہوا جو ضرب المثل بن چکی ہے۔ زراعت و فلاحت کے لیے پانی کی کم یابی جس کی وجہ سے کاشت بھی محدود ہوتی ہے اور غیر متنوع بھی اور خاران قلات کے دیگر علاقوں کے برعکس نسبتاً زیادہ آبادی اور کثیر التعدد دیہات وقصبات ہیں۔"(22)

بَلوچستان کی آب و ہوا کا اثر وہاں کے رہنے والوں پر بھی پڑتا ہے۔ ایسی شدید سردی جس میں پانی نلکوں میں جم جاتا ہے اور غریب لوگوں کے لیے خود کو سردی سے بچانا بھی ایک مسئلہ عظیم بن جاتا ہے۔ مگر قُدرت نے ہر مسئلے کا حل دیا ہے۔ بَلوچستان میں ایک چھوٹا سا گہرے سبز پتوں والا درخت ہوتا ہے جس پر چنے کے دانے سے چھوٹا ایک پھل لگتا ہے جو دیکھنے میں سبز رنگ کی گول مرچ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں شنئے کہتے ہیں۔ اکثر لوگ اسے سرِ عام چباتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاثیر میں بہت گرم ہے کھانے والے کو سردی کا احساس نہیں ہوتا یہ عام سی خاصی سستی چیز ہے اور گرمی میں لوگ پہاڑوں سے لمبے لمبے سفید سرخی مائل ڈنٹھل جن کے سروں پر سلاد کے سے پتے ہوتے ہیں لوگ بہت شوق سے گاجر کی طرح کھاتے ہیں۔ ذائقے میں سخت تُرش اور گرمی کے لیے بے حد مفید ہوتے ہیں۔ نکسیر جن کو آتی ہے ان کے لیے یہ ایک بہترین چیز ہے۔

میسن نے اپنے سَفر نامے " سَفر نامہ قلات " میں قلات کے مشرق، مغرب، جنوب، شمال کے علاقوں کی آب و ہوا بیان کی ہے جو کہ مختلف ہے اور اثرات یہاں کے رہنے والوں کے مزاج، بود و باش، رہن سہن اور ثقافت کو بھی مُتاثر کرتے ہیں۔ آب و ہوا کسی بھی علاقے کے رہنے والوں پر سب سے زیادہ اَثر انداز ہوتی ہے۔ کچھ قبائل تو سردی کے موسم میں سراوان کے برف پوش جنگلوں میں گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا کچھی کے گرم اور ہموار میدان ان کی آماجگاہ بن جاتے تھے۔ میسن کا اندازِ بیان بہت سادہ ہے۔ ان کے اُسلوب کی سادگی نے اس سَفر نامے کو جاذبیت بخشی ہے۔ میسن نے بہت فصاحت سے یہاں کی آب و ہوا کو بیان کیا ہے جو کہ قاری کے لیے معلومات کا قیمتی سرمایہ ہے۔

کوئٹہ بلوچستان کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے۔ کوئٹہ چوں کہ بلوچستان کا دارالحکومت ہے یہی وجہ ہے کہ یہ قدرے ترقی یافتہ شہر ہے اور اپنی قدامت ، آب و ہوا ، ثقافت ، تاریخ اور

تجارت کی وجہ سے ہمیشہ سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے یہاں کی آب وہوا صحت بخش ہے ۔ اس لیے لوگ یہاں کا رخ کرتے ہیں۔

بقول الحاج ایم زمان:

"اپنے حُسن، ماحول اور گہما گہمی کی بنا پر کوئٹہ روز بروز ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ جہاں اپریل سے اکتوبر تک موسم انتہائی خوش گوار اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔"(23)

کوئٹہ بلوچستان کا سب سے الگ اور ترقی یافتہ شہر ہے ۔ یہاں کا موسم، حسن ،ماحول ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے ہمیشہ سے باعث کشش رہا ہے ۔ یہاں کا موسم اپریل سے اکتوبر تک انتہائی خوش گوار اور ٹھنڈا رہتا ہے ۔ یہاں کا ماحول بلوچستان کے دوسرے علاقوں سے مختلف ہے ۔ کوئٹہ آب و ہوا کے لحاظ سے ایک خوش گوار علاقہ ہے ۔ کوئٹہ کی یہی خصوصیات ہمیشہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔

ii. زبان:

اظہار کے ذریعوں میں زبان سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زبان ہی کے ذریعے انسان اپنا ماضی الضمیر بیان کرتا ہے۔ اپنے جذبات ، احساسات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ زبان کسی بھی علاقے میں رہنے والے لوگوں کے خیالات ، جذبات ، احساسات ، عادات واطوار سے لے کر چوتھی سطر اس علاقے کی ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ کسی علاقے کی ثقافت کو سامنے لانے میں زبان مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان بننے سے پہلے بَلوچستان کی مقامی زبانیں 836 تھیں۔ بَلوچستان میں صرف بلوچی ہی نہیں بلکہ یورپی زبانیں، سندھی، مرہٹی، گجراتی بولنے والے سب یہاں ملتے ہیں۔ اس پورے صوبے کے ہر ضلعے کی عدالتی زبان اُردو ہے۔ کوئٹہ پشین کی مقامی آبادی کی بڑی بولیاں براہوئی اور پشتو ہیں۔ ضلع ژوب میں ساری مقامی آبادی افغان ہے اور پشتو بولتی ہے۔

اسماعیل صدیقی نے تمام ثقافتی عوامل کو اچھی طرح دیکھا اور بیان کیا ہے۔ ان کا یہ سَفر نامہ اُردو اَدب میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ اپنے اس سَفر نامے میں انھوں نے بَلوچستان کی ثقافت کے ہر گوشے کو سامنے لانے کی کاوش کی ہے۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

> ”کوئٹے میں صرف بلوچی نہیں بستے یہاں پٹھان ہیں، ہزارہ ہیں، مغل ہیں، افغان ہیں، ایرانی ہیں، تورانی ہیں، پنجابی بولنے والے ہیں، اُردو بولنے والے ہیں، سندھی بولنے والے ہیں، فارسی بولنے والے ہیں، مسلمان، ہندو، فارسی، ذکری، بہائی سبھی ہیں۔ان میں کئی تو پشتہا پشت سے یہاں رہ رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر اپنے ماحول میں اس طرح رَچ بَس گئے ہیں کہ وہ مقامی زبانوں یعنی بلوچی، بروہی، پشتو یا فارسی میں بلا تکلف بات چیت کر لیتے ہیں۔اس لیے سننے والا انھیں بلوچی ہی سمجھتا ہے بلکہ بعض تو اپنی شکل و شباہت، لباس اور وضع قطع سے بھی بلوچی نظر آنے لگتے ہیں۔“(24)

ضلع ساراوان میں بولی جانے والی بڑی زبانیں براہوئی، بلوچی اور دہواری ہیں۔دہواری بولنے والے مستونگ اور قلات تک محدود ہیں۔یہ فارسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔یہ زبان مغربی بلوچی یا مکرانی خان کے اہلِ خاندان بولتے ہیں۔لہڑی عموماً آپس میں بلوچی بولتے ہیں۔لیکن اجنبیوں کی موجودگی میں وہ اپنی ایک خفیہ زبان بولتے ہیں۔لوہڑی چینی یا مُکا کی کہلاتی ہے۔یہ بلوچی، اُردو او سندھی کی اُلٹی شکل ہے۔مختلف جگہوں پر براہوی اور ان کی زبان غالب ہے۔سراوانی براہوئی خالص تر ہے۔جب کہ جھالاوانی براہوئی میں کافی الفاظ سندھی کے شامل ہیں۔ضلع جھالاوان میں بولی جانے والی زبانیں براہوئی، مشرقی اور مغربی بلوچی، جدگالی اور عجیب وغریب لوہڑی چینی ہیں۔بیش تر آبادی براہوئی زبان بولتی ہے۔جھالاوانی بولی کسی حد تک ساراوانی سے مختلف ہے۔کیوں کہ اس میں سندھی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔مکران کی مغربی بلوچی جیسے جھالاوان کی تقریباً ایک تہائی آبادی بولتی ہے۔مشرقی بلوچی میں عام اشیا اور روزمرہ کے الفاظ تقریباً خالص بلوچی ہیں اور باقی فارسی، پنجابی اور سندھی زبان سے لیے گئے ہیں۔کچھی کے مری بلوچ، دریائے مولہ کے آس پاس بسنے والی پہاڑیوں کے لوگ اور چکور اور کرخ کے لوگ بولتے ہیں۔جدگالی لَس بیلا کی لاسی بولی سے ملتی جلتی ہے۔جو سندھی کی ایک شاخ ہے اور کرخ اور چکور میں بسنے والے جاٹوں اور ہندوؤں کی زبان ہے۔لوہڑی اپنے اپنے سرپرست قبیلے کی زبان بولتے ہیں۔اس کے الفاظ بلوچی، اُردو، سندھی اور پنجابی الفاظ کی الٹ شکلیں ہیں۔لَس بیلا کی مقامی زبانیں سندھی جو کہ براہوئی اور جدگالی ہیں اور یہاں کی تین چوتھائی آبادی یہی زبانیں بولتی ہیں۔جسے مقامی طور پر کُردی کہا جاتا ہے اور جسے لَس بیلا میں مستقل طور پر رہنے والے براہوئی بولتے

ہیں۔ ضلع لورالائی کی مقامی آبادی کی بڑی زبانیں پشتو، کھیترانی اور بلوچی ہیں۔ سرکاری دستاویزات کے سوا مسلمانوں کا ذریعہ خط و کتابت فارسی ہے اور یہاں رہائش پذیر ہندوؤں کا لہندا ہے۔ بوری اور دُکی میں اور پشتو میں فارسی حروف میں خط و کتابت کی جاتی ہے۔ پشتو سب افغان بولتے ہیں۔ اور یہ ضلع کوئٹہ پشین کی عام پشتو سے مختلف ہے۔ ضلع سبّی کی مقامی آبادی کی بڑی بڑی زبانیں بلوچی، پشتو، براہوئی جٹکی اور سندھی ہیں۔

بقول چارلس میسن:

> ”کچھی کے جٹوں کی زبان جٹکی ہے۔ جو سندھ اور پنجاب کی زبانوں سے مشابہ ہے۔ جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ موجودہ زبانوں میں سب سے زیادہ سنسکرت سے ملتی جلتی ہیں۔“(25)

مسلمانوں کی خط و کتابت کی زبان فارسی اور ہندوؤں کی سندھی ہے۔ ضلع میں بولی جانے والی بلوچی مغربی یا مکرانی کی بجائے مشرقی ہے اور روزمرہ میں استعمال ہونے والے الفاظ تقریباً سب خالص بلوچی ہیں۔ یہاں بولی جانے والی پشتو ضلع کوئٹہ کی عام پشتو سے مختلف ہے۔ جٹکی یا سندھی میدانی جاٹوں کی زبان ہے۔ ضلع مری بگٹی میں مشرقی بلوچی بولی جاتی ہے ان میں سندھی اور پنجابی الفاظ کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔ جٹکی قبائل علاقوں کے ہندو اور جاٹ بولتے ہیں۔ ضلع چاغی میں آبادی کی بڑی بڑی زبانیں بلوچی، براہوئی اور پشتو ہیں۔ 62 فیصد لوگ براہوئی بولتے ہیں۔ چاغی میں سنجرانیوں کی زبان بھی بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بلوچی، مغربی یا مکرانی بولی جاتی ہے۔ مقامی ہندو آپس میں جٹکی بولتے ہیں۔

> ”انگریز کے دور میں ضلع کی زبان اُردو ہی ہے۔ عموماً ہر شخص یہ زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔ افغان قبائل پشتو۔ بلوچ، بلوچی اور کھیتران آپس میں کھیترانی بولتے ہیں۔“(26)

اس کے علاوہ یہاں لوہڑی چینی بھی بولی جاتی ہے۔ یہاں بھی اردو سرکاری زبان ہے لیکن خط و کتابت میں فارسی استعمال ہوتی ہے۔ ضلع خاران میں مغربی بلوچی رائج ہے۔ تین چوتھائی لوگ اِسے بولتے ہیں اور باقی براہوی بولتے ہیں۔ اکثر لوگ پشتو اور فارسی بھی بولتے ہیں۔ خارانی، بلوچی، پنجگوری سے ملتی جلتی ہے۔ اسے رخشانی کہا جاتا ہے۔ براہوئی، جسے کُردی بھی کہتے ہیں۔ گرساسولیوں کی خالص زبان ہے اور سراوانی بولی سے ملتی جلتی ہے۔ ضلع مکران میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں: بلوچی، جدگالی اور لوہڑی چینی۔ بلوچی سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ مکرانی بلوچی، بلوچستان کے مشرقی اور جنوبی حصّوں میں رہنے والے لوگوں کی زبان

ہے۔اندرونی طور پر یہ کیچ، گلانچ اور کولواہ بمعہ ملحقہ اضلاع کے وسیع علاقوں میں بولی جاتی ہے۔اس پورے علاقے کی بولی میں اختلاف بہت کم ہے۔ہر ضلع میں الفاظ میں بہت معمولی فرق ہے۔یہ زبان بولنے والے ایک ضلع کے رہنے والے لوگ دوسرے ضلع کے رہنے والوں کی زبان بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔فارسی الفاظ اس زبان میں بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔مکرانی بلوچی، فارسی زبان کی ایک بولی معلوم ہوتی ہے۔

شوکت علی شاہ لکھتے ہیں:

"مکران میں بلوچی بولی جاتی ہے۔لیکن قلات کے باقی حصّوں میں بروہی اور سندھی مروج ہے۔"(27)

ضلع مکران اب تو سندھ میں شامل ہے مگر کسی زمانے میں یہ بلوچستان میں شامل تھا آج کا مکران بھی بلوچیوں کی آماجگاہ ہے اور یہاں کے بلوچی مکرانی بولتے نظر آتے ہیں۔بلوچی سندھی بھی بولتے ہیں۔کچھ علاقوں میں یہ زبان اب بھی بولی جاتی ہے۔ضلع مکران میں کئی قبائل آباد ہیں جو بلوچی ہیں۔یہاں بولی جانے والی زبان فارسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تمام لوگ بلوچی زبان بولتے ہیں۔جو فارسی کی مَسخ شدہ شکل ہے۔ویسے تو مکران میں کئی قبائل آباد ہیں۔لیکن نسلی اعتبار سے ان کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔"(28)

یوں تو بَلوچستان کے بیش تر حصوں میں بلوچی ہی زیادہ بولی جاتی ہے۔قلات کے مختلف حصوّں میں بلوچی، براہوی، جٹکی بھی بولی جاتی ہے۔جھالاوانی قبائل میں سے بعض جن میں مینگل بزنجو اور رند ملغوبہ کے بعض قبائل میں بلوچی ہی بولی جاتی ہے۔بلوچی ہی خوانین اور سرداروں کی بھی زبان ہے۔بلوچی کو مغربی حصّے کی زبان سمجھا جاتا ہے۔

اس ضمن میں چارلس میسن رقم طراز ہیں:

"پہلے یا مغربی حصّے کی زبان جسے زیادہ تر بلوچی کہا جاتا ہے، حدود کرمان تک چھائی ہوئی ہے اور بَلوچوں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے۔موجودہ فارسی اس کی مشابہت ناقابل انکار ہے۔"(29)

سراوان اور جھالاوان کے قبائل کی مخصوص زبان براہوئی ہے۔اسے کورگامی یعنی گنوار زبان بھی کہتے ہیں۔اس زبان میں بلوچی یا فارسی اور تھوڑی سی پشتو کی بھی آمیزش ہے۔کچھی میں بسنے والے جٹ، جٹکی زبان بولتے ہیں اور یہ زبان سندھ اور پنجاب کی زبانوں سے مشابہت رکھتی ہے اور یہ سنسکرت سے ملتی جلتی ہے۔

مغربی سندھ کے ہم اصل قبائل جوکھیا اور بلفتی زبان بولتے ہیں اور لَس بیلا کے لَمری قبائل بھی یہی زبان بولتے ہیں اور یہی زبان تقریباً دریائے سندھ کے دونوں طرف کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔سندھ کی زبان تقریباً رند جیسی ہے۔آس پاس کے علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں جیسے گجراتی وغیرہ یہ ان میں مدغم ہوئی ہے۔اسی طرح قلات کے دہوار افغانستان اور ترکستان کے تواجیک کی طرح فارسی یا وہ زبان جو اس کا چربہ ہے، بولتے ہیں۔اس کے علاوہ قلات میں پشتو بھی بولی جاتی ہے۔وہاں کافی تعداد میں افغان بھی رہتے ہیں۔جن کی زبان پشتو ہے۔بَلوچستان میں چوں کہ قبائلی نظام ہے اور قبائلی اپنی اپنی مخصوص زبانیں بولتے ہیں لیکن سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان بلوچی ہے۔پھر براہوی بولنے والے بلوچ نظر آتے ہیں۔جب کہ افغان، پشتو اور جو سندھی بلوچ ہیں ان کی زبان ان سے ذرا ہٹ کر ہے۔

بقول چارلس میسن:

> "قلات کے دہوار افغانستان اور ترکستان کے تواجیک کی مانند فارسی بولتے ہیں یا وہ زبان جو اس کا چربہ ہے۔شال کے افغان پشتو بولتے ہیں۔"[(30)]

یوں تو صوبہ بَلوچستان ایک بڑا صوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ پس ماندگی کا مجسمہ بھی ہے اور یہاں بہت سے قبائل آباد ہیں۔مختلف مذاہب کے لوگ جیسے ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ سبھی موجود ہیں اور ہر علاقے کی زبان کی ادائیگی میں ذرا ذرا فرق بھی نمایاں نظر آتا ہے۔مکران میں فارسی کی مسخ شدہ شکل میں بلوچی زبان بولی جاتی ہے۔بَلوچستان کے تمام علاقوں کے لوگوں کے خدوخال میں قدرے نمایاں فرق ہے۔جو اور ستو کا استعمال کرنے والے لوگوں کے رنگ اور خدوخال میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔مکران کے لوگ سیاہی مائل جب کہ قلات کے لوگ سفیدی مائل ہوتے ہیں۔سید شوکت علی شاہ نے "اجنبی اپنے دیس میں" اس سَفر نامے میں کوشش کی ہے کہ اس خطہ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی قاری کے گوش گزار ہو سکیں۔

بقول سید شوکت علی شاہ:

"مکرانیوں کا رنگ گندمی یا سیاہی مائل ہوتا ہے جب کہ باقی قلات کے باشندگان کا رنگ نسبتاً سفید ہے۔ مکران میں بلوچی بولی جاتی ہے لیکن قلات کے باقی حصّوں میں بروہی اور سندھی مروج ہے۔"(31)

زبان ماضی الضمیر بیان کرنے کا چوں کہ سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اس لیے کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں سب سے معتبر ہے۔ بلوچی کے علاوہ یہاں پر پشتو اور براہوی زبان بھی بولی جاتی ہے۔ یہ قدیم زبان ہے۔ مگر رسم الخط دیر سے مروج ہوا لوک داستانیں اور رزمیہ شاعری اس زبان کا خاص حصہ ہیں۔ اردو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری زبان اردو رائج ہے۔ سَفر نامہ نگاروں نے خطہ بَلوچستان کے خدوخال کو اُبھارنے اور وہاں کی ثقافت کو اجاگر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے کوئٹہ ہی دیکھیں یہ صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے پورے صوبے میں کوئٹہ سب سے الگ اور مُنفرد شہر ہے۔ یہاں کے لوگ بھی تہذیب و تمدن میں دوسرے علاقوں سے بہت بہتر ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ اس خطے کا اَکلوتا شہر ہے۔ یہاں کی آبادی ملی جلی ہے۔ یہاں تقریباً سبھی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اُردو، بلوچی، پشتو، براہوی، سندھی، فارسی، سرائیکی وغیرہ۔ کوئٹہ صوبہ بَلوچستان کا دارالحکومت ہے۔ دارلحکومت ہونے کی وجہ سے کوئٹہ کو صوبے میں مرکزیت حاصل ہے۔

بقول الحاج ایم زمان کھوکھر:

"کوئٹہ صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے اور کچھ لوگ اسے بَلوچستان کا اَکلوتا شہر بھی کہتے ہیں۔ یہاں ملی جلی آبادی ہے۔ لہٰذا اُردو، بلوچی، پشتو، براہوی، فارسی، پنجابی، سندھی اور سرائیکی بولنے والے یہاں مل جاتے ہیں۔ صوبائی دارلحکومت ہونے کی وجہ سے کوئٹہ کو صوبے میں مرکزیت حاصل ہے۔"(32)

کوئٹہ بلوچستان کا ایک ایسا بڑا شہر ہے جہاں کی آبادی مخلوق آبادی لوگوں پر مشتمل ہے یہ بلوچستان کا دارلحکومت ہونے کے ساتھ ساتھ صوبے کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے ۔ یہاں کی مخلوط آبادی مختلف زبانیں بولتی ہے باقی ٹھیک ہے۔ یہاں کی مخلوط آبادی مختلف زبانیں بولتی ہے۔ یہاں اُردو ، بلوچی ، پشتو ، براہوی ، فارسی ، پنجابی ، سندھی ، سرائیکی ہر زبان سنائی دے گی۔ شہر

کوئٹہ صوبے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا پُررُونق شہر ہے ،جہاں کا کلچر سیاح کو بہت متاثر کرتا ہے اور وہ اس سے اچھی طرح محظوظ ہوتا ہے۔

iii. خوراک:

ہر علاقے کی اپنی ایک الگ بود و باش، رہن سہن، ثقافت ہوتی ہے۔ جو وہاں کے رہنے والوں کی زندگی کے طور طریقوں، عادات و اطوار کو ظاہر کرتے ہیں۔ تقریباً پوری دُنیا میں ہر جگہ کی اپنی ایک منفرد ثقافت ہے۔ بالکل ایسا ہی حال پاکستان کا بھی ہے۔ جس کے تمام صوبے اپنی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اور ان صوبوں کے تمام علاقے بھی ایک جیسی ثقافت کے حامل نہیں۔ اگر ایک علاقے کی آب و ہوا دوسرے سے مختلف ہے تو وہاں کے بسنے والے لوگوں کی خوراک، رہائش، پیشے، طرزِ زندگی بھی دوسرے علاقے کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ مگر روایات کچھ ایسی ہیں جو تمام صوبوں کے علاقوں میں تقریباً ایک جیسی ہیں۔ صوبہ بَلوچستان کا شہر کوئٹہ جو کہ وہاں کا صدر مقام ہے اور صوبے کے باقی علاقوں کی نسبت وہاں کے لوگ خوش حال ہیں۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی تھوڑا مختلف ہے۔ کوئٹہ کے مشہور کھانے گندم، جوار، چاول، سجی، دودھ، مکھن اور سبزیاں ہیں۔ وہاں کی بہت ہی مشہور ڈش شیر یخ ہے۔ جو دودھ اور کریم سے بنتی ہے اور اتنی مزے دار ہے کہ بار بار کھانے کو دل کرتا ہے۔

> ”اکثریت کی خوراک آٹے کی روٹی اور لسّی پر مشتمل ہوتی ہے۔ بھیڑوں اور بکریوں کے دودھ سے مختلف اشیائے خوردنی تیار ہوتی ہیں۔ جن کی بلوچ بہت قدر کرتے ہیں۔“(33)

بَلوچستان کے تمام اِضلاع میں اکثر لوگ دو دفعہ کھانا کھاتے ہیں۔ صبح اور غروبِ آفتاب کے وقت (ایک دفعہ صبح جسے ہر روز خُوما گہیز یا سحار کہتے ہیں اور دوسرا شام کو جسے ماشام ہور کہتے ہیں)۔ کچھ کاشت کار دوپہر کو بھی کھانا کھاتے ہیں۔ ان لوگوں کی خوراک بہت زیادہ ہے۔ بہت کھانا کھاتے ہیں۔ موقع لگے تو ایک بالغ مرد اور عورت ایک سیر تک روٹی کھالیتے ہیں۔ گندم بہت کھاتے ہیں۔ خمیری، پطیری روٹیاں بنا کر کھاتے ہیں۔ گرمیوں میں خمیری روٹی بطور ناشتہ استعمال کرتے ہیں۔ خانہ بدوش دورانِ سَفر کاک یا کُرنو کھاتے ہیں جو خمیر کو ایک گرم پتھر پر لپیٹ کر رکھنے سے تیار ہوتے ہیں۔ میٹھی روٹیاں خلازی یا پشلی بہت مقبول ہیں۔ اکثر لوگ سادہ اور بے مزہ روٹی کھاتے ہیں لیکن گاہے بگاہے ان پر کُرت غوری اور اُبلتا اُبلتا گھی ڈال لیا جاتا

ہے۔ چرواہے اپنے کھانے کے ساتھ دودھ اور اس کی اشیا عموماً مبئ شلوبئ (لسّی) استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں شاذونادر ہی گوشت کھایا جاتا ہے۔

ضلع لَس بیلا میں لوگوں کی خوراک جواری، مونگ یا باجرہ سے ملی ہوئی چاول اور لسّی ہے اور ساحلی علاقوں میں مچھلی اور کھجوران کی مرغوب غذا ہے۔ اُونچے طبقے کے لوگ گوشت کھاتے ہیں۔ لیکن اکثر اہلِ دیہہ اس عیاشی کے ہفتہ میں صرف ایک بار ہی متحمل ہوسکتے ہیں۔ خُشک سالی میں گم، بَر اور حنظل کے بیجوں کا آٹا بطور خوراک استعمال ہوتا ہے۔ لاسی بھی دوبار کھانا کھاتے ہیں۔ ایک بار صبح آٹھ بجے جواری کی روٹی اور لسّی اور شام کو غروبِ آفتاب کے تھوڑی دیر بعد چاول اور مونگ کی کھچڑی جس میں وہ نمک اور گھی ملاتے ہیں، بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ساحلوں کے مید اور بلوچ دوپہر کو بھی کھانا کھاتے ہیں۔ گندم کی روٹی سب کی پسند دیدہ ہے۔ لیکن یہاں پر لوگ بہت کم اس کی استطاعت رکھتے ہیں۔ ضلع مری بگٹی اور ضلع چاغی میں گرمیوں میں روٹی اور دہی اور سردیوں میں کھجوریں، مکھن اور کبھی کبھی کباب پر مشتمل خوراک استعمال ہوتی ہے۔

> ”بعض علاقوں میں بکرے یا دُنبے کے گوشت کو نمک لگا کر ایسے ہی سکھا لیتے ہیں، جیسے یورپ میں خیز لز کے گوشت کو براہوی اسے ”خدیت“ اور افغان لاندی بولتے ہیں۔ جو سردیوں میں ذخیرے کا کام دیتا ہے۔ بلوچ تمبا کو نوش ہے اور افیم اور بَھنگ بھی کھاتا ہے۔“(34)

گندم من پسند اَناج ہے۔ تافو (توا) پر خمیری روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ کھجوریں بہت استعمال ہوتی ہیں۔ گوان یا پستہ خنجک کا پھل اپنے موسم میں جو تازہ کھایا جاتا ہے اور خُشک بھی پہلے اسے گندم کی روٹیوں میں ملایا جاتا تھا یا اس کا عرق بنا کر روٹیاں بھگو کر کھائی جاتی ہیں۔ خُشک سالی کے دنوں میں ایک خاص قسم کا دلیا یا دال مقامی پودوں کے بیجوں سے تیار کی جاتی ہے۔ جنھیں کل کُشتہ اور مُغیر کہتے ہیں۔

اکثر لوگ سادہ روٹی کھاتے ہیں جو بہت بد مزہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کُرت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اسے اُبلتے گھی میں ملایا جاتا ہے۔ اس کا نام سی ارغ ہے۔ ایک اور مصالحہ اَچار کہلاتا ہے۔ جو پیاز، ہلدی، مرچ، دھنیا، انار دانہ، الائچی اور دار چینی کو پیس کر اور آٹے کے ساتھ گوندکر چھوٹی چھوٹی روٹیوں کی صورت میں بنایا جاتا ہے اور یہ ایک نفیس قسم کا کھاجا سمجھا جاتا ہے۔ اور صرف مواقع پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ گوشت گرمیوں میں شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ خوش حال لوگ پرندے انڈے، چاول اور سجی (بھنا ہوا گوشت) کھاتے ہیں اور سبز چائے ضرور لیتے ہیں۔ بَلوچستان میں قہوہ کا بہت رواج ہے۔

سَفر نامہ نگاروں نے بَلوچستان جیسے دور افتادہ خطے کی ثقافت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ بَلوچستان قاری کی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔اسماعیل صدیقی ایک ایسے سَفر نامہ نگار ہیں۔جنھوں نے اپنے سَفر نامے ”آئینہ بلوچستان“ میں بَلوچستان کے باشندوں کی مخصوص خوراک پر خامہ فرسائی کی ہے اور اُردو سَفر ناموں میں نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔بَلوچستان چوں کہ پس ماندہ علاقہ ہے۔غریب لوگ مُشکل زندگی گزار رہے ہیں۔اُنھوں نے روایتی پکوانوں کی بجائے ان چیزوں پر لکھا، جسے دوسرے سَفر نامہ نگاروں نے نظر انداز کیا ہے۔یہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کی طرح ہے۔

بَلوچستان میں چند ایسی جڑی بوٹیاں بھی ہیں جن کو طاقت کے لیے نشاستے بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ان جڑی بوٹیوں کو اگر گڑ اور سوجی ملا کر بھون لیا جائے تو عمدہ اور لذیز قسم کا نشاستہ تیار ہو جاتا ہے۔جو کہ عموماً زچہ کو کھلایا جاتا ہے تاکہ اس کی طاقت بحال ہو سکے۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

”شوتک، ماذک اور کمرکس ہیں۔انھیں مقامی لوگ یا تو اپنے استعمال کے لیے جمع کرتے ہیں یا پنساریوں کے پاس لا کر بیچ دیتے ہیں۔ان جڑی بوٹیوں کو اگر گڑُ اور سوجی ملا کر بھون لیا جائے تو عُمدہ اور لَذیز قسم کا نشاستہ تیار ہو جاتا ہے۔“(35)

موسم گرما میں کھمبیاں یعنی Mashrooms بکثرت اور بہت سستی ملتی ہیں۔بہت لذیز بڑی بڑی کھمبیاں یہاں بہت سستی اور ملک کے باقی حصوں میں بہت مہنگی ملتی ہیں۔شوتک، ماذک اور کمرکس کی طرح مگسیر ایک خورد و ساگ ہے۔اسے سوکھا کر پیس کر شکر کے ساتھ گوندھ کر روٹی جسے پوس کہتے ہیں، بنا کر کھاتے ہیں۔اس روٹی کو اسٹور کر کے بھی رکھا جاتا ہے۔اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ مُدتوں اپنی اصلی حالت برقرار رکھتی ہے اور خراب نہیں ہوتی۔کوئی ایک چیز ہو تو انسان کہے یہاں تو ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔”دریائی درخت“ کو ہی لیجیے یہ ایک خاص قسم کا درخت ہے، جو صرف بگتی کے علاقے میں ہی پایا جاتا ہے۔یہ ندی نالوں میں اُگتا ہے، سفید سفید دانے ہوتے ہیں، جنھیں یہاں کے رہنے والے جمع کر کے بطور شکر استعمال کرتے ہیں۔بَلوچستان پر اللہ کی خصوصی رحمت ہے، یہاں ایسی جڑی بوٹیاں ہیں جو خوراک کے ساتھ ساتھ بیماریوں کا بھی علاج ہیں۔

بقول اسماعیل صدیقی:

> "گز شکل" یہ شکر دانوں سے ملتی جلتی شے ہے جو صرف گز (اُردو میں جمل، انگریزی میں Temarix کے درخت سے حاصل ہوتی ہے، یہ درخت بَلوچستان میں پایا جاتا ہے۔اس لیے اسے "دریائی درخت" بھی کہا جاتا ہے۔اس درخت کی ایک خاص قسم صرف بگتی کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔جیسا کہ پتوں پر نومبر کی بارش کے بعد سفید سفید دانے اُبھر آتے ہیں۔جنھیں مقامی لوگ جمع کر کے شکر کے طور پر پر استعمال کرتے ہیں۔"(36)

صاحبِ حیثیت لوگ گائیں رکھتے ہیں۔لیکن دودھ عام طور پر بکریوں، بھیڑوں اور اونٹنیوں کا پیا جاتا ہے۔دہی جو ترشی یا پنیر بند سے بنتا ہے۔دودھ سے بننے والی اکثر اشیا مشمولہ بہ مکھن اور پنیر کی بنیاد ہے۔لسّی بھی بہت پی جاتی ہے۔اس کے بعد کُرت کا نمبر ہے۔جو اُبلی ہوئی چھاچھ سے بنی ہوئی روٹیاں ہوتی ہیں۔جنھیں خُشک کر کے نمک ملا دیا جاتا ہے۔اگرچہ ضلع مکران بَلوچستان کا حصہ ہونے کے باوجود رسم و رواج اور عادات کے اعتبار سے باقی بَلوچستان سے خاصا مختلف ہے۔کھجور، مچھلی، مکرانیوں کی مرغوب غذا ہے۔مچھلی وہاں وافر مقدار میں ملتی ہے۔کیوں کہ یہ ساحلی علاقے سے جڑے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ گندم بھی ان کی پسندیدہ خوراک ہے اور مختلف علاقوں میں کھائی جاتی ہے۔

سید شوکت علی شاہ نے بَلوچستان کے مخصوص کھانے، مرغوب، روایتی پکوان اپنے سَفر نامے "اجنبی اپنے دیس میں" کے ذریعے متعارف کرائے ہیں۔ان مفید معلومات نے ہی سَفر نامے میں دل چسپی اور تجسس کے رنگ بھرے ہیں۔ان مفید معلومات نے سَفر نامے کو قاری کی دل چسپی کا محور بنایا ہے۔مکران میں گائے، بھینس بہت کم تعداد میں ہیں۔اس لیے وہاں بکری کا دُودھ پینے اور چائے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اب جن کو عادت نہ ہو ان کے لیے اس دودھ کی چائے پینا خاصا مشکل کام ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

> "مکران میں خالص بکری کا دُودھ واقعی غنیمت ہے۔پورے مکران میں گنتی کی چند گائیں ہوں گی اور وہ بھی استعداد کم دودھ دیتی ہیں کہ سرکاری ملازم تو اس کو پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"(37)

بَلوچستان میں کچھ کھجوریں بکثرت ہیں لیکن مکران کی کھجوریں ایسی بہترین ہیں جن کی مثال نہیں ہے۔ کھجور کی ڈھیروں قسمیں ہیں اور کھجور ذائقے میں مُنفرد ہے۔ سبزو، علینی، آب دندان، بیگم جنگی، مضاوتی وغیرہ۔ ہر کھجور کا ذائقہ دوسری کھجور سے مختلف اور مُنفرد ہے۔

بقول سید شوکت علی شاہ:

"کھجور اور مچھلی مکرانیوں کی اصل خوراک ہے۔ جب کہ دیگر علاقوں میں گندم کھائی جاتی ہے۔"(38)

ان کھجوروں کی اَفادیت کے حوالے سے یہ مشہور ہے کہ مختلف قسم کی کھجوریں مختلف اُوقات میں کھانے سے ان کے موثر نتائج ملتے ہیں۔ جیسے اگر آب دندان کو صبح کے ناشتے کے بعد کھایا جائے تو مسوڑے دَرد نہیں کرتے کھانے کے بعد مضاوتی کھالی جائے تو بہت زیادہ نیند آتی ہے۔ کھانا فوراً ہضم کرنے کے لیے علینی کے چند دانے کھالیں۔ گرمیوں اور سردیوں میں کھانے کے لیے کھجوریں الگ الگ ہوتی ہیں۔ سردیوں میں ایک انتہائی مزے دار ڈش کھجوروں سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ وہاں کی اسپیشل سویٹ ڈش ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

"سردیوں میں مضاوتی کو علینی کے شیرے میں تیار کیا جاتا ہے اور پھر دُنیا کی کوئی "سویٹ ڈش" اتنی لذیز نہیں ہوتی جتنا یہ مرکب ہوتا ہے۔"(39)

اہلِ مکران کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: (1) نبسی (ب) کروچ۔ نبسی اعلیٰ قسم کی کھجوریں امیر طبقے کے لیے جب کہ کروچ سے پیدا شدہ کھجوریں بالخصوص مویشی اور بالعموم عامتہ الناس کھاتے ہیں۔ بغیر دودھ کے چائے پی جاتی ہے، جسے "سلیمانی چائے" کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سالم دُنبہ ذبح کر کے "سجی" بنانے کا رواج عام ہے۔ ضلع مکران بہت وسیع و عریض ہے۔ ہر چند کہ مکران بَلوچستان کا ایک حصہ ہے۔ مگر رسم و رواج اور عادات و اطوار کے اعتبار سے باقی بَلوچستان سے مختلف ہے کھجور اور مچھلی مکران کے لوگوں کی خوراک ہے اور دوسرے علاقوں میں گندم استعمال ہوتی ہے۔ خوراک کا اثر ان کی طبیعت اور مزاج سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ بلوچی مہمان نوازی میں تو بہت آگے ہیں اور دل کھول کر کھلاتے پلاتے ہیں۔ امیر طبقے کی دعوت کے انداز ہی مختلف ہیں ان کے ہاں کھانے کے لیے دستر خوان بچھا کر چکن روسٹ سالم دُنبہ جیسے کھانے پیش کرتے ہیں۔ شکم سیر ہو جاتا ہے پھر ڈشیں ختم نہیں ہوتیں، پلاؤ، کلیجی، انڈے، کباب، تمام پُر تکلف کھانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔

شوکت علی شاہ - رقم طراز ہیں:

"رسالدار لیویز نے دستر خوان بچھایا اور بڑی سی ٹرے میں روسٹ کیا ہوا ایک سالم دُنبہ آیا۔ کہدا صاحب نے دُنبے کا پیٹ چاک کیا تو بیچ میں دم کیا ہوا پلاؤ نکلا جس میں تلی ہوئی کلیجیاں تھیں، جب پلاؤ کے ڈھیر کو ایک طرف سے ہٹایا تو درمیان میں مرغ مسلم نکلا ابھی میں نئی طرز کی دعوت پر حیران ہو رہا تھا۔ مرغ مسلم کا پیٹ بھی چاک ہو گیا اس میں سے اُبلے ہوئے انڈے اور شامی کباب نکل آئے۔"(40)

یہ مخصوص قسم کا کھانا صرف بڑے لوگوں کے ہاں ہی نظر آ سکتا ہے۔ کیوں کہ باقی باشندے تو پس ماندہ ہیں۔ ان کے حالات کسی تکلف کی اجازت نہیں دیتے۔ جس طرح ہر علاقے کی اپنی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ بلوچ بھی اسی طرح روایات کے پابند اور یہاں کے بھی کچھ روایتی کھانے ہیں۔ جو اپنے ذائقے اور پکانے کے مختلف طریقوں کی وجہ سے مُنفرد ہیں۔ بلوچی بغیر دُودھ کے چائے پیتے ہیں اور یہ پورے بَلوچستان کا طریقہ ہے۔ بلوچیوں میں رواج ہے کہ کھانے کے بعد قہوے کا دور دورہ ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد پھل لینے کا رواج ہے۔ قلات میں تو خوبانیوں کی بہتات ہے۔ اس کے علاوہ بَلوچستان میں سیب بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پنجگور مکران کا سب ڈویژن ہے۔ یہاں کھجوروں کی کثرت ہے۔ بہترین کھجوریں یہاں دستیاب ہیں۔ یوں تو ہر علاقے کی ایک مخصوص خوراک ہوتی ہے۔ جو وہاں کے لوگوں کی غمازی کرتی ہے۔ ان کے طور طریقے، رہن سہن، ثقافت کا پتہ دیتی ہے۔ سَفر نامہ نگار اپنی چیزوں کو سامنے لاتا ہے۔ چارلس میسن نے اپنے سَفر نامے "سَفر نامہ قلات" میں وہاں کے لوگوں کی خوراک، پسندیدہ کھانے، موسمی پھل، گوشت کے بنے منفرد کھانے ان سب کو اس سَفر نامے میں پیش کر کے وہاں کے لوگوں پر روشنی ڈالی ہے اور وہاں کی مُنفرد ثقافت کو سامنے لانے میں اہم کردار پیش کیا ہے۔ بَلوچستان کے بیش تر حصے ایسے ہیں جہاں جانور گھریلو زندگی کی اہم ترین چیز ہیں اور ان کے دُودھ سے کئی قسم کی اشیاو مرکبات تیار ہوتی ہیں۔ بھیڑ کے دُودھ کا مکھن اور پنیر بہت عمدہ ہے جو کہ ماس (دہی سے) بنا کر مٹی کے مرتبان میں رکھ کر مدانی سے پھینٹا جاتا ہے۔ یہ اُبلے ہوئے انڈے دودھ میں لسّی ڈال کر بنتا ہے۔ جس سے یہ جم جاتا ہے اور ہلکا سا تُرش ذائقے میں ہوتا ہے اور صبح میں ناشتے میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر جانوروں کے دُودھ سے روغن یا گھی بنایا جاتا ہے۔

براہوئیوں کی پسندیدہ ڈش شیلانچ (افغانوں کا کُروت) ہے۔ یہ بھی دُودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ لسّی کو اتنا اُبالتے ہیں کہ وہ آدھی رہ جاتی ہے اس کو سکھا کر رکھ لیا جاتا ہے اور بوقتِ ضرورت اسے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس مادے کو جب کھانا ہو تو کچھ گھی میں ڈال کر اُبال کر روٹی سے سالن کی طرح کھایا جاتا ہے۔ یہ افغانستان اور ایران میں بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ اُونٹنی کا دُودھ بالائی بَلوچستان کے اضلاع میں جزوی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لَس بیلا اور سندھ میں یہ بہت استعمال ہوتا ہے اور شریں ترین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سراوان اور قلات میں بھیڑوں کے دُودھ کی بہتات کی وجہ سے اس کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔

چارلس میسن لکھتا ہے:

> ”براہوئیوں کا شیلانج (افغانوں کا کروت) بھی دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ لسّی کو اتنا اُبالا جاتا ہے کہ وہ آدھی رہ جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس گاڑھے سیال کو بالوں یا اُون کے ایک تھیلے میں رکھا جاتا ہے اور خُشک ہونے کے بعد دُھوپ میں رکھا جاتا ہے۔ جب خشکی کا عمل پورا ہو جائے تو تھیلے کا مواد چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں میں بٹ جاتا ہے۔ جو دھوپ میں سکھا کر سخت کر لی جاتی ہیں۔ بوقت استعمال انھیں توڑ لیا جاتا ہے۔ اور گرم پانی میں ڈال کر ہاتھوں سے مل کر انھیں حل کر لیا جاتا ہے اس کے بعد اس گاڑھے مادے کو کچھ گھی ڈال کر اُبالا جاتا ہے۔ اور پھر اس میں روٹی بھگو کر کھا لیا جاتا ہے۔“[41]

مستونگ اور شال کے لوگ موسمی پھلوں میں شفا بخش مسالے ڈال کر صحت پسند کھانے کی اشیا بناتے ہیں۔ شہتوتوں اور خرمانیوں کو سکھا کر موسمِ سرما کے لیے صحت افروز اور غذائیت سے بھرپور خوراک بنا لیتے ہیں۔ خُشک شہتوتوں کا ذائقہ شہد کی طرح منفرد ہوتا ہے۔ خُشک خرمانیوں کو یہاں روٹی کے ساتھ سالن کے طور پر کھانے کا بھی رواج ہے۔ اِنھیں کوُٹ کر اُبال کر مسالے اور رُوغن ڈال کر مزے دار قسم کا سالن بنایا جاتا ہے، اسے چمری کہا جاتا ہے۔ ہر علاقے کی اپنی مخصوص ثقافت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح سے اس علاقے کی بھی اپنی ثقافت، طور طریقے، رہن سہن ہیں، جو باقی بَلوچستان سے قدرے مختلف ہیں۔ اور یہ چمری مرغوب غذا کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قلات میں ہنگ کا پودا بھی کھایا جاتا ہے۔ یہ پہاڑوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ قلات کے لوگ ہنگ کا اچار بھی ڈالتے ہیں۔ زیادہ تر ہندو لوگ اسے کھاتے ہیں۔ اس کا تنا براہوئی لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کا ذائقہ اور لذت کی لوگ تعریف کرتے نہیں تھکتے۔

بقول چارلس میسن:

> ”شہتوتوں اور خرمانیوں کو سکھا کر موسم سرما کے لیے یکساں طور پر صحت افزوز اور پُر غذائیت خوراک کا بندوبست کر لیتے ہیں۔خشک شہتوتوں کا ذائقہ میٹھے کنول یا شہد آگیں اور کی روٹی کی طرح اُنوکھا اور خوش گوار ہوتا ہے۔خُشک خرمانیاں روٹی کے ساتھ بطور سالن کھالی جاتی ہیں۔اِنھیں پانی کے ساتھ کوٹا جاتا ہے اور کچھ روغن ڈال کر اُبال لیا جاتا ہے۔اِسے چمری کہا جاتا ہے اور یہ بہت خوش ذائقہ بنایا جا سکتا ہے۔بہ شرط یہ کہ صحیح مصالحہ ڈالا جائے۔“(42)

قلات کے علاقے نوشکی اور گور گینہ میں رداش بہت وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔یہ پودا بھی بطور خوراک استعمال ہوتا ہے۔اِس کے ڈنٹھل الگ کر کے اِنھیں بھُون کر کھایا جاتا ہے۔اِس کا ذائقہ بہت پسند کیا جاتا ہے۔بعض تو اصل حالت میں بھی کھاتے ہیں۔اسی طرح ایک پودارال ہوشی کا تنا بھی کھایا جاتا ہے۔جو پہاڑوں میں بکثرت ملتا ہے۔خاران میں درخت موسومہ بہ شکر گز سے ایک ٹھوس سفیدی مائل گوندرستا ہے، جو شیریں ہوتا ہے اور قلات میں بکتا ہے۔گندم کا نعم البدل سمجھا جاتا ہے اور جب قلات میں اَناج کی قلت ہو تو اسے روٹی کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔سردیوں میں یہاں کی عورتیں گوشت محفوظ کرتی ہیں۔سردی کے آغاز میں جانور ذبح کر کے اس کی ہڈیاں نکال کر گوشت کو چھوٹی چھوٹی چھڑیوں کے ذریعے پھیلا دیا جاتا ہے۔کمرے کی چھت یا صحت میں سوکھنے کے لیے لٹکا دیا جاتا ہے۔بھیڑ کی آنتیں اور دیگر کھانے کے لائق حصے نمک لگا کر سوکھائے جاتے ہیں۔یہ گوشت بہت مزے دار ہوتا ہے۔بلوچستان میں اسے نمک کے علاوہ مصالحے لگا کر بھی بنایا جاتا ہے اور یہ بہت ذائقہ دار بنتا ہے۔اسی گوشت کو براہوی ”خدیت“ کہتے ہیں اور افغان اِس کو ”لاندی“ کہتے ہیں۔قلات میں اِس طرح کے بنے گوشت کو بہت شوق سے سردیوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

تربوز پسندیدہ پھل ہے۔اسی وجہ سے بہت اُگایا جاتا ہے۔کھجوریں خاران سے منگوائی جاتی ہیں جو کہ بہت قسموں کی ہیں اور خانہ بدوش قبیلوں کی من پسند چیز ہے۔عام سبزیاں نہیں اُگائی جاتیں لیکن مقامی پودے جسے کل کشتہ اور مغیر اور گربُست، چمر سرا، پشک اور پوچکو سبزی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔اِسی طرح پُوس بہت پسند کی جاتی ہے۔یہ ایک قسم کی روٹی ہے۔

بقول بریگیڈ ئیر اسماعیل صدیقی:

> ”مگسیر ایک خورد رَو ساگ ہے۔ جو پہاڑوں میں اُگتا ہے۔ لوگ اِسے جمع کر کے سکھاتے ہیں۔ سکھانے کے بعد اسے پیس لیتے ہیں۔ پھر اِسے شکر میں گوندھ کر اس کی روٹی بناتے ہیں۔ جسے پوس کہتے ہیں۔ یہ روٹی مدتوں خراب نہیں ہوتی۔“(43)

بَلوچستان میں تمباکو کھانے کا بھی رواج ہے۔ ضلع مری بگتی میں تمباکو پینے، چبانے اور کبھی کبھی نسوار لینے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بَلوچستان میں کھمبیاں موسم گرما میں کاشت ہوتی ہیں۔ یہ تھوڑے ہی دنوں کے لیے نظر آتی ہیں۔ کھمبیاں یعنی مشروم بہت ہی لذیز اور بَلوچستان میں بہت ہی سستی ملتی ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں یہ خاصی مہنگی ملتی ہیں۔ مستونگ کا علاقہ چاولوں کے لیے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا چاول ہے۔ خربوزے، گندم، جو، باجرہ، جوار، مونگ، مکئی، دال، آڑو، مٹر، تل، چنا کاشت کیے جاتے ہیں۔ قلات بہت زرخیز علاقہ ہے۔ جہاں شلجم، گاجر، کرم کلہ، سلاد، پھول گوبھی، مٹر، باقلا، لوبیا، مولیاں، پیاز، لہسن، اجمود، بیگن، ککڑی، کھیرا وغیرہ بآسانی دستیاب ہیں۔ ضلع قلات کے لوگ خوش حال اور کھاتے پیتے ہیں۔ قلات کے علاقے شال اور مستونگ میں نفیس قسم کے بادام ہوتے ہیں۔ بَلوچستان کے ہر علاقے کی خوراک دوسرے علاقے کے رہنے والے لوگوں سے قدرے مختلف ہے۔ جسے سَفر نامہ نگاروں نے اُجاگر کیا ہے۔ شہتوت غریب لوگوں کی خوراک ہے۔ تازہ، انگور، خرمانی، آڑو اور تربوز بھی بکثرت کھائے جاتے ہیں۔ صاحبِ حیثیت صبح ناشتے میں نہاری بھی کھاتے ہیں۔ ناشتہ عموماً جواری کی روٹیوں، لسّی یا مکھن اور کبھی کبھار کھجوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دودھ اور دہی بھی ناشتے میں استعمال کرنے کا رواج ہے۔ دودھ کی بنی اشیا کو اولیت حاصل ہے۔ چاول عیدین یا اہم مواقع پر کھائے جاتے ہیں۔ یہ عیدین پر بننے والے مرغوب اور پر تکلف کھانے ہیں جو کہ عام طور پر نہیں بنتے خاص خاص موقعوں پر بنانے کا رواج ہے۔ پرندے نفیس غذا سمجھے جاتے ہیں۔ خربوزے کا گودا سکھا کر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور بیجوں کو پیس کر بنائے ہوئے سفوف کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ خربوزے کے بیج نمک لگا کر بھونے جاتے ہیں۔ اندر کا حصہ (پاٹو) کھایا جاتا ہے۔ پاٹو اور کھجور اگر دستیاب ہوں تو عام طور پر توشہ سَفر ہیں۔ گندم اور جواری کی روٹیاں بنانے کا طریقہ وہی ہے جو مکران میں ہے۔ دہی، مکھن، پنیر بھی ویسے ہی بنائے جاتے ہیں۔ بھیڑ کے سکھائے ہوئے گوشت کا استعمال کم ہے۔ مصالحہ جات بھی وہی استعمال ہوتے ہیں جو مکران میں استعمال ہوتے ہیں۔ سبزیاں قریباً معدوم

ہیں۔ سوائے چند بستیوں کے جہاں پیاز استعمال ہوتا ہے۔ وہ بھی کچا کھایا جاتا ہے۔ بہار کے موسم میں خارانی کئی قسم کے جنگلی پودے کھاتے ہیں۔ شتر بانوں کی من پسند خوراک اونٹنی کا دُودھ ہے۔ جو صرف ایک کھانے پر تین سیر پی جاتے ہیں۔ کبھی کبھی دودھ اُبال کر مٹھی بھر گندم یا جواری کا آٹا اور ذرا نمک ملا کر ایک لئی سی بنا لیتے ہیں، جسے دال کہتے ہیں۔ ضلع مکران میں اکثر لوگ چار دفعہ کھانا کھاتے ہیں یعنی ناشتہ اُٹھنے کے فوراً بعد، ظہرانہ دوپہر کے وقت، عصرانہ تین اور چار بجے کے دوران اور عشائیہ (شام) غروب کے بعد ہوتا ہے۔ عصرانہ ہلکا ہوتا ہے اور ہر آدھی کھجوریں کھاتا ہے۔ اکثر لوگ ناشتہ اور ظہرانہ کھجوروں سے کرتے ہیں۔ جو پانی یا دودھ کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ عشائیہ میں جوار کی روٹیاں چلتی ہیں۔ کبھی کبھار اپنے تینوں کھانوں میں کھجوریں ہی کھاتے ہیں۔ اُبلی ہوئی مچھلی کھائی جاتی ہے۔ یخنی کھجوروں کے ساتھ گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں اور گوشت آخر میں کھاتے ہیں۔ غریب کہاں گوشت کی استطاعت رکھتے ہیں۔ امیر لوگ ناشتہ چاول سے کرتے ہیں اور ظہرانہ اور عشائیہ میں کھجور کی بجائے گندم کی روٹی کھاتے ہیں۔ صاحبِ وسائل ہر کھانے کے ساتھ گوشت یا مچھلی کھاتا ہے۔ مچھلی اور کھجور من پسند کھانا ہے۔ پرندوں کا گوشت بھی پسند سے کھایا جاتا ہے لیکن امیر لوگ اپنے مہمانوں کی ضیافت کے لیے کبھی کبھار بھیڑ بکریاں ذبح کر لیتے ہیں۔ امیر لوگ گائیں رکھتے ہیں مگر دودھ بھیڑ اور بکری کا ہی پیتے ہیں۔ دودھ کچا پیا جاتا ہے۔ مکھن، پنیر، دہی، چھاچھ استعمال ہوتی ہے۔ اشٹو بنا کر خشک سالی کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اشٹو میں گھی بھی ڈالتے ہیں۔ لوگ سبزیوں کے اشٹو کے شوقین ہیں۔ پنجگور میں کھجوروں کے ساتھ اُبلے ہوئے شلجم مرغوب غذا ہے۔ اسی طرح کئی سبزیاں استعمال ہوتی ہیں۔ سجی بلوچوں کے پہاڑی قبائل کی خصوصیت ہے اور خاص مواقع اور اہم مہمانوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ امیر طبقے لاندی کھاتے ہیں۔ اور کوہلو اور شاہرگ تحصیلوں کے بعض غریب لوگ اسے پرسندہ بھی کہتے ہیں۔ اور براہوئی کدیت یا خدیت یا پٹاؤ بھی پکارتے ہیں یہ عموماً بھیڑ بکری اور کبھی کبھار گائے یا اُونٹ کے گوشت کا بھی بنتا ہے اور نمک اور ہینگ ملا کر دُھوپ میں سکھا کر ٹکڑوں کی صورت میں رکھا جاتا ہے۔ امیر لوگ سبز چائے اور شربت پیتے ہیں اور پرندوں کا گوشت اور انڈے کھاتے ہیں۔ نصیر آباد کے جاٹوں اور بلوچوں میں نشہ آور شراب کا استعمال بھی مقبول ہے۔ پہاڑوں میں شہتوت، انگور، خرمانی، آڑو، تربوز بہت کھائے جاتے ہیں۔ جنگلی پھل شنے، سرگا (جنگی بادام) اور جونیپر کے بیر بھی دلیا (دوشا) کی صورت میں کھائے جاتے ہیں۔ ضلع مکران میں اکثر لوگ چار دفعہ کھانا کھاتے ہیں۔ یعنی ناشتہ (ہرزبند)، ظہرانہ (نہاری یا سبھارگ)، عصرانہ (نیمروزی) اور عشائیہ (شام) ناشتہ اُٹھنے کے فوراً بعد، ظہرانہ دوپہر کے وقت، عصرانہ تین اور چار بجے

کے دوران اور عشائیہ غروب کے بعد ہوتا ہے۔ عصرانہ ہلکا پھلکا ہوتا ہے اور ہر آدمی کھجوریں کھاتا ہے۔ اکثر لوگ ناشتہ اور ظہرانہ کھجوروں سے کرتے ہیں۔ جو پانی یا دودھ کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ عشائیہ میں جوار کی روٹی چلتی ہے۔ چرواہے کبھی کبھار اپنے تینوں کھانوں میں کھجوریں ہی کھاتے ہیں۔ اُبلی ہوئی مچھلی کھائی جاتی ہے۔ یخنی کھجوروں کے ساتھ گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں۔ اور گوشت آخر میں کھانے کے کھاتے ہیں۔ غریب لوگ گوشت کی استطاعت نہیں رکھتے۔ صرف کھجور پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ امیر لوگ چاول سے ناشتہ کرتے ہیں اور ظہرانہ اور عشائیہ میں کھجور کی بجائے گندم کی روٹی کھاتے ہیں۔ صاحبِ وسائل ہر کھانے کے ساتھ مچھلی یا گوشت کھاتے ہیں۔ مچھلی اور کھجور یہاں کے لوگوں کی من پسند خوراک ہیں۔ پرندوں کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ امیر لوگ مہمانوں کی ضیافت کے لیے بھیڑ بکریاں ذبح کر کے مہمانوں کی خاطر داری کرتے ہیں۔ امیر لوگ گائیں رکھتے ہیں مگر دودھ بھیڑ یا بکریوں کا ہی پیتے ہیں۔ دودھ، مکھن، پنیر، دہی، چھاچھ استعمال کرتے ہیں۔ مصالحہ، ہلدی، انار دانہ، تخم مذ اور کالی مرچ استعمال کرتے ہیں۔

الغرض بَلوچستان میں بسنے والے تمام لوگ ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ہیں۔ ان کی عادات و اطوار اور خوراک میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال صوبہ بَلوچستان کے تمام اضلاع کو ایک دوسرے سے منفرد بناتی ہے اور ان کی انفرادیت کو اُجاگر کرنے میں سب سے اہم کردار سَفر نامہ نگاروں کا ہے۔ ان کی بدولت بَلوچستان کا چپہ چپہ قاری کے گوش گزار ہو گیا ہے۔

iv. مذہب:

مذہب بھی کسی علاقے کی ثقافت، وہاں کے لوگوں کے عقائد، رسوم ورواج کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہر قوم کے اپنے اپنے مذہبی رسوم و عقائد ہوتے ہیں۔ جن کی پاس داری وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق کرتے نظر آتے ہیں۔ گو کہ پاکستان میں رہنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مگر پھر بھی سب علاقوں کے لوگ اپنے اپنے عقائد کے مطابق مذہب پر عمل پیرا ہیں۔ ضلع کی مقامی آبادی مذہبی لحاظ سے دو قسموں کی ہے۔ مسلمان اور ہندو، ہندو نسبتاً کم تعداد میں ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے اکثر لوگ کوئٹہ شہر میں مذکور ہیں۔ بَلوچستان کے تمام علاقوں کے مسلمان سنی العقیدہ ہیں۔ صرف مُلا اور سادات ہی اپنے مذہب کے ظواہر کو کسی حد تک سمجھتے ہیں۔ قبائلی عموماً بر وقت نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے پابند ہیں۔

"بَلوچوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں اگر ہم جسارت کر کے یہ کہہ دیں
کہ بلوچ من حیث القوم عقیدے کے لحاظ سے نہ سنی ہیں نہ شیعہ صرف
مسلمان ہیں تو یہ غلط نہ ہو گا۔"(44)

تمام قبائل سنی العقیدہ ہیں۔ بَلوچستان کے لوگ عموماً مذہبی اور پرہیز گار ہیں۔ پہاڑوں پر رہنے والوں کو چوں کہ تعلیم نہیں ملی، وہ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ تعلیم سے دور رہنے والوں کو کلمہ تک نہیں پڑھنا آتا اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حصہ کا کام ان کا سردار کرتا ہے۔ صرف سردار یا مولوی کلمہ پڑھ سکتا ہے لیکن وہاں جہاں تعلیم کا چرچا ہے وہاں کے مسلمان پکے مسلمان ہیں۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"جہاں تعلیم کا چرچا ہے۔ وہاں کے مسلمان پکے مسلمان ہیں۔ ان کے دلوں
میں اسلام کا درد اور محبت ہے۔ وہ مخصوص مفادات سے اُبھر کر دونوں کی
بہتری کے لیے کوشاں اور دستِ بد نمار ہتے ہیں۔"(45)

مذہب کے معاملے میں تمام صوبے کے عقائد تقریباً ایک جیسے ہیں۔ مسلمان ضرور ہیں مگر ان کا اسلام صرف نام تک یا ظاہری شکل و صورت سے جھلکتا ہے۔ لمبی داڑھی اور لمبے پٹے دار بال رکھ کر سمجھتے ہیں کہ مسلمان کا فرض ادا ہو گیا ہے۔ جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ دین کی پاس داری کرتے ہیں، نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے پابند ہیں۔ اسی طرح افغان نماز کے پکے پابند ہیں۔ جب کہ براہوئی افغان مذہبی رسوم میں کافی حد تک لاپرواہ ہیں اور نماز میں بھی غفلت برتتے ہیں۔ براہوی نسلوں کی طرح ان میں بھی اسلام صرف مزارات و سادات سے عقیدت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

چارلس میسن لکھتے ہیں:

"براہوئی افغان شبانی قبائل کی درشتی اور کٹرپن سے پاک ہیں اور کم متعصب
ہیں بلکہ مذہبی عبادات اور رسوم میں قدرے لاپروہ ہیں اور نماز کے سلسلے
میں بھی غافل ہیں۔ جب کہ افغان اس کے اتنے پابند ہیں۔"(46)

ضلع ساوران میں مقامی مسلمان آبادی جو کل آبادی کا 99 فیصد ہے۔ ضلع کچھی میں 88 فیصد مسلمان سنی العقیدہ ہیں۔ ضلع بولان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، عیسائی، سکھ اور دیگر مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ باقی مذاہب میں ہندو تعداد میں قدرے زیادہ ہیں۔ مقامی باشندے سب کے سب سنی العقیدہ ہیں۔ اکثر نا

خواندہ ہیں۔ نماز، روزہ اور خیرات کے پابند ہیں۔ ملّا نماز پڑھاتے ہیں۔ شادی اور مرگ کی رسومات بھی ادا کرتے ہیں:

> " بلوچستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں لیکن ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو آبادی کی 95 فیصد پر مشتمل ہیں اور سنی العقیدہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہاں شعیہ عقائد رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ "[47]

تمام اضلاع کے لوگ یعنی پورا خطہ بلوچستان توہم پرست ہے۔ دیگر اُمور میں توہمات مذہب پر غالب آجاتے ہیں اور روزمرہ زندگی کے مشاغل میں آباؤ اجداد اور اولیا کی دست گیری کا عقیدہ عام ہے۔ اولیا کو بیماری سے شفا دینے، بلاؤں کو ٹالنے والے، بارش برسانے اور بے اولاد کو بارور کرنے کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں:

> "ضلع کے مسلمان سنی العقیدہ ہیں صرف ملاّ اور سادات ہی اپنے مذہب کے ظواہر کو کسی حد تک سمجھتے ہیں۔ قبائل عموماً ہر وقت، نماز، روزہ، زکوٰۃ کے پابند ہیں۔ لیکن دیگر اُمور میں توہمات، مذہب پر غالب آجاتے ہیں۔ "[48]

سادات اور ملاّ بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے تعویز گنڈوں اور دُعاؤں کی مسلسل التجا کی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض سے بارش برسانے، بیماری دور کرنے، اولاد بخشنے، فصلوں کو مکڑی اور پھپھوندی سے بچانے اور آسیب اُتارنے کی طاقت منسوب کی جاتی ہے۔ ایک عام وہم یہ ہے کہ اگر کوئی افغان یا سید کو عین اس وقت پکارا جائے جب وہ عازم سَفر ہو تو اسے قدم اُٹھانے سے پہلے بیٹھنا لازماً چاہیے۔ اگر روانگی کے وقت خرگوش اس کا راستہ کاٹ لے تو اسے گھر لوٹ کر دوبارہ روانہ ہونا چاہیے۔ یہی عمل کسی جولاہے کے ملنے پر بھی دہرانا پڑتا ہے اور اگر ایک گیدڑ راستہ کاٹ لے تو اسے ایک اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔ سَفر نہ منگل کے روز ہو نہ ماہ صفر میں پُش یا لوہار نہ ہو تو سبز پتے کا درخت خشک کاٹ سکتا ہے اور نہ پتھر کا ایک ایسا توا بیچ سکتا ہے جو ایک دفعہ آگ پر رکھا جا چکا ہو۔ تحصیل فورٹ سنڈیمن کے تارن اور خوستی سادات دشمن کی گولیوں کو بے ضرر بنانے اور جلالزئیوں کے پارہ شاہے زئی کے افراد اپنے جادو ٹونے سے ٹڈی دل کو دور بھگانے کے اہل سمجھتے ہیں۔ ایک شادیزئی ملک یار ترین مکھن نہیں کھاتا۔ ایک ترین یا سید خاتون غروبِ آفتاب کے بعد کسی اجنبی کو نمک نہیں دیتی۔ مبادا گھر کی تقدیر پلٹ جائے اور پشین کا ترین یا سید نماز عصر کے وقت چائے یا پانی نہیں پیتا۔ ایک یا سین زئی یا بازئی کاکڑ بید کے سائے میں نہیں سوتا اور اچکزئی خاتون دودھ اُبالتے وقت اپنے

ہمسائے کو چولھے سے آگ نہیں دیتی پہلے موسمی دودھ کا مکھن بھی کسی کو نہیں دیا جاتا تھا۔اس وقت تک جب تک برتن میں جمع کردہ کا گھی نہ بنالیا جائے کوئی اچکزئی نہ ہی جنگلی انجیر کاٹتا ہے اور نہ ہی اسے بطور ایندھن جلاتا ہے۔ پیر علیزئی اچکزئی اپنی موسمی ہجرت کے دوران کوچ کی پہلی رات کسی مہمان یا رشتہ دار کو اپنے خیمے میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ بدروحوں اور ان کی چرانے کی قوت پر عقیدہ عام ہے۔اور بٹائی تک تلوار سے پڑھ کے اناج کے گرد دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے اور اس پر قرآن شریف اور ننگی تلوار رکھ دی جاتی ہے۔ مبادا بھوت پریت کا پہرہ ہو جائے۔ بلوچستان کے تقریباً تمام علاقوں میں یہ توہمات پرستی عام تھی۔

بلوچ قبائل جہالت یعنی کم علمی کی وجہ سے اپنے بزرگوں کے بتائے دین پر چلنے کو درست مانتے ہیں اور خود کو صرف انھی قوانین کا پابند سمجھتے ہیں جو ان کے بزرگوں نے انھیں بتائے ہیں ۔وہ مذہب کے ظاہری رسوم و آداب پر بالکل بھی عمل نہیں کرتے ۔اپنی روایات سے ذرا برابر بھی انحراف کرنے کو تیار نہیں کیوں کہ وہ ان کے بزرگوں کی تعلیمات سے ہٹ کر ہیں ۔اس لیے ان کے لیے قابلِ قبول نہیں ۔اگرچہ ان کے اصول ،اخلاق اور طور طریقے اسلامی تعلیمات کے جیسے ہی ہیں ۔ ان کے نزدیک مذہب کا احترام اور پابندی لازمی ہے ۔بلوچ قبائل انتہائی پس ماندہ ہیں اور بری طرح سے توہمات کا شکار ہیں ۔

> ”بلوچ ضابطہ اضلاق کے بیش تر عناصر اسلام کی حقیقی روح سے قریب تر نظر آتے ہیں۔“(49)

بلوچ قبائل اپنی کم علمی کی وجہ سے مذہب کی طرف سے پابند کیے گے اُصولوں پر کم عمل کرتے ہیں ۔روایات کی پاس داری کرتے ہیں اور خود پر صرف ان اصولوں کو فرض سمجھتے ہیں جو ان کے بزرگوں نے بتائے ہیں اور جن پر وہ بچپن سے عمل پیرا ہیں اور صرف انھی کی پیروی کو درست مانتے ہیں ۔وہ بزرگوں کے بتائے مذہب کا حد درجہ احترام کرتے ہیں مگر اسلام کے اُصولوں سے بے بہرہ ہیں ۔اصل میں اسلام ہے کیا؟ اس سے وہ ناآشنا ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ کم علمی ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ”وہ مذہب کے ظاہری آداب و رسوم پر بہت کم عمل کرتے ہیں۔ مگر ان کا طرزِ حیات ، فکر و شعور اور ضابطہ ہائے اخلاق بڑی حد تک اسلامی تعلیمات

کے عکاس ہیں اور ان کے نزدیک مذہب کا احترام اور پابندی یہی معنی رکھتے ہیں۔"(50)

مختلف قسم کی آزمائشیں تھیں اور ان کی وجہ ناخواندگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بظاہر یہ مسلمان ہیں، نماز روزہ بھی کرتے ہیں، مگر اسلام کو سمجھتے نہیں ہیں۔ جہالت کا عالم یہ لوگ سرداروں پر اس حد تک اعتماد رکھتے تھے کہ ان کا ماننا تھا کہ ہمارے حصّے کی نمازیں سردار پڑھتا ہے۔ کلمہ بھی وہی پڑھتا ہے اور دُنیاو آخرت دونوں میں ہماری فلاح اور بخشش کا سبب یہی سردار ہیں۔

علاوہ ازیں یہ لوگ اولیا پر بھی بہت یقین رکھتے ہیں۔ زیارتوں کو بھی بہت مانتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو مسلمان ہیں مگر مذہب تو نام کا ہے، ورنہ باقی تو یہ صدیوں سے اپنے ان ہی طور طریقوں تو ہمات اور عادات و اطوار پر کاربند ہیں۔ جن پر ان کے آباؤاجداد عمل کرتے تھے۔

بریگیڈئیر اسماعیل صدیقی رقم طراز ہیں:

"شاید کسی کو خیال ہو کہ ان پہاڑوں پر رہنے والوں کو دینوی تعلیم نہیں ملی، تو دینی تعلیم سے ضرور بہرہ ور ہوں گے کیوں کہ آخر مسلمان ہیں، ہاں مسلمان ہیں مگر ان کا اسلام صرف نام تک یا زیادہ سے زیادہ ظاہری شکل و شباہت تک محدود ہے۔ ظاہری شکل و شباہت سے مراد لمبی داڑھی اور لمبے پٹے دار بال ہیں۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ مسلمان اور فرنگی میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے۔"(51)

عجیب عجیب قسم کی توہمات، آزمائشیں بلوچی ثقافت کا حصہ نظر آتی ہیں۔ ضلع کچھی میں تو بہت ہی عجیب ترین رواج ہیں۔ رند اُونٹ کا گوشت نہیں کھاتے، حاجیجا بلیدی کسی جانور کا گردہ نہیں کھاتے لاشاری آلٹر و نامی پودے سے متنفر اور گریزاں ہیں۔ واگہ جاٹ فاختہ نہیں کھاتے اور کلوراجاٹ کسی جانور کا دل اور جگر استعمال نہیں کرتے۔ مزاروں اور پیروں کے پاس جانا ان کی فطرت ہے۔ آگ کی آزمائش میں ہل کا دہکتا ہوا پھالا مشتبہ شخص کے ہاتھ پر رکھ دیا جاتا تھا اور اسے سات قدم چلنے کو کہا جاتا تھا۔ اگر وہ چل لیتا تھا تو وہ بے گناہ قرار دیا جاتا تھا۔ مختلف قسم کی آزمائشیں تھیں لکڑی کے کشکول کی تہہ میں ایک سوراخ کر کے ایک چھڑی اس میں ڈال دی جاتی تھی۔ اس کے بعد ملاّ قرآن کریم کی سورۃ یٰسین پڑھ کر کشکول کو پھونک مارتا تھا اگر

کشکول بائیں طرف ملے تو ملزم کو مجرم قرار دیا جاتا تھا یا یہی سورۃ پسے ہوئے جوار پر پھونکی جاتی تھی اور پھر ملزم کو نگلنے کے لیے دی جاتی تھی اگر یہ اس کے گلے میں چمٹ جاتی تو اسے مجرم سمجھا جاتا تھا۔

بقول شوکت علی شاہ:

”روزِ اول سے اقوام اور افرد تاہمات کے اسیر رہے ہیں۔ بلوچ قبائل میں بھی مختلف قسم کے توہمات موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص سَفر پر جارہا ہو تو اس کو پیچھے سے بلانا یا آواز دینا بد شگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مسافر سَفر پر جانے کا ارداہ ترک کر دیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ سَفر کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ ایک جوتی کا دوسری جوتی پر آنا سَفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آنکھ کا پھڑ کنا کسی عزیز سے ملنے کی نوید دیتا ہے۔ ہتھیلی پر خارش امد سیم وزر سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح بار بار ہچکی کا آنا بھی آمد دولت تصور کیا جاتا ہے۔“(52)

بَلوچوں میں ایک عادت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ پرندوں کو بھی نحوست کی علامت سمجھتے ہیں۔ جس طرح اُلو کو نحوست کی علامت کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بَلوچوں میں گیا پنچ نامی پرندے کو سعادت اور نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی سَفر پر جارہا ہو۔ تو یہ پرندہ اگر دائیں جانب اُڑتا نظر آئے تو اسے نیک شگون مانا جاتا ہے اور اگر بائیں جانب ہو تو تباہی و بَربادی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔

بَلوچستان چوں کہ انتہائی پس ماندہ پاکستان کا صوبہ ہے۔ جہاں لوگ مذہبی تعلیم سے بہت دور ہیں اور اسی وجہ سے مختلف لوگ اور عجیب قسم کے توہمات اور آزمائشوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر جہاں جہاں لوگ تعلیم سے بہرہ ور ہیں، وہاں کے لوگ پکے مسلمان ہیں مذہب کی صحیح معنوں میں پاس داری کرتے ہیں اور اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

”جہاں جہاں تعلیم کا چرچا ہے وہاں کے مسلمان پکے مسلمان ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کا درد اور محبت ہے۔“(53)

V. توہم پرستی:

بلوچ قوم میں ضعیف الاعتقادی، جہالت اور توہم پرستی کچھ زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے وحشیانہ اور مجنونانہ تصورات پر بہت فخر کرتے ہیں۔ وہ جنوں اور پریوں پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ پیروں، فقیروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بیمار ہوں تو صرف خیرات ہی سہارا نہیں بلکہ خیرات کے ساتھ ساتھ تعویز بھی لیتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں یقین ہے کہ وہ تعویز جادو کا کام کرے گا اور بیماری کا خاص علاج سمجھا جاتا ہے۔ تعویز لکھنے کا کام نیک، پارسا آدمی یا اس کا خلیفہ مجاز یا سید ہی لکھ کے دیتا ہے۔ یہ لوگ ان ضعیف الاعتقاد لوگوں کی خوش اعتقادی سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تعویز کا مقصد صرف علاج ہی نہیں بلکہ مصیبت کے آنے سے پہلے بچاؤ ہے۔ غرض یہ کہ زندگی کے عام اور غیر معمولی حادثات کے لیے یہ ایک مفید علاج ہے۔

بقول چارلس میسن:

> "تعویز کا مقصد صرف علاج ہی نہیں بلکہ حفظ ما تقدیم بھی ہے۔ جیسے لڑائی میں زخموں سے بچنا، عشق میں کام یاب ہونا، کسی شخص کو غیر مرئی بنانا غرض یہ کہ یہ زندگی کے عام اور غیر معمولی حادثات کے لیے ایک تریاق ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ روزمرہ کا تجربہ ان ٹونے ٹوٹکوں پر اعتماد کو کم نہیں کرتا اصل میں اعتقاد اتنا اندھا اور متعصبانہ ہے اور وحشی لوگ مافوق الفطرت اور محیر القول کے اس بری طرح قائل ہیں کہ خلاف عقل ہونے کے باوجود انھیں تیز تہدف سمجھتے ہیں اور ادوایات بھی نظر انداز نہیں کی جاتیں ہر خاتون خانہ کے پاس سیدھی سادھی دواؤں کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔"(54)

لوگوں کی توہم پرستی کا یہ عالم ہے کہ حادثات اور بیماریوں میں دوا پر تعویز کو ترجیح دی جاتی ہے اور بیماریاں جیسے مار گزیدگی اور بخار کا علاج "دم" سے کیا جاتا ہے۔ دریائے مولہ کی آبادی کے براہوئی جادو کے زور سے گولیوں کو چلنے سے روکنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

شوکت علی شاہ نے "سفر نامہ اجنبی اپنے دیس میں" بلوچستان کے باسیوں کی اس طرح سے تصویر کشی کی ہے کہ ان کی عادات و اطوار، سوچ اور نظریات سامنے آگئے ہیں۔ بلوچ قبائل مختلف قسم کے توہمات کے اسیر ہیں۔ توہم پرستی کی بڑی وجہ جہالت ہے۔ مختلف قسم کی باتیں اُنھوں نے فرض کر لی ہیں۔ مختلف

باتیں جیسے سَفر پر جانے والے کو اگر کوئی پیچھے سے پکارے تو یہ مصیبت کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ یہ سَفر اس کے لیے خطرناک ہے۔اسی طرح آنکھ کا پھڑکنا، جوتی کا جوتی پر چڑھنا، ہچکی کا آنا ان سب سے کوئی نہ کوئی توہمات جڑے ہوئے ہیں۔پرندوں کو منحوس کہنا انھیں نحوست کی علامت سمجھنا ان کا مصنف نے اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

"جس طرح پرندوں میں الو نحوست کی علامت ہے۔اسی طرح بَلوچوں میں گیا پنج نامی پرندے سے سعادت اور نحوست کے درواہوتے ہیں۔اگر سَفر پر جاتے ہوئے آغاز سفر ں میں یہ پرندہ دائیں جانب اُڑتا ہوا نظر آئے تو اسے نیک شگون تصور کیا جاتا ہے۔اس کے برعکس یہ بائیں جانب نظر آجائے تو تباہی وبربادی کی علامت ہوتا ہے۔"(55)

vi. رہائش گاہیں:

""پشین کے دیہات زیادہ تر چھپروں پر مشتمل ہیں۔جو بے ہنگم اور بے ترتیب انداز میں کیچڑ سے تعمیر ہوئے ہیں۔قدیم تر مکانوں کے اردگرد مٹی کی چار دیواریاں ہیں جو اکثر و بیش تر ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔مکانوں کی قطاروں کے درمیان تنگ گلی کوچے ہیں، جو ہر قسم کے کوڑا کرکٹ سے بھرے رہتے ہیں۔لیکن اب اُونچی دیواروں میں محصور باغیچے نظر آتے ہیں۔ہنہ بَر شور جیسی جگھوں پر مکانات بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"گاؤں میں لوگ کچے مکان بنا کر رہتے ہیں۔خانہ بدوش سردیوں میں اُون کے کمبل کے خیمے بنا کر بَسر اوقات کرتے ہیں۔ان خیموں کو گیدان کہا جاتا ہے۔"گیدان" کے کمبل بکری کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں۔گیدان کے عموماً گیارہ حصے ہوتے ہیں۔ہر ایک کو "پٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"(56)

لوگ اکٹھے رہتے تھے، اپنے جارحانہ و مدافعانہ مقاصد کے لیے مگر اب پھیل جانے کا رُجحان ہے۔اس لیے دیہاتوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ضلع ساوران میں مستونگ اور قلات کا علاقہ بہت کم آباد تھا۔تا حال دیہاتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔اکثر براہوی آبادی خیموں میں رہتی تھی، قلات اور مستونگ کے علاوہ 36،37

اہم ترین گاؤں ہیں۔ ضلع بولان میں واحد گاؤں کرتہ تھا جو آباد تھا۔ گاؤں بلوچستانی دیہات کی طرح مٹی کے جھونپڑوں پر مشتمل ہے۔ ان میں مُچ (مچھ) کول پور، ہرک، آب گم، پیشی، پنیر اور مشکاف قابلِ ذکر علاقے ہیں۔ ضلع کچھی میں دیہات سب سے زیادہ ہیں۔ 40 سے اُوپر گاؤں ہیں۔ پہلے یہ علاقہ تاخت و تاراج جھالاوان اس ضلع میں اتنی آبادی نہیں ہے۔ صوبے کا بڑا رقبہ پہاڑوں نے گھیرا ہوا ہے۔ قابل کاشت رقبہ معمولی ہے۔ صرف چند گاؤں ہیں زیادہ تر لوگ خانہ بدوش ہیں۔ آہستہ آہستہ اس ضلع میں بھی دیہاتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے دیہات جن میں سوراب، نچارہ، باغبانہ، خضدار، نال، وڈ اور گجر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ضلع لَس بیلہ پہلے لوگ اکٹھے ہو کر بڑے بڑے دیہات میں رہا کرتے تھے۔ لیکن اب کاشت کار اپنی ایک الگ جھونپڑی بنا کر اپنے کھیتوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تیزی سے نئے گاؤں آباد ہوتے جا رہے ہیں۔ ضلع لورالائی واحد قصبہ ہے۔ جو انگریزوں کے قصبے کے بعد تیزی سے بڑھا اس میں زیادہ تر آبادی بیرونی مقیم ہے۔ دیہات میں رہنے والے جعفروں کے سوا تحصیل موسیٰ خیل کے اکثر لوگ خانہ بدوش ہیں۔ گاؤں معمول کی پٹھان طرز کے ہیں اور زیادہ تر مٹی کی جھونپڑیاں ہیں۔ جو کسی باقاعدہ نقشے کے بغیر تعمیر کی گئی ہیں۔ گاؤں عموماً بہت گندے ہیں اور غیر صحت مندانہ ہیں۔ ضلع میں 500 سے زیادہ دیہات ہیں۔ مری بگٹی میں آبادی کی بڑی تعداد خانہ بدوش ہے۔ سرداروں اور امیروں کے عُمدہ مکانات ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ زیادہ تر مٹی کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ چاغی گاؤں کے مکانات عموماً مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ نوشکی تحصیل میں گاؤں زیادہ تر کھڈیوں پر مشتمل ہیں۔ جو پیش کی چٹائیوں یا گز کے چوکھٹوں سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی تنور آسا جھونپڑیاں ہیں۔ جنھیں مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔ خارانیوں کی خانہ بدوشیت، بھیڑ، بکریوں اور اُونٹوں کے ریوڑوں کا ان کی اصل دولت ہونا اور کاشت کاری کا انتہائی خطرناک ہونا اس بات کے مظہر ہیں کہ یہاں مستقل دیہات نہیں ہو سکتے۔ خانہ بدوشیت بَلوچستان میں خاران سے زیادہ کہیں نہیں ہے۔ دیہات مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ ہر گھر آسانی کے نکتہ نظر سے بنایا گیا ہے نہ کہ کسی باقاعدگی یا عام اُصول کی بنا پر۔

بقول پروفیسر ایم رومان:

> ”بلوچ بہت فخر سے کہتے ہیں: ”رات کا حُسن ستاروں میں ہے اور جنگلوں کا حُسن بَلوچوں سے ہے۔“ اور یہ احساس باشندوں کے اس رُجحان سے اُجاگر ہوتا ہے کہ وہ بڑی آبادیوں میں اکٹھا رہنے سے کتراتے ہیں۔ ایک واحد جگہ

جسے قصبہ کہا جا سکتا ہے گوادر ہے جب کہ دیہات صرف تعداد میں تھوڑے
بلکہ طول و عرض میں چھوٹے ہیں۔"(57)

ضلع مکران میں خانہ بدوشی کا رُجحان اتنا نمایاں نہیں جتنا بَلوچستان کے دیگر حصوں میں ہے۔خانہ بدوش آبادی کافی ہے اور کُل آبادی کا تقریباً نصف ہے۔یہ آبادی دو گرہوں میں تقسیم ہے۔پہلا گروہ عادتاً سال بھر کے علاقے میں اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ان میں سنگر، ہزنجو، کلکور، بلوچ اور رخشانی ہیں۔دوسرا گروہ بہت ہی محدود دائرے میں گھومتا ہے اور اپنے ریوڑ اور اُونٹ پہاڑوں میں چرا کر دیہات کے گردو نواح میں آجاتے ہیں۔ریوڑ چرائی کے علاوہ یہ لوگ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے نقل و حمل کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔کیوں کہ ذرائع آمدنی بہت کم اور مخدوش ہیں۔اندرونی موسمی ہجرت کھجور کی فصل پر ہوتی ہے۔جب سب دیہاتی کیچ اور پنجگور کا رُخ کرتے ہیں۔جو سب سے بڑے خرما آفرین علاقے ہیں۔سخت سردی میں یعنی دسمبر جنوری، فروری کے مہینوں میں جب کوئٹے کے بیش تر باشندے مقابلتاً کم سردیا معتدل مقامات کی جانب منتقل ہو جاتے ہیں۔مقامی آبادی میں سے کھاتے پیتے لوگ تو کراچی اور حیدر آباد کا رُخ کرتے ہیں۔اور ذرا کم وسائل والے غریب غربا بستی چلے جاتے ہیں۔یوں بَلوچستان کے ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے میں منتقل ہو جاتے ہیں اور یوں ان کی موسمی ہجرت جاری رہتی ہے۔موسمی حالات کی وجہ سے ان کے رہن سہن، رہائش، طرزِ زندگی نہ صرف دوسرے صوبوں سے بلکہ اپنے ہی صوبے کے لوگوں سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آب و ہوا کسی بھی علاقے کی ثقافت پر اثر انداز ہوتی ہے۔کیوں کہ آب و ہوا کے پیشِ نظر ہی وہ موسم کے مطابق اپنے رہن سہن کا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔جیسے کہ بلوچی ہیں۔دیہاتوں میں رہنے والے بلوچی موسم سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔کیوں کہ غریب طبقہ زیادہ تر آبادی پر مشتمل ہے۔موجودہ صورتِ حال میں تو کوئٹہ جو کہ صوبے کا دار الحکومت ہے اور بدلتے وقت کی کروٹ نے یہاں کے حالات میں بھی تبدیلی پیدا کی ہے۔کوئٹہ میں عمارتیں قدیم طرزِ رہائش کے ساتھ ساتھ نئی نئی عمارتیں اور نو تعمیر شدہ گھر بھی نظر آنے لگتے ہیں۔اس وقت کوئٹہ پورے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔شہر سے بڑی بڑی عمارتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

"ان عمارتوں کا طرزِ تعمیر کوئٹہ کے مخصوص اندازِ تعمیرات کا غماز اور موسمی
حالات کا عکاس ہے۔بَلوچستان صوبائی اسمبلی کی عمارت کا اندازِ تعمیر جداگانہ

اور بڑا دل کش ہے۔ اسے ایک خیمے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ جو کوئٹہ کے لوگوں کی صدیوں پرانی جفاکش زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔"(58)

دیہاتوں کے علاوہ کچی جھونپڑیاں بہت کم ہیں۔ سردیوں میں کٹر دیوں میں رہتے ہیں اور گرمی میں منڈاو (لکڑی کے بانسوں کی عارضی پناہ گاہ جسے سرگشتے یا لکھا گھاس سے ڈھانپ دیا جاتا ہے) کٹر دی بکری کے بالوں سے بنتا ہے اور عموماً گیارہ ٹکڑوں (ٹاگئی) پر مشتمل ہوتا ہے۔ کٹر دی کے سامنے صحن ہوتا ہے۔ جس کے گرد چٹائیوں یا جھاڑیوں کی باڑھ ہوتی ہے۔ صرف خوش حال لوگ ہی اپنے ریوڑوں اور مویشیوں کے لیے علیحدہ کٹر دی کی استطاعت رکھتے ہیں۔ کٹر دی واٹر پروف ہوتی ہے اور بہت ہی پسندیدہ اندازِ رہائش ہے۔ کیوں کہ اسے باضرورت جگہ بہ جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ جلال زئی کا کڑ زیادہ تر ریوڑ چلانے والے ہیں اور وہ غاروں میں پناہ لیتے ہیں اور اکثر کے پاس کٹر دی بھی نہیں ہے۔ بہت سے کاشت کار گرمی میں اپنی جھونپڑیوں سے کٹر دیوں میں چلے جاتے ہیں۔ جنھیں "مینا" کہتے ہیں۔ لیمپ نہیں ہوتے گھریلو سازو سامان مختصر ہوتا ہے۔ کٹر دی کی ایک اور شکل گرمائی پناہ ہے۔ جسے کمبلوں کی بجائے جھاڑیوں سے ڈھانپ لیا جاتا ہے اور جسے کُدھل کہتے ہیں۔ دیہاتوں میں لوگ عموماً جھونپڑیاں لمبے لمبے بانسوں سے بنا کر رہتے ہیں۔ جن پر اُونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے کھردرے کپڑے بچھا کر انھیں استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ سورج کی شِدت سے بچاؤ کے لیے بہت اچھا انتظام کر رکھا ہے ان کی جھونپڑیوں یا خیموں کی سمت شرقاً غرباً ہوتی ہے۔ اکیلا خیمہ "بونگھی" جب کہ بہت سے خیموں کا مجموعہ "ثُمن" کہلاتا ہے۔ ان کی جھونپڑیاں ایسی ہوتی ہیں۔ جن میں ایک طرف اناج، آٹا اور دیگر ضروریات کی چیزیں رکھی جاتی ہیں اور انھیں دری لٹکا کر چھپا دیتے ہیں اور ان کے اُوپر دریوں اور نمدوں کو تہہ لگا کر رکھ دیتے ہیں تاکہ رکھا سامان بدنما نہ لگے۔ ان کی سلیقہ مندی کا یہ وصف ان کی جھونپڑیوں میں دکھائی دیتا ہے کہ کس طرح سے اُنھوں نے ان جھونپڑیوں کو اپنے سلیقے سے رہنے کے قابل بنایا ہے۔

بقول چارلس میسن:

"براہوئیوں کی رہائش گاہیں لمبے پتلے بانسوں کو جھکا کر ایک دوسرے کی طرف موڑ کر بنائی جاتی ہیں۔ جن پر اُونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے کھردرے کپڑے بچھا دیئے جاتے ہیں۔ جنھیں سیاہ رنگ دیا جاتا ہے۔"(59)

مستقل باشندے پتھروں اور مٹی کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔امیر لوگوں کے مکانات بہت بہتر ہیں۔ کئی کمروں پر مشتمل ہیں لَس بیلا میں بنے ہوئے مکانات بہت بہتر ہیں۔

> ”چوں کہ اکثریتی آبادی خانہ بدوش ہے۔لہٰذا بڑے قصبات کے سوا مستقل رہائش گاہیں شاذو نادر ہی ملتی ہیں۔قصباتی مکانات بھی زیادہ تر مٹی یا نیم سوختہ اینٹوں سے بنتے ہیں۔جن کا ڈھانچہ چوبی ہوتا ہے اور جن پر مٹی یا چونے کا پلستر کیا جاتا ہے۔شبانی قبائل کے مکان کئی لمبے پتلے بانسوں سے بنتے ہیں۔جنھیں جھکا کر اندر کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔اور ان کے اُوپر اونٹوں کے بالوں کے عموماً سیاہ اور کھردرے کپڑے ڈال دیئے جاتے ہیں۔یہ گویا چٹائیوں کی جھونپڑیاں یا چھپر ہیں جنھیں کِری یا گدان کہا جاتا ہے۔“(60)

خانہ بدوش لوگوں کی اکثریت ہے جو کہ مٹی اور اینٹوں کے مکانات میں رہتے ہیں۔یہاں پتھروں اور اینٹوں کے مکانات کا بھی رواج ہے۔جھونپڑیاں بھی لوگوں کی مستقل جائے رہائش ہے۔

vii. پیشے:

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ بَلوچستان ایک پس ماندہ علاقہ ہے۔یہاں پر زمین کا بیش تر حصّہ بنجر ہے۔اگر تمام ارضی کو کاشت کاری کے لیے بروئے کار لایا جائے تو بَلوچستان کی ساری آبادی زراعت سے منسلک ہو سکتی ہے۔ابھی بھی جہاں جہاں زمین زرخیز ہے،لوگ کاشتکاری کرتے ہیں۔لوگ گلہ بانی کے پیشے سے بھی منسلک ہیں۔بندر گاہیں کسی بھی ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہیں۔یہاں لوگ تجارت،لین دین،کاروبار اور نقل و حمل کے لیے بندر گاہ استعمال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں پر لوگوں نے سمگلنگ کو بھی ذریعہ آمدنی بنالیا ہے۔بَلوچستان میں معدنیات وافر مقدار میں موجود ہیں۔جن کو نکالنے کے کام میں لوگوں کو مزدوری مل جاتی ہے۔بَلوچستان کے پہاڑوں میں سونا بھی پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بَلوچستان میں عُمدہ قسم کا کوئلہ نکلتا ہے۔جس کو نکالنے کے کام سے بھی لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے۔

کسی بھی علاقے کی ثقافت کو پوری طرح عیاں کرنے میں وہاں کے لوگوں کے پیشوں کو بھی بہت عمل دخل ہے۔لوگوں کے کام کاج،پیشے،وہاں کے لوگوں کے رہن سہن،عادات و اطوار اور چال چلن کو واضح کرتے ہیں۔جہاں لوگوں کی زندگی گزارنے کے ڈھب دوسرے صوبوں سے مختلف ہیں۔بَلوچستان کے تمام اضلاع میں یہ عادت ہے کہ وہ کنبہ کے سربراہ کے پیشے کو ہی سب کا پیشہ سمجھتے ہیں۔کوئٹہ سے باہر نکلیں تو تاحد

نظر چٹیل اور بنجر اراضی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں کہیں کہیں صحرا بھی ہیں۔ اس خطے کی حالت دیکھ کر یہاں کے لوگوں کے طرزِ بود وباش اور زندگی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ شہر کے اندر باہر ذرائع نقل وحمل کے طور پر اونٹوں کے قافلے آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ چرواہوں کے قبائل نئی چراگاہوں کی تلاش میں سَفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان علاقوں میں زیادہ تر لوگ چرواہی کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔

"یہاں کی آبادی اس قسم کے وحشی قبائل پر مشتمل ہے۔ جن کی معاشی زندگی کا دارومدار مال مویشیوں کی پرورش ہے۔"(61)

اس کے علاوہ لوگ یہاں قالین بیچنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ افغانی اور ایرانی قالینوں کی خریداری کے لیے کوئٹہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کے علاوہ بلوچی شیشے کا کام، کڑھائی، اُونی واسکٹیں، ٹوپیاں، قیمتی پتھر اور خُشک میوے کوئٹہ کے بازروں میں بیچے جاتے ہیں اور وہاں کی سوغات سمجھے جاتے ہیں۔

ضلع ژوب میں بڑے قبائل یعنی کاکڑ، مندوخیل، شیرانی اور خوستی شامل ہیں۔ اور اس میں اکثر اپنی زمینیں خود کاشت کرتے ہیں لیکن جو گزئیوں کے اُونچے خاندان اور ساقی خانہ بدوش بزگر ملازم رکھتے ہیں۔ بزگر اپنی قبائل کے غریب تر لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ گلہ بان زیادہ تر مسلم باغ میں مُلازئی، کمال زئی، گھوڑے زئی ہیں۔

بقول ملک محمد سعید دہوار:

"یہاں کے باشندوں کی معیشت کا دارومدار کلیتاً بھیڑ بکریوں کی پرورش پر تھا۔"(62)

پورے بَلوچستان میں لوگ زراعت، گلہ بانی، ماہی گیری، کانوں میں کام کرنا وغیرہ جیسے پیشوں سے منسلک ہیں۔ لیکن قلات میں معیشت کا دارومدار مختلف ہے۔ چوں کہ بَلوچستان کے مختلف علاقوں کی آب وہوا مختلف ہے۔ اس لیے لوگ اپنے علاقے کی آب وہوا اور سہولیات کے اعتبار سے پیشے اپناتے ہیں۔ چارلس میسن نے نہایت عمدگی سے بلوچستان کے ثقافتی رنگوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار دودھ پر ہے۔ اگرچہ براہوئیوں کی گھریلو معیشت بہت سادہ اور محدود ہے۔ دودھ ان کی روزمرہ زندگی کا ایک اہم جز ہے۔ دودھ زیادہ تر بھیڑوں اور بکریوں سے ملتا ہے۔ سراوان اور جھالاوان میں گائیں بہت کم ہیں، بھینسیں تو گائے سے بھی کم ہیں۔ بھیڑوَں کا دودھ یہاں پر وافر مقدار میں موجود ہے۔ بھیڑوں کا دودھ بھاری اور گاڑھا ہوتا ہے۔ بھیڑوں کا دودھ گاڑھا ہونے کی وجہ سے اس پر بالائی بہت ہوتی ہے۔ افغانستان اور بَلوچستان میں گھریلو

زندگی کی اہم ترین چیز دودھ ہے۔اس سے بہت سی اشیاو مرکبات بنائے جاتے ہیں۔بھیڑ کے دودھ سے مکھن اور پنیر بہت عمدہ بنتا ہے۔دُودھ سے بلوچی کئی ایک اشیا تیار کرتے ہیں۔جو ذائقے اور افادیت میں بہترین ہوتی ہیں۔قلعہ سیف اللہ تحصیل کے علی خیل، گھوڑے زئی، دولت زئی بہترین شیر پال ہیں۔مقامی کاریگر لوہار (پِش)، ترکھان اور جولاہے (پیشہ ور) ہیں جو ہر تحصیل کے گاؤں گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔کچھ لوانے اور جلالزئی زمینی نمک بھی بناتے ہیں۔ضلع ساراوان میں بھی لوگ انہی پیشوں سے مُنسلک ہیں۔مصنفہ ہنری پوٹنگر اپنے سَفر نامے " بَلوچستان وسندھ "میں بَلوچستان کے لوگوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "سراوان اور جھلاوان کے بالائی حصّوں اور شال اور مستونگ میں گندم
> اگست یا ستمبر میں بوئی جاتی ہے اور آئندہ جون میں کاٹی جاتی ہے۔جو ایک ماہ
> بعد بوتے ہیں اور کچھ پہلے کاٹتے ہیں۔گویا یہ فصل تقریباً آٹھ ماہ لیتی ہے۔مکئی
> تین چار ماہ میں پک جاتی ہے۔"(63)

قلات کے باغوں میں خرمانی، آڑو، مختلف قسموں کے اِنگور، بادام، پستہ کئی قسموں کے سیب، ناشپاتی، آلوبخارا، کشمش، چیری، سَفر جل، انجیر، انار، شہتوت، کیلے، امرود، خربوزے وغیرہ وافر مقدار میں اُگتے ہیں اور بازاروں میں لوگ انھیں مناسب قیمت پر بیچتے ہیں۔یہ بھی سود مند کاروبار ہے۔ضلع ساراوان کی طرح ضلع کچھی میں بھی لوگوں کے یہی پیشے ہیں۔جو باقی اضلاع میں رائج ہیں۔ضلع بولان میں مقامی آبادی کا پیشہ زراعت ہے اور غیر مقامی ریلوے میں یا فوجی ہیں۔ضلع جھالاوان میں آبادی پیشوں کے لحاظ سے چار طبقوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔زمیندار، کاشت کار، گلہ بان اور دست کار، بیش تر آبادی زراعت بمعہ گلہ بانی میں مشغول ہے۔دیگر کسان اپنی زمینیں خود کاشت کرتے ہیں۔باقی اپنی آمدنی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے بڑھاتے ہیں۔بڑے بڑے گلہ بان قبائل سینگل، سمالاڑی، محمد حسنی ہیں۔دست کار زیادہ تر لوہڑیوں سے ماخوذ ہیں، جو سوراب، گدر، زہری، خضدار، نال، وڈ اور دیگر اہم جگہوں میں پائے جاتے ہیں۔ان کے بڑے پیشے لوہار، ترکھان گویا اور موسیقار کے ہیں۔

> " بَلوچستان کے لوگ عموماً مویشی پالنے کے پیشے سے مُنسلک ہیں لیکن جہاں
> ان کی زرعی اراضیات ہیں۔وہاں یہ کاشت کاری کا کام بھی کرتے ہیں۔ساحلی
> علاقوں کے لوگ ماہی گیری کا کام کرتے ہیں اور یہ ان کے معاش کا واحد

ذریعہ ہے۔ ان کے علاوہ یہاں کے بعض لوگ، تجارت اور بعض ٹرانسپورٹ
کے پیشے سے بھی منسلک ہیں۔"(64)

ضلع لَس بیلا میں انگریزوں کی آمد سے پہلے یعنی زمانۂ قدیم میں لوگ لوٹ مار پر گزارہ کرتے تھے۔ چند کا انحصار اپنے ریوڑوں پر تھا لیکن اب کاشت کاری اکثریت کا پیشہ ہے۔ زراعت کے بعد گلہ بانی بلوچ قبائل کا بڑا ذریعہ معاش ہے۔ مچھلی پکڑنے اور سکھانے کا کاروبار ساحل کے ساتھ ساتھ ایک صنعت ہے۔ بڑی منڈیاں اور پہاڑی اور سونمیانی ہیں۔ پیش کی چٹائیوں اور رسوں کی صنعتیں سونمیانی، اتھل اور ماڑہ، لیوی علاقوں اور کنراچ میں خوب زوروں پر ہیں۔ بلوچ قبائل ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ کودیوں کا ایک پارہ چکن چکن کپڑا بناتا ہے۔ جو عورتوں کے لباس میں کام آتا ہے۔ شہ لیاری نیابت میں انگاریہ مستورات کی بنائی ہوئی دریاں سندھ کو برآمد کی جاتی ہیں۔ ضلع بستی کی آبادی پیشوں کے لحاظ سے چھ حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہے۔ زمیندار، کاشت کار، گلہ بان، تاجر، مزدور اور کاریگر زمیندار کثیر التعداد ہیں اور دوسرے طبقے انہی سے ماخوذ ہیں۔ ان میں ضلع کے بڑے بڑے قبائل شامل ہیں۔

"ضلع کی آبادی کو پیشوں کے لحاظ سے چھ طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی زمیندار، مزارع، گڈریے جن کا تعلق بھیڑ بکری چرانے سے ہے۔ تجارت پیشہ لوگ مزدوری کرنے والے اور کاریگر زمینداروں کی تعداد خاصی ہے۔ یہ لوگ زمینداری کے علاوہ اور بھی پیشے اپنا لیتے ہیں۔ مثلاً کوئلے کا کاروبار، زمینداری میں کاکڑ۔"(65)

ان میں اکثر اپنی زمینیں خود کاشت کرتے ہیں۔ میدانوں میں جاٹ اور براہوئی زارعت کے پیشے سے منسلک ہیں۔ گلہ بانی بھی کرتے ہیں۔ مزدور زیادہ تر جاٹوں، کاکڑوں، گولوں اور براہوی خانہ بدوشوں میں ملتے ہیں۔ مقامی کاریگر لوہار، ترکھان، جولاہا، چمار، نوناری یا نمک ساز ہیں جو سب کے سب جاٹ ہیں۔ ضلع چاغی میں بھی کنبہ کے سربراہ کا پیشہ ہی سب کا پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح وہاں آبادی کے لحاظ سے پیشے پانچ طبقوں میں بٹ گئے۔ زمیندار، کاشت کار، گلہ بان، تاجر اور کاریگر، گلہ بان اور ان سے وابستہ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان میں اکثر شتربان ہیں۔ اکثر قبائل اپنی زمینیں خود کاشت کرتے ہیں۔ شوراک اور نوشکی کے درمیان گندم، اُون اور گھی کی تجارت کرتے ہیں۔ کاریگر زیادہ تر سرمستانی لوہڑی (کم ذات یعنی میراثی) ہیں۔ جو نوشکی تحصیل میں بطور لوہار، ترکھان، گلوکار اور موسیقار کام کرتے ہیں۔

"پیشہ ور لوگوں کو یہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ محنت مزدوری تو غریب قبائل ہی کرتے ہیں۔ اکثریت خانہ بدوشوں کی ہوتی ہے۔ پیشہ ور لوگ تو وہی ہیں۔ جن کے گھرانوں میں آباؤ اجداد سے یہ کام ہوتا آیا ہے۔ جیسے بڑھئی، لوہار، جولاہے اور موچی وغیرہ مگر ان کی تعداد خاصی کم ہے۔"(66)

تجارت یہاں کا ایک اہم پیشہ ہے۔ مثلاً فروٹ، کوئلہ، ینگ سیز، گیس (سوئی)، عمارتی پتھر وغیرہ ہیں۔ جو دوسرے صوبوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ بَلوچستان کا سب سے بڑا معاش سمگلنگ کا سامان ہے۔ بڑی بڑی باڑہ مارکیٹیں ہیں۔ جہاں درجنوں دُکانیں ہیں۔ جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مصروف ہیں۔ اب تو اسی مال کی بدولت سبھی بڑے شہروں میں باڑہ مارکیٹیں ہیں۔ جنھیں یہی لوگ آگے بڑھانے میں سب سے اوّل ہیں۔ سَفر نامہ "آئینہ بَلوچستان" میں بریگیڈ یئر اسماعیل صدیقی نے بَلوچستان کی ثقافت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"کراچی، کوئٹہ، پشاور، نوشہرہ جیسے معروف شہروں میں باڑہ مارکیٹوں کا اتنے بڑے پیمانے پر وجود انہی کا مرہونِ منت ہے۔"(67)

عورتیں زراعت میں مدد کرنے کے علاوہ فارغ وقت میں نمدنے، اُونی کوٹیاں، سادہ دریاں اور خاکی ظروف بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ بَلوچستان کی عورتیں کشیدہ کاری کے فن میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ ٹوپیوں پر شیشے کا کام اس نفاست اور عمدگی سے کرتی ہیں کہ کپڑے پر کوئی بھی جگہ ایسی نہیں بچتی جہاں شیشہ نظر نہ آئے۔ اس کے علاوہ شیشوں کا کام مردوں کے کرتوں پر کرتی ہیں۔ گھریلو استعمال کے لیے اُون سے بھی بہت سی چیزیں بناتی ہیں۔ سبّی کڑھائی کا مرکز ہے۔ سبی میں عورتیں کڑھائی کا کام کرتی ہیں۔ اور پھر اس کو بیچتی ہیں۔ سبی میں کام کے اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔ ہر قسم کے کام کرنے والی عورتیں یہاں بآسانی مل جاتی ہیں۔ بَلوچستان کی عورتیں بہت محنتی اور ہُنر مند ہیں۔ اُون سے خیمے اوڑھنے، بچھونے کی چیزیں وغیرہ تیار کرتی ہیں۔ ٹھپے لگا کر دوسوتی اور چار سوتی کپڑا تیار کرتی ہیں۔ بلوچی خواتین گھر کے کاموں سے لے کر دست کاری میں بھی ماہر ہیں۔ بلوچی خواتین نے تن کے کپڑوں کو ایسی جلا بخشی ہے کہ ان کا لباس ان کے لیے پوشش فاخرہ بن گیا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"بلوچی عورت کی سوئی دھاگے کی مدد سے بنائی گئی چیزوں میں حُسن اور تنوع
کا وہ امتزاج ہے جو صدیوں کے بعد بھی اپنی تعریف آپ ہی ہے۔"(68)

کشیدہ کاری ان کا فن ہے۔ عورتیں مَلبوسات کی تیاری سے لے کر تقریباً سبھی کام کرتی ہیں۔ جوتوں اور چپل پر بھی شیشہ کاری عام ہے۔ عورتوں کا کام قابلِ رشک ہے۔ چھوٹے چھوٹے شیشوں کے گرداگرد گھتے ہوئے انداز میں کڑھائی کرکے انھیں جڑ دیا جاتا ہے اور پھر مختلف نوعیت کے نمونوں سے ان شیشوں کو مزین کیا جاتا ہے۔ کشیدہ کاری کی اس صنف کو شیشگی کہتے ہیں۔ بَلوچستان میں یہ کام عورتیں پیشے کے طور پر بھی کرتی ہیں اور گھر گھر کام کے آڈر لے کر کام کرتی ہیں۔ دُکانوں پر یہ چیزیں بِکتی ہیں اور دُکان دار کوڑیوں کے دام خرید کر مہنگی فروخت کرتے ہیں۔ یوں ہمیشہ سے سرمایہ دار غریب و مجبور لوگوں کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عورتیں قالین بانی کا کام بھی کرتی ہیں۔ بلوچی عورت نے یہ کام پیشے کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"آج سے پندرہ بیس برس قبل کوئٹہ شہر میں بلوچی کام کی شاذ ہی کوئی دُکان ہوتی تھی اب یہ نہ صرف جگہ جگہ دُکانیں کھل گئی ہیں بلکہ کئی ادارے بھی کھل گئے ہیں۔ ان جگہوں پر یا تو مقامی عورتیں اپنی بنائی ہوئی چیزیں فروخت کرنے کے لیے چھوڑ جاتی ہیں یا خاص آڈر پر بناتی ہیں۔ دکان دار عام طور پر ان کام کرنے والی عورتوں کو دھاگے اور مزدوری دیتے ہیں۔"(69)

عموماً بَلوچستان میں یہ کام ایک عورت ٹھیکہ لے کر دوسری عورتوں سے کراتی ہے اور پھر انھیں دُکان دار کو بیچ کر مزدوری ان کام کرنے والیوں کو دے دیتی ہے اور خود کمیشن رکھ لیتی ہے۔ گاؤں کی بوڑھیاں بغل میں بگیچیاں لے کر گھر گھر گھومتی ہیں۔ ان کی بگیچیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیوں کہ ان میں ایک سے ایک اعلیٰ نمونے کے قیمتی کپڑے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کو دکھا کر آرڈر لیتی ہیں اور فروخت کرتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے فن کو گھر گھر دکھا کر پیسہ کماتی ہیں۔ سمال انڈسٹریز کے ادارے بھی مقامی عورتوں سے محدود نوعیت کا سامان بنواتے ہیں۔ اُنھوں نے اب اپنے کارندے کو لہو، کہان مھوند، ڈیرہ بگٹی، خضدار وغیرہ میں مقرر کر دیئے ہیں۔ جو مقامی بلوچی عورتوں سے کام کراتے ہیں اور عورتوں نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے اور دست کاری کا کام ان مراکز سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ بھیڑ، بکریاں بَلوچستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ صدیوں سے یہاں کے لوگوں کا اگر کوئی مستقبل اور کار آمد پیشہ رہا ہے تو

وہ گلہ بانی ہے۔بَلوچوں کی زندگی سے اگر یہ بھیڑ بکریاں نکل جائیں تو ان کی زندگی قطعی معطل ہو کر رہ جائے گی۔اُونٹ بھی یہاں کثرت سے پالے جاتے ہیں۔شہر کے اندر اور باہر اُونٹوں کے لمبے لمبے کاروان آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں، جن کی اپنی رونق ہے۔

بقول ایم زمان کھوکھر:

> ”شہر کے اندر اور باہر اُنٹوں کے لمبے لمبے کاروان نظر آتے ہیں۔یہ کاروان زیارت، لورالائی، نوشاکی اور زاہدان وغیرہ جاتے ہیں۔جب کہ چرواہوں کے قبائل نئی چراگاہوں کی تلاش میں سَفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔یہ مناظر اس علاقے کی صدیوں پرانی پہچان ہیں۔“(70)

گلہ بانی بَلوچستان کا ایک ایسا پیشہ ہے۔جو مستقل طور پر سارا سال چلتا رہتا ہے۔جانور ان کے لیے بہت مفید ہیں۔ان کا دودھ، گوشت استعمال ہوتا ہے۔ان کے بالوں سے اُون بناتے ہیں۔قالین، دریاں بنتی ہیں۔اُون سے عمدہ قسم کے قالین تیار کیے جاتے ہیں۔یہاں کی عورتیں دست کاری میں بہت ماہر ہیں۔ٹھپے لگا کر عام دوسوتی یا چار سوتی کے کپڑے پر چند گھسے پٹے نمونوں پر مشتمل بستر کی چادریں، کرتے یا قمیض مہارت سے بناتی ہیں۔عورتیں کپڑوں کی کشیدہ کاری کرتی ہیں۔کپڑوں پر شیشے کے کام میں بھی خاصی مہارت رکھتی ہیں۔یہاں کی عورتیں مزدوری پر بھی کام کرتی ہیں۔

اسماعیل صدیقی لکھتے ہیں:

> ”صدیوں سے یہاں کے لوگوں کا اگر کوئی مستقل اور کار آمد پیشہ رہا ہے تو وہ گلہ بانی ہے۔یہاں کی چوبیس لاکھ آبادی کے مقابلے میں تقریباً ڈھائی گنا بھیڑ اور بکریاں ہیں۔جن کا اُون انھیں پوشش عطا کرتا ہے۔خیمے کی شکل میں گھر دیتا ہے۔اُوڑھنے، بچھونے کو اُونی کپڑے مہیا کرتا ہے اور بھیڑ بکریوں کا دُودھ پی کر اور گوشت کھا کر جیتے ہیں۔“(71)

ضلع کچھی کے لوگ کھال (سواتھ) سے چوٹ اور پیش سے چٹائیاں بناتے ہیں۔ضلع خاران میں پیشے کے لحاظ سے علاقے کی آبادی مکران طبقہ، خود کاشت زمینداروں، مزارعین، گلہ بانوں اور دست کاروں میں تقسیم ہے۔حکمران طبقے کے لوگ جاگیرات کے مالک ہیں اور کمین مزارعین ان پر کاشت کرتے ہیں۔ضلع مکران کی کل آبادی پانچ پیشوں میں تقسیم ہے: زمیندار، کاشت کار، گلہ بان، بحر نورد اور ماہی گیر اور دست کار،

زمیندار سب سے کم ہیں اور حاکم طبقوں اور اعلیٰ بَلوچوں پر مشتمل ہیں ان میں گچکی، نوشیروانی، میرواڑی، بزنجو، رند، ہوت، رئیس، لنڈی، کٹور، کینا گی زئی اور ملازئی شامل ہیں۔ ان کی زمینیں مزارع یا مزدور کاشت کرتے ہیں۔ حاکم طبقے اپنی زمینوں سے مالکانہ حقوق کے علاوہ مالیہ بھی وصول کرتے ہیں۔ بَلوچستان میں اگر زراعت پیشہ افراد کم ہیں۔ کیوں کہ یہ پس ماندہ اور غریب صوبہ ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یا پھر مزارع رکھے ہوئے ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ جہاں زمین زرخیز ہو وہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ جیسے قلات میں گندم کاشت کی جاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی علاقوں میں زراعت کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ مگر یہ کام اعلیٰ بلوچ کرتے ہیں۔

بقول چارلس میسن:

> "بَلوچستان کی بہترین اور مشہور ترین گندم قلات کے جنوب مشرق میں کپوتو کے خشکاوہ زمینوں پر ہوتی، دو قسم کی گندم کاشت ہوتی ہے۔"(72)

بَلوچستان ویسے تو ایک پس ماندہ علاقہ ہے۔ مگر پاکستان کا یہی خطہ ایسا ہے، جہاں سمگلنگ کو لوگوں نے ذریعہ معاش بنایا ہوا ہے اور سمگلنگ کا سامان مارکیٹوں میں بکتا ہے۔ کوئٹے کی باڑہ مارکیٹیں ایسے سامان کی آماجگاہ ہیں۔ تجارت کا یہ طریقہ نہ صرف رائج ہے بلکہ پھل پھول رہا ہے۔ لوگوں کی ذہنی پس ماندگی کو دیکھتے ہوئے اپنے ملک کے اندر تیار کردہ مصنوعات کو بھی سمگل شدہ اشیا کا لیبل لگا کے فروخت کیا جاتا ہے۔ کوئٹہ شہر میں تو ان باڑہ مارکیٹوں کا جال بچھا ہوا ہے اور اب تجارت کا یہ طریقہ پورے ملک کے ہر بڑے شہر میں رائج ہو چکا ہے۔ ملک کے ہر بڑے شہر میں باڑہ مارکیٹیں موجود ہیں۔ جہاں لوگوں کو خرید و فروخت کے دوران اچھی اور مناسب قیمت پر اشیا مل جاتی ہیں اور جب نیا مال آتا ہے تو مارکیٹوں میں قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کا کھیل چلتا ہے اور یوں کمیشن پر چیزیں بیچی جاتی ہیں۔

اسماعیل صدیقی رقم طراز ہیں:

> "سب کی آنکھیں اور دُکان اس کی آمد پر لگے ہوتے ہیں کہ کیا مال آیا ہے اور پھر اس کی آمد سے مارکیٹ میں قیمتوں کا اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ بیش تر دُکانوں پر مختلف ملکوں کا سامان ہوتا ہے۔ وہ اپنی کمیشن پر اسے بیچ رہے ہوتے ہیں۔ کہاں تک سنیں گے، کہاں تک سناؤں۔ بس اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اب یہی ان کی سب سے بڑی ٹریڈ ہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا کاروبار

ہے۔یہی ذریعہ معاش ہے۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مصروف ہیں۔"(73)

پیشوں سے بَلوچستان کے لوگوں کی ذہنیت، ان کا طرزِ زندگی، ان کی ثقافت کُھل کر عَیاں ہوگئی ہے کہ وہاں کے لوگ کس طرح اور کن رسوم ورواج کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

viii. معدنیات:

بَلوچستان سے نکلنے والی گیس، معدنیات بھی ان کا ذریعہ معاش ہیں۔ بَلوچستان کا علاقہ "مچ" جو کہ مچھ کہلاتا ہے۔ کوئلے کے ذخائر سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں کا کوئلہ بہترین قسم کا ہے۔ اس کے علاوہ بہترین سنگِ مر مَر، سونا چاندی، سیسہ، تانبے کے ذخائر ہیں۔ جن کی آمدنی سے وہاں کے بڑے بڑے سردار، زمیندار اور نواب مستفید ہو رہے ہیں اور یہ تجارات ان کے آمدن میں اضافے کا باعث ہے۔

"بَلوچستان کے پہاڑوں میں تہ بہ تہ چونے کے پتھر ہیں۔ یہاں خالص گرینائیٹ کی چوٹیاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ سیسہ بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سُرمہ بھی انہی پہاڑوں میں پایا جاتا ہے۔ گندھک بھی پائی جاتی ہے۔ نفیس چینی، مٹی قلات اور منگوچر کی پست پہاڑیوں میں ملتی ہے۔ کوئلہ درہ بولان میں بھی ملتا ہے۔"(74)

میلوں پھیلا ہوا بَلوچستان کا علاقہ اپنے دامن میں کئی تاریخی واقعات لیے ہوئے ہے۔ یہ سرزمین تیل اور گیس سے مالا مال ہے۔ دُنیا کی قدیم تہذیبوں کے آثار بَلوچستان میں پائے جاتے ہیں۔ بَلوچستان، افغانستان اور ایران سے آنے والے تجارتی قافلوں کی گزر گاہ ہے۔ بَلوچستان کا بیش تر علاقہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ قدیم انسان کا مسکن پہاڑوں کے دامن میں رہا ہے۔ بعد میں انسان نے پہاڑوں کو کاٹ کر سرنگیں بنالیں۔ درہ بولان میں ٹرین کے ذریعے سَفر کریں تو درہ بولان میں 19 چھوٹی بڑی سرنگیں آتی ہیں۔ صوبہ بَلوچستان کا علاقہ "مچ" کوئلے کی کانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان کانوں میں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ وہاں کے لوگوں کا روزگار ہے۔ یہاں قدرتی گیس کے ذخائر 1952 میں دریافت ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ہر قسم کے معدنی ذخائر موجود ہیں۔ معدنی لحاظ سے قدرت نے بَلوچستان کو مالا مال کر رکھا ہے۔ یہاں ہر قسم کی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ بَلوچستان پاکستان کا ایک ایسا صوبہ ہے جس کو قدرت نے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔

میر نصیر خان احمد زئی لکھتے ہیں:

> ”یہاں تقریباً ہر قسم کے معدنی ذخائر موجود ہیں۔ علاوہ قدرتی گیس کے جو 1952ء میں دریافت ہوئی۔ دیگر معدنی ذخائر جو اب تک دریافت ہوئے ہیں ، یہ ہیں: بیرائیٹ، کرومائیٹ، سلیکا، جپسم، سنگِ مرمر، مینگنیسائیٹ، لائم اسٹون، سُرمہ گندھک، مینگنیز، ، ائیز بسٹاس، لوہا، سکہ، فلورائیڈ، گریفائیٹ، پٹرول اور تانبہ۔“(75)

بَلوچستان کا اکثر حصہ پہاڑی یا صحرائی ہے۔ بَلوچستان میں کوئٹہ کرومائیٹ (کچا لوہا)، گندھک، استباس، سرمہ اور سیسہ وافر مقدر میں پایا جاتا ہے۔ درہ بولان، شاہرگ اور ڈگاری (دشتِ سارا وان) کی کانوں سے کئی ہزار ٹن کوئلہ ماہوار نکلتا ہے۔ سندھ، بہاول پور اور پنجاب کو بڑی مقدار میں کوئلہ بھیجا جاتا ہے۔ کرومائیٹ تحصیل ہندو باغ، ضلع ژوب اور ضلع چاغی میں وافر مقدر میں نکالا جاتا ہے۔ جو بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔

بقول ملک صالح محمد خاں لہڑی:

> ”تحصیلِ ہندو باغ، ضلع ژوب سے سالانہ 20 ہزار ٹن کرومائیٹ (کچا لوہا) نکالا جاتا ہے۔ جو بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ نیز دالبندین اور ضلع چاغی میں بھی پایا جاتا ہے۔“(76)

بَلوچستان کی سرزمین معدنیات کا خزانہ ہے۔ اللہ پاک نے ان پہاڑوں کو نعمتوں سے نوازا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے معدنی ذخائر سے بَلوچستان کو مالا مال کر رکھا ہے مگر یہ علاقہ پس ماندہ ہے کیوں کہ ان علاقوں کو حکومت کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ اگر حکومت اس طرف توجہ دے اور بَلوچستان میں موجود معدنیات کو نکالنے کا کام کریں تو اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت بَلوچستان کی ترقی کی طرف توجہ دے تو بَلوچستان جو کہ معدنیات کا خزانہ ہے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، جو ملک کی ترقی میں معاون ثابت ہوگا۔ بَلوچستان میں اعلیٰ قسم کی معدنیات جیسا کہ ضلع چاغی میں اعلیٰ قسم کا سنگِ مرمر پایا جاتا ہے۔ اسی طرح تیزابی نمک (فاسفیٹ) ضلع ژوب میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ قلات میں گریفائیٹ کے ذخائر ہیں۔ چونے کا پتھر ہر جگہ موجود ہے۔ قدرتی گیس ”سوئی“ کے مقام پر دریافت ہوئی ہے۔ بَلوچستان ”سوئی گیس“ ڈیرہ بگٹی کے مقام سے حاصل کی جارہی ہے۔ یہ وہ سوغات ہے جس نے پورے ملک کی کایا پلٹ دی۔ ”سوئی گیس“ کی دریافت قُدرت کا بیش بہا انمول تحفہ ہے۔

"یہ بگٹی علاقہ میں سوئی کے مقام پر حاصل کی جارہی ہے اور تقریباً پاکستان
کے تمام شہروں تک پائپ کے ذریعے پہنچائی گئی ہے اور گھریلو استعمال کے
علاوہ کارخانوں میں بھی بڑے پیانے پر استعمال کی جاتی ہے۔"(77)

قدرتی گیس کی دریافت سے پورا ملک مستفید ہو رہا ہے۔قدرتی گیس کے علاوہ کرومائیٹ کے ذخائر خضدار اور ضلع چاغی میں بکثرت ہیں۔زنک ضلع ژوب ، چاغی اور لَس بیلا کے اضلاع میں پائی جاتی ہے۔برائیٹ اس کے ذخائر چاغی، خضدار، لَس بیلا میں ہیں۔گریفائیٹ قلات میں بکثرت پایا جاتا ہے۔کوئلہ، مُچھ، آب گم، جوہان، سور بنج، ڈگاری، کھوسٹ، شارگ، دکی، کچھ، سنجدی وغیرہ میں ان گنت کوئلے کے ذخائر موجود ہیں۔معدنیات کے سلسلے میں ماہرین کی رائے ہے کہ:

"ضلع ژوب سویا ہوا دیو ہے۔جسے انگریزی اصطلاح میں (Sleeping
Gaint) کہتے ہیں۔یہ خاصا توجہ طلب مسئلہ ہے۔جہاں تک معدنیات کا
تعلق ہے۔بَلوچستان کے سارے اضلاع اہم ہیں۔"(78)

بَلوچستان کے تمام اضلاع معدنیات سے مالا مال ہیں۔جو معدنیات سامنے آئی ہیں انھیں بروئے کار لانے کے لیے لوگوں کو روزگار میسر آیا ہے۔اگر حکومتی سطح پر ان تمام معدنیات کو زیرِ استعمال لایا جائے تو ہزاروں بے روزگار افراد اس کام سے منسلک ہو جائیں گے۔یوں ملک کی ترقی میں یہ معاون ثابت ہوں گے اور بے روزگار افراد کو روزگار میسر آسکے گا۔

ix. لباس:

کسی بھی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں وہاں کے لوگوں کا لباس بھی اہمیت کا حامل ہے۔لباس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے لوگ کس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا رہن سہن وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے۔وہاں کے لوگ سرد علاقے سے تعلق رکھتے ہیں یا گرم۔گویا لباس بھی کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔بَلوچستان کے تمام اضلاع کے لوگ تقریباً ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔لیکن پھر بھی کچھ علاقوں کے لوگوں کا لباس دوسرے علاقے کے لوگوں سے تھوڑا مختلف ہوتا ہے۔جو ان کی انفرادیت کا سبب بنتا ہے۔مرد اور عورتوں کا لباس اپنی اپنی جگہ مُنفرد ہے۔ہم نے بَلوچستان کے تمام اضلاع کی پوشاک یا پہناوے کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مردانہ لباس:

دُنیا کے تمام لوگ جو لباس زیب تن کرتے ہیں وہ ان کے خطے یا علاقے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ان کی ثقافت کا علم بردار ہوتا ہے۔ چارلس میسن نے ایک انگریز ہونے کے باوجود اپنے سَفر کے دوران تمام چیزوں کا جو بلوچیوں کی ثقافت کا حصہ ہیں، انھیں اپنے سَفر نامے میں جس طریقے سے پیش کیا ہے۔ سَفر نامہ قلات میں اُنھوں نے ضلع قلات کی ثقافت، تہذیب، بودوباش کو من و عن بیان کر کے اس علاقے سے شناسا ہونے میں بھرپور راہ نمائی کی ہے۔ اس نے اگرچہ اس سَفر نامے میں ان ثقافتی عناصر کو مختصر مگر جامع الفاظ میں پیش کیا ہے جو قارئین کی علمی لیاقت میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ بَلوچستان کے مرد ڈھیلا ڈھالا لباس زیبِ تَن کرتے ہیں۔ جو پاؤں تک لمبا ہوتا ہے۔ ان کا یہ بے ڈول لباس ان کی مُنفرد ثقافت کا علم بردار ہے۔ ان کی شلواریں اُوپر سے بے حد کُھلی اور پائینچوں سے تنگ ہوتی ہیں۔ چھینٹ سے بنی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ یہ ٹوپیاں روئی سے بھری جاتی ہیں اور عین سر کے مطابق ہوتی ہیں۔ براہوئی اور لَس بیلا کے لُمری قبیلے کے لوگ جو ٹوپی پہنتے ہیں۔ اس میں چوٹی کے عین وسط چھوٹا سا گچھا یا تکمہ لگا ہوتا ہے۔ شکل سے یہ یورپی ٹوپی جیسی لگتی ہے۔ یہ ٹوپی چہرے پر سایہ نہیں کرتی، لہٰذا یہ گرم آب وہوا کے لیے مفید نہیں ہے۔ کیوں کہ بَلوچستان کے کچھ علاقے گرمیوں میں سخت گرم ہوتے ہیں۔

بقول چارلس میسن:

"ان کی قومی ٹوپی اُونچی اور مدور ہوتی ہے اور چھینٹ یا کمخواب سے بنتی ہے اور سندھ میں بھی مستعمل ہے۔"(79)

لنگی اور پگڑی صرف امیر لوگ پہنتے ہیں۔ ریشم اور کمخواب کی شالیں بھی ہیں۔ بَلوچوں کے لباس عموماً گندے مندے ہوتے ہیں اور غریب طبقہ تو بہت ہی برے حال میں ہوتا ہے۔ کوئٹہ پشین میں ایک زمیندار ململ کی پگڑی، ٹوپی یعنی کلاہ گھٹنوں تک قمیص بھاری بھر کم شلوار، چرواہے اُونی ٹوپی جس کے گرد سستی سی پگڑی لپیٹ لیتے ہیں۔ ان کی پوشاک معمولی ہوتی ہے۔ خوش حال لوگ زردوزی کے کوٹ، ٹوپیاں اور لمبی قمیض اور شلواریں پہنتے ہیں۔ پشاوری چپلیں اور نقلی پٹو کی چادریں اور کبھی کبھی اُونی کابلی چادریں بھی۔ کوئٹہ چوں کہ باقی اضلاع میں ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کے مرد عموماً پگڑی یا ٹوپی ضرور پہنتے ہیں۔ بلوچی شیشیے کا کام اور کڑھائی، ایرانی واسکٹیں، ٹوپیاں بلوچیوں کی پہچان ہیں۔ ضلع ژوب میں اکثر لوگوں کا لباس سادہ اور موٹے کپڑے کا ہوتا ہے۔ ایک عام قبائلی ایک پگڑی ایک (بھاری بھر کم شلوار) جوتے (کپٹی) یا سینڈل (سپلئی) پہنتا

ہے۔سنائیہ کا کڑ جابی (بھاری بھر کم شلوار) کی بجائے قمیض پہنتے ہیں اور پگڑی کے نیچے کلہ یا مخروطی ٹوپی بھی۔ سنزر خیل عام طور پر اپنی پگڑی کا ایک سرا گردن کے گرد لپیٹ لیتا ہے۔ سنزرخیلوں میں بڑی شلواریں نشانِ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ اکثر قبائلی سفید پگڑی پہنتے ہیں لیکن شیرانی مندو خیل اور علیزئی سنزر خیل سیاہ استعمال کرتے ہیں۔ ضلع ساراوان میں بھی یہی لباس پہنا جاتا ہے۔ ضلع سبی کچھی کے بلوچ تک لمبا پاجامہ، شلوار ، ایک لمبی چادر، سوتی پگڑی اور انگوٹھے کی طرف تنگ جوتے یا گھاس کے سینڈل پہنتا ہے۔ وہ صرف سفید کپڑے پہنتا ہے۔ ضلع بولان میں بھی سفید لباس پہنا جاتا ہے۔ مرد کا لباس سوتی کپڑے (ستین) سے بنی ہوئی پشک یا قمیض جو گھٹنوں تک ہوتی ہے۔ بھاری بھر کم شلوار اور چادر پر مشتمل ہوتا ہے۔ سردی میں قندھاری پوستین بڑھالیتے ہیں۔ امیر لوگ تقریباً 9 گز ململ کی پگڑی پہنتے ہیں۔ کچھ لوگ انگریزی جوتے پہنتے ہیں۔ کشیدہ کی ہوئی واسکٹیں اور کوٹ بھی مقبول ہیں۔

بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی نے سَفر نامہ ”آئینہ بَلوچستان“ میں بلوچیوں کے لباس کو بہت مُنفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ جس سے وہاں کے لوگوں کی ثقافت عیاں ہوئی ہے۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

> ”حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا بھی وقت تھا جب بلوچی مرد کی شلوار قابلِ رشک رہی ہو نا قابلِ برداشت ضرور رہی ہوگی کیوں کہ اس میں 40،30 گز کپڑے کی کھپت ہوتی تھی۔ دس پندرہ گز کپڑے سے وہ کاسہ سر لپیٹتے تھے اور تقریباً اتنے ہی کپڑے میں ان کا چھولداری کرتہ بنتا تھا۔“[80]

ضلع جھالاوان میں مرد ایک کھلا بالائی لباس یا فراک پہنتے ہیں، جسے کُوس کہتے ہیں۔ جو پاؤں تک لمبا ہوتا ہے۔ ان کی شلواریں تہہ پر تنگ ہوتی ہیں۔ چھینٹ کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ چرواہے نمدے کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ امیر لوگ اچھی پگڑیاں، کشیدہ کوٹ اور انگریزی ساخت کے سوتی کپڑے پہنتے ہیں، جنھیں وہ سامان یا کتابی کہتے ہیں۔ لَس بیلا کے متوسط طبقے کے لوگ ایک کھلے پیرہن، نیلی سوتی شلوار، ایک سوتی پگڑی، ایک سرخ یا نیلی سوتی چادر، ایک سوتی صدری اور دیسی چُرمے، جوتے یا سینڈل پہنتے ہیں۔ چرواہے کا لباس شلوار، چادر، پگڑی اور چھل (چپل) پر مشتمل ہوتا ہے۔ کپڑوں پر اور ضروریات استعمال کی چیزوں پر کشیدہ کاری بھی ہوتی ہے۔

بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

" شیشے کا کام نہ صرف کرتوں پر ہوتا ہے۔ بلکہ مرد اپنے شلوکوں پر کرواتے ہیں اور انھیں بڑے شوق سے پہنتے ہیں۔ اپنی ٹوپیوں پر کرواتے ہیں۔ گھوڑا گاڑی کی نشستوں پر ہوتا ہے۔ سائیکل کی گدی پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ لوگ اپنے جوتے بھی شیشے سے مزین کرتے ہیں۔ جہاں تک ٹوپی پر شیشے کے کام کا تعلق ہے۔ وہ دھاگے سے بھی کیا جاتا ہے اور سنہرے تاروں سے بھی۔ "(81)

ضلع لورالائی میں مردانہ لباس ایک سرخ ٹوپی یا پگڑی، قمیض شلوار (جس کا نچلا حصہ لازماً سرخ ہوتا ہے) چادر اور کبھی کبھی قمیض کے اُوپر انگرکھا بھی پہنا جاتا ہے۔

ضلع سبی میں ایک بلوچ ٹخنوں تک لمبا پاجاما، سُتھن یا شلوار، ایک چادر، ایک پگڑی اور جوتے (انگوٹھے کی طرف تنگ) یا چمڑے یا گھاس کے سینڈل پہنتے ہیں۔ ضلع چاغی خانہ بدوش اور غریب طبقے کے لوگوں کا لباس ایک سوتی قمیض (کُوس) ایک سوتی شلوار (سفید یا نیلی) اور ایک اُونی ٹوپی ہے۔ سردی میں نمدے کے جوتے پہنتے ہیں۔ جنھیں سُر کہتے ہیں۔ ضلع خاران اور ضلع مکران کا لباس تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اُونچے طبقے سفید لٹھا (کتابی) استعمال کرتے ہیں اور ململ کی پگڑیاں پہنتے ہیں۔ خارانی واسکٹ کے بھی شوقین ہیں۔

عورت کا لباس:

پشین میں عورتیں ہمیشہ لمبی قمیض اور ڈھیلی ڈھالی شلوار پہنتی ہیں۔ ضلع ژوب میں شادی کے قابل لڑکی کا لباس عموماً دو رنگوں کا ہوتا ہے۔ مسلم باغ میں کنواری لڑکیاں ماتھے پر ایک اُون بھری سرخ پٹی (زیکان) پہنتی ہیں۔ امیر طبقوں میں لباس بہت بہتر ہوتا ہے۔ ضلع ساراوان کی عورتیں بھی یہی لباس پہنتی ہیں۔ ضلع کچھی میں عورتیں اپنے سر پر سرخ یا سفید سوتی چادر اُوڑھتی ہیں اور گھٹنوں تک چولا پہنتی ہیں، جو آگے سے بہت خوب صورت کشیدہ ہوتی ہے۔ زیوارات وہی جو عموماً بلوچ عورتیں پہنتی ہیں۔ ضلع بولان میں غریب عورتیں کپڑوں کے لیے سُوت یا چھینٹ استعمال کرتی ہیں جو سستا کپڑا ہے۔ امیر لوگوں کی عورتیں بہت کپڑا استعمال کرتی ہیں۔ زنانہ لباس ایک سوتی چادر یا سَری۔ ٹخنوں سے ذرا اُوپر شلوار پر مشتمل ہوتا ہے۔ جوتے صرف امیر گھرانوں کی عورتیں پہنتی ہیں۔ غریب گھرانوں کی عورتیں نہایت غربت اور کسمپرسی کی زندگی جی رہی ہیں یہاں تک کہ وہ جوتے تک نہیں پہنتیں کیوں کہ یہ ضرورت ان کی استطاعت سے

بڑھ کر ہے۔اب تو کافی حد تک وہاں کے لوگوں میں بھی شعور آتا جارہا ہے ،البتہ دیہات ابھی بھی پس ماندہ ہیں۔

چارلس میسن عورتوں کے لباس سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مستورات بڑے بڑے ڈھیلے ڈھالے چغوں میں ملبوس ہوتی ہیں۔جو ان کے سراپا کو بری طرح ڈھانپ لیتے ہیں۔اور وہ شلوار نہیں پہنتیں ان چغوں پر مختلف رنگوں اور نمونوں کی ریشمی سوز نکاری کی ہوتی ہے۔یہ سجاوٹ سینوں ، گھیروں اور لمبی آستینوں پر کی جاتی ہے۔وسط سے گھیرے تک ایک سجی ہوئی جیب بھی ہوتی ہے۔''(82)

ضلع جھالاان کی عورتوں کا لباس کافی اضلاع کی مستورات سے مختلف ہے۔لباس میں بڑے بڑے چغے جو سر سے پاؤں تک ڈھانپ لیتے ہیں ۔شلوار نہیں پہنتیں ایک بڑی سی چادر جو زمین تک گھسٹتی ہے اور سر کو کالے یا ریشمی فیتے سے باندھتی ہیں ۔زیورات بھی بہت شوق سے پہنتی ہیں۔عورتیں بڑے بڑے چغوں میں ملبوس ہیں۔جو انھیں سر سے پاؤں تک ڈھانپ لیتے ہیں۔وہ شلوار نہیں پہنتیں کپڑے خوب صورت رنگوں اور کشیدہ کاری سے مزین ہوتے ہیں۔اور ایک بڑی سی چادر اوڑھتی ہیں۔جو زمین تک گھسٹتی نظر آتی ہیں اور سر کو کالے یا ریشمی فیتے سے باندھتی ہیں۔زیورات بھی شوق سے پہنتی ہیں۔ ضلع لورالائی میں بلوچی عورتیں گھٹنوں تک لمبا چولا (قمیض) پہنتی ہیں۔لَس بیلا کی عورتوں کا لباس بھی باقی عورتوں سے قدرے مختلف ہے۔ان کے لباس خوب صورت کشیدہ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ضلع خاران اور ضلع مکران کا لباس بھی تقریباً ایک جیسا ہے۔اعلیٰ طبقے کی خواتین چوڑی دار پاجامے بھی پہنتی ہیں۔سر کو سلکی رومال (گشان) سے باندھتی ہیں۔غریب طبقوں کے طور طریقے باقی اضلاع جیسے ہی ہیں۔بال بھی باقی تمام اضلاع کی عورتوں کی طرح مانگ نکال کر دو حصوں میں تقسیم کر کے پیشانی سے گردن کے منکے تک لے کر جاتی ہیں۔پھر بالوں کو لٹوں کی صورت میں چوٹی پر اکٹھا کر لیتی ہیں یا سر کی طرف اور بعد میں دو پٹیوں کی صورت میں چوٹی پر اکٹھا کر لیتی ہیں یا سر کی طرف اور بعد میں دو پٹیوں میں بُن کر پشت پر ملا دیتی ہیں۔زیادہ بال حُسن و جمال کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

بَلوچستان کی خواتین کشیدہ کاری کے فن میں مہارت رکھتی ہیں۔ اسماعیل صدیقی نے ان کے لباس میں رنگوں کی ترتیب کے فن کو بہت سراہا ہے۔ ان کا فن بذاتِ خود ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ بلوچی کشیدہ کاری کے فن کو ''دوچ گھر'' کہا جاتا ہے اور بلوچی عورتیں یہ کام کرتی ہیں انھیں دُوچ گھر کہتے ہیں۔

بلوچی عورتیں لمبا چُغا پہنتی ہیں جن کی آستینیں کُشیدہ ہوتی ہیں۔ قمیض مرد اور عورت دونوں پہنتے ہیں۔ ان پر شیشے کا کام انتہائی خوب صورت اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔ خواتین چھوٹے چھوٹے شیشیوں کے گرد انھیں کڑھائی کر کے جڑ دیتی ہیں۔ بلوچی افراد کی شلواریں بھی خاصی بڑی ہوتی ہیں۔ دس پندرہ گز کپڑے سے تو وہ سر لپیٹے ہیں۔ تقریباً اتنا ہی کپڑا ان کے چھولداری کُرتے میں لگتا ہو گا۔ جب مرد کے لباس کا یہ حال ہے تو یقیناً عورتوں کا تو اس سے بھی زیادہ کپڑا لگتا ہو گا۔ مگر اپنے لباس کو خواتین نے ایسا خوب صورت بنا لیا ہے کہ اس کی فن کاری ان کی ہُنر مندی ان کے لباس سے جھلکتی ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

> ''ان خواتین نے اپنے تن کے کپڑوں کو ایسی جلا بخشی کہ ان کا لباس ان کے لیے پوشش فاخرہ بن گیا اور دیکھنے والوں کے لیے قابلِ رشک جب کہ وہ تھانوں کپڑا لپیٹنے والے بے پیرہن ہو گئے۔''(83)

بلوچی عورت کی سوئی دھاگے کی مدد سے بنائی گئی چیزوں سے حُسن اور تنوع کا وہ امتزاج ٹپکتا ہے جو صدیوں کے بعد بھی اپنی تعریف آپ ہے۔

بلوچی پشک جسے مرد اور عورت دونوں پہنتے ہیں۔ مردوں کے پشک عموماً سادہ اور سفید دھاگوں سے بنائی جاتی ہے جب کہ زنانہ پوشاک دھاگوں کے خوش نما امتزاج کا حسین نمونہ ہے۔ جو گریبان اور سینے پر ہوتا ہے۔ اسے بلوچی زبان میں ژی جیگ کہتے ہیں۔ بلوچی عورتوں کا کمال کشیدہ کاری ہے۔ رنگوں کا انتخاب ایسا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ان جیسی پس ماندہ عورتوں میں ایسا (Colour Sence) کڑھائی اور کشیدہ کاری میں آئینوں کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑے کڑھائی کر کے جڑ دیتے ہیں۔ کشیدہ کاری کی اس صنف کو شیشگی کہتے ہیں۔

شیشوں کے کاموں کا یہاں بہت رواج ہے۔ مرد اور عورت دونوں کے کپڑے شیشوں سے مزین ہوتے ہیں۔ مرد نہ صرف اپنے کرتوں بل کہ اپنے شلوکوں پر بھی شوق سے کرا کر پہنتے ہیں۔

صرف یہی نہیں بل کہ ٹوپیوں ،جوتیوں ، گدھا ،گھوڑا گاڑی اور سائیکلوں کی گدی پر بھی سجاوٹ کراتے ہیں۔ شیشوں کا کام بلوچیوں کی پہچان کا ضامن ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

> ”جوتے یا چپل پر شیشے کاری اب اتنی عام نہیں رہی مگر جہاں کہیں ہے وہاں کے لوگ ان شیشے والے جوتوں سے فلٹریشن میں مدد لیتے ہیں۔ جسے شیشہ مارا ما کہتے ہیں۔“(84)

X. بلوچیوں کی عادات و اطوار :

کسی بھی علاقے کی ثقافت کو پوری طرح جانچنے کے لیے وہاں کے لوگوں کی طرف زندگی کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ان کے رہنے سہنے، ملنے جلنے کے طریقے انوکھی رسومات اور ایسے رواج جو انھیں دوسرے علاقے کے رہنے والوں سے مُنفرد بناتے ہیں۔ وہاں کی ثقافت کہلاتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی قوم کی ثقافت کو جاننے کے لیے وہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی سمجھنا ضروری ہے۔لوگوں کا آپسی میل ملاپ بہت معنی رکھتا ہے۔ مہمان نوازی سے ان کی عادات کا پتہ چلتاہے۔ زبان کیاہے؟شادی و مرگ کے طور طریقے، رسم ورواج کیاہیں؟ کھیل، تفریحات، تہوارات کیاہیں؟ اور انھیں وہ کس طرح مناتے ہیں؟ علاج معالجے کے مختلف طور طریقے یہ سب کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں معاون کردار ادا کرتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے ایک خطے کی ثقافت کو ہم دوسرے خطے سے الگ کرسکتے ہیں۔ مہمان داری کا یہ ایک ایسا عمل ہے۔ جس کو مسلمان نبی پاک ﷺ کی سُنت سمجھ کر ادا کرتے ہیں اور گاؤں دیہات میں لوگوں کے مہمان نوازی کے طور طریقے مختلف ہیں۔

مہمان نوازی:

بلوچستان ایک پس ماندہ صوبہ ہے اور اس کے تمام اضلاع میں بسنے والے لوگوں اور ان کے طور طریقے ایک جیسے ہونے کے باجود کچھ نہ کچھ تضاد نظر آتا ہے۔ جس کو ہم نے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس صوبے میں بسنے والے کس طرح مہمان کی خاطر داری کرتے ہیں۔

یوں تو بلوچ مہمان نوازی میں بہت آگے ہیں۔ مگر پشین اور ژوب کے بلوچ مہمان نوازی میں اتنے فراخ دل نہیں ہیں۔ حیثیت والوں اور قریبی رشتہ داروں کی تواضع گوشت روٹی اور پلاؤ سے کرتے ہیں۔ لیکن

غریب رشتہ داروں کے لیے اتنی پرواہ نہیں کرتے۔ تقریباََ بلوچستان کے ہر ضلع ہر علاقے میں اجنبی مساجد میں ٹھہرتے ہیں۔ نماز پر ملنے والے دیہاتی کھانا بھیج دیتے ہیں۔ یا یہ کام سرداروں اور صاحب حیثیت لوگوں کے ذمے ہوتا ہے۔ بڑی بڑی ذاتوں والے قبائل جیسے اچکزئی، سادات کرنی، براہوی مہمان نوازی کو اپنا فرض سمجھ کر مہمانوں کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔

بقول ایم عثمان حسن :

"جہاں تک مہمان نوازی کا تعلق ہے۔ یہاں بھی اسے فرض کی طرح نبھایا جاتا ہے۔ اکثر بلوچ خاص طور پر رند اور مگسی اپنے علاقوں میں اجتماعی طور پر مہمان خانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ جہاں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کی خاطر مدارت کی جاتی ہے۔"(85)

ضلع بولان کے سرداروں اور پشین سادات اور ترین، جوگیزہ اور اکابرین (یعنی باحیثیت لوگ ہیں) نے اپنے مہمان خانے بنا رکھے ہیں اور ان کی مہمان نوازی سب کے لیے ہے۔ جو اجنبی مسافر چلے جاتے ہیں۔ انھیں وہاں کھانا پہنچایا جاتا ہے اور واقف کاروں کو کھانا اور بستر دیئے جاتے ہیں۔ گوشت اور دہی سے ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ اور باقی خُشک روٹی اور اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی لسّی پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ اجنبیوں کی مہمان داری سرداروں، معتبرین اور خوش حال لوگوں پر فرض ہے۔ ہر گاؤں یا بستی میں کمبلوں کے خیمے مہمانوں کے لیے نصب ہیں۔ مہمانوں کی خاطر داری کی جاتی ہے جب کہ عام اجنبی کی اتنی خاطر نہیں ہوتی۔ بستر، اناج اور مہمان کے جانوروں کے لیے چارہ وافر مقدار میں دیا جاتا ہے۔ بلوچیوں کی ایک عادت ہے کہ وہ مہمان کو کھانا دے کر باہر چلے جاتے ہیں تاکہ وہ آرام سے کھانا کھا سکے۔ سَفر نامہ "اجنبی اپنے دیس میں" سید شوکت علی شاہ نے بلوچیوں کی صفت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ لگتا ہے کہ پورا بَلوچستان ہمارے سامنے موجود ہے۔

سید شوکت علی شاہ۔ رقم طراز ہیں:

" ہر بلوچ صاحبِ استطاعت کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ سالم دُنبہ ذبح کر کر اس کی سجی بنائی جاتی ہے۔ دستور کے مطابق کوئی بلوچ مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا۔"(86)

یہاں کے لوگ رسم ورواج کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ جیتے جی ان سے چھٹکارا ممکن نہیں۔لوگ رسم ورواج نبھانے میں اس قدر آگے ہیں کہ بہت سے صاحبِ حیثیت لوگ قرض جیسی موذی بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں۔لَس بیلا کے لوگ مہمان نوازی میں بہت ہی آگے ہیں۔وہ تو اجنبیوں کا بھی بڑھ چڑھ کر خیال کرتے ہیں۔ ضلع لورالائی اور ضلع سبی کی مہمان نوازی کا یہ عالم ہے کہ وہ مہمان نوازی کو ایک مقدس فریضہ کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ان کے لیے مہمان نوازی مذہب کا حصہ ہے۔قبائلی اپنا دروازہ سب ہی کے لیے حتیٰ کہ دشمن کے لیے بھی کھول کر رکھتے ہیں۔اور ان کی مہمان نوازی سب کے لیے یکساں ہے۔چارلس میسن نے اپنے سَفر نامے " سَفر نامہ قلات " میں بَلوچوں کی مہمان نوازی کی خصوصیت کو بڑی جامعیت سے پیش کیا ہے۔

بقول چارلس میسن:

"مہمان داری دیگر نیم وحشی قبائل کی طرح بَلوچوں کا بھی طرہ امتیاز ہے۔"(87)

ضلع چاغی اور ضلع مکران کے لوگوں میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ سرداروں پر قناعت کرتے ہیں۔ ضلع چاغی مہمان داری میں سب سے مختلف ہے۔ان علاقوں میں مہان داری سردار یا صاحب حیثیت لوگ ہی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ بَلوچستان کے لوگوں میں بڑی خوبی پائی جاتی ہے۔اگر مہمان زیادہ ہوں تو پھر ان کے کھانے پینے کا انتظام سب گاؤں والے مل کر کرتے ہیں تا کہ کسی ایک پر بوجھ نہ پڑے۔

بقول سید شوکت علی شاہ:

"اگر مہمان زیادہ ہوں تو ان کے خورد و نوش کا بار تمام گاؤں والے مل کر برداشت کرتے ہیں۔"(88)

ضلع مکران کے لوگ مہمان داری میں صرف اپنے عزیز و اقارب تک ہی محدود رہتے ہیں۔مکران کا رواج ہے کہ مہمان کو دو کھانے کھلاتے ہیں اور سونے کے لیے بستر چٹائی وغیرہ بھی فراہم کر دیتے ہیں۔

ضلع خاران میں مہمان نوازی اور سخاوت کا مظاہرہ صرف امیر اور دولت مند لوگ ہی کرتے ہیں۔اگر مہمان صاحبِ وسائل ہو تو اسے "پنڈگ" کہتے ہیں۔سیاحوں کے تحائف تمباکو کی شکل میں ہوں تو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔افغان مہمان نوازی میں بَلوچوں سے بہت پیچھے ہیں۔کوئٹہ کے لوگ صاحبِ

حیثیت ہیں۔ مہمان کی خاطر داری بہت اچھے طریقے سے کرتے ہیں۔اچھا کھانا کھلاتے ہیں۔ مہمان کو سبز چائے لازمی پلاتے ہیں۔

ایم زمان کھو کھر لکھتے ہیں:

”کوئٹہ کے لوگ بڑے مہمان نواز اور خوش اخلاق ہیں۔ مہمان کو سبز چائے پلائے بغیر نہیں بھیجتے۔اکثر میز بان محبت کے اظہار کے لیے چائے میں ڈھیر ساری چینی ملا دیتے ہیں۔“(89)

چارلس میسن نے بلوچیوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ضلع قلات کے لوگ مہمان نوازی کو مقدس سمجھتے ہیں۔اس کی جان و مال سے بڑھ کر معتبر کوئی اور چیز نہیں۔ اگر ایک مسافر کو آتا دیکھیں تو خیموں میں رہنے والے فوراً اپنے خیموں کے باہر نمدے اور دریاں بچھا لیتے ہیں تا کہ وہ اس پر آرام کر سکے۔ مسافر کو مالش کے لیے تیل دیا جاتا ہے کہ اگر سَفر کی تھکاوٹ ہو تو مسافر اپنے تیل مل سکتا ہے۔جب وہ مسافر اپنا رختِ سَفر باندھتا ہے۔تو اس کا میزبان بندوق لے کر اس کو واپس چھوڑ نے کے لیے جاتا ہے کچھ مغربی قبائل تو مہمانوں کے احترام میں اسے بچانے کے لیے اپنے عزیز و اقارب سے بھی لڑ جاتے ہیں۔ یہ لوگ مہمان پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

بقول چارلس میسن:

”کچھ مغربی قبائل بالخصوص ماماسینی مہان کا احترام تو کرتے ہیں اور اسے بچانے کے لیے اپنے عزیز و اقارب سے لڑ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ ان کے علاقے سے نکل جاتے ہیں۔ تو عرب بدوؤں کی طرح اس پر حملہ کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔“(90)

بلوچ قبائل مہمان نوازی میں بہت اچھے ہیں۔ غریب سے غریب انسان بھی مہمان داری کرنے سے بخل نہیں کرتا جو کچھ ہو مہمان کی تواضع کے لیے صرف کر دیتے ہیں۔ بلوچی مہما ن کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں اور اس کی مہمان داری کو فریضہ دینی سمجھ کر نبھاتے ہیں۔

وعدے کی پابندی:

بلوچ قوم وعدہ کے پابند ہیں جو وعدہ کر لیں اسے پورہ کرنے کے لیے جان تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ سید شوکت علی شاہ نے اپنے سَفر نامے ”اجنبی اپنے دیس میں“ بلوچوں کی اس خوبی کو اُجاگر کیا ہے کہ

وہ زبان کے پکے اور وعدے کے پابند ہیں۔ بلوچ تاریخ گواہ ہے کہ بلوچ سرداروں نے جو عہد کیے تھے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے اُنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں مگر وہ ثابت قدم رہے۔ مگر اُنھوں نے ہر صورت میں اپنے عہد کی پاسداری کو اولیت دی۔ جیسے میر جاڑو نے عہد کیا تھا کہ اگر کسی نے اس کی داڑھی کو ہاتھ لگایا تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ اسی طرح سردار میران نے عہد کیا تھا کہ وہ جس بلوچ کے سر پر پانی کا مشکیزہ دیکھے گا۔ اس کو ایک کنیز عطا کرے گا۔ اسی طرح کے ان گنت قصے ہیں جو بَلوچستان کی سرزمین کا خاصہ ہیں۔ اگرچہ ان میں جہالت کا رنگ ملتا ہے مگر وہ اپنے اقوال پر پوری طرح قائم رہے۔

بقول سید شوکت علی شاہ:

> "بلوچ تاریخ بتلاتی ہے کہ اُنھوں نے ان اقوال کو پوری طرح نبھایا۔ شاہ مرید اپنی چہیتی محبوبہ حانی تک سے دست کش ہو گیا۔ میر جاڑو نے اپنے بیٹے کو پاس عہد کی خاطر ہلاک کر ڈالا۔"(91)

ہمسائے کے ساتھ حُسن سلوک:

بلوچیوں میں ہمسائے کے ساتھ حُسنِ سلوک کو اولیت دی جاتی ہے اور ہمسائے کے حقوق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی پناہ میں آجائے تو اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بلوچ تاریخ میں دو واقعات ایسے سامنے آئے ہیں جن سے اس رسم کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس رسم کو زندہ رکھنے کے لیے قبائل آپس میں ٹکرا گئے ان تاریخی واقعات نے رزمیہ شاعری کو جنم دیا اور بلوچی شعرا نے اپنی رومانی شاعری سے اس میں دل کش رنگ بھرے بلوچی ایک غیور قوم ہے۔ وہ اپنی رسوم کے معاملے میں بہت پکے ہیں۔

بقول شوکت علی شاہ:

> "بلوچ معاشرے میں ہمسائے کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے اور پناہ میں آئے ہوئے شخص کی حفاظت ایک ایسا فرض ہے جو ہر بلوچ مرتے دم تک ادا کرتا ہے بسا اوقات اس قرض کی تکمیل میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ لیکن رسم زندہ رکھی جاتی ہے۔"(92)

رسم بجار / ایک دوسرے کی مدد کرنے کی رسم:

بلوچ قوم میں بہت سی عادات ایسی ہیں جن میں ان کی اخلاقیات جھلکتی ہیں۔ پورے بَلوچستان میں یہ رسم ہے ہر صوبے میں ایک دوسرے کی مدد کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سَفر نامہ نگاروں نے بَلوچستان کے چپے چپے سے متعارف کرایا ہے اور وہاں کے رسم و رواج، بود و باش اور ثقافت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ بَلوچستان جیسا پس ماندہ علاقہ قاری کے لیے دل چسپی کا موجب بن گیا ہے۔ ایسے ہی سَفر نامہ نگار سید شوکت علی شاہ ہیں جنھوں نے اگرچہ اجمالی انداز اختیار کیا ہے مگر پھر بھی خطہ بَلوچستان کو ہمارے سامنے اس طرح لا کھڑا کیا ہے کہ جیسے چلتا پھرتا بَلوچستان نظروں کے سامنے ہو۔ بَلوچستان کے تمام اضلاع میں بعض مواقع پر چندہ لینے کا رواج ہے۔ جسے ''بجار'' کہتے ہیں۔ مختلف اضلاع میں جیسے کوئٹہ، پشین، ضلع ژوب، ساراوان، لَس بیلہ، خاران، مکران میں بھی شادی کے موقع پر لیا جاتا ہے۔ مکران اور خاران میں شادی اور ختنہ کے موقع پر لیا جاتا ہے۔ شادیوں کے لیے بجار صرف دولھا کے لیے لیا جاتا ہے۔ یہ چندے متعلقہ اشخاص براہ راست خود لیتے ہیں یا کسی قریب ترین عزیز کی معرفت، تمام رشتہ داروں، دوستوں، قبیلہ والوں بلکہ اجنبیوں تک جاتے ہیں۔ اور نقد بھیڑ، مویشی، اسلحہ کی صورت میں عطیات لیتے ہیں۔ نظری طور پر تمام چندے رضا کارانہ ہوتے ہیں۔ بجار یا پھوڑی کے پس پردہ جو بنیادی جذبہ کار فرما ہوتا ہے، وہ امداد باہمی کا ہے۔

اس ضمن میں شوکت علی شاہ لکھتے ہیں:

> ''اگر کوئی غریب بلوچ شادی کرنا چاہتا ہے اور مروجہ لب یا زر ولور دُلھن کے والدین کو ادا نہیں کر سکتا یا اسے کوئی اور آفت یا ناگہانی آگھیرتی ہے تو وہ خود یا اس کے عزیز و اقارب قبیلے کے لوگوں سے امداد طلب کرتے ہیں۔ اس کو بلوچی میں بجار یا پھوڑی کہا جاتا ہے۔''(93)

بجار کی رسم ایسی ہے جس سے دوسرے کی مشکل بھی دور ہو جاتی ہے اور عزتِ نفس بھی محفوظ رہتی ہے۔ اور معاشی تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ پھوڑی اور بجار میں یہ فرق ہے کہ ''پھوڑی'' کے حصول کے لیے خود لوگوں کے پاس جانا ہوتا ہے جب کہ بجار لوگ خود ہی اپنے عزیز و اقارب یا سردار کو پیش کر دیتے ہیں۔ ''بجار'' شادی اور غمی دونوں موقعوں پر دیا جاتا ہے۔ بجار میں جانور مویشی، بکرے، دُنبے یا نقد رقم دینے کا رواج ہے۔ مرگ کی صورت میں یہاں رواج ہے کہ رشتہ دار، ہمسائے اور دوست سوگوار خاندان کے پاس تعزیت کے لیے تحفے کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ تحائف عموماً بھیڑوں اور اناج کی شکل میں رشتہ دار لاتے

ہیں۔ جب کہ ہمسائے، دوست اور اہلِ قبیلہ نقد بھی لا سکتے ہیں۔ پہلے کو لنگری اور دوسرے کو پرس کہتے ہیں۔ یہ عمل بجار یا پھوڑی کہلاتا ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

> "پھوڑی اور بجار" میں فرق یہ ہے کہ "پھوڑی" حاصل کرنے کے لیے خود لوگوں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ جب کہ قبیلے کے لوگ "بجار" خود بخود اپنے عزیز و اقارب یا سردار کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتے ہیں۔ بجار شادی اور غمی دونوں مواقع پر پیش کی جاتی ہے۔ اس میں دُنبہ، بکری یا نقد رقم دی جاتی ہے۔"(94)

بلوچستان کی یہ رسم ہی یہاں کی ثقافت کو جاندار بناتی ہیں اور انھیں منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

xi. بَلوچوں کی خصوصیات:

بَلوچستان کے ہر قبیلے کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بہادر ہیں۔ غیرت مندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ جو ہتھیار ڈال دے اسے امان دینا ان کی فطرت ہے۔ دشمنی چاہے کتنی ہی ہو مگر عورت، بچے اور ہندو کو کچھ نہیں کہتے اگر دشمن کے گھر کی عورت سمجھوتے کے لیے آجائے تو پھر اس کی عزت رکھتے ہیں۔ اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے مگر اس صورت میں کہ تنازعہ سیاہ کاری کا نہ ہو غیر کے نام پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ زانی کی سزا صرف موت ہے۔ دورانِ جنگ اگر کوئی شخص سر پر قرآن رکھ کر آجائے تو فوری جنگ بند کر دیتے ہیں۔

> "بلوچ قبائل میں مری قبیلے کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ یہ بہادری اور ہُنر سپاہ گری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔"(95)

xii. خوشی و غمی کی رسومات:

سَفر نامہ نگاروں نے اپنے سَفر ناموں میں بَلوچستان کو اس طرح پیش کیا ہے جو قارئین کے لیے یقیناً ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

بچے کی پیدائش پر رسومات:

بَلوچوں میں بچے کی پیدائش کو بہت خوشی سے منایا جاتا ہے۔ ساز بجتے ہیں۔ خیرات تقسیم ہوتی ہے۔ بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔ پیدائش کے چوتھے دن نام رکھنے کی رسم کی جاتی ہے اور مٹھائی اور پھل تقسیم کیے جاتے ہیں۔ چھٹے دن کو بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اسے "چھٹی کی رسم" کہتے ہیں۔ اس رسم کو بھر پور خوشی کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ایک دو بھیڑیں ذبح کر کے رشتہ داروں و دوستوں کی خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ ساتویں دن ختنہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ اسے ملتوی کر دیتے ہیں، ڈرتے ہیں، سوچتے ہیں کہ بچہ ایک دو سال کا ہو جائے گا تب کرائیں گے۔ یہ تقریب بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ خوشی منائی جاتی ہے۔ صدقہ و خیرات کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

چارلس میسن اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> "ساتویں دن کاٹم یا ختنہ کیا جاتا ہے گو اکثر اسے ایک دو سال کے لیے ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ یہ تقریب اہم سمجھی جاتی ہیں۔ لہٰذا بے حد خوشی اور خیرات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ یہ گویا نومولود کا حلقہ اسلام میں شمولیت کا اعلان ہوتا ہے۔" (96)

موت پر رسومات:

میسن نے وہاں کے لوگوں کے عقائد و رسومات کو سفر نامے میں پیش کیا ہے۔ تاکہ اَدب کا قاری اس سے خوشہ چین ہو سکے۔ بَلوچوں میں جب کوئی مر د مرتا ہے تو صدقہ و خیرات کا عمل بار بار دہرایا جاتا ہے تاکہ مردے کی رُوح کو ثواب پہنچ سکے۔ مردانہ قبر یہاں پر تھوڑی اُوپر سے کھودی جاتی ہے۔ لیکن زنانہ قبر سینے تک کھودی جاتی ہے۔

بقول چارلس میسن:

> "مردانہ قبر تھوڑی تک کھودی جاتی ہے۔ لیکن زنانہ قبر سینے تک کھودی جاتی ہے۔ کیوں کہ ان میں عجیب توہم ہے کہ عورت کی فطرت اتنی بے چین ہوتی ہے کہ اگر قبر میں بھی اس پر ڈھیروں مٹی نہ ڈالی جائے تو شاید وہ وہاں بھی پر سکون نہ رہے۔" (97)

غریب لوگوں کی قبروں پر سجاوٹ نہیں کی جاتی یا برائے نام ہوتی تھی۔ ان کی حفاظت کے لیے قبر کے بالائی ڈھیر پر پتھر کے سیاہ و سفید ٹکڑے نہایت خوب صورتی سے لگائے جاتے ہیں۔ بَلوچستان میں یہ رواج

عام ہے۔بیویاں اپنے شوہروں کی وفات کے بعد پندرہ دن سوگ مناتی ہیں۔نہ نہاتی دھوتی ہیں اور نہ ہی اپنی پرواہ کرتی ہیں۔بس نوحے پڑھتی رہتی ہیں پھر ان کے رشتہ دار بیوہ عورت کو رونے دھونے سے منع کرتی ہیں اور لاوہ(ایک پودا) کا سفوف لے کر اس سے اپنا سر دھوتی ہیں اور پھر اپنی زندگی معمول کے مطابق بسر کرنے لگتی ہیں اور ایسا وہ اپنے رشتہ داروں کے اصرار پر مجبور ہو کر کرتی ہیں۔

مسلمانوں میں جو طریقہ رائج ہے۔پورے بَلوچستان میں اسی طریقے پر عمل کیا جاتا ہے۔میت کو شمالاً جنوباً اس طرح رکھا جارتا ہے کہ سر مغرب کی طرف جھکا رہے۔ملاّ کچھ علاقوں میں میت کے ماتھے پر جب کہ کچھ علاقوں جیسے مری، بگٹی، خاران، لَس بیلا، خضدار وغیرہ میں ملا کسی برتن یا پتھر پر کلمہ لکھ کر مردے کے سر کے نیچے رکھ دیتے ہیں۔مری بگٹی میں ضلع کے مغربی حصوں میں خانہ بدوش کم سن بچوں کی لاشوں کو دفن کرنے سے پہلے ان پر چربی مل دیتے ہیں اور اگر ملاّ دستیاب نہ ہو تو ایک بالغ آدمی کی لاش، اسی کے کپڑوں میں کفن کے بغیر دفنا دی جاتی ہے۔اگر کوئی آدمی صحرا میں پیاس کی شِدت سے مر جائے تو وہ ایسی جگہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ایسے لوگوں کو شہدا کہا جاتا ہے۔سات سال سے زیادہ عمر کے لیے سات دن تعزیت ہوتی ہے اور اس دوران لوگ فاتحہ خوانی اور ایصالِ ثواب کے لیے آتے ہیں۔یہ لوگ اپنے ساتھ ایک بھیڑ یا کچھ رقم بھی بطور ”پُرسی“ لاتے ہیں اور سوگوار خاندان ان کو کھانا کھلاتا ہے۔تعزیت کے آخری دن بھیڑیں ذبح ہوتی ہیں اور خرات کی جاتی ہے۔سات سال سے کم عمر بچے کی تعزیت صرف ایک دن ہوتی ہے۔

حال کی رسم:

یہ رسم بَلوچستان کے تمام اضلاع میں رائج ہے اور یہ ایک خالص بلوچ رسم ہے کہ بلوچ راہ گیر سے تمام ملنے والے خبریں پوچھتے ہیں۔جسے بلوچی اصطلاح میں ”حال“ کہتے ہیں۔حال کا مطلب ہے تازہ ترین معلومات جو مسافر کو لازماً دوسروں تک پہنچانا ہوتی ہیں۔ان حاصل شدہ معلومات کو پہلے ملنے والے شخص تک پہنچا دیتا ہے اور یوں بَلوچوں میں ہر قسم کی معلومات کا فوری ابلاغ ہوتا رہتا ہے۔یہ رسم مسافروں تک ہی محدود نہیں بلکہ اہلِ حیثیت جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کا حال بتایا اور پوچھا جاتا ہے۔سوالات کا سلسلہ طویل ہوتا ہے اور وافر سوالات ہوتے ہیں۔اس گفت گو میں بیوی یا کسی عورت کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔

بقول چارلس میسن:

”اور پھر خیریت پوچھنے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے جو فرد متعلقہ اس کے خاندان، اس کے مویشیوں وغیرہ کے متعلق ہوتا ہے۔دراخ، دراخ!

دراخ جوڑ، جوڑ مسن! مسن دراخ، ایم دراخ، لشکر دراخ، تمن دراخ وغیرہ
وغیرہ جس کے جواب میں دوسرا کہتا جاتا ہے فضل! فضل خدا! شکر! الحمد اللہ
وغیرہ۔"(98)

حال کی یہ رسم بھی سی طرح ادا کرتے ہیں۔اس طرح یہ لوگ اپنے لوگوں سے باخبر رہتے ہیں۔

طریقہ انتقام:

پورے بلوچستان میں بدلہ لینا فرض عین ہے اور انتقام نہ لینا ایک طرح کی بزدلی اور کم زوری تصور کی جاتی ہے اور بلوچستان کے تمام اضلاع کے لوگ انتقام لینا اور سزا دینا اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

بقول چارلس میسن:

"خونین جھگڑے ایک دفعہ شروع ہو جائیں تو رُکنے کا نام نہیں لیتے اور قبائل
ان انتقامی جنگوں کا حساب طرفین کے متقولین کی تعداد سے برابر رکھتے
ہیں۔ گویا مقروض اور قرض خواہ کا سا نمونہ ہے۔"(99)

طریقہ انتقام اس رواج کو نبھانے میں تمام بلوچی قبائل تمام اضلاع ایک جیسے ہیں۔عام طور پر اگر ایک گروہ کا کوئی آدمی کسی دوسرے گروہ کے آدمی کو مار دے تو مظلوم گروہ پر لازم ہے کہ وہ فوراً خون کا بدلہ لے۔اسی طرح اگر ایک ہی قبیلے کے دو گروہ ملوث ہوں۔تو وہ اندرونی گروہ خون ریزی پر اُتر آتے ہیں۔اور چوں کہ قبائل میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا رواج ہے۔اور اس طرح ایک گروہ کے ساتھ دوسرا گروہ ملتا جاتا ہے اور پورا قبیلہ برادر کشتی کی جنگ میں پھنس جاتا ہے۔اگر قاتل اور مقتول الگ الگ قبیلوں سے تعلق رکھتے ہوں تو گویا وہ قبائل کی جنگ ہے اور یہ جھگڑا اسی وقت ختم ہوتا ہے جب اموات اور زیادہ نقصان برادر گروہ کو معاوضہ (یعنی خون بہا) دیا جائے گا۔اس کے علاوہ قتل کا معاوضہ نقد یا کسی عورت کو نکاح میں دے کر یا مویشیوں کی ادائیگی سے بھی ہوتا ہے۔بلوچستان میں خون بہا لینے کا رواج بھی ہے۔

سید شوکت علی شاہ-رقم طراز ہیں:

"انتقام ایک ایسا جذبہ ہے۔جو ہر بلوچ کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا
ہے۔انتقام کی بھٹی میں بعض دفعہ افراد کی جگہ قبائل کو دپڑتے ہیں۔"(100)

بلوچ اپنی عزت کے معاملے میں بہت محتاط ہیں اور چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔ انتقام کے معاملے میں بھی ان کا رویہ بہت سخت ہے ۔انتقام نہ لینا بلوچستان کی ایک طرح سے بے عزتی ہے اور ایسا کرنے سے ان کو بزدل کہا جائے گا جو کہ ان کے لیے کسی طرح قابلِ قبول نہیں اس لیے وہ انتقام لینے میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے اور انتقام لیناہر صورت میں واجب سمجھا جاتا ہے۔

xiii. تفریحات، تہوار اور کھیل:

تفریح اور کھیل انسانی زندگی کا ایک حصہ ہیں اور اس کے بغیر زندگی نہ مکمل ہے۔ دُنیا کے کسی بھی خطے میں چلے جائیں ہر جگہ کے اپنے کھیل ، تفریحات نظر آئیں گے۔ جو ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہی ہمارے اپنے ملک کا بھی حال ہے۔ جہاں کا ہر صوبہ ایک الگ ثقافت کا اظہار ہے۔ صوبہ تو الگ اس صوبے میں آنے والے اضلاع الگ الگ ثقافت کے علم بردار ہیں اور ان کی یہی ثقافت انھیں ایک دوسرے سے مُمیز کرتی ہے۔ کوئٹہ ، پشین ، ضلع ژوب کا واحد اندرونی کھیل کٹار ہے جو شطرنج سے ملتا جلتا ہے۔ بیرونی کھیل ہینڈا اور کُشتی ہیں۔ ہینڈا آنکھ مچولی سے ملتا جلتا ہے۔ اور کُشتی پہلوانی کا کھیل ہے۔ امیر لوگ نشانہ بازی اور کُتے دوڑانے کے شوقین ہیں۔ گھوڑا دوڑ، چوگان میخی، رَقص، نشانہ بازی، کُشتی اور رنگین انڈوں کا کھیل ان مواقع کی تفریحات ہیں۔

پوٹنگر کہتا ہے:

> "بلوچی تفریحات وحشی اور غیر مہذب لوگوں کی تفریحات ہیں۔ وہ ہر قسم کے میدانی کھیل کود کے رسیا ہیں اور ان کا کافی وقت نشانہ بازی، شکار اور تعاقب میں گزرتا ہے۔ جس کے لیے وہ اپنے شکاری کُتوں کو خاص طور پر سدھارتے ہیں۔ چاندماری، لٹھ بازی، پہلوانی، شمشیر آزمائی اور نیزہ افگنی بھی ان کی پسندیدہ تفریحات ہیں۔"(101)

خوشی کے تہوار صرف عیدین ہیں اور ان عیدوں کو ضلع ژوب میں لوئے عید اور ہلکی عید کہا جاتا ہے۔ ضلع کچھی میں تقریباً وہی تفریحات ہیں جو براہوئیوں میں ہوتی ہیں۔ بہت سے جاٹ (مل) کُشتی کے شائق ہیں۔ ایک مقبول تفریح جاٹوں کی کافی خوانی ہے۔ مجمع میں لوگ باری باری یا مل کر گاتے ہیں۔ ضلع

بولان میں کچھ امیر لوگ شکار کے شوقین ہیں۔ یہاں کے واحد اہم تہوار عیدین ہیں۔ جنھیں ”مرنی عید اور کسانی عید“ کہتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ اور جھولا بڑی تفریحات ہیں۔ ضلع جھالاوان کا مقبول ترین کھیل کٹار ہے۔ سردی میں آتش دان کے گرد جمع ہو کر براہوئیوں کی عام تفریح چاچا (بجھارت) کہلاتی ہے۔ مقبول ترین بیرونی کھیل ہُو، جی یا جُو ہے۔ اللہ داد (آنکھ مچولی)، کُشتی (مل یابک) اور ٹِلی (جو گیند بلا سے کھیلا جاتا ہے) بھی کھیلے جاتے ہیں۔ عیدین اور کسی خوشی کے موقع پر دوڑ (گو)، نیز بازی اور ناچ (چاپ) کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دائروں میں ناچتے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ کُتوں کی لڑائی، نشانہ بازی میں بہت تیز ہیں۔ گانا یہاں کی ایک مَقبول تفریح ہے۔ عیدین کو ضلع جھالاوان میں بھلاّ اور چُھنا عید کہتے ہیں۔ لَس بیِلا میں لاسوں اور میدوں کی مقبول ترین تفریح ناچ ہے۔ ناچ کے بعد اردیا کُشتی ہے۔ یہ بَلوچستان کے دیگر حصوں میں رائج عام کُشتی سے مختلف ہے۔ یورپی طرز کی کشتی جسے مقامی طور پر مَل یا ملا کھڑو کہا جاتا ہے۔ یہ میدوں کی ایک بڑی تفریح ہے۔ رات کے وقت لاسی موسیقی سے دل بہلاتے ہیں۔ براہوئی کٹار سے ملتا جلتا کھیل نوہگدا گی میدوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ ضلع لورالائی میں چوکاٹ یا بیٹ واحد اندرونی کھیل ہے۔ جو شطرنج سے ملتا جلتا ہے جسے چھ یا آٹھ کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ بوری کا ایک خاص کھیل ”ڈاپ“ ہے۔ جسے عموماً فصلِ ربیع کے بعد کھیلا جاتا ہے۔ بستی میں بھی شطرنج کی شکل میں کھیل چک یا بیٹ کھیلا جاتا ہے۔ تیر اندازی، نیزہ اندازی، نشانہ بازی کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ ضلع چاغی کا مقبول کھیل پُوچ اور کٹار ہیں۔ مقبول ترین بیرونی تفریحات کُشتی، خمب، تِھلی جو بلے اور گیند سے کھیلا جاتا ہے۔ لوہڑی (میراثی) خوشی کے موقع پر قبائلی سورماؤں اور ان کے کارناموں کے منظوم قصے بھی گاتے ہیں۔ چرواہوں کا من پسند ساز ”نال“ ہے، جو ناڑ سے بنتا ہے۔ لڑکے ہڈیوں سے لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ بیرونی کھیلوں میں ”جی“ مقبول ترین ہیں۔ مکران، خاران کی بھی یہی صورتِ حال ہے۔ حاکم طبقوں کی تفریحات کُتوں کی لڑائی، نشانہ بازی اور جانوروں کا شکار ہیں۔ شادی کے مواقع پر گھوڑا دوڑ اور گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ایک نقطے کو نشانہ بنانے کے شوقین ہیں۔ اسے ”سپارلو“ کہتے ہیں۔ ضلع مکران کا اندوانی کھیل چوک ہے، جسے چوپٹ یا سر کہتے ہیں۔ گھریلو کھیل ہشتان چوکی پسندیدہ کھیل ہے۔ نچلے طبقے کا پسندیدہ کھیل کُشتی اور دوڑ ہے۔

xiv. علاج کے عجیب و غریب طریقے:

دُنیا کا ہر خطہ کوئی نہ کوئی کہانی سمیٹے ہوئے بیٹھا ہے۔ یہی صورتِ حال اگر بلوچستان کے نقشے پر ڈالیں تو ایسی ہی کہانیوں کے ساتھ یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ بلوچستان میں ہسپتالوں کا فقدان ہے۔ وہاں کے دیہات ہسپتال اور علاج جیسی سہولتوں سے عاری ہیں۔ نہ ہسپتال ہیں نہ ڈاکٹر نہ دوائیں۔ لہٰذا لوگ مختلف طریقوں سے بیماریوں کا علاج کرنے لگے۔ کوئی جڑی بوٹیوں پر اکتفا کرنے لگے تو کوئی پیروں، فقیروں کے اختیار میں مر رہا ہے۔ بد قسمتی سے جہاں جہالت اور غربت کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں مسائل بھی بے پناہ ہوتے ہیں۔ مقامی بیماریاں عجیب ہیں تو ان کے مقامی علاج عجیب تر۔ اگر کوئی چوٹ لگ جائے یا لڑائی جھگڑے میں گولی یا تلوار کا گھاؤ لگ جائے تو ان کا علاج ضروری ہے۔ مگر یہاں کے پس ماندہ عوام جو کہ زندگی کی معمولی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ وہ علاج کہاں سے اور کیسے کرائیں۔ مجبوراً اُنھوں نے اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کا علاج دریافت کر لیا اور وہ یہ ہے کہ زخم کو گرم لوہے سے داغ دیا جائے۔ بلوچوں میں داغ کی رسم عام تھی۔ آرام ہو گیا تو ہو گیا، زخم ٹھیک ہو گیا تو ہو گیا نہیں ہوا تو زخمی ہی نہ رہے گا۔ یہ عمل وہاں کی مقامی زندگی میں واگ یا داگنا کہلاتا ہے۔ نزلے، درد اور اعصابی تناؤ کے لیے لوہے کی سلاخ گرم کر کے مریض کے جسم کے کسی حصے کو داغ دیا جاتا تھا۔ اب بلوچی اس علاج سے قدرے اجتناب کرنے لگے ہیں۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

> "ایک اور دل چسپ علاج بتائیں اگر آپ کو نزلہ، زُکام مستقل تنگ کر رہا ہے، تو ناک کی پھنگنی سے انگل اپ کر کھوپڑی کو سرخ گرم سلاخ سے داگیں (داغیں) زُکام یا زُکام کی اگلی پچھلی پشتیں معافی طلب ہو کر بھاگ نہ جائیں تو بے شک معالج کا نام بدل دیں۔"(102)

کسی بھی قسم کے شدید درد کا علاج مثلاً گُردے میں یا پتے میں، کمر میں یا پسلی میں تو بڑی بڑی کیلوں کے سر آگ میں دہکا کر درد والی جگہ کو داغا جاتا تھا اب بیچارہ مریض درد کو بھول کر اس نئے درد میں مبتلا ہو جاتا تھا اور تعلیم کے فقدان کے یہ کمالات کہ یہ علاج ترقی پا گئے۔ بعض قبائل میں جانوروں کی کھال سے علاج ہوتا ہے۔ جوڑوں کے درد میں ایک تندرست، توانا دُنبہ ذبح کر کے اس کی کھال اُتار کر مریض کے گرد تقریباً منڈھ دی جاتی ہے اور پھر اسے سی دیا جاتا ہے۔ اچھا بھلا انسان دُنبہ بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں جوڑوں کا درد ایسے غائب ہوتا کہ جیسے تھا ہی نہیں۔

سید شوکت علی شاہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”بعض قبائل میں نمونیہ، یرقان اور بخار اُتارنے کے لیے مریضوں کو جانوروں کی کھال پہنائی جاتی ہے۔یرقان کے لیے بکری کی تازہ کھال موزوں خیال کی جاتی ہے۔جب کہ نمونیے کے لیے بھیڑ کی کھال کو استعمال کیا جاتا ہے۔“(103)

چھوٹے بچوں کے امراض کا علاج انھیں گائے کی اوجڑی سے نکلنے والے مواد میں پوری رات لٹکا کر کیا جاتا ہے۔بچے کو پورے بارہ گھنٹے اس میں رکھا جاتا ہے۔وہ صرف آنکھیں، ناک اور منہ کھلے رہتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ علاج بہت مفید ہے۔پھولوں اور جڑی بوٹیوں کو بھی مختلف بیماریوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔جو بخار، قبض کُشائی، ضعفِ جگر میں اَکسیر سمجھی جاتی ہیں اس کے علاوہ بَلوچستان میں سردی اور گرمی کو کنٹرول کرنے کے لیے بھی جڑی بوٹیاں استعمال کی جاتی ہیں تاکہ موسمی اَثرات سے محفوظ رہا جاسکے۔بلوچستان میں ہر خاتون دواؤں کے ذخیرے سے مالامال ہے۔پہاڑوں یا میدانوں کا کوئی پودا ایسا نہیں ہے، جس سے صحت وشفا مَنسوب نہ ہو۔یہ واقعی سچ ہے کہ بعض سبزیاں اور جڑی بوٹیاں بعض بیماریوں میں مفید ہیں۔کچھ بیماریاں شدید ہیں۔اس کے علاج ٹونوں ٹوٹکوں سے مَنسوب کر دیئے جاتے ہیں اور انھیں نکالنے کے لیے بہت سے مضحکہ خیز طریقے استعمال کرتے ہیں۔تعویز جلا کر اس کے دھوئیں سے مریض کا برا حال کر دیتے ہیں۔یہاں لوگوں میں جہالت اور ضعیف الاعتقادی بہت زیادہ ہے۔زخموں کا علاج بھی بڑے ہی عجیب طریقے سے کرتے ہیں۔اسی طرح چیچک جیسی ہولناک بیماری جو اہلِ طب کو بھی چکرا دیتی ہے۔مگر وہ اس کے علاج کے لیے ٹونوں ٹوٹکوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔چارلس میسن نے اپنے سَفر نامے ” سَفر نامہ قلات“ میں اس خطے کی عکاسی بہت موثر انداز میں کی ہے اور وہاں کے تمام رسوم ورواج کے ساتھ ساتھ مسائل کی بھی نشان دہی کی ہے۔جس نے سَفر نامے کو قاری کے لیے دل چسپ بنا دیا ہے۔

اس خطے کے لوگ ایسی خطرناک بیماریاں جن سے اہلِ طب بھی چکرا دیتے ہیں۔مگر یہ لوگ اس کے علاج کے لیے ٹونوں ٹوٹکوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔

بقول چارلس میسن:

> ”تاہم یہ اتفاق ہوتا ہے یا پھر قُدرت کی شفا بخشی کا نتیجہ، کلائی سے اُوپر ایک استرے سے بازو کے اندرونی حصہ پر ایک روایتی زخم لگائے جاتے ہیں اور

زخم زَدہ کھال پر پھوڑوں کا خُشک مواد باندھ دیا جاتا ہے اور ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ یہ عمل جراحی بسا اوقات دو تین دفعہ دہرایا جاتا ہے اور عموماً ملاّ یا سادات یہ کام انجام دیتے ہیں اور معاوضے کے طور پر کچھ غلہ اور بھیڑ یا کوئی اور چھوٹی موٹی چیز لیتے ہیں۔ سادات کو ترجیح دی جاتی ہے کیوں کہ وہ اہلِ بیت ہونے کی بدولت بیماری کو قابو کرنے میں زیادہ موثر سمجھے جاتے ہیں۔"(104)

XV. شادی بیاہ کے رسوم ورواج:

ہر علاقے کے کچھ اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں جو اس کی ثقافت کو عیاں کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اُردو سفر نامہ نگاروں کا یہ قابل قدر کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے بلوچستان کے ہر گوشے کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کیا ہے کہ بلوچستان کے تمام ثقافتی رنگ قوس قزح کی طرح ہمارے سامنے روشن ہو گئے ہیں۔ سفر نامے دراصل صداقت پر مبنی صنف ہے۔ ثقافتی عناصر کو سامنے لانے میں جتنا اچھا کردار سفر نامہ نے انجام دیا ہے۔ اتنا اچھا کردار شاید کوئی اور صنف ادا نہیں کر سکتی۔ شادی بیاہ کی رسوم و رواج کے حوالے سے دُنیا کے کسی بھی خطے کا جائزہ لیا جائے تو ہر قوم اپنی اپنی مُنفرد رَسومات اور رَوایات کی علم بردار نظر آئے گی۔ ایسا ہی کچھ حال ہمارے ملک کے خطہ بَلوچستان کا ہے۔ صوبہ بَلوچستان کے اضلاع میں شادی بیاہ کے رسوم ورواج کا تفصیلی جائزہ کچھ اس طرح سے لیا گیا ہے:

پورے بَلوچستان میں شادی کرنے کے لیے "زرلب" یا "ولور" کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ جب کسی لڑکے کے والدین اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتے ہیں، تو وہ حسبِ معمول مناسب لڑکی ڈھونڈ کر اس کا رشتہ مانگتے ہیں۔ اگر گفتگو کے بعد رضا مندی محسوس ہو تو لڑکے کا باپ اس کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس اَمر کا تعین کرواتا ہے کہ کتنے جانور اور سامان کھانے پینے کا کیا انتظام کیا جائے گا۔ یہ رسم ہاؤنٹنگ کہلاتی ہے۔ یہ رسم دُولھا کے گھر انجام پاتی ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"اس رسم کو ہاؤنٹنگ "اظہارِ رضا مندی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ رسم دولھا کے گھر انجام پاتی ہے۔ جہاں پر لڑکی والوں کو رومال اور انگوٹھی دی جاتی

ہے۔مقامی زبان میں اسے ''گدو چھلاوا'' کہا جاتا ہے اور باہمی رضا مندی کو
''سنگ''یعنی منگنی کہا جاتا ہے۔''(105)

بَلوچستان میں وٹہ سٹہ کی شادیوں کا بھی رواج ہے۔بَلوچستان میں ولور کا رواج ہے اور تقریباً تمام قبیلوں میں یہ رسم ہے۔پہلے مرحلے میں ایک وفد جس کو بلوچی اصطلاح میں ''میٹر'' کہتے ہیں۔وہ لڑکی والوں سے رضا مندی لے کر معاملات شرائط حق، زرولور، وٹہ سٹہ طے کرتا ہے۔زرولور اکٹھا کرتے کرتے ایک عام بلوچ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیتا ہے۔ابتدائی بات چیت کے بعد لڑکے کی ماں اپنی رشتہ دار خواتین کے ساتھ لڑکی کے گھر جا کر دُلھن کے سر پر رنگ کی چادر ڈال دیتی ہے۔جسے ''جھمی کی رسم'' کہتے ہیں۔شادی کے موقع پر کئی رسمیں ادا ہوتی ہیں۔جو ان کے مخصوص قسم کے رسم و رواج کی غماز ہیں۔یہ رسم و رواج ان کی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔شادی سے سات دن پہلے دُلھن کو گھر کے ایک مخصوص حصے میں محدود رکھا جاتا ہے۔جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ رہتی ہے اور آنے والی زندگی کے خوابوں سے لُطف اندوز ہوتی ہے۔اسے ''دری کی رسم'' کہتے ہیں۔

بقول شوکت علی شاہ:

''شادی کی تاریخ سے سات یوم قبل دُلھن کو گھر کے ایک مخصوص حصے میں رکھا جاتا ہے۔جسے بلوچی میں ''دری'' کہا جاتا ہے۔دُلھن اپنی سہیلیوں کے ساتھ آنے والے دنوں کے حسین خواب دیکھتی ہے اور اس کی کنواری سہیلیاں کبھی حسرت سے دُلھن کو دیکھتی ہیں۔کبھی یاس سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو ٹٹولتی ہیں۔''(106)

شادی کے حوالے سے براہوی رسومات بھی خاص دل چسپ ہیں۔مقررہ تاریخ پر برات بڑی دھوم دھام اور سَج دھج کے ساتھ دُلھن کے گھر جاتی ہے۔بَلوچوں میں جانوروں کا سنگھار بھی لازمی ہے۔دولھا کے جانور کو خوب سجایا جاتا ہے۔

برات کی دعوت کا اہتمام دُلھن والے کرتے ہیں مگر خرچہ دولھا کے ذمے ہوتا ہے۔برات کا استقبال گرم جُوشی سے کیا جاتا ہے۔نوجوان دولھا کے گرد رقص کرتے ہوئے گھیر اڈالتے ہیں اور عورتیں دولھا والوں کے ساتھ اپنی روایتی رسمیں نبھاتی ہیں۔دُلھن کی بہنیں، والدہ، سہیلیاں، رشتے دار عورتیں دولھا والوں کے

ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ نمک ملا آٹا ان پر ملنے کے لیے بھاگتی ہیں۔ منت سماجت کر کے ان سے جان بخشی ہوتی ہے۔

سید شوکت علی شاہ لکھتے ہیں:

> ”جہاں برات دُلھن کے گھر کے قریب اپنی مقرر کردہ جگہ پر پہنچتی ہے تو دُلھن کی والدہ، بہنیں، الہڑ دوشیزاؤں کا لشکر لیے آ ٹپکتی ہیں۔ اب چھیڑ چھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں نمک ملا آٹا ہاتھوں میں لیے دولھا کی ماں اور بہنوں پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ غضب کا رن پڑتا ہے۔ منت سماجت کی جاتی ہے۔ فکر و فن کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ فریب وعدہ فردا کے جال پھیلائے جاتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان حسین بھڑوں کے رنگین چُنگل سے جان بچتی ہے۔“(107)

مہندی کی رات سے لے کر نکاح تک ایک ہمہ صفت آدمی دولھا کا مصاحب خاص بنایا جاتا ہے۔ اسے براہوی اصطلاح میں ”جانی“ کہا جاتا ہے۔ مہندی کی رسم کے وقت بھی جانی دولھا کے ساتھ ہوتا ہے۔ دولھا کے غُسل کا اہتمام اور تخت نشینی کی تقریب شام کو ہوتی ہے۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر غسل کرایا جاتا ہے۔ جہاں دولھا کے نوجوان دوست اور رشتے دار اس کے گرد تلواریں تان کر پہرہ دیتے ہیں۔ غسل کے بعد دولھا کو نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ غسل سے فراغت کے بعد نکاح خوانی کی رسم ہوتی ہے۔ نکاح کی جگہ دولھا دُلھن کو اس جگہ تین راتیں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اس مخصوص جگہ کو ”کوٹھو“ اور اس رسم کو ”کوٹھو کی رسم“ کہا جاتا ہے۔ ان تمام رَسومات کے بعد نکاح کی رسم شروع ہوتی ہے۔ دُلھن کی رضامندی کے لیے دولھا کی طرف سے دو مقرر کردہ حاضر جواب قاصد جنھیں ”ریالو“ کہا جاتا ہے، بھیجے جاتے ہیں۔ تو ان کی مڈ بھیڑ بوڑھی عورتوں سے ہوتی ہے۔ اس موقع پر نہایت عمدہ اور اچھوتی قسم کی نوک جھونک کا سلسلہ چلتا ہے۔ جس پر ریالو غصے میں آ کر واپس چلے جاتے ہیں اور چائے پانی پی کر تازہ دَم ہو کر واپس جاتے ہیں۔ یہ رسم تین بار ادا کی جاتی ہے۔ نکاح کی رسم ادا کر کے دُلھن والوں کی طرف سے ایک بڑے برتن میں دودھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس دودھ کو پلا کر باقی خاص و عام میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ شادی سے اگلے دن صبح بڑی بوڑھیاں اور دُلھن کی سہلیاں نو بیاہتا جوڑے کو مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ ان پر گندم، جو اور چاول کے دانے نچھاور کرتی

ہیں۔ مقصد یہ کہ خدا ان کو صاحبِ اولاد کرے۔ بَلوچستان میں شادی بیاہ کی رسمیں پورے جوش و جذبے سے منائی جاتی ہیں۔

بقول چارلس میسن:

> ”شادی کے روز دولھا شوخ و رنگین ریشمی کپڑے پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دوستوں کی معیت میں ایک لمبا چکر کاٹ کر برکت و سلامتی کے لیے روضے پر جاتا ہے۔ بہت سا کھانا تیار ہوتا ہے اور ہمسایوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور خوشی کی یہ تقریبات فریقین کے وسائل اور مزاج کے مطابق جاری رہتی ہیں۔“(108)

بَلوچوں میں منگنیاں کرنے کا رواج عام ہے۔ نوزائیدہ، نازائیدہ اور بچپن کی منگنیاں عام ہیں۔ منگنی کی رسم کو ”سانگ“ کہا جاتا ہے۔ شادی کے اخراجات طرفین کی حسبِ حیثیت ہوتے ہیں اور ولور کے بغیر ان کا بیش تر حصہ دولھا والوں کو کچھ زیورات، بستر اور گھریلو فرنیچر کی اشیا دیتے ہیں۔ ایک جوڑا دولھا کو دیا جاتا ہے۔ امیر خاندان دُلھن کو تین مَلبوسات زیادہ بہتر زیورات اور فرنیچر دیتے ہیں۔ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو جو تحائف دیتا ہے، اسے بَلوچستان میں ”کور“ کہتے ہیں۔ ولور کے علاوہ شادی کے اخراجات طرفین کی حیثیت پر منحصر ہوتے ہیں۔

بقول کیمی پوا:

> ”کوئٹہ کے علاقے کی جوان عورتوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لیے شادی کے رسم و رواج میں دلھن کی قیمت کا ذکر ضروری ہے اگر لڑکی جوان اور خوب صورت ہو تو اس کی قیمت ایک ہزار سے دس ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ بیوہ کی قیمت کم ہوتی ہے۔ اس کے 500 روپے بھی لگ سکتے ہیں۔“(109)

ولور کی ادائیگی اور رسم ولور کا طریقہ تمام بَلوچستان کے اضلاع میں ایک جیسا ہے۔ ضلع ژوب، کوئٹہ پشین، قلعہ سیف اللہ کے جوگیزئی، سرداخیل، ہندوباغ کے سرغڑوں میں، فورٹ سنڈیمن کے شیرانیوں میں، مندوخیلوں میں، سنزرخیلوں وغیرہ میں ولور کی ادائیگی لازمی اَمر ہے۔ سادات کرانی کے سوا باقی تمام قبائل ولور لیتے ہیں۔

اسماعیل صدیقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”زرلب کہنے کے تو کتنا خوب صورت لفظ ہے، مگر اپنے اندر جتنے دُکھ، درد اور بے بسی کی کہانیاں سمیٹے ہوئے وہ سب کچھ بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ یہاں کے رواج میں عام طور پر مرد کو بھی حُسنِ انتخاب کا حق نہیں ہوتا لیکن خاص طور پر عورت کو تو قطعی نہیں۔“(110)

اگر ایک شخص اپنے سے اُونچے گھرانے میں شادی کرتا ہے یا ایک معمر آدمی ایک جوان لڑکی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے تو اسے عام سائل سے زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ بیوہ کا ولور عموماً دوشیزہ کی نسبت آدھا ہوتا ہے لیکن جوان اور دل کش ہونے کی صورت میں زیادہ مہر موجل نظری طور پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ رقم عموماً تھوڑی ہوتی ہے۔ کوئٹہ میں سب سے کم پشین میں قدرے زیادہ اور سادات میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

”زرولور کے طور پر اکثر بھاری رقم کا مطالبہ ہوتا ہے پرانے وقتوں میں شاید اس کا کوئی جواز ہو لیکن آج کل ایک عام بلوچ اس کے بوجھ تلے تمام عمر دبا رہتا ہے اور اپنی زندگی کا بیش تر حصہ ولور اکٹھا کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔“(111)

ولور یا لب، زیورات، تھوڑی سی رقم کے علاوہ عموماً بھیڑوں، بکریوں، اُونٹوں مویشیوں یا اسلحہ کی صورت میں ادا کر دیا جاتا ہے کہ 30 سال قبل ”لب“ سے نا آشنا تھے۔ اُنھوں نے یہ طریقہ بَلوچوں اور براہوئیوں سے سیکھا ہے۔ دُلھن کی قیمت یا لب زر اور کنووتی یا لڑکیوں کا تبادلہ ان طریقوں سے جاٹ شرفاً گریز کرتے ہیں۔ پر اب بَلوچستان کے تقریباً تمام قبائل لب زر یا ولور کی رسم اپنائے ہوئے ہیں۔ جب ابتدائی گفتگو طے ہو جاتی ہے۔ تو گھر کا بزرگ یا قبیلے کا کائی سید لڑکی کے باپ کے پاس جا کر اس لڑکی کے ولور یا زرلب یا زبان ناپسندیدہ میں لڑکی کی قیمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جانور اور سامانِ خورد نوش بھی فیصلہ کر لیا جاتا ہے، جو شادی کے موقع پر دیئے جائیں گے۔

”جہاں رشتے کی اُمید نظر آئی گھر کے کسی معتبر یا پھر کسی سید صاحب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لڑکی والوں سے بات کی جاتی ہے۔ قبیلے میں اگر ”لب“ کا رواج

ہو تو رقم بھی طے ہوتی ہے۔ دعوت کے لیے کچھ جانوروں کا نذرانہ بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس رسم کو "ہاؤنٹنگ" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی رضامندی سمجھ لیں۔"(112)

بَلوچستان میں بلوچ اور براہویوں کی رسومات شادی ایک جیسی ہیں۔ اپنے قبیلے سے باہر شادی کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ البتہ اب حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی اور اگر مناسب رشتہ نہ ملے تو اب باہر بھی رشتے کر لیتے ہیں۔

صوبہ بَلوچستان میں شادی کی درج ذیل اقسام ہیں:

نازائیدہ بچوں کی منگنیاں:

بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا رشتہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے رشتے انتہائی قریبی رشتہ داروں میں طے کیے جاتے ہیں۔ ضلع مکران، ضلع خاران اور ضلع بولان میں بہتر طبقوں میں نازائیدہ بچوں کی منگنیاں منظر عام پر آئی ہیں۔

"اس میں بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے یعنی اس کی پیدائش سے قبل اس کا رشتہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے رشتے مکران کے علاوہ بَلوچستان کے دیگر علاقوں میں بھی کیے جاتے ہیں۔"(113)

قولی منگنیاں:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ماں باپ قول دے کر بچے کو اپنے وعدے کی زنجیر میں باندھ دیتے ہیں۔ یہ منگنیاں عموماً ولادت سے پہلے ہوتی ہیں اور ان کا مکران میں بہت رواج ہے۔

بچپن کی منگنیاں:

ایسی منگنیاں عموماً قریبی رشتہ داوں میں ہوتی ہیں۔ پورے بَلوچستان میں اس کا رواج ہے۔ 20 فیصد لڑکے جوان ہو کر منگنیاں توڑ دیتے ہیں۔ مگر لڑکیاں ماں باپ کے قول کو نبھاتے ہوئے بخوشی قبول کر لیتی ہیں۔ ضلع مکران میں ایسی شادیاں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ جن میں مجبوری شادی ہوتی ہے اور ساری عمران میں پیار و محبت نہیں ہوتا۔ مکران میں سب سے کم عمری میں شادیاں ہوتی ہیں۔

جلد شادی کا رواج:

بَلوچستان کے تمام اضلاع میں لوگ جتنی جلدی ممکن ہو شادی کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ ان علاقوں میں بیوی کو سخت قسم کی ذمہ داریاں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ جو ایک بالغ عورت ہی بااحسن طریقے سے انجام دے سکتی ہے۔

نصیر آباد کے ایک سرکردہ زمیندار نے صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے:

"کم سن بیوی کو گھر لانے، اسے کھلانے، پلانے اور پہنانے سے ہمیں کیا فائدہ؟ ہم صرف اس عورت سے شادی کر سکتے ہیں۔ جو اس کی اہل ہو، گھر کا کام کاج سنبھال سکے اور ہمارے کاروبار میں معاون ہو۔"(114)

شادی کی عمر:

بَلوچستان کے تمام اضلاع میں شادی عموماً سنِ بلوغت میں کرنے کا رواج ہے۔ ضلع کوئٹہ پشین میں دولھا کی عمر 25 سال اور لڑکی اس سے چار سال چھوٹی ہوتی ہے۔ ضلع ژوب، بولان، لورالائی، مکران میں لڑکا 20 سال اور لڑکی اس سے چار سال چھوٹی ہوتی ہے۔ ضلع لَس بیلا میں لڑکا 17 سال کا اور لڑکی اس سے 2 سال چھوٹی ہوتی ہے۔ جب کہ میدوں میں 10، 12 سال کی عمر میں شادی ہوتی ہے۔ امیروں کے ہاں عموماً لڑکا 20 اور لڑکی 16 سال کی ہوتی ہے۔ غریب اور خانہ بدوش لوگ اَدھیڑ عمر کو پہنچ جاتے ہیں، ولور اکٹھا کرتے کرتے۔

قریبی رشتہ داروں میں شادی کا رواج:

بَلوچستان میں قریبی رشتہ داروں میں شادی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس میں چچازاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد اور اس طرح کے قریبی رشتہ داروں میں شادی کی جاتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں میں "لب" اگر دینا پڑے تو بہت ہی کم ہوتا ہے۔

بقول شوکت علی شاہ:

"شادی کے سلسلے میں چند بلوچ اور براہوی رسومات تقریباً ایک سی ہیں البتہ فردعات میں کچھ فرق ہے اسے قبیلے سے باہر شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مناسب بر نہ ملے تو باامر مجبوری دوسرے قبیلے میں رشتے ناطے کر لیے جاتے ہیں۔"(115)

دُلھن کے انتخاب کا حق:

یہاں کے رواج کے مطابق عام طور پر مرد کو بھی دُلھن کے انتخاب کا حق نہیں لیکن عورت تو خاص طور پر اس حق سے محروم ہے۔

شادی کے لیے لڑکی کا خود انتخاب کرنا:

غریبوں میں جب شادی زیادہ عمر میں ہو تو مرد اکثر خود انتخاب کرتا ہے۔اگر ابتدائی مزاکرات حوصلہ افزا ہوں تو کوئی بڑا رشتہ دار یا سید لڑکی کے پاس جاتا ہے اور قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

ادل بدل یا وٹہ سٹہ کی شادیاں:

شادی کی یہ قسم بلوچ قوم کے علاوہ دوسری اقوام میں بھی پائی جاتی ہیں۔تمام قبائل ادل بدل کی شادیاں کرتے ہیں۔

بقول بریگیڈیئر محمد اسماعیل صدیقی رقم طراز ہیں:

> "شادی کے سلسلے میں لڑکی دے کر لڑکی لینے کا رواج بھی ہے۔اسے اَدل بدل کہتے ہیں۔بالکل ایسے ہی جیسے پنجاب میں "وَٹہ سَٹہ" کی رسم ہے۔عام طور پر یہ رسم قریبی رشتہ داروں میں مروج ہے۔جہاں اَدل بدل کے لیے لڑکی نہ ہو وہاں بہ اَمر مجبوری زرِلب ادا کرنا پڑتا ہے۔"[116]

ضلع بولان میں لڑکیوں کے تبادلے یعنی اَدلے بدلے کی شادی کو "چڑیا چڑی" کہا جاتا ہے اور ژوب میں اَدلے بدلے کے رواج کو "سَرائے پٹ سَرائے" کہتے ہیں۔اور پشین کی طرح زیرِ تبادلہ لڑکیوں کی عمروں میں زیادہ فرق ہو تو والدین کو اضافی رقم دینا پڑتی ہے۔جسے "بر آور دیا سر" کہتے ہیں۔

"اَر" طریقہ شادی:

ضلع ژوب کے سنزرخیلوں میں ایک طریقہ شادی موسوبہ "اَر" بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ایک آدمی ایک لڑکی پر عاشق ہو جائے اور لڑکی کے والدین رشتہ دینے سے انکار کر دیں تو عاشق اس کے گھر میں بھیڑ یا بکری کی سری پھینک کر بندوق چلاتا ہے۔اس کی زُلفیں کاٹ کر (زرونگٹی) زیور اُتار لے گا اس کی چادر (سری یا ٹکری) لے کر بھاگ جائے گا اور ساتھ ہی اعلان کرے گا کہ وہ میری ہے اور کوئی اس سے شادی کی جرات نہ کرے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے والدین راضی ہو جاتے ہیں اور ولور لے کر اس کی شادی کر دیتے ہیں۔اب یہ طریقہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔

دوسرے قبائل کے ساتھ رشتہ کرنا/ دوسرے قبائل میں شادیاں کرنا:

بلوچ قبائل میں اپنوں کے علاوہ شادیاں کرنے کا رواج بہت کم ہے۔ اگر مناسب رشتہ خاندان میں نہ ہو تو باہر شادیاں کی جاتی ہیں اس طرح کی شادیوں میں ولور کی رقم بھی زیادہ لی جاتی ہے اور حق مہر رشتہ داروں کی نسبت زیادہ لیا جاتا ہے۔

ایک سے زائد شادیاں کا رواج:

بَلوچستان کے تمام اضلاع میں ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج ہے۔ امیر طبقے کے لوگ کثیر الازواج کے مالک ہیں۔ کیوں کہ وہ ولور ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ کبھی اولاد کے حصول کے لیے، کبھی مُسرت کے لیے شادیاں کرتے ہیں۔

بقول اسماعیل صدیقی:

> "اگر کوئی ایک سے زائد شادیاں کرنا چاہتا ہے تو وہ اس حقیقت کا مظہر ہوتی ہے کہ وہ آدمی خوش حال ہے، جوان مرد ہے اور کسی کے ہاں ایک سے زائد بیوی کا ہونا Status Symbol بھی تو ہے۔"[(117)]

بھاجائی یعنی بھابھی سے شادی:

بھائی کی بیوہ سے شادی کرنے کے اس رواج کو رسم بھاجائی یا بجائی کہتے ہیں۔ سندھ اور بَلوچستان کے بَلوچوں کی یہ رسم ہے کہ جب کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے۔ تو مرنے والے کا حقیقی بھائی یا رشتے کا بھائی اس کی بیوہ سے شادی کر لیتا ہے۔ اگر کوئی عورت اپنی پسند سے کہیں شادی کرنا چاہے تو اس کو بقایا مہر نہیں دیا جاتا جو اس کے شوہر کے ذمے تھا۔ بعض قبائل میں رواج ہے کہ مرنے والے کے بھائی اس کی بیوہ کا دوسروں سے نکاح کروا کر ولور یعنی عورت کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ البتہ عورتوں کی منگنی کے وقت یہ شرط یعنی "سریوار" طے ہو جاتا ہے کہ اگر عورت بیوہ ہو گئی تو وہ اپنے والدین کے گھر اپنے سب زیور اور تحفے ساتھ لے کر چلی جائے گی، جو اس کے والدین کی طرف سے ملے تھے۔ اس شرط کی وجہ سے عورت بیوگی کے وقت خود مختار سمجھی جاتی ہے۔

اپنے سے کم تر لوگوں میں شادیاں کرنے کا رواج:

اس طرح کی شادیاں پسند کی ہوتی ہیں۔ مگر اس طرح کی شادیوں سے ہونے والے بچوں کو خاندان نہیں ملتی۔ ضلع مکران میں اس طرح کے کئی رشتے میں آئے ہیں۔

زبردستی کی شادی:

بَلوچستان کے تمام اضلاع میں اس طرح کی شادیاں عام ہیں۔ بعض قبائل جو صاحب حیثیت ہیں۔وہ چاہے کتنی بھی شادیاں کرلیں کوئی حرج نہیں۔اگر کوئی لڑکی پسند آجائے تو زبردستی اسے حاصل لیتے ہیں۔ان کا یہ خیال ہے کہ ان کا یہ پیدائش حق ہے۔دشمن کو نیچا دکھانے، اس سے بدلہ لینے اور اس پر مردانگی کرنے کے لیے زبردستی عورتوں سے شادی کرلیتے ہیں۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

> ”جو خاتون پسند آئے اسے جبراً اپنے حرم میں داخل کرلیں۔ جہاں تک دشمن کی آل اولاد کا سوال ہے تو وہ تو خیر حلال ہیں، دشمن پر اپنی برتری رعب و دبدبہ جمانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے خاندان یا قبیلے کی عورت کو بزور بازو چھین کر واپس لے جائے ان کے نزدیک شیوہ مردانگی یہی ہے۔“(118)

خون بہا کے بدلے شادی:

بلوچ قبائل میں یہ قدیم روایت ہے کہ اگر کسی آدمی سے کوئی قتل ہو جائے تو بلوچ جرگہ فیصلہ کرتا ہے کہ خون بہا کے بدلے قاتل مقتول کے اپنے خاندان میں سے رشتہ دے دے۔ یہ رشتہ انتہائی قریبی لڑکی سے ہوتا ہے۔ جیسے بہن، بھانجی، بھتیجی، چچازاد یا پھوپھی زاد بہن کا رشتہ دے کر سزا سے بچایا جاتا ہے۔اس طرح خون کی قیمت کے ساتھ ساتھ آپس میں دشمنی ختم کر کے دونوں خاندانوں کا ملاپ کرایا جاتا ہے۔

> ”مکران کے ضلع پنجگور کے مقاماتی علاقہ گوارگو، پروم، تربت کے علاقے بلیدہ، عمران، دشت، بل نگور، تمپ اور گوادر کے تحصیل جیونی میں خون بہا کے بدلے رشتے داریاں کی گئی ہیں۔“(119)

کم تر نسلوں میں شادیاں:

بلوچ کم تر نسلوں میں مزدور، درزادے، لوہڑی، دست کار، نوکر چاکر میں شادیاں نہیں کرسکتے۔اگر شادی کا ارداہ کرلیں تو یہ شادی حقیر سمجھی جاتی ہے اور بہت کم ان کا رواج ہے۔بَلوچستان میں ایک روایت ہے

کہ یہاں مویشیوں کی طرح عورتوں کی بھی منڈی لگتی ہے۔ سب سے زیادہ بولی دینے والا زر خرید لونڈی کی حیثیت سے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ اس طرح سے پیدا ہونے والی اُولاد بھی کم ترین سمجھی جاتی ہے۔

خادماؤں سے شادیاں:

خادماؤں سے شادیاں عموماً ایسا رواج بہت ہی شاذ و ناز ہے۔ بلوچی قبائل خادموں سے جنسی تعلقات بموجب روا رکھتے ہیں۔ اس پر عمل کم ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کی اُولاد حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اور وراثت میں بھی ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

طلاق یافتہ بیوی اور رنڈوا کی شادیاں:

عورتوں کو بھی طلاق کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے قبیلے میں دوبارہ شادی کر سکتی ہیں۔ ضلع مکران میں عورتوں کو سب سے زیادہ حقوق اور حق مہر دیا جاتا ہے۔ بیوہ اور رنڈوں کی شادیاں بھی منظر پر آئی ہیں۔ ضلع مکران میں ایک بیوہ عورت کی پانچ شادیاں تک دیکھی گئی ہیں۔ پانچ شادیوں کی زندہ مثال موجود ہے۔

اجتماعی شادیاں:

اجتماعی شادیوں کی رَسم بَلوچوں کے اتحاد و اِتفاق کو ظاہر کرتی ہے۔ جوان کے بھائی چارگی کی علامت ہے۔ قبیلے کا امیر آدمی اپنے بچے کی شادی کرتا ہے تو وہ اپنے عزیز و اقارب کی شادیوں کا بھی سارا خرچہ برداشت کرتا ہے۔ تقریباً 10 سے 20 جوڑوں کو اکٹھا رشتہ ازدواج میں باندھ دیا جاتا ہے۔ ایسی شادیاں زیادہ تر ضلع مکران کے ساحلی علاقوں میں کی جاتی ہیں۔

عشقیہ شادی:

اگر کوئی لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، لیکن اگر لڑکے کے والدین نہ مانیں تو لڑکا لڑکی گھر سے فرار ہو کر کراچی اور سندھ کے دوسرے علاقوں میں جا کر کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ جب والدین کو خبر ہوتی ہے تو یا تو وہ ان سے تعلق توڑ لیتے ہیں یا گھر آنے پر انھیں قتل کر دیتے ہیں۔ بلوچ معاشرے میں لڑکے کے ساتھ لڑکی کا بھاگنا ایک ایسا برا عمل ہے جسے گناہ تصور کیا جاتا ہے اور یہ سب طور طریقے بلوچی روایات کے خلاف ہیں۔

حلالہ کر کے شادی کرنا:

قدیم روایت ہے کہ بَلوچوں میں حلالہ کے ذریعے شادیاں عام تھیں۔اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طیش میں آکر طلاق دے دیتا اور پھر پشیمان ہو کر نکاح کے لیے دونوں دوبارہ آمادہ ہوتے تو اس صورت میں عدت گزر جانے کے بعد عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے کچھ دنوں کے بعد طلاق لے کر اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر کے واپس اس کے پاس آ جاتی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رواج دم توڑ تا جا رہا ہے۔مذہبی علمانے اسے غیر اسلامی جاہلانہ رَسم قرار دیا ہے۔اس لیے اب یہ رسم تقریباً ختم ہو چکی ہے۔

xvi. عورت کا مقام:

بَلوچستان کی عورت کی مظلومیت کی کہانی ایسی درد ناک ہے، جسے سن کر انسان ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔کہ اسلام کے پیرو کار اس مذہب کے ماننے والے نبی ﷺ کی تعلیمات پر عمل کیوں نہیں کرتے حق دار کو اس کے حق سے کیوں محروم کرتے ہیں۔اسلام کے بنیادی اُصولوں کے مطابق مرد اور عورت ایک برابر ہیں۔سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔عورت کو بھیڑ بکری سمجھنا درست نہیں۔

> ”ہمارے ہاں ان قبائل میں ابھی تک عورت کا مقام کافی پَست ہے۔اس کی شاید جائز وجوہات بھی ہوں گی۔مگر جوں ہی عورت کام کرنے کے قابل ہوتی ہے گھر کے سارے کام اس کے سُپرد کر دیئے جاتے ہیں۔“(120)

دُشمن پر رُعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے اس کے خاندان یا قبیلے کی عورت کو بزورِ بازو حاصل کر لیا جاتا ہے۔اگر کسی میں اتنی ہمت اور استطاعت ہے تو بزورِ بازو چھین کر واپس لے جائے۔ان کے نزدیک یہ طرۂ مردانگی ہے۔بَلوچستان کے قبائل عورت کے معاملے میں بالکل بھی تہذیب یافتہ نہیں ہیں۔قبائلی عورت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔یوں تو ہمارے ملک کی عورت پس ماندہ ہے۔ بلوچستان کی عورت کو تو اپنی شناخت کے لیے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ اس صنف میں جسے عورت کہتے ہیں اسے اس میں شمار بھی کیا جاتا ہے کہ نہیں بلوچستان کے بیش تر علاقوں میں بیچارگی کی زندگی جینے پر مجبور ہے۔ بَلوچستان کے بیش تر علاقوں میں ازمنہ قدیم کی سی حالت کا دور دورہ ہے۔اندرون بلوچستان کی عورت بے مائیگی و بے چارگی کی زندگی جی رہی ہے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو وہ بے چاری جڑی بوٹیوں سے کر لیتی ہے۔اگر حالت بگڑ جائے تو یہ بے زبان ہستی کہاں جائے، سوائے اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں کہ مریضہ گھٹ گھٹ کر مر جائے

کیوں کہ یہ اس کے مجازی خدا کی مرضی ہے اور اس کی دوسری شادی کے لیے راستہ ہموار ہے۔ بلوچستان کی عورت کی حیثیت اپنے مرد کے لیے صرف خدمت کرنا، ذمہ داریاں اُٹھانا ہے۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"بلوچستان کی عورت کو تو اپنا حال زار بیان کرنے سے پہلے یہی ثابت کرنا ہو گا کہ وہ جس صنف پر اپنا حق جتاتی ہے ، اس میں شمار بھی ہوتی ہے یا نہیں؟"(121)

یہاں کی عورت بے زبان جانور کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ "زرلب" لے کر اس کی چاہے جیسا بھی مرد ہو اس کے والدین لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ اس کی عمر، کردار کچھ نہیں دیکھا جاتا۔ اگر کسی کے گھر لڑکی پیدا ہو جائے تو گھر والے بڑی خوشی مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب تو ان کے گھر ہن برسے گا۔

بلوچستان کی عورت آٹا پیسنے والی مظلوم عورت غربت کی چکی میں پسی جا رہی ہے۔ یہ بے جان ، بے چاری، جس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ کیسے اتنا سب کرتی ہے۔ اپنی ہستی مٹا دیتی ہے۔ علی الصبح اُٹھ کر دور دراز چشمے سے پانی لاتی ہے۔ گھر صاف کرتی ہے ، آٹا پیسنا، جانوروں کو گھاس ڈالنا، دودھ دوہنا، گھر کی دیکھ بھال کرنا، بچے پالنا، کھیتی باڑی کرنا، گھر کے تمام افراد کے کپڑے بنانا، کپڑے بھی ایسے ویسے نہیں بلکہ خوش رنگ دل آویز دھاگوں سے سجے ہوئے ہیں۔ قالین دری بُنتی ہیں۔ عرض کونسا ایسا کام ہے جو وہ نہیں کر سکتی اور مرد بکریاں چرا کر کاروبار کر کے وافر مقدار میں پیسہ جمع کرتا ہے تو وہ ایک اور شادی کر لیتا ہے۔ کسی کے ہاں ایک سے زائد بیوی کا ہونا Status Symbol ہے۔ بلوچستان کی عورت مظلومیت کی تصویر ہے۔ ہر حق سے محروم صرف فرائض کی بھٹی میں چُپ چاپ جلتی رہتی ہے۔ قبائلی عورتوں کو پاؤں میں جوتے پہننے کی اجازت نہیں کہ اگر وہ مصیبت زدہ زندگی سے فرار حاصل کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتیں۔ ہزاروں سال پہلے چین میں عورتوں کو لوہے کے جوتے پہنانے کا رواج تھا۔ تاکہ ان کے پاؤں پوری طرح نشو ونما نہ پا سکیں اور اگر وہ بھاگنا بھی چاہیں تو بھاگ نہ سکیں۔

بقول اسماعیل صدیقی:

"یوں بھی اگر وہ ملک چھوڑ کر فرار ہونا چاہیں تو ان چھوٹے چھوٹے پاؤں کی وجہ سے یہ بھاگ نہ سکیں۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ بلوچستان کا یہ معاشرہ

بیسویں صدی کے ساتویں دہائے میں ہے یا قبل از مسیح کے زمانے میں رہ رہا
ہے۔"(122)

بعض موقعوں پر بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عورتوں کی نیلامی بھی ہوتی ہے اور جانوروں کی طرح ان کی بھی بولی لگائی جاتی ہے اور سب سے زیادہ بولی دینے والا زر خرید لونڈی کے طور اپنے گھر لے جاتا ہے اور ان سے پیدا ہونے والی اُولاد کی معاشرے میں کوئی وقعت نہیں ہوتی نہ انھیں وراثت میں حصہ ملتا ہے۔نہ سماج میں عزت بَلوچستان کی عورت کی بے مائیگی اور کم تری اس کی مظلومیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بَلوچستان کے بعض علاقوں میں تو بیٹی کی پیدائش خوشی کا باعث سمجھی جاتی ہے۔کیوں کہ ان کے گھر بیٹی نہیں بلکہ زر و جواہر نے قدم رکھا ہے۔وہاں تو چھ چھ بیٹیاں بھی رحمت سمجھی جاتی ہیں۔کیوں کہ یہ تو اس کُنبے کے لیے چیک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بریگیڈئیر اسماعیل صدیقی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"آپ مجھ سے ہمدردی کس بات کی جتا رہے ہیں ؟ جناب میں تو بڑا خوش قسمت باپ ہوں کہ میرے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں یہ افسوس کی نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔"(123)

بَلوچستان میں عورت کو کوئی ایسا مقام حاصل نہیں جیسا کہ ان کا حق ہے وہاں مردوں کا راج ہے عورت کو اگرچہ وہ پاؤں کی جوتی نہیں سمجھتے لیکن سر کا تاج بھی نہیں سمجھتے۔البتہ کچھ معاملات میں عورت کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔اگر دو قبیلوں میں لڑائی ہو رہی ہو اور عورت بیچ میں آجائے تو تمام قبائل کے براہوئی اس کا احترام کرتے ہوئے لڑائی رُوک دیتے ہیں۔اور عارضی صلح دونوں فریقین کے درمیان ہو جاتی ہے۔خواتین اکثر خون خرابہ رُوکنے میں اہم کردار رکھتی ہیں۔براہوئی عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے اگر کوئی عورت غلطی سے زخمی ہو جائے۔تو وہ اسے بہت ہی بُرا سمجھتے ہیں۔

سید شوکت علی شاہ رقم طراز ہیں:

"بہر حال بلوچ معاشرے میں عورت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔اگر دو قبائل میں جنگ شروع ہو جائے تو عورت کی مداخلت سے ختم ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی عورت خون بخشوانے کے لیے "میٹر" کے طور پر چلی جائے تو اس کے احترام میں خون تک معاف کر دیا جاتا ہے۔"(124)

اگرچہ بَلوچستان میں انسانی جان کی قدر و قیمت نہیں ہے، مگر پھر بھی ان معاملات میں عورت کا احترام کرتے ہیں۔بَلوچستان کی عورت ایک خدمت گار کے طور پر ہمہ وقت مرد کی خدمت کے لیے تیار رہتی ہے۔گھر کے اندر کے کاموں سے لے کر باہر کے کام بھی وہ خوش اُسلوبی سے انجام دیتی ہے اور بنا کسی صلے کے سب کی خدمت کرتی ہے۔براہوئی مرد کبھی اپنی عورتوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔عورت ہر دَم شوہر کی خِدمت کے لیے تیار رہتی ہے۔

بقول چارلس میسن:

”براہوئی مرد کبھی اپنی بیوی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا بلکہ وہ کھانے کے دوران اس کی خدمت میں کمر بستہ رہتی ہے۔اور اس کا کھانا پورا ہونے کے بعد بچا کچھا ہنسی خوشی کھالیتی ہے۔“(125)

گھر کے تمام کام کاج کرنے کے بعد بھی بے مائیگی کی زندگی جی رہی ہے۔عورت زمانہ قدیم سے آج تک مظلوم ہے۔تعلیم کی کمی نے عورت کی حیثیت کو ابھی تک اُبھرنے نہیں دیا۔یہی ان علاقوں میں عورت کی زندگی کا المیہ ہے۔

xvii. میراث:

اکثر قبائل میں عورتوں کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں تھا۔لیکن اب موجودہ دور میں کوئٹہ کے بازئی کاکڑوں اور پشین کے سناٹیہ کاکڑوں نے یہ محسوس کیا یہ رسم غلط ہے اور خلاف شریعت ہے۔لہٰذا اُنھوں نے شریعت کے مطابق عورتوں کا وراثت میں حصہ دینا منظور کر لیا۔مردوں میں وراثت کی تقسیم قبائلی رواج کے مطابق کی جاتی ہے۔لیکن ضلع ژوب میں عورتوں کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں۔حتیٰ کہ بیوہ کا 8 / 1 حصہ بھی اسے نہیں دیا جاتا۔البتہ مردوں کا حصہ شریعت کے مطابق ہے۔

”عورت کا وراثت میں کوئی حق نہیں ہوتا بس وہ اس کی حق دار ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے ساتھ ماں باپ کے گھر سے لائی ہے ، اسے واپس لے جائے۔“(126)

جاٹ وراثت میں شریعت پر چلتے ہیں۔بیوہ کو مرحوم شوہر کے ترکے سے حصہ ملتا ہے اور وہ دوسری شادی کے معاملے میں آزاد ہے۔ضلع بولان میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں اور اکثر لڑکیاں خون بہا جیسی رسم

کا حصہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ سارا دن گھر کی چکی میں پسنے کے باوجود اس کا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں۔ بیوہ شوہر کی جائیداد پر صرف گزارہ کر سکتی ہے، اس وقت تک جب تک وہ میکے نہ چلی جائے یا دوسری شادی نہ کر لے۔ اور یہی صورتِ حال ضلع جھالا وان میں بھی ہے۔ لَس بیلا میں بھی عورت کی حیثیت پست ہے۔ اور میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ لاسی میراث کا کوئی حصہ بیٹی، لونڈی کی اُولاد یا اس کی بیوہ کو نہیں دیتے۔ قبائلی عورت کو بیوگی پر شرعی حق حاصل ہے۔ ضلع لورالائی میں کچھ قبائل وراثت میں عورتوں کے حق کو تسلیم کرتے ہیں اور انھیں شریعت کے مطابق حصہ دیتے ہیں۔ ضلع سبی میں بھی عورت انتہائی پست زندگی گزارتی ہے۔ جائیداد میں کوئی حصہ نہیں۔ بس سارا دن گھر کے کام، مویشی چرانا یہی اس کی قسمت ہے۔ البتہ بیوہ کی حیثیت سے وہ اپنے مرحوم شوہر کی جائیداد سے صرف گزارے کی مستحق ہے۔ تاہم ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں جب ایک بیٹا ولور لے کر اپنی ماں کا ہاتھ سائل کو پکڑا دیتا ہے۔ بھائی کی بیوہ سے شادی کا رواج عام تھا۔ البتہ اب حالات میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ بیوگان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے، شادی کرے یا نہ کرے۔ ضلع خاران کی بَلوچستان کے دیگر حصوں کی عورتوں سے زیادہ مضبوط حیثیت ہے۔ وہ شوہر سے ملنے والی جائیداد کی اکیلی مالک ہے۔ شریعت کے مطابق اس کو مراعات حاصل ہیں۔ والدین اور شوہر دونوں کے گھروں میں اس کا حصہ ہے۔ مکران کی عورت حیثیت کے لحاظ سے سب سے اچھی حالت میں ہے۔

xviii. سیاہ کاری کی سزائیں:

پورے بَلوچستان میں بے وفائی یا بد کرداری کی سزا موت ہے۔ اس معاملے میں تمام قبائل بہت سخت ہیں۔ ضلع پشین میں مجروح شوہر معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اگر آشنا اور عورت دونوں بچ جائیں تو معاوضہ وصول کیا جاتا ہے اور عورت کو طلاق دے دی جاتی ہے۔ معاوضہ عموماً ایک یا زیادہ لڑکیوں اور کچھ نقدی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ضلع کچھی میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی سزا بَلوچوں اور جاٹوں میں صرف موت ہے۔ اگر وہ بچ نکلیں تو تصفیہ کیا جاتا ہے۔ معاوضے میں یہاں بھی ایک سے زائد لڑکیاں اور نقدی وصول کی جاتی ہے۔ ضلع بولان، ضلع جھالاوان، ضلع لَس بیلا سب میں سیاہ کاری کی سزا موت ہے لیکن اگر بچ جائیں تو کچھ قبائل لڑکیاں اور نقدی وصول کر کے عورت کو طلاق دے دیتے ہیں۔

لیفیٹننٹ ہنری پوٹنگر رقم طراز ہیں:

"ایک آدمی اگر معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی سیاہ کاری کی مرتکب ہوئی ہے۔ تو دونوں کو قتل کر سکتا ہے۔"(127)

ضلع لورالائی، ضلع سبی، ضلع چاغی بے وفا عورت کی سزا موت ہے۔ مختلف قبائل عورتوں کو سخت سے سخت سزا دیتے ہیں۔ لہر زئی، موسیٰ خیل عورت کی ناک کاٹ دیتے ہیں اور عورت کے آشنا کی پیشانی اور کلائیوں کو داغ دیتے ہیں۔ کچھ قبائل جن میں دومڑ، زخ پیل اور ونیچی ناک اور کان کاٹ دیتے ہیں۔ کچھ قبائل میں اگر عورت اپنے آشنا سے شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کے آشنا کو اسے حاصل کرنے اور اپنی جان بچانے کے لیے بھاری معاوضہ اور لڑکیاں دی جاتی ہیں۔ پہاڑی بلوچوں کی اکثریت بھی سزائے موت کی ہی قائل ہے۔ ضلع خاران اور ضلع مکران میں بھی طور طریقے تقریباً ایک جیسے ہیں۔ مکران کی عورتیں بے وفا ہیں۔

"سیاہ کاری یا ننگ داری کے معاملے میں قتل کا رواج بھی ایک خالص بلوچی رسم ہے۔"(128)

مکران میں طلاقوں کا بھی بہت رواج ہے۔ شادیاں بھی بہت کم عمری میں کر دی جاتی ہیں۔ مگر یہاں بھی عورت کی سیاہ کاری کے معاملے میں اُصول بہت سخت ہیں۔ اول تو ایسا ہوتا ہی بہت کم ہے۔ لیکن اگر بیوی بحالت جرم پکڑی جائے تو اس کی سزا موت ہے اور اس معاملے میں یہ باقی بلوچوں کی طرح ہی ہیں۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

"حالتِ جرم میں پکڑا جانے پر اس مسئلے کا حل اب بھی صرف موت ہے۔ ہاں البتہ نا جائز تعلقات کے بارے میں صرف شک ہو جانے کی صورت میں عورت کا باپ یا بھائی اس قسم کی خبر ملنے پر خود ہی خاموشی سے قضیہ چکا دیتا ہے۔ ورغلانے والا اگر پکڑا جائے تو اس کی سزا بھی صرف موت ہے۔"(129)

بلوچستان غیرت کے نام پر جان پر کھیل جاتے ہیں۔ بے راہ روی کی سزا تو اسلام میں بھی بہت سخت ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلام کے مطابق سنگ سار کیے جانے کی سزا مقرر ہے۔ بلوچستان کے لوگ بھی سیاہ کار کو جان سے مارنے کے قائل ہیں اور اس سزا میں کسی ترمیم کی حامی نہیں ہے۔ بلوچستان کے لوگ عموماً بڑے مذہبی اور پرہیز گار قسم کے ہیں روایات کے پابند ہیں۔

بَلوچستان میں عورت مرد کا ہاتھ بٹاتی ہے۔اس کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا، جانوروں کو سنبھالنا، غرض ہر کام کرتی ہے۔پردے کا رواج نہیں ہے لیکن بلوچ باضابطۂ اخلاق کے معاملے میں اُصول پسند ہیں۔اگر کوئی عورت آزادی کا غلط استعمال کرے اور اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر سیاہ کاری کی سزا صرف موت ہے۔غیرت کے معاملے میں بلوچ بہت سخت ہیں۔جان دینا اور لینا غیرت کے نام پر عام سی بات ہے اور ان اُصولوں میں وہ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے۔

فرحت علی شاہ رقم طراز ہیں:

> ”اگر کوئی عورت اس آزادی کا غلط استعمال کر لے تو پھر سیاہ کاری کی سزا موت ہے۔ایک خاوند کے لیے یہ اعلان کرنا کافی تھا کہ اس کی عورت سیاہ کار ہے۔اس کے بعد قبائلی قانون کے تحت حق پہنچتا تھا کہ وہ مرد وزن و مرد کو قتل کر دے۔“(130)

xix. طلاق:

بَلوچستان میں دوسرے رواجوں کی طرح طلاق کا طریقہ بھی بالکل مختلف ہے۔حالاں کہ یہ تو ایک ایسا فعل ہے۔جو جس طرح اللہ نے مقرر کیا ہے، اسی طرح اس پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔مگر بَلوچوں میں طلاق کا طریقہ بالکل الگ ہے۔طلاق کا یہ طریقہ بَلوچستان کے تمام اضلاع میں رائج ہے۔طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ عورت کے پیچھے تین پتھر یا مٹی کے ڈھیلے پھینکے جاتے ہیں۔طلاق یافتہ عورت کی حیثیت بیوہ کی سی ہے۔وہ اپنے قبیلے میں اگر چاہے تو دوبارہ شادی کر سکتی ہے۔یوں تو طلاق کا براہوئیوں میں رواج نہیں مگر جو لوگ مکران کے رسم و رواج کی پاس داری کرتے ہیں ان میں اور اُونچے طبقے کے لوگوں میں طلاق کو برا نہیں سمجھا جاتا۔بعض اُوقات یہ لوگ معمولی باتوں پر طلاق جیسا قدم اُٹھا لیتے ہیں۔علیحدگی کی وجہ بیوی کی بدصورتی، کجُ خلقی، بدکاری (چاہے ثابت ہو یا صرف شبہ ہو) بے وفائی اور معمولی چوری بھی ہو سکتی ہے۔اگر طلاق سیاہ کاری کی بنا پر ہو تو اکثر قبائل اس عورت کو اپنے آشنا سے شادی کرنے نہیں دیتے۔پہلے تو مردوں کا یہ حال تھا کہ عورت کو وہ صرف شک کی بنا پر ہی قتل کر دیتے تھے۔بَلوچوں کی اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔تو بلاشبہ بَلوچوں کی بہادری اور غیرت مندی ایک داستان کی شکل میں نظر آئے گی۔

بقول بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی:

"طلاق دینے کا یہ طریقہ کہ عورت کی جانب تین پتھر یا مٹی پھینکی جائے مطلقہ عورت کی حیثیت بیوہ کی سی ہوتی ہے اور وہ دوبارہ شادی کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ کہ طلاق کی وجہ بے وفائی نہ ہو۔"(131)

مجموعی طور پر اس باب میں ان سَفر ناموں کو اور ان سے متعلقہ کتب کو شامل کیا گیا ہے۔ جنھوں نے بَلوچستان جیسے دو افتادہ اور پس ماندہ خطے سے قاری کو اس طرح روشناس کرایا ہے کہ قاری بَلوچستان کے چپے چپے سے مانوس ہو گیا ہے۔

سَفر نامے ہمارا ثقافتی وُرثہ ہیں۔ سَفر ناموں کی بدولت ہمیں بَلوچستان کی تاریخ، تہذیب و تمدن، مذہب اور سیاست، معاشرت، ثقافت، رہن سہن، زبانیں، لباس، رسم و رواج اور دیگر معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

سَفر نامہ "آئینہ بَلوچستان"، "اجنبی اپنے دیس میں"، "سَفر نامہ قلات" اور "سَفر نامہ بلوچستان و سندھ" یہ ایسی کتب ہیں، جن کے اُسلوب کی شگفتگی اور رَعنائی قاری کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ "آئینہ بَلوچستان" اس سَفر نامے میں اسماعیل صدیقی نے بلوچی قوموں کے رسوم و رواج، زبان و بیان، علم و عمل، شادی بیاہ کی تقریبات، فنِ موسیقی سے ان کی دل چسپیاں ان سب کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے یہاں کے موسموں، زرعی پیداوار، پھلوں، باغات اور مصنوعات کو بھی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے رویے، مختلف مذہبی تہوار وغیرہ بھی اس سَفر نامے کا حصہ ہیں۔

"آئینہ بَلوچستان" صرف سَفر نامہ ہی نہیں بلکہ بَلوچستان کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ "آئینہ بلوچستان" میں محمد اسماعیل صدیقی نے سادہ اُسلوب میں بَلوچستان کی ثقافت کو پیش کیا ہے۔ اس میں داستان اور کہانی کا سا عَنصر پایا جاتا ہے۔ منظر نگاری، جزئیات نگاری، واقع نگاری اور شخصیت نگاری کی بھی مثالیں اس میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ سَفر نامہ بَلوچوں کی زندگی کے ہر رَنگ کو عَیاں کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

"کرنل محمد اسماعیل صدیقی کا "آئینہ بَلوچستان" ایک سَفر نامہ ہے۔ جس میں حقیقت افسانے کی طرح دل چسپ بن گئی ہے۔"(132)

یوں کہا جا سکتا ہے اسماعیل صدیقی نے بَلوچستان کی تصویر پہلے اپنے دل کے آئینے پر اُتاری ہو گی، پھر اِسے قارئین تک پہنچنے دیا ہو گا۔

سَفر نامہ " اَجنبی اپنے دیس میں " سید شوکت علی شاہ کا شاہکار ہے۔ جنرل ایوب کے زمانے میں سید شوکت علی شاہ نے تین سال کا عرصہ دورانِ ملازمت بلوچستان کے مختلف علاقوں میں گزارا۔ اس دور ان اُنھون نے بَلوچستان کے لوگوں کی زِندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس کو اُنھوں نے اپنے سَفر نامے میں یوں پیش کیا کہ یہ جیتی جاگتی تصاویر کی شکل اختیار کر گئیں۔ اِس دوران اُنھوں نے وہاں کے تہذیب و تَمدن، مذہب، سیاست، ثقافت، تعلیم اور زندگی سے جڑے دیگر شعبوں کا غایت نظر سے مُشاہدہ کیا اور اِن مشاہدات کو اُنھوں نے صفحہ قُرطاس پر سَفر نامہ "اَجنبی اپنے دیس میں" کی شکل میں رقم کیا۔ "اَجنبی اپنے دیس میں" وہ سَفر نامہ ہے۔ جو قیامِ بَلوچستان کی روداد ہے۔ ان کا سَفر نامہ وہ سفر نامہ ہے جو اُنھوں نے قیامِ بَلوچستان کی روداد کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ بد قسمتی سے بہت کم اصحاب نے اس موضوع پر قلم فرسائی کی ہے۔ سید شوکت علی شاہ کا اندازِ بیان بہت شِیریں ہے۔ اِن کی روانی اور سلاست دل آویز ہے اور ان کی سادگی بے مثال ہے۔ سید صاحب کی تحریر نے بَلوچستان کے تمام خَدوخال کو واضح کیا ہے اور یہ بات ہمارے سامنے روزِ رُوشن کی طرح عَیاں ہے۔ آج کا جلتا ہوا بلوچستان ماضی میں جن محرومیوں کا شکار رہا ہے۔ سید شوکت علی شاہ نے ان کی پردہ کُشائی کی ہے اور خطہ بَلوچستان ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ اُنھوں نے قاری پر یہ بات عَیاں کی ہے کہ ہمارے اپنے ہی ان محرومیوں کا باعث ہیں۔ وہ خطہ زمین جو قیمتی خزانوں کے ذَخائر سے مالا مال ہے اور اس کا بَاسی کتنا بد حال ہے۔

وقار اَنبالوی "اَجنبی اپنے دیس میں" کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "زیرِ نظر کتاب ایک مختصر سی مُدت کا سَفر نامہ ہے اور آپ بیتی بھی اور کتاب کا مصنف زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بھی آگاہ ہے اس لیے نہ تو سَفر نامہ محض زمین پیمائی تک محدود ہے۔ نہ آپ بیتی میں کسی جگہ بھی انسانی سطح سے مصنف نے اُوپر اُٹھنے دیا ہے۔ میرے ناقص علم میں "تزک جہانگیری" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جو ایک خطہ زمین کے حالات کے ساتھ ساتھ عام اِنسانی جَذبات و احساسات کو دل نشین پیرائے میں ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ "تزک" لکھنے والا اپنے زمانے کا شہنشاہ ہے، لیکن لکھتے وقت وہ پندار شاہی میں گرفتار نہیں رہتا ایک سَفر کے حال میں کس سادگی اور بے تکلفی سے لکھتا ہے۔" (133)

سید شوکت علی شاہ نے بَلوچستان کے ثقافتی رنگوں کو بڑی ہنری مندی سے پیش کیا ہے اور ان کا یہ کارنامہ قابلِ تحسین ہے۔ سفر نامہ ''قلات '' چارلیس میسن کی ذاتی دل چسپی کی بھر پور عکاسی کرتا ہے۔ کہنے کو چارلس میسن انگریز ہے۔ مگر اس نے بَلوچستان کی ثقافت کو جس طرح بیان کیا ہے ، وہ قابلِ تعریف ہے۔ میسن نے اس کتاب میں قلات کی سیر کے دوران جو چیزیں دیکھیں محسوس کیں ان سب کو پڑھ کر اس کی دل چسپی اور مُتجسس ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ اس نے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ قلات کی ثقافت کو بھی اُبھارا ہے اور تمام ثقافتی عَناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ '' سَفر نامہ قلات '' اپنے موضوع کے اعتبار سے بہترین کتاب ہے۔ اُنھوں نے اس سَفر میں وہاں کی ثقافت ، رہن سہن ، ماحول وغیرہ کو مفصل پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

1. ملک محمد سعید ، دہوار ، تاریخ بلوچستان، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ، ص: 13
2. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں (بلوچستان پر ایک رپورتاژ)، گورا پبلشرز 25لوئر مال روڑ ، لاہور،ص113
3. مجلہ تاریخ وثقافت پاکستان ،جنوری -جون 2018ء
4. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز : سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب ، کوئٹہ ،ص: 318
5. عبدالرحمٰن براہوئی،، ڈاکٹر ، بلوچستان اور پاکستان ، الحاق کی کہانی حقائق کی زبانی (مزید اہم دستاویزات کے ساتھ) ، قلات پبلشرز ، رستم جی لین جناح روڑ کوئٹہ ، اشاعت سوم ، 2009ء،ص:18
6. احمد ندیم قاسمی ،(دیباچہ)، اجنبی اپنے دیس میں ، سید شوکت علی شاہ ، خزینہ علم و اَدب ، 2006ء،ص:5
7. غفور شاہ قاسم ،سفر نامہ ، مشمولہ : پاکستانی اَدب شناخت کی نصف صدی ،ص: 269
8. انعام الحق کوثر ،ڈاکٹر ،بلوچستان میں اُردو اَدب کے سو سال ، ص: 212
9. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص: 35
10. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ، لاہور ،ص: 26
11. ایضاً،ص: 82
12. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں (بلوچستان پر ایک رپورتاژ)، گورا پبلشرز 25لوئر مال روڑ ،لاہور،ص: 43
13. ایضاً

14. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص: 149

15. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹرپرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص: 35

16. لیفٹینٹ ہنری پوٹنگر ،ترجمہ: ایم رومان ،بلوچستان و سندھ ،نساٹریڈرز ،7جناح کلاتھ مارکیٹ ، کوئٹہ ، ص:50

17. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپور تاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:76

18. ہنری پوٹنگر ، انوررومان ،پروفیسر ،قدیم بلوچستان ،گوشہ اَدب جناح روڑ ،کوئٹہ پاکستان ،ص : 35

19. ہنری پوٹنگر ،لیفٹینٹ، ترجمہ :ایم رومان ،بلوچستان وسندھ ،نساٹریڈرز ، 7جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ،ص:51

20. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص:82

21. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:280

22. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹرپرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:299

23. ایم زمان کھوکھر ، ایڈووکیٹ ، الحاج ، پشاور سے کوئٹہ تک ، گلی سیشن کوٹ ،کچہری روڑ ، گجرات ،ص: 569

24. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص:22

25. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:359

26. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:299
27. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:181
28. ایضاً،ص: 76
29. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:359
30. ایضاً،ص: 360
31. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:181
32. ایم زمان کھوکھر ، ایڈووکیٹ ، الحاج ، پشاور سے کوئٹہ تک ،یاسر اکیڈمی بالمقابل گلی سیشن کوٹ ، کچہری روڑ ، گجرات ،ص:562
33. انور رومان ،پروفیسر ،قدیم بلوچ ،گوشہ اَدب ، جناح روڑ ،کوئٹہ (پاکستان) ،ص: 60
34. ایضاً،ص:62
35. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڑ ،لاہور ،ص:84
36. ایضاً،ص: 84
37. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:77
38. ایضاً،ص: 181
39. ایضاً،ص:79
40. ایضاً،ص: 81
41. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:400 – 399

42. ایضاً، ص: 601
43. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ ، لاہور ، ص:84
44. ایم عثمان حسن ، بلوچستان اضلاع اور تاریخ ، پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ، ص:365
45. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ ، لاہور ، ص:49
46. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ، سفر نامہ قلات ، پبلشرز : بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڈ ، کوئٹہ ، ص:385
47. اثر عبدالقادر شاہواڑی ، ریسرچ اسکالر ، بلوچستا ن مذہبی ، علمی ، فکر رُجحانات اور مکتبہ درخانی کا کردار ، براہوئی اکیڈمی (رجسٹرڈ) ، کوئٹہ پاکستان ، ص: 30
48. منصور بخاری ، بلوچستان کے قبائل (تاریخ ، جغرافیہ ، رسم ورواج اور بودوباش)، ضلع کوئٹہ پشین اور ژوب ، سیلز اینڈ سروسز کبیر بلڈنگ ، جناح روڈ کوئٹہ (پاکستان)، ص:75
49. محمد اشرف ، شاہین قیصرانی بلوچ ، ڈاکٹر ، بلوچستان تاریخ اور مذہب(ایک تحقیقی جائزہ)، ادارہ تدریس ، آرچر روڈ ، کوئٹہ بلوچستان ، ص: 347
50. ایضاً، ص345
51. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ ، لاہور ، ص:48
52. سید شوکت علی شاہ ، اجنبی اپنے دیس میں ، (بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ، گورا پبلشرز ، 25 لوئر مال روڈ ، لاہور ، ص:140
53. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ ، لاہور ، ص:49
54. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ، سفر نامہ قلات ، پبلشرز : بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڈ ، کوئٹہ ، ص:388

55. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:140
56. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ،تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:3
57. ایم رومان ،پروفیسر ،(ترجمہ) بلوچستان کے قبائل ضلعی گزیٹئیر سے انتخاب ،پبلشرز نسا ٹریڈرز پٹیل روڑ ، کوئٹہ ،طبع اول ، 1989ء،ص:311
58. ایم زمان کھوکھر ، ایڈووکیٹ ، الحاج ، پشاور سے کوئٹہ تک ،یاسر اکیڈمی بالمقابل گلی سیشن کوٹ ، کچہری روڑ ،گجرات ،ص:567
59. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:404
60. ایضاً،ص420
61. ہنری پوٹنگر ،ترجمہ: پروفیسر ،ایم رومان ، قدیم بلوچستان ،گوشہ اَدب ،جناح روڑ ، کوئٹہ (پاکستان)،ص:65
62. ملک محمد سعید دہوار ، تاریخ بلوچستان ، ناشر: بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ،ص: 47
63. ہنری پوٹنگر ،ترجمہ ،بلوچستان وسندھ ،نسا ٹریڈرز ، 7جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ،ص:52
64. اثر عبدالقادر شاہواڑی ،بلوچستان مذہبی ، علمی ،فکر رجحانات اور مکتب درخانی کا کردار ،ریسرچ اسکالر براہوئی اکیڈمی (رجسٹرڈ) ،کوئٹہ پاکستان ،ص: 30
65. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ،تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:611
66. ایضاً،ص:612
67. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڑ ،لاہور ،ص:175
68. ایضاً،ص:90
69. ایضاً،ص:93

70. ایم زمان کھوکھر ایڈووکیٹ ،الحاج ،پشاور سے کوئٹہ تک ،یاسر اکیڈمی بالمقابل گلی سیشن کورٹ ، کچہری روڑ ، گجرات ،ص: 568
71. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڑ ،لاہور ،ص:95
72. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:378
73. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڑ ،لاہور ،ص:167
74. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:310
75. میر نصیر خان احمدزئی ،تاریخ بلوچ وبلوچستان (جلد اوّل)، بلوچی اکیڈمی ،مکران ہاؤس ،کوئٹہ ، ص: 4 – 3
76. ملک صالح محمد خان ،لہڑی بلوچستان از ، ایم اے ایل ایل بی (علیگ)،کوئٹہ ،ص: 11
77. ملک محمد سعید دہوار ، تاریخ بلوچستان ، ناشر:بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ،ص:42
78. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:566
79. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:392
80. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڑ ،لاہور ،ص:90
81. ایضاً،ص: 92
82. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:392

83. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ ،لاہور ،ص:90
84. ایضاً،ص:93
85. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:368
86. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڈ ،لاہور ،ص:136
87. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڈ ،کوئٹہ ، ص:387
88. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڈ،لاہور ،ص:136
89. ایم زمان کھوکھر ایڈووکیٹ ،الحاج ،پشاور سے کوئٹہ تک ،یاسر اکیڈمی بالمقابل گلی سیشن کورٹ ، کچہری روڈ ،گجرات ،ص: 568
90. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڈ ،کوئٹہ ، ص:385
91. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڈ،لاہور ،ص:138
92. ایضاً،ص: 137
93. ایضاً،ص: 148
94. ایضاً،ص:148
95. ایم عثمان حسن ،بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:420
96. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انوررومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹر پرائزز زرغون روڈ ،کوئٹہ ، ص:397

97. ایضاً،ص398

98. ایضاً،ص: 387

99. ایضاً،ص: 386

100. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:138

101. ہنری پوٹنگر ، انور رومان ، پروفیسر ،(ترجمہ) قدیم بلوچستان ،گوشہ ادب ،جناح روڑ ،لاہور ، ص: 81

102. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص:81

103. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ ،لاہور ،ص:147

104. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹرپرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:389

105. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ،آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص:35

106. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپورتاژ) ،گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ،لاہور ،ص:142

107. ایضاً،ص:143

108. چارلیس میسن ، ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ قلات ،پبلشرز :بے نظیر انٹرپرائزز زرغون روڑ ،کوئٹہ ، ص:394

109. کیمی پوا،سفر نامہ پاکستان ،ترجمہ: محمد حسن ، بک ہوم بک سٹریٹ،46مزنگ روڑ،لاہور ،ص110

110. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ، ص:50

111. سید شوکت علی شاہ، اجنبی اپنے دیس میں، (بلوچستان پر ایک رپورتاژ)، گورا پبلشرز، 25 لوئر مال روڈ ،لاہور، ص:149

112. اسماعیل صدیقی، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ)، آئینہ بلوچستان، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڈ ،لاہور، ص:60

113. شاہوانی عبدالقادر، بلوچی دودءُ ربیگ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، ص: 236

114. منصور بُخاری، بلوچستان کے قبائل (لسبیلہ، لورالائی، سبّی، مری بگٹی)، سیلز اینڈ سروسز، کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ پاکستان، 2012ء، ص: 127

115. سید شوکت علی شاہ، اجنبی اپنے دیس میں، (بلوچستان پر ایک رپورتاژ)، گورا پبلشرز، 25 لوئر مال روڈ، لاہور، ص:148

116. اسماعیل صدیقی، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ)، آئینہ بلوچستان، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ، لاہور ،ص:35

117. ایضاً، ص: 39

118. ایضاً، ص: 36

119. عامل یعقوب، چکار، دیدگ پبلی کیشنز، پنج گور، 2011ء، ص: 87

120. ایم عثمان حسن، بلوچستان اضلاع اور تاریخ، پبلشرز سیلز اینڈ سروسز، تقسیم کار: گوشہ ادب کوئٹہ، ص:694

121. اسماعیل صدیقی، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ)، آئینہ بلوچستان، جنگ پبلشرز 13 سر آغاخان روڈ، لاہور ،ص:38

122. ایضاً، ص: 40

123. ایضاً، ص:39

124. سید شوکت علی شاہ، اجنبی اپنے دیس میں، (بلوچستان پر ایک رپورتاژ)، گورا پبلشرز، 25 لوئر مال روڈ، لاہور، ص:135

125. چارلیس میسن، ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان، پروفیسر، سفر نامہ قلات، پبلشرز: بے نظیر انٹرپرائزز زرغون روڈ، کوئٹہ، ص:404

126. ایم عثمان حسن ، بلوچستان اضلاع اور تاریخ ، پبلشرز سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشہ ادب کوئٹہ ،ص:318

127. ہنری پوٹنگر ، لیفیٹننٹ ،بلوچستان وسندھ،نساٹریڈرز ، 7جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ،ص:92

128. ملک سعید دہوار ،تاریخ بلوچستان ،ناشر: بلوچی اکیڈمی ،کوئٹہ ، ص: 13

129. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص:35

130. سید شوکت علی شاہ ،اجنبی اپنے دیس میں ،(بلوچستان پر ایک رپور تاژ) ، گورا پبلشرز ، 25لوئر مال روڑ،لاہور ،ص:136

131. اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ، آئینہ بلوچستان ، جنگ پبلشرز 13 سر آغا خان روڑ ،لاہور ،ص:35

132. انور سدید ،ڈاکٹر ، آئینہ بلوچستان از محمد اسماعیل صدیقی ،ص: 11

133. وقار انبالوی ،اجنبی اپنے دیس میں از سید شوکت علی شاہ ،ص: 14

باب سوّم:

اُردو سفر ناموں میں صوبہ سندھ کی علاقائی ثقافت کی پیش کش

صوبہ سندھ ایک قدیم تاریخ کا منبع ہے۔ اپنے اندر ایک عظیم تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ زمانے کے اُتار چڑھاؤ سے اگر کسی قوم اور ملک کو اگر کبھی نقصان پہنچتا ہے تو کبھی فائدے کی صورت بھی نظر آتی ہے۔ مگر خطہ سندھ جو آج ایک چھوٹے حصّہ زمین کا نام ہے۔ اس کو شاید زمانے کے ہاتھوں کبھی شاذو نادر ہی فائدہ اُٹھانا نصیب ہوا ہو گا۔ سندھ کی تہذیب دنیا کی قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ قدیم عالمی تاریخ میں تین اہم قدیم تہذیبیں ہیں:

1. مصری تہذیب
2. میسوپوٹامیہ کی تہذیب
3. وادی سندھ کی تہذیب

1۔ مصری تہذیب: مصری تہذیب تاریخ کی قدیم ترین اور سب سے دل چسپ تہذیب ہے۔ یہ تہذیب 3000 قبل مسیح کے آس پاس قائم ہوئی تھی۔ دریائے نیل کے میدانی علاقوں میں پروان چڑھی۔ دریائے نیل دُنیا کی سب سے بڑی ندی ہے۔ جس کی لمبائی 4 ہزار میل ہے۔ مصری تہذیب کے ارتقا میں دریائے نیل کا اہم کردار ہے۔ مصر کو دریائے نیل کا تحفہ بھی کہتے ہیں۔

2۔ میسوپوٹامیہ کی تہذیب: اس کے بعد ہم تاریخ کی ایک اور قدیم تہذیب کی طرف آتے ہیں۔ جو ہے میسوپوٹامیہ کی تہذیب۔ یہ تہذیب قریباً 3500 قبل مسیح کی ہے۔ میسوپوٹامیہ سے مراد ہے دو دریاؤں کے درمیان کا علاقہ۔ یہی تہذیب دجلہ اور فرات کی ندیوں کے درمیانی علاقے میں آباد ہوئی۔

3۔ وادی سندھ کی تہذیب: اس تہذیب کا دائرہ کار شمال میں مانڈا، جنوب میں دائم آباد، مشرق میں ستکاچنڈور، مغرب میں عالم گیر پور، کل ملا کر وادی سندھ کا رقبہ ایک ہزار میل پر مشتمل ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس تہذیب کا پھیلاؤ مصر اور میسوپوٹامیہ کی تہذیب سے کہیں زیادہ تھا۔ سندھ کی تاریخ اتنی پرانی ہے کہ اس کے متعلق درست شواہد موجود ہی نہیں ہیں۔ صرف تاریخ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ ہزاروں

سال پہلے آریا جب اس خطے میں آئے تو اُنھوں نے اس کا نام "سندھو" رکھا تھا۔ کیوں کہ آریا اپنی زبان میں دریا کو "سندھو" کہتے تھے۔ ارتقا میں وہ اس ملک کو سندھو کہتے رہے، پر آہستہ آہستہ اُنھوں نے اس کو "سندھو" کہنا شروع کر دیا۔ اس نام نے اتنی شہرت اختیار کی کہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی اس کا نام سندھ ہی ہے۔ لفظ "سندھ" دریائے سندھ سے مستعار ہے۔ سنسکرت لفظ "سندھو" کی موجودہ شکل ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب 3500 سے لے کر 1700 قبل مسیح تک قائم رہنے والی انسان کی چند ایک قدیم تہذیبوں میں سے ایک تھی۔ جس نے تاریخ پر اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

> "ابتدائی زمانے میں یہ دریا آریہ لوگوں کا دریا کہلاتا تھا۔ آریہ لوگوں نے قبضہ کرنے کے بعد اس دریا کا نام سندھو رکھ دیا۔ اس لیے کہ نیز ان کی زبان سنسکرت میں سندھو کے معنی دریا کے تھے اور سمندر کا دیوتا ان کے اعتقاد میں اس نام سے یاد کیا جاتا تھا۔"(1)

سندھ کی وُسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اِس ملک کی حدیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنوب کی طرف بحیرہ عرب لہریں لے رہا تھا، مشرق کی طرف دیکھیں تو شمالی کوہستان ہے۔ شمال کی طرف وہ چھوٹی وادی جو پنجاب کہلاتی تھی، ان تمام شاداب و زرخیز اضلاع پر مشتمل ہے۔ جو شمال میں واقع ہیں۔ مغرب کی طرف بلوچ ہیں۔ جنھوں نے سندھ کے تمام مغربی و جنوبی اضلاع پر قبضہ کر لیا جو آج بلوچستان کہلاتے ہیں۔

سندھ کا کل رقبہ 54123 میل مربع زمین ہے۔ جس پر 3417ء گاؤں آباد ہیں۔ تمام شہروں میں ممتاز شہر کراچی ہے جو بحیرہ عرب کی ایک مشہور بندر گاہ ہے۔ کراچی میں اگرچہ روز بروز ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ مگر سندھ کا پرُانا دار السلطنت حیدر آباد آج تک سندھ کے اہم شہروں میں تصور کیا جاتا ہے۔

اس سرزمین کی ساری رونق دریائے سندھ ہے۔ جو قدیم تجارت کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہا ہے۔ جس طرح تمام قدیم جغرافیہ نویس یونانیوں سے لے کر عربوں تک ملک سندھو کو ملک مصر کے مشابہ بتاتے رہے ہیں کہ جس طرح مصر کی ساری رُونق و آبادی وہاں کے لوگوں کی زندگی میں سرسبزی و شادابی دریائے نیل پر منحصر ہے۔ اسی طرح سندھ کی رُونق و شادابی کا دار و مدار دریائے سندھ پر ہے۔ اس خطہ سندھ کی زمین عموماً ریگستانی اور قابلِ زراعت ہے۔ سب سے عمدہ اور قابل زراعت زمین شکار پور اور لاڑکانہ کی ہے۔ یہ سرزمین سندھ کی قدیم تاریخ کا ایک دَرخشاں نمونہ ہے۔ سندھ کی تہذیب تاریخ اور ثقافت اپنے مزاج میں مُنفرد

ہے۔سندھ کی منفرد ثقافت اسے دوسرے تمام خطوں سے ممیز کرتی ہے۔سندھ کی آب و ہوا، ثقافت رہن سہن، کھانا پینا، لباس، پیشے، رہائش وغیرہ سب منفرد ہیں۔سندھ کی ثقافت ایسی شان دار ہے اس میں ایسا دل فریب طلسم ہے جو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اس باب کا مقصد صوبہ سندھ کی ثقافت کو سامنے لانا ہے۔صوبہ سندھ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے۔2017ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 4 کروڑ 78 لاکھ 90 ہزار ہے۔۔وادی سندھ اپنی رنگارنگ ثقافت کے حوالے سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

سید محمد تقی ثقافت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "پاکستانی ثقافت ان کی نظر میں وہ تاریخی تجربہ ہے۔جس سے برعظیم کے مسلمان گزرے ہیں۔ثقافت میں تاریخی تجربے کو اہمیت دینے کے بعد وہ اس کی جغرافیائی حیثیت پر بات کرتے ہوئے وادی سندھ کو پاکستان کا جغرافیائی حیثیت پر بات کرتے ہوئے وادی سندھ کو پاکستان کا جغرافیائی ورثہ خیال کرتے ہیں۔لیکن ان کے خیال میں موجودہ پاکستانی ثقافت پر اس کے کوئی تہذیبی اثرات نظر نہیں آتے۔"(2)

پاکستان کی علاقائی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں سَفر نامہ نگاروں کا کردار بہت مثبت ہے۔پاکستان کی علاقائی ثقافت کو پوری طرح اُجاگر کرنے میں سَفر ناموں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے سندھ جیسے قدیم اور عظیم صوبے کی ثقافت کو جس باریکی سے پیش کیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

اس باب کا مقصد اُردو سفر ناموں میں صوبہ سندھ کی علاقائی ثقافت کی پیش کش ہے۔تاکہ یہ قدیم خطے جو ثقافتی عوامل سے مالامال ہیں، سامنے آسکیں۔سندھ کے تمام شہر اپنی قدامت کی داستان سُناتے ہیں۔اس باب میں اُردو سفر ناموں کے تناظر میں سندھ کی ثقافت کو اُجاگر کیا گیا ہے اور اردو سفر ناموں میں سندھ کی ثقافت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

آب وہوا، خوراک، مذہب، رہن سہن، زبان، پیشے، رسم ورواج ان تمام ثقافتی عوامل کو اُردو سفر نامہ نگاروں نے بخوبی بیان کیا ہے۔اُردو سَفر ناموں میں سندھ ثقافت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

دُنیا کے تمام خطے اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اسی طرح ایک صوبے میں بسنے والے تمام علاقے ایک دوسرے سے ہر لحاظ سے مختلف ہیں اور ان کی یہی انفرادیت انھیں ایک دوسرے سے مُنفرد

بنا دیتی ہے۔صوبہ سندھ کے شہر کراچی کو آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا بڑا شہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس کا رقبہ 3527 مربع کلومیٹر ہے۔صوبہ سندھ کے اِضلاع بدین، تھرپارکر، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈوالہ یار ، ٹھٹھہ، جام شورو، جیکب آباد، حیدر آباد، خیر پور، دادو، سانگھڑ، سکھر، شکارپور، شہداد کوٹ، کمبر، عمر کوٹ، کراچی، کشمور، گھوٹکی، لاڑکانہ، مٹیاری، میر پور خاص، نواب شاہ اور نوشہر وفیروز مشہور ترین ہیں۔

وادی سندھ کی تہذیب (موہن جوڈارو) کے ذکر کے بغیر صوبہ سندھ کا تذکرہ نا مکمل ہے۔وادی سندھ جسے ہم قدیم ہڑپہ کی تہذیب بھی کہتے ہیں۔اس کے سیاسی ،سماجی ،مذہبی ،ثقافتی پہلو کیا تھے۔ تین اہم قدیم تہذیبیں ہیں :

1. مصری تہذیب
2. میسوپوٹامیہ کی تہذیب
3. وادی سندھ کی تہذیب

وادی سندھ کا تمدن اسے ہم ہڑپہ کی تہذیب کہتے ہیں۔اس تمدن کی کھدائی ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ سرجان مارشل کی نگرانی میں 1921 سے 1927ء میں پہلی بار ہوئی۔موہن جوڈارو اور ہڑپہ کی کھدائی کے دوران حاصل ہونے والے اوزار ،برتن ،عمارتیں وغیرہ میں کافی یکسانیت تھی۔یہ دونوں علاقے چوں کہ دریائے سندھ سے کافی قریب تھے۔اس لیے ماہرین آثارِ قدیمہ نے ان تہذیبوں کو ہڑپہ کی تہذیب یاوادی سندھ کی تہذیب کا نام دیا۔بہت سے مقامات پر مرحلہ وار کھدائی کرائی گئی۔

سرمور ٹیمر وھیلر لکھتے ہیں :

"ارتقا یافتہ شہری زندگی کے ابتدائی دور کا آغاز ہمالیہ کے نیچے کے خطے میں ہوا۔اپنی اولین اور وسیع تر جائے وقوع کی بنا پر اس تہذیب کا نام وادی سندھ کا تمدن پڑا۔

1921 ء کے بعد سرجان مارشل اور اس کے ساتھیوں نے جو آثارِ قدیمہ دریافت کیے ان سے ہندوستان کو ماقبل تاریخ عہد کے تقریباً 2 ہزار زریں سالوں کا اضافہ ہوگیا اور دُنیا کو اس کی تین قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک سب سے بڑی تہذیب کا علم ہوا۔"(3)

ماہرینِ آثارِ قدیمہ لفظ تہذیب کا استعمال ایک مخصوص جغرافیائی خطے اور مخصوص دور میں پائی جانے والی منفرد انداز کی اشیا کے مجموعے کو دیکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ہڑپہ کی تہذیب سے حاصل ہونے والی منفرد اشیا میں مہریں ،وزن کے باٹ ، کشتی نما مہر ،موتی ،پتھر کے ہتھیار ،تانبے کے اوزار ، پتھر ،پختہ اینٹیں ہیں۔

دُنیا کی قدیم تہذیبوں کے آغاز وارتقا اور نشوونما میں وہاں کے دریاؤں کا اہم کردار رہا ہے۔دنیا کی قدیم تہذیبوں نے دریاؤں کے قرب وجوار میں جنم لیا ہے۔انھی تہذیبوں نے فروغ پایا اور بامِ عروج تک پہنچیں۔وادی سندھ کی تہذیب کو اس لیے وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے کہ یہ آج سے پانچ ہزار سال قبل دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں جہلم ،چناب ،راوی ،بیاس ، ستلج اور دریائے ہاکڑہ کے ملحقہ علاقوں میں پروان چڑھی۔وادی سندھ کی تہذیب کے آثار صوبہ پنجاب میں ہڑپہ ، گنویر والا اور جلیل پور ،صوبہ سندھ میں موہن جوڈارو ،کوٹ دیجی ،چھانو دڑو اور ستکاجن دڑو ،صوبہ سرحد میں رحمان ڈھیری اور بنوں میں ترکئ قلعے تک پھیلے ہوئے ہیں۔حالیہ تحقیق کے مطابق ڈاکٹر رفیق مغل نے پاکستان میں وادی سندھ کی تہذیب کی تقریباً 363 بستیاں دریافت کی ہیں۔

ہڑپہ شہر کے تمام دریافت شدہ آثار ایک منظم منصوبہ بندی کی عکاسی کرتے ہیں۔مغرب میں بالائی شہر جو زیادہ تر کچی اینٹوں کے اُونچے چبوترے پر آباد تھا مشرق کی طرف شہر زیریں جو دراصل رہائشی علاقہ تھا۔شہر کی بڑی گلی کارخ شمالاً جنوباً تھا شہر کے اردگرد فصیل بنی ہوئی تھی۔گلیوں کی چوڑائی ایک خاص تناسب سے رکھی جاتی تھی۔تمام بستیوں میں استعمال ہونے والی اینٹوں کے سائز ایک ہیں۔

بقول سر مورٹیمر وھیلر :

> ”مکانوں کی ایک خصوصیت تھی۔بغیر کھڑکیوں کی بیرونی دیواریں دروازے بڑی سڑکوں کی بجائے تنگ گلیوں کی طرف کھلتے تھے۔بعد کے کسی عہد میں شہر کے اندر کہیں کہیں بھٹیاں یا بھٹے بنائے جاتے تھے۔ان کی ایک خصوصی مثال دائیں طرف دیکھی جاسکتی ہے۔کنویں

سب ہی عہدوں میں عام تھے۔اینٹوں کا نفیس کام ان کی ایک خاص
بات ہے۔"(4)

ساڑھے چار ہزار قبل آباد موہن جوڈارو کراچی کے شمال میں 300 میل کے فاصلے پر ہے۔سندھی زبان میں موہن جوڈارو کا مطلب مردوں کا ٹیلہ ہے۔5000 سال قبل مسیح یہ شہر سات بار تباہ ہوا اور پھر تعمیر ہوا۔موہن جوڈارو سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا۔2500 ہیکٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔یہ شہر طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ان کھنڈرات میں زندگی گزارنے کی تمام سہولیات ملیں گی جو اس دور کا انسان تصور کر سکتا ہے۔پختہ مکانات ، کشادہ بازار ،کشادہ سڑکیں ،شہر کی حفاظت کے لیے فصیل بھی بنائی گئی تھی۔ماہرینِ کہتے ہیں کہ منصوبہ بندی کے تحت بنائے گئے شہر کی یہ پہچان ہے۔تمام شہر جدید ٹاؤن پلاننگ جیسا ہے۔پورا شہر ایک گلی سے نکلتا ہے۔خودروگاؤں نظر آتے ہیں۔تمام گلیاں ایک دوسرے کو 90 کے زاویے پر کاٹتی ہیں۔ٹیڑھی میڑھی گولائی میں بنی گلیاں خود روگاؤں کی نشانی ہیں۔آج بھی ان گلیوں میں چلیں تو ایک پلان کا احساس ہوتا ہے۔قطار در قطار پکی اینٹوں سے بنے گھروں میں کنویں کے ذریعے صاف پانی کی سہولت موجود تھی۔بیت الخلا اور مکانوں سے گندے پانی کی نکاسی کے لیے گھروں میں بنی زیرِ زمین نالیاں آج بھی سینکڑوں سالوں بعد جوں کی توں موجود ہیں۔

سر مور ٹیمر وھیلر "وادی سندھ اور تہذیبیں" میں لکھتے ہیں :

"مکانوں میں پہلی یا دوسری منزل پر بیت الخلا ہوتا تھا۔جس کے ساتھ نالیاں بنی ہوئی تھیں۔یہ آگے جاکر بڑے نالوں میں گرتی تھیں۔موہن جوڈارو اور دوسرے مقامات پر اینٹوں کی بنی ہوئی نالیاں وادی سندھ کی تہذیب کی ایک خصوصیت ہیں۔ان کے ڈایزئن بڑی تفصیل سے بنائے گئے ہیں۔یہاں تک کہ معائنہ کے لیے بہت صفائی سے تیار کیے گئے سوراخ بھی ہیں۔"(5)

یہ تہذیب ایک وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔دو حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔پہلا حصّہ چھوٹا تھا مگر اونچائی پر آباد تھا۔دوسرا حصہ کافی بڑا مگر نشیبی علاقے کا نام دیا ہے۔قلعہ بڑی عمارتوں

پر مشتمل تھا۔ یہ علاقہ پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ قلعے کے چاروں طرف فصیلیں تھیں جو اسے رہائشی علاقے سے الگ کرتی تھیں۔ آج بھی اس علاقے کے اندر رہائشی عمارتوں کے کھنڈر موجود ہیں۔

بہت سی عمارتیں پلیٹ فارم پر بنائی گئی تھیں۔ جو ان کی بنیاد کا کام کرتی تھیں۔ گھر کے چاروں طرف کمرے اور آنگن بنا ہوتا تھا۔ آنگن میں کھانا پکانے اور بنائی کا زیادہ تر کام کیا جاتا تھا۔

محمد ادریس صدیقی لکھتے ہیں :

> ”رہائشی مکانات کم سے کم دو کمروں پر مشتمل ہیں لیکن بعض کافی وسیع و عریض ہیں۔ ان مکانات کی بیرونی دیواریں بالکل سادہ ہیں اور ان میں داخل ہونے کے دروازے چوڑی سڑکوں کے بجائے گلیوں میں کھلتے ہیں عام مکانات کا رقبہ 2 x 30 فٹ تھا جن میں 4 یا 5 کمرے ہوتے تھے۔ بڑے مکانات اس کے دوگنے رقبہ پر مشتمل ہوتے اوراسی مناسبت سے ان میں زیادہ کمرے بنائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض مکانات میں 3 کمرے تھے۔“(6)

خاص طور پر گرمی کے موسم میں زیادہ تر گھروں میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گھر دو منزلہ تھے۔ گھروں میں کنویں بھی ہوتے تھے۔ موہن جوڈارو اور ہڑپہ کی تہذیبی عمارتیں بہترین منصوبہ بندی کا امتزاج ہیں۔ ہڑپہ تہذیب میں استعمال کی گئی اینٹیں آگ میں پکائی ہوئی یا دھوپ میں سکھائی ہوئی تھیں۔ یہ تمام اینٹیں ایک سائز کی تھیں ، یہ اینٹیں ہڑپہ کی تہذیب میں ملتی ہیں۔ یہی حال موہن جوڈارو کا ہے۔ ہر گھر میں حمام خانہ تھا۔ جو سڑک کے کنارے بنایا جاتا تھا تا کہ پانی کی صحیح نکاسی ہو سکے۔ سب مکانوں میں کنویں تھے۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ موہن جوڈارو میں 700 کنویں تھے۔ موہن جوڈارو میں کئی منزلہ عمارتیں تھیں۔ کنویں تیسری منزل تک جا رہے تھے۔ اتنی تہذیب یافتہ قوم کے اندر بھی امیر اور غریب کا فرق موجود تھا۔ مال دار حکومتی اور اثر و رسوخ والے افراد مرکز شہر جب کہ غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے شہر سے باہر رہتے تھے۔ پوش علاقے کے گھروں میں کم از کم ایک غسل خانہ ضرور ملے گا۔ امیروں کے گھروں میں صحن بھی لازمی تھا۔ صحن کے اطراف میں چھوٹے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے ان گھروں کے کچرے کو ٹھکانے لگانے کا انتظام بھی تھا۔ گھر کی بیرونی دیوار میں موجود سوراخ کے ذریعے کوڑا کرکٹ باہر پھینکا

جاتا تھا ،جو صفائی کا عملہ لے جاتا تھا۔ٹوائلٹ جو فلش ہوتا تھا۔موہن جوڈارو کے گھروں میں فلش سسٹم موجود تھا ڈھائی ہزار قبل مسیح پہلے بھی یہ لوگ کانسی جیسی دھات کا استعمال جانتے تھے۔بعض گھروں میں کمروں کے ساتھ اوزار اور مختلف اشیا بناتے تھے اور بر آمد کیا کرتے تھے۔موہن جوڈارو کے کسان کپاس کی فصل کاشت کیا کرتے تھے اور یہاں کے کاری گر کپڑا بننے کا فن بھی جانتے تھے۔ماہرِ آثار قدیمہ ڈاکٹر سر جان اور مارشل نے اس کی کھدائی کی۔ موہن جوڈارو مصر میسو پوٹا میہ جیسی تہذیبوں کا ہم عصر تھا۔ میسو پوٹامیہ سے ملی تحریروں میں مشرق میں ملوہانامی ایک جگہ کا ذکر ملتا ہے جس کے ساتھ تجارتی روابط قائم تھے۔ماہرین کا خیال ہے کہ موہن جو ڈارو ہی وہ جگہ ہے جہاں سے 1200 مہریں ملی ہیں ان پر جانوروں اور دیو مالائی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ایک کانسی کا بنا ہوا رقاصہ کا مجسمہ بھی ملا ہے۔جس نے دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں جو آج بھی چولستان او رتھر کی خواتین کا رواج ہے۔اس کے علاوہ ایک راہب کا مجسمہ بھی ملا ہے۔لباس کے بارے میں اتنے آثار نہیں ملے پر ماہرین کی رائے ہے کہ اوپری حصّے کے لیے شال استعمال کرتے تھے۔مرد دوھتی پہنتے تھے ،نیکلس ،کڑے ،انگوٹھیاں استعمال کرتے تھے۔ان لوگوں کے زیورات سونے ،چاندی ،ہاتھی دانت اور قیمتی پتھروں کے ہوتے تھے جب کہ غریب لوگ سیپیاں ،ہڈیاں اور تانبے کے زیورات زیب تن کرتے تھے۔موہن جوڈارو اور ہڑپہ سے ملنے والی چیزیں ایک دوسرے سے مشابہہ ہیں۔

بقول محمد ادریس صدیقی:

> ”موہن جوڈارو اور ہڑپہ کی کوزہ گری میں زبردست مماثلت ہے۔اگر ان دونوں مقامات سے دریافت شدہ حذف ریزے ایک جگہ جمع کیے جائیں تو یہ امتیاز کرنا یقیناً نا ممکن ہو گا کہ کون سا کپڑا ہڑپہ کا ہے اور کون سا موہن جوڈارو کا ہے۔“ (7)

موہن جوڈارو اور ہڑپہ کے زیریں حصّوں سے جو تہذیب کے قدیم ترین دور کے مظہر ہیں۔تانبے اور کانسی کی بنی ہوئی لاتعداد چیزیں ملی ہیں۔جو گھریلو استعمال کے برتنوں ،کلہاڑیوں ، خنجر ، چاقو ، برچھے ،کٹار ، تیر ،درانتی ، مجسمے ،چوڑیاں ،انگوٹھیاں ،کانوں کے آویزے ،تار وغیرہ ، وادی سندھ کی تہذیب کو کانسے کے عہد کی تہذیب کہا جاتا ہے۔یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کے پیشے سے

منسلک تھے۔یہاں کی قدیم کاشت کاری اور فصلوں کا اندازہ دریافت شدہ باقیات سےلگایا جا سکتا ہے۔یہاں گیہوں اور جو کے ایسے جلے ہوئے دانے ملے ہیں جو خودرو نہیں ہیں بلکہ اسی قسم کا گیہوں آج بھی مغربی پاکستان میں اُگایا جاتا ہے۔ایسا ہی جو مصر کے قدیم حکم رانوں کی قبروں میں بھی دستیاب ہوا ہے۔

بقول محمد ادریس صدیقی :

> "یہاں گیہوں اور جو کے علاوہ چاول اور دالیں بھی اُگائی جاتی ہوں گی اور ان کے ساتھ ساتھ ترکاریاں بھی زائد فصل کی حیثیت سے بوئی جاتی ہوں گی۔دودھ کی فراوانی گائے اور بکری کی موجودگی سے ظاہر ہے۔غلّہ اور ترکاریوں کے علاوہ جانوروں کا گوشت بھی کھایا جاتا ہو گا۔کیوں کہ یہاں کی گلیوں ،سڑکوں اور مکانوں میں گائے ،بیل ، بھینسے ،بکری دریائی اور سمندری مچھلی گھڑیال اور کچھوے کی لاتعداد ہڈیاں ملی ہیں۔"(8)

ضلع لاڑکانہ میں موہن جوڈارو ریلوے اسٹیشن سے تقریباً 14 کلو میٹر کی دوری پر ایک ٹیلہ ہے۔جس کو موہن جوڈارو یعنی مردوں کا ٹیلہ کہتے ہیں۔اس تہذیب کے آثار 1911 میں ظاہر ہوئے اور 1922ء میں اس کی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ثقافتی اعتبار سے اس تہذیب کا موازنہ مصری تہذیبوں سے کیا جاسکتا ہے۔رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے کشادہ تہذیب ہے۔شہری منصوبہ بندی کو دیکھ کر ان کی تہذیب کے متوالے اس قدیم شہر کے ماضی کی منفرد تہذیب کا مشاہدہ کرنے کے لیے دنیا بھر میں سے یہاں آتے ہیں اور اس عظیم شہر کی تاریخ اور تہذیب کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔یہ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب اس شہر کے اعلیٰ ذوق کی نشان دہی کرتی ہے۔یہاں کے تعمیر شدہ مکانات ،گلیاں ،سڑکیں سب منفرد نوعیت کی حامل ہیں۔

ماجد فرید ساٹی سفر نامہ "مناظرِ پاکستان" میں موہن جوڈارو کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "1922ء سے قبل کون جانتا تھا کہ لاڑکانہ او رڈوکری کے مقام پر ویران اور بے ڈھنگے ٹیلے میں تاریخ اور تہذیب کا ایک باب دفن ہے۔اس سرزمین کے دل میں ایسی قوم کی تہذیب مدفون ہے۔جس

کے وجود اور تہذیب کو کسی عمل نے نابود کر دیا تھا جو پانچ ہزار سال قبل کی تہذیبوں کے نقیب تھے۔اس شہر سے برآمد ہونے والے مجسمے راہب ،رقاصہ ،چوڑیاں ،گھونگھے ،ہار ، ظروف اور گوتم بدھ کا مجسمہ اس شہر کے اعلیٰ ذوق کی نشان دہی کرتے ہیں۔اس شہر کا سب سے اونچا مقام ٹیلہ ہے۔جو پچاس فٹ اونچائی پر واقع ہے جو شاید قلعہ ہوگا۔شہر کی سڑکیں 35 فٹ سے زیادہ کشادہ تھیں۔پانی کے استعمال کے لیے لوگوں نے گھروں میں کنویں بھی کھودے ہوئے تھے۔اس شہر میں تعمیر شدہ مکانوں کی ایک خصوصیات یہ تھی کہ بیرونی دیواروں اور دروازے بڑی سڑکوں کی بجائے تنگ گلیوں میں نکالتے تھے تا کہ بڑی سڑک پر رکاوٹ نہ ہو۔"(9)

موہن جوڈارو میں لباس سے متعلق بہت کم مواد حاصل ہوا ہے۔کیوں کہ کپڑا زیادہ دنوں تک زیرزمین دفن رہنے پر دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں اور زمین کے کھاد کی نظر ہو جاتا ہے۔چناں چہ وادی سندھ میں کوئی کپڑا دریافت نہیں ہوا۔لیکن یہاں ہر گھر میں سوت کا تنے کی تلکیاں برآمد ہوئی ہیں۔

بقول سر مور ٹیمر وھیلر :

"موہن جوڈارو ایک صنعتی مرکز تھا۔کپڑا بُننا ایک اہم صنعت تھا۔اس کا ثبوت لوگوں کے گھروں سے ملنے والے چرخوں سے ہوتا ہے۔یہ کپڑوں کو رنگنے کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔"(10)

یہاں مختلف نسلوں کے لوگ رہا کرتے تھے اور خیال ہے کہ ان کے لباس بھی مختلف رہے ہوں گے مگر ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی باقیات اس سلسلے میں ہماری زیادہ مدد نہیں کرتیں۔صرف چند مجسمے اور برتنوں پر بنے ہوئے نقوش ہی یہاں کے باشندوں کے طریق لباس کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لباس کی ترتیب ڈائزائن سے یہ لوگ بیگانہ نہ تھے۔جو مورتیاں اور مجسمے ملے ہیں وہ البتہ برہنہ ہیں۔ہو سکتا ہے ایسا وہاں کا رواج ہو اور رقص کرتے ہوئے وہ رقاصائیں برہنہ ہو جاتی ہوں۔

محمد ادریس صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"مٹی کی ایسی لاتعداد نسوانی مورتیاں ملی ہیں۔جن کے جسم کے اُوپر کوئی کپڑا نہیں البتہ ان کے گلے اور سینے پر لاتعداد ہار اور مالائیں پڑی ہوئی ہیں۔اسی طرح ان کے ہاتھ میں لاتعداد چوڑیاں ہیں۔لیکن یہ مورتیاں مادرارض کا مجسمہ ہیں جن کی تقدیس ستر پوشی اور عریانیت کی قید و بند سے آزاد سمجھی جاتی ہوں گی۔اس کے علاوہ کانسی کے بالکل عریاں مجسمے ملے ہیں۔جن کو رقاصوں کا مجسمہ کہا گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ قدیم رقاصاؤں کی طرح بعض رقصوں میں وادی سندھ کی رقاصائیں رقص کے وقت برہنہ رہتی ہوں۔لیکن ان مجسموں کی روشنی میں یہاں کی عورتوں کی نیم عریانیت یا عریانیت کے بارے میں آخری فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔"(11)

مرد یہاں کے معمولی کپڑے پہنتے تھے۔نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے۔لیکن عام پوشاک کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔کیوں کہ بعض مجسمے برہنہ اور بعض میں ستر کے لیے ایک پتلی سی پٹی نظر آتی ہے۔یہاں کے لوگ سوتی کپڑے کے علاوہ کینوس کی طرح کے موٹے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ہو سکتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگ اسے در آمد کرتے اور استعمال کرتے ہوں۔امیر لوگوں کے زیورات سونے ،چاندی ، ہاتھی دانت اور قیمتی پتھروں کے ہوتے تھے۔موہن جوڈارو سے ملنے والے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ معاشی طور پر یہ ایک خوش حال شہر تھا۔

ماجد فرید ساٹی سفر نامہ " مناظرِ پاکستان" میں رقم طراز ہیں :

"یہاں کی خواتین بناؤ سنگھار اور زیورات کی دل دادہ تھیں۔جن کا اندازہ کھدائی کے دوران بر آمد ہونے والے زیورات اور سُرمے دانیوں سے ہوتا ہے۔دل بہلانے کے لیے کھلونے بھی ہوتے ہیں۔جانوروں کی مورتیوں میں سب سے زیادہ بیل گاڑی دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"(12)

یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے گندم ،چاول، کپاس ، گیہوں ، مکئی ،ترکاریاں وغیرہ کا استعمال کرتے تھے۔درانتی کا استعمال بھی اسی سے ہوا۔لوگ کھیتوں میں آب پاشی بھی کرتے

تھے۔لوگ بیل ، گائے، بھینس ، بکری ، بھیڑ اور اونٹ جیسے جانور پالتے تھے۔موہن جوڈارو تجارت کا بھی ایک بڑا مرکز تھا۔ نقل وحمل کے لیے بیل گاڑیوں کا استعمال کیاجاتا تھا۔بیرون ملک تجارت پانی کے راستے ہوتی تھی۔ مجسمہ سازی میں بھی یہ لوگ بہت ماہر تھے۔ان کا ذوق کمال کا تھا۔ایک مجسمہ جو مذہبی پیشوا کا لگتا ہے۔اس کا چہرہ بارعب تھا۔داڑھی تراشی ہوئی پیشانی تنگ اور مونچھ منڈی ہوئی ہے۔ان مورتیوں میں سب سے مشہور اور عالمی شہرت کی حامل مورتی رقاصہ کی ہے۔اس نے گلے میں ہار اور بازو میں کنگن پہنے ہوئے ہیں۔اس شہر سے نکلے ہوئے برتن دجلہ اور فرات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہڑپہ تہذیب سے ملنے والی کچھ چیزیں مصر اور میسو پوٹامیہ سے بھی دستیاب ہوئی ہیں۔کچھ مہریں ماہرین کو بندر گاہ کے پاس سے برآمد ہوئی ہیں۔یہی نہیں وہاں کے دیگر حصوں میں اس طرح کی مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ہڑپہ تہذیب کے لوگ ناچ گانے کے شوقین تھے۔وہ پاسا کا کھیل جانتے تھے ،بچے مٹی کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ان کے کھلونوں میں پرندے ، گاڑیاں ،رتھ اور انسانی تصاویر شامل تھیں۔مچھلی پکڑنا شکار کرنا اور پرندے اُڑانا ان کا دل چسپ مشغلہ تھا۔ہڑپہ تہذیب کےلوگ تعلیم یافتہ تھے۔اس کا ثبوت تختیوں سے پتہ چلتا ہے۔گھریلو چیزوں اور مٹی کے برتنوں پر بھی یہ تحریر ملتی ہے۔ہڑپہ تہذیب کی زبان اور تحریر کے بارے میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہاجاسکتا۔رسم الخط کے جو نمونے ملے ہیں وہ آج تک پڑھے نہیں جاسکتے ہیں۔

بقول ماجد فرید ساتی:

> ”موہن جوڈارو کےلوگ جو تحریر سے بھی آشنا تھے مگر رسم الخط کے ماہرین اب تک انھیں پڑھنے سے قاصر ہے۔“(13)

ہنٹر کے مطابق یہ تحریر براہوی زبان کی ابتدائی تحریر ہیں۔اس زبان میں 600 سے زائد حروف پائے جاسکتے ہیں جن میں 60 بنیادی ہیں۔باقی تبدیل ہوجانے والے ہیں۔موہن جوڈارو کے زوال کے بارے میں ماہرین مختلف رائے رکھتے ہیں۔کٹی پھٹی لاشوں سے لگتا ہے کہ بیرونی حملہ آوروں نے انھیں نیست و نابود کردیا تھا۔عالموں کاخیال ہے کہ یہ زلزلے کا شکار ہوئیں۔قطعی طورپر کچھ نہیں کہہ سکتے۔موہن جوڈارو اور بوتھل میں سیلاب کی تباہی کے کچھ آثار ضرور ملے ہیں۔7 بار اجڑ کر یہ شہر 2500ق م میں بسنے والا یہ شہر 1500 میں صفحہ ہستی سے مٹ چکا تھا۔کوئی ایک ہزار سال یوں گزرے اور پھر بت مت کے پیروکار یہاں آئے اور تباہ شدہ شہر کی اینٹیں جمع کر کے اپنے لیے رہائشی

منصوبہ اور عبادت کے لیے اسٹوپا تعمیر کیا۔یہی اسٹوپا موہن جوڈارو کی تصویری علامت کے طور پر جانا جاتا ہے موہن جوڈارو کا اکثر حصّہ ابھی ابھی زیرِ زمین ہے۔جو آثار ملے ہیں وہ اصل شہر کا صرف 10 فیصد ہیں۔ سیم و تھور کی وجہ سے نئی کھدائی ممکن نہیں۔ان کی بقا اسی میں ہے کہ وہ زیرِ زمین رہیں۔

اس باب کا مقصد صوبہ سندھ کے تمام اِضلاع کی ثقافت کی پیش کش ہے۔اس باب میں ہم نے موضوع کی مناسبت سے جن سفر ناموں کو شامل کیا ہے۔ان میں ''اور سندھ بہتا رہا''، ''میرا سندھو سائیں''، ''شیر دریا''، ''بلوچستان و سندھ''، ''یاترا''، ''سفر نامہ پاکستان''، ''سندھو کنارے''، ''ماروی کے دیس میں'' ہیں۔یہ سفر نامے سندھ کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

سفر نامہ ''سندھ بہتا رہا'' اس سفر نامے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مصنف نے گاہے بگاہے موقع کی مناسبت سے اپنے سابقہ ناولوں اور سفر ناموں کا جن میں ''اندلس میں اجنبی''، ''غارِ حرا میں ایک رات'' اور ''راکھ'' سمیت دیگر سفر نامے شامل ہیں، کا بھی اس میں ذکر کیا ہے۔اس انداز سے اس سفر نامے میں ایک فکشن کی سی کیفیت پیدا ہوتی محسوس ہوتی ہے۔سندھ کا یہ سفر نامہ گو کہ کچھ مختصر ہے لیکن تارڑ صاحب نے سندھ کی قدیم ثقافت اور تاریخ کو زندہ کرنے کی بہترین کوشش کی ہے اور سابقہ سفر ناموں کی نسبت یہ سفر نامہ زیادہ پُراثر اور دل چسپ انداز میں لکھا ہے۔

اگر کوئی بھی سندھ کو تاریخی انداز میں کھوجنے کا متلاشی ہو تو وہ یہ سفر نامے اس کے لیے اہم سنگِ میل ثابت ہوں گے۔ مستنصر حسین تارڑ کے تمام سفر ناموں میں سے شاید سندھ کا یہ سفر نامہ ''اور سندھ بہتا رہا'' سب سے مُنفرد اور لاجواب سفر نامہ ہے۔بہت کم سفر نامے ایسے ہوتے ہیں جو قاری کو دورانِ مطالعہ ہی ان مقامات تک پہنچنے کے شوق اور حسرت میں مُبتلا کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ایسے سفر نامے جن میں تاریخ، جغرافیہ، ثقافت اور معلومات ہونے کے ساتھ ساتھ اَدب، منظر نگاری اور کردار سازی بھی ہو ، موجودہ دور میں ایسے سفر نامے بہت کم لکھے جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ سفر نامہ اسی نوعیت کا ہے کہ جس میں آپ سفری احوال کے ساتھ ساتھ تاریخ اور اَدب سے بھی واقفیت حاصل کر پاتے ہیں۔''اور سندھ بہتا رہا'' پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ بہاتا چلا جاتا ہے۔

ذوالفقار علی احسن، مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے قارئین بہت دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔کیوں کہ وہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس میں بارہ مصالحوں کی

چاٹ شامل کر دیتے ہیں وہ شاید جانتے ہیں کہ قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے۔ آج کے قاری کی وہی خواہش ہے کہ گھر بیٹھے بیٹھے سیر بھی کر لی جائے اور جنس کے حوالے سے چٹخارے دار باتوں سے اس کی ذہنی عیاشی بھی ہو جائے گویا مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث ہیں۔"(14)

دریائے سندھ صدیوں پرانی روایتوں کا امین ہے۔"شیر دریا" رضا علی عابدی کا ایک سفری کارنامہ ہے۔ یہ وہ سفر نامہ ہے جو اُنھوں نے لداخ سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے طے کیا ہے۔ یہ وہ سفری رُوداد ہے جس میں دریائے سندھ کے کنارے آباد گاؤں، قصبوں اور شہروں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس سفر نامے میں دریا کنارے آباد لوگوں کی تہذیبی و تاریخی، ثقافتی، اَدبی، سیاسی، مذہبی، معاشی، زندگی کی عکاسی کی گئی ہے ان لوگوں کی زبان، بود و باش، رہن سہن شادی بیاہ اور دُکھ سُکھ میں زندگی بتانے کے رنگ موجود ہیں۔

بقول شان الحق حقی:

"آپ کا گہرا مشاہدہ موضوع سے گہری دل چسپی تاریخ سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ عصری احوال سے پوری وابستگی، آثار و باقیات پارینہ کے علاوہ موجودہ حالات اور جیتے کرداروں سے مخلصانہ ارتباط، ان کے دل چسپ اور نکتہ خیز مکالمے، غرض کیا کچھ نہیں، پھر آپ کا شگفتہ اندازِ بیان، سادہ و شائشتہ رواں دواں پر اثر، گویا اَدب کی جان، اتنی باتیں کسی تصنیف یا تالیف میں کم ہی جمع ہوتی ہیں۔ یہ بات کسی ڈرائنگ روم کے مطالعے یا سٹڈی میں لکھی ہوئی تحریر میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک نادر اَدبی کارنامہ ہے۔ جس کی اَدبی حیثیت دستاویزی حیثیت سے کم نہیں۔"(15)

"میر اسندھو سائیں" ڈاکٹر عباس برمانی کا لکھا سفر نامہ ہے۔"میر اسندھو سائیں" میں دریائے سندھ کی داستان ہمارے سامنے بکھری ہوئی ہے۔ اس میں غموں کا بین بھی اور خوشیوں کے شادیانے بھی ہیں۔ سندھ کی دل چسپ ثقافت کو اُنھوں نے بہت خوب بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عباس برمانی نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور سندھو سائیں کی سچی داستان قارئین تک پہنچی اور سندھو سائیں کی ثقافت کے رنگ نظر آئے۔

بقول مستنصر حسین تارڑ:

"عباس برمانی اور سندھو سائیں اصل میں دونوں ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ چناں چہ ہم یہ سفر کتھا کبھی عباس برمانی کی زبانی سنتے ہیں اور کبھی سندھ بولنے لگتا ہے۔ عباس کا ہمہ جہت شعری ذوق اور اس کی پر اثر جادوانی تحریر پڑھنے والے کو زیر کر لیتی ہے۔ یہ تحریر محض لفظوں کی شعبدہ بازی نہیں بلکہ اس میں سندھ کی گہرائی اور زندگی حسن و فریب گندھے ہوئے ہیں۔"(16)

"سفر نامہ "بلوچستان و سندھ ایک غیر ملکی ہنری پوٹنگر کی تحریر ہے۔ اس سفر نامے کا سلیقہ مندانہ ترجمہ پروفیسر ایم رومان نے کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں بلوچستان اور سندھ کا سفر سیاسی مقاصد کے لیے اختیار کیا تھا۔ ان کا سفر نامہ "بلوچستان و سندھ "کا سفر نامہ "بلوچستان و سندھ "کی سرکاری سفر کی رُوداد ہے اور اس میں اس خطے کے لوگوں کے اطوار و عادات، قبیلہ وار تقسیم اور مزاج کو دریافت کرنے کی عمدہ کاوش کی گئی ہے۔ ان کا نظریہ اگرچہ محدود ہے لیکن تجربہ با معنی ہے۔ اس سفر نامے میں ثقافت کا بیان قدرے کم ہے۔ زیادہ تر یہ سفر نامہ جغرافیے اور تاریخ کو بیان کرتا ہے۔

محمد خالد اختر کا سفر نامہ "یاترا" سرزمین تھر کے سفر نامے کی رُوداد ہے۔ اس سفر نامے میں دو سفروں کی رُوداد کو خالد اختر نے قلم بند کیا ہے۔ ایک اسلام کوٹ کا سفر نامہ جو کہ ابتدائی 100 صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا راولپنڈی کا سفر جو کہ 28 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلام کوٹ ایک مثالی آبادی پر مشتمل علاقہ ہے۔ اس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ چاہے ملکی حالات جتنے بھی کشیدہ ہوں اسلام کوٹ میں محبت و امن اور بھائی چارے کی فضا قائم رہی۔

خالد اختر کا انداز سیاحت الگ ہے وہ بیرونی منظر کشی کی بجائے انسان کے اندر بسی دُنیا عیاں کرنے کو فوقیت دیتے ہیں۔ بقول سہیل احمد خان:

"اجنبی زمینوں کی سیاحت کے برعکس محمد خالد اختر نے سرزمین وطن کو اپنے سفر نامے کا موضوع بنایا ہے۔ "یاترا" میں اپنے وطن کی مٹی کی باس اور اپنے ہم وطنوں کے سانسوں کی مہک ہے۔ وہی ہمارے دیکھے بھالے زمین و آسمان اور جانے پہچانے انسان ہیں۔ لیکن محمد خالد اختر کے کمالِ فن نے ہر چیز کو ایک نئی معنویت کی گڑتی دے دی ہے۔ جانے پہچانے مناظر اور کچھ

لوگ اجنبی سے لگنے لگ جاتے ہیں اور جہاں حقیقت کے وزن حیرت کدے
کی جانب کھل جاتے ہیں۔"(17)

"سفر نامہ پاکستان" کیمی پوا ایک غیر ملکی مصنفہ کی پاکستان کی سیاحت کی رُوداد ہے۔اس نے پورے ملک کا دورہ کیا اور اپنی اس روداد کو سفر نامے کی صورت میں قلم بند کیا ہے۔ جس کا ترجمہ محمد حسن نے کیا ہے۔اُنھوں نے کراچی، سندھ، حیدر آباد، موہن جو داڑو، کوئٹہ، ملتان، ہڑپہ، لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، ٹیکسلا، منگلا ڈیم، مری نتھیا گلی، کاغان، پشاور، سوات، گلگت، بلتستان، سکر دو سب جگہ کی سیاحت کی اور ان علاقوں کی ثقافت کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔22 عنوانات اُنھوں نے اس سفر نامے میں بیان کیے ہیں۔سفر نامہ "ماروی کے دیس میں" شکیل الدین کی تحریر ہے وہ سندھ کے باسی ہیں۔ تھر کی سر زمین تاریخ و ثقافت اور تہذیب و تمدن کی سر زمین ہے۔ تھر تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، جہاں علم و فن نے زندگی پائی۔"ماوری کے دیس میں" تھر کے سب رنگ موجود ہیں۔ شکیل الدین صدیقی ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے تھر پر لکھنے کی کاوش کی ہے۔

بقول محمد موسیٰ بھٹو:

"یہ نوجوان شکیل الدین صدیقی صاحب ہے۔ان کی پہلی کتاب پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔یہ کتاب اپنا تعارف خود ہی ہے۔پڑھنے والے مصنف کے مشاہدہ اور مطالعہ کی صلاحیت کا بآسانی اندازہ لگا سکیں گے۔ شکیل صاحب نے تھر کی عوامی زندگی اور تھر کے سادہ کلچر کی جس خوب صورتی سے تصویر کشی کی ہے، وہ لائق تعریف ہے۔ان کا یہ کام اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اُنھوں نے "ماروی کے دیس میں" کو اُردو داں طبقہ کے سامنے متعارف کرا کر سندھی اور اُردو داں طبقات کے درمیان موجودہ فاصلوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جس پر وہ تحسین کے مستحق ہیں۔"(18)

شکیل احمد صدیقی سندھ کے رہنے والے ایک مُنجھے ہوئے سفر نامہ نگار ہیں۔اُنھوں نے "ماروی کے دیس میں" اس سفر نامے میں تھر کی ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ان تمام رنگوں سے سفر ناموں کو موجزن کیا ہے۔ تھَر کی ثقافت بہت قدیم ہے۔ادبا نے تہذیب تھر کو اُجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

i. آب وہوا:

کسی علاقے کے ثقافتی عوامل میں آب وہوا ہی کو لیجئے صوبے کے تمام اضلاع میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ ایک صوبے کے تمام چھوٹے بڑے علاقے اس فرق کے زیرِ اثر نظر آتے ہیں۔ آب وہوا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی وہاں کے لوگ رہائش اختیار کرتے ہیں، پیشے اپناتے ہیں، خوراک کھاتے ہیں، لباس پہنتے ہیں، اپنی زندگی کا کلیہ متعین کرتے ہیں۔ طرزِ زندگی اختیار کرنے میں آب وہوا بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا آب وہوا کسی بھی علاقہ کی ثقافت کو بھرپور انداز میں متاثر کرتی ہے۔ بدین کو ہی لیجئے یہ علاقہ ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے "بادبان" کہلاتا ہے۔ شروع میں یہاں بدین لوگ رہتے تھے۔ ان کی مناسبت سے یہ علاقہ بدین کہلایا چوں کہ یہ ساحل سمندر پر ہے۔ سمندری ہواؤں کے مرہونِ منت گرم موسم سرد ہو جاتا ہے، فضا میں مون سون کے دنوں میں نمی شامل ہو جاتی ہے۔

گرمیوں میں درجہ حرارت 46 سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ سردیاں نومبر کے اوائل میں آتی ہیں۔ صوبہ سندھ کے جنوبی و مشرقی طرف آخری سرحد پر ضلع تھرپارکر ہے۔ پاکستان کا یہ سرحدی ضلع ہونے کی وجہ سے بڑا اہم ہے۔ تھرپارکر دو حصوں پر مشتمل ہے ایک نہری اور دوسرا ریگستانی۔ ریگستانی نہری علاقے کی آب وہوا معتدل اور ریگستانی حصے میں گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ہے۔ ٹنڈو محمد خان یہ علاقہ میر محمد خان تالپور نے آباد کیا تھا اور انہی کی نسبت سے اس علاقے کو ٹنڈو محمد خان کا نام دیا گیا۔ مئی تا اکتوبر موسم گرم رہتا ہے۔ درجہ حرارت عموماً 42 سینٹی گرید ہوتا ہے۔ سمندری ہوائیں موسم کو معتدل کرتی ہیں۔ جولائی تا ستمبر کی بارشوں کے بعد موسم سرد ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر موسم گرم ہی ہوتا ہے۔ جام شورو، شورو قوم کے سرکردہ جام کی وجہ سے علاقہ جام شورو کہلایا۔ یہاں کا موسم گرم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر سارا سندھ آب و ہوا کے لحاظ سے گرم ہے۔ جو علاقے سمندر کے ساتھ لگتے ہیں وہاں سمندری ہواؤں کی وجہ سے موسم خوش گوار ہو جاتا ہے، یہاں دن چاہے کتنا بھی گرم ہو راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ صوبہ سندھ کی گرمی سے متعلق ضرب المثل مشہور ہے کہ دھوپ ایسی تیز کہ انڈا بُھن جائے۔

> "عموماً سارے ملک میں ایسی شدید گرمی ہوتی ہے کہ افغانی اور شمالی بلاد کے لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ان میں یہ ضرب المثل موجود ہے کہ "سندھ کی دھوپ گورے کو کالا کر دیتی ہے اور ایسی تیز ہے کہ اس میں چاہے انڈا بھون لیجئے" (19)

ضلع جیکب آباد دُنیا کے گرم ترین خطوں میں شمار ہوتا ہے۔ گرمیوں میں اس کا درجہ حرارت 50 سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے اور سردیوں میں کم از کم 8 سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ جولائی، اگست میں بارشیں بھی ہوتی ہیں۔ حیدر آباد حیدر نامی، شخص کی نسبت سے پڑا اس کا قدیم نام نیرو کوٹ تھا جس کا وجود محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے بھی تھا۔ اپریل تا ستمبر نہایت گرم، اکتوبر تا نومبر معتدل جب کہ دسمبر، جنوری اور فروری میں سردی اور مارچ میں بھی موسم معتدل ہی ہوتا ہے۔

> "جیکب آباد میں سب سے زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ وسط علاقے کی آب و ہوا دریا کے سبب معتدل ہے۔ خصوصاً حیدر آباد کی آب و ہوا بڑی اچھی ہے۔ صحرائی حصّہ گرم ترین اور سرد ترین۔"(20)

خیر پور خیر الدین نامی شخص کے نام سے یہ علاقہ آباد ہوا۔ یہ ضلع صوبہ سندھ کے شمال میں ہے۔ یہاں بھی موسم گرم و سرد ہے۔ موسم گرما مارچ سے اکتوبر تک رہتا ہے۔ جون جولائی میں بقیہ سندھ کی طرح یہاں بھی شدید گرمی پڑتی ہے۔ 42 سینٹی گریڈ عموماً رہتا ہے۔ دسمبر، جنوری اور فروری میں سردی اچھی خاصی ہوتی ہے۔

> "بالائی سندھ کی طرح عموماً گرم اور سرد موسم ہیں۔ موسم گرما مارچ تا اکتوبر ہے گرم ترین مہینے جون اور جولائی ہیں۔ 47 تا 42 سینٹی گریڈ درجہ حرارت رہتا ہے۔ دسمبر جنوری اور فروری سرد ترین موسم ہیں۔ 25 تا 7 سینٹی گریڈ درجہ حرارت رہتا ہے۔"(21)

دادو نامی شخص نے یہ علاقہ آباد کیا۔ اس لیے یہ ضلع اسی کے نام سے منسوب ہے۔ ضلع کا درجہ حرارت گرمیوں میں شدید گرم اور سردیوں میں کافی سرد ہوتا ہے۔ بارشیں بھی اس ضلع میں اچھی خاصی ہوتی ہیں۔ ضلع سانگھڑ میں شدید گرم اور سردیوں میں سرد ہوتا ہے۔ بہار میں موسم بہت خوش گوار ہو جاتا ہے۔ خزاں کے موسم میں موسم متغیر ہوتا ہے اور بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ سکھر سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے اور دریا کے ساتھ ساتھ ہے۔ یہاں سخت گرمی پڑتی ہے۔ خزاں کا موسم بہت خراب ہوتا ہے اور لوگوں کو فصلی بخار بھی ہوتا ہے۔

> "سکھر نشیبی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی پر واقع ہے یہ جگہ صحت کے لیے نا مناسب ہے اس بات کی تصدیق بے شمار قبرستان سے بھی ہوتی ہے دو یورپی

قبرستان بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں پر قبریں بھری پڑی ہیں۔ مگر جب گرمی ہی اتنی زیادہ ہو تو ان اموات پر بھلا کون حیران ہوتا؟"[22]

شکارپور سندھ کا بڑا ضلع ہے۔ یہاں کا موسم بھی مئی اور جون میں سخت گرم اور جنوری قدرے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ عمر کوٹ بھی موسم کے اعتبار سے شدت رکھتا ہے۔ کراچی موسمی اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔ سمندر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے ہوامیں نمی کی وجہ سے موسم معتدل رہتا ہے۔ سارا سال سمندری ہوائیں چلتی ہیں۔ مئی اور جون گرم ترین مہینے ہیں۔ فروری کے آخر سے ہی گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ دسمبر، جنوری، فروری میں جب کوئٹہ کی یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں تو سردی ہوتی ہے اور درجہ حرارت 5 سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ کشمور، گھوٹکی یہ اضلاع سخت گرمی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔ درجہ حرارت 48 - 47 سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ لاڑکانہ، ضلع ٹمیاری یہ بھی گرم ترین علاقے ہیں۔ ضلع میرپور، ضلع نواب شاہ آب وہوا کے لحاظ سے بہت گرم علاقے ہیں۔ درجہ حرارت 48 سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ نوشہرو فیروز یہاں کا درجہ حرارت بالائی سندھ کی طرح ہے۔ مئی، جون اور جولائی گرم ترین اور دسمبر جنوری اور فروری سرد ترین ہو جاتے ہیں۔ درجہ حرارت 3 . 5 تک چلا جاتا ہے اور گرمیوں میں 8 . 3 سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ آب وہوا کے لحاظ سے سندھ چار موسموں میں تقسیم ہے۔

1. موسم سرما : دسمبر تا فروری
2. موسم گرما : مارچ تا جون
3. مون سون یا برسات کا موسم : جولائی تا ستمبر
4. موسم خزاں : اکتوبر تا نومبر

صوبہ سندھ کے موسم باقاعدگی کے خوگر ہیں۔ دریائے سندھ بھی موسموں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جو علاقے دریا کے ساتھ ساتھ ہیں وہاں کی آب وہوا معتدل رہتی ہے۔

بقول ہنری پوٹنگر:

"دریائے سندھ کے دھارے کی تیزی موسموں کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ خواہ وہ خشک ہوں یا تر اور جن علاقوں سے یہ گزرتا ہے وہ بھی اسے مُتاثر کرتے ہیں۔"[23]

جو علاقے دریا اور سمندر سے قریب ہیں وہاں کی آب و ہوا میں نمی زیادہ پائی جاتی ہے۔ چوں کہ آب و ہوا کسی بھی علاقے کی ثقافت پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سے ایک ہے۔ سندھ کی آب و ہوا ہر علاقے کی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں کے لوگ بھی ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ سندھ میں ہمیں کئی قسم کے موسم ملتے ہیں۔ کہیں دریا قریب ہے کہیں سمندر قریب ہے تو کہیں صحرا ہے۔ حیدر آباد کی آب و ہوا کو ہی دیکھیں حیدر آباد کی سڑکوں کے دونوں جانب اُونچے اُونچے درخت ہیں۔ جو گرمی کے دنوں میں سایہ مہیا کرتے ہیں۔ حیدر آباد کی آب و ہوا عموماً خوش گوار رہتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر جمیل حسین "سندھو کنارے" میں رقم طراز ہیں:

"حیدر آباد دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ جس کا قدیم نام نیرون کوٹ ہے اور نہ صرف تاریخی شہر ہے بلکہ اپنے اندر تاریخ کی کتنی ہی کتابیں سموئے ہوئے ہے، جہاں شام کی ہوائیں یک سرور ساطاری کر دیتی ہیں۔"(24)

حیدر آباد میں رطوبت کم ہے جب کہ کراچی کی آب و ہوا میں رطوبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے طبیعت میں سُستی اور کاہلی محسوس ہوتی ہے۔ اُردو سفر نامہ نگاروں نے اُردو سفر ناموں میں ہر علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے اس اقدام نے اُردو سفر ناموں کو، بیش بہا معلومات کے خزانے سے سرفراز کیا ہے۔

غیر ملکی سفر نامہ نگار کیمی پوا نے اپنے سفر نامے جسے اُنھوں نے "سفر نامہ پاکستان" کا عنوان دیا ہے۔ کیمی پوا نے اس سفر نامے میں پورے ملک کی سیاحت کا لب لباب پیش کیا ہے۔ حیدر آباد کی آب و ہوا کے بارے میں اپنے سفر نامے میں کیمی پوا لکھتی ہیں:

"کراچی کی نسبت یہاں رطوبت کم ہے اور سمندر کی تازہ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ سردی زیادہ شدت کی نہیں ہوتی۔"(25)

سندھ کی آب و ہوا ان علاقوں میں بہت زیادہ غیر موزوں ہے جو زیر آب آجاتے ہیں۔ جب پانی اُترتا ہے تو مٹی کی سڑانڈ اور جزوی جمود شروع ہو جاتا ہے۔ آب و ہوا کے اسی مسئلے کی وجہ سے یہاں کے مقامی باشندوں میں کچھ بیماریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جیسے ملیریا، بخار، دمہ، دق وغیرہ۔ یہ بیماریاں ہوا میں رطوبت اور گندگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ گرمی کے مہینوں میں سندھ میں سمندر کے قریب تو درجہ حرارت

دوسرے علاقوں جیسا ہی رہتا ہے۔ لیکن شمال کی جانب بڑھتے جائیں تو یہ گرمی جان لیوا حد تک بڑھ جاتی ہے۔ اتنی گرم ہوا چلتی ہے کہ دن میں سفر کرنا ناممکن ہے۔ اندرون سندھ کے پس ماندہ علاقے اس سخت گرمی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔ سندھ میں سردیاں بھی پڑتی ہیں مگر اس حد تک نہیں ہوتیں جتنی کہ گرمیاں سخت ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں چلنے والی گرم ہوا بہت تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ مجموعی طور پر سندھ میں گرمیوں کا موسم سردیوں کی نسبت طویل ہوتا ہے۔ سمندری ہوائیں ہیں جو گرمی کے زور پر قابو رکھتی ہیں۔ سمندر صوبہ سندھ کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

> "گرمی کے مہینوں میں سمندر کے قریب تو درجہ حرارت ہندوستان کے اکثر علاقوں کی طرح ہوتا ہے لیکن جب تم شمال کی جانب جاؤ تو یہ گرمی جان لیوا حد تک بڑھ جاتی ہے ہر سال دو ماہ کے لیے سیوستان میں گرم ہوائیں اتنی تیز چلتی ہیں کہ قندھار کی جانب جانے والے راستے پر دن میں سفر کرنا ناممکن ہوتا ہے اور مسافروں کو اتنا مجبور کر دیتی ہے کہ وہ خیمہ زن ہو جاتے ہیں۔"(26)

ضلع تھرپارکر کے جنوب مشرقی کونے میں ایک مختصر سے پہاڑی خطہ کے سوا صرف مغربی سندھ ہی واحد پہاڑی علاقہ ہے، جسے "کوہستان" کہتے ہیں۔ لیکن یہاں بارش کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ مون سون کے موسم میں بھی بارشیں خال خال ہی ہوتی ہیں۔ سندھ میں بارش عموماً غیر یقینی ہوتی ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو پورا صحرا جھوم اُٹھتا ہے۔ لوگ خوشی سے جھومتے گاتے ہیں۔ تھر کے صحرا سبزہ زار بن جاتے ہیں۔ سندھ کے رہنے والے جوق درجوق تھر کا رُخ کرتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی سفر نامہ "مناظر پاکستان" میں لکھتے ہیں:

> "تھر کی دھرتی پر بارش کی چند بوندیں بھی پڑ جائیں تو وہاں کے لوگ خوشی سے جھوم اُٹھتے ہیں اور ہم رچو (تھری لوک گیت) گاتے ہیں، تپتی ریت کی پیاس جب بجھتی ہے تو تھر کا صحرا سبزہ زار بن جاتا ہے اور وہاں کے حسین مناظر بارشوں کے بعد حسین ترین بن جاتے ہیں۔ اس وقت یہاں کے خوب صورت نظارے سارے دکھ بھلا دیتے

ہیں۔سندھ کے رہنے والے لوگ جو اس تبدیلی سے واقف ہیں جوق در جوق یہاں کا رخ کرتے ہیں۔"(27)

ii. زبان:

کوئی بھی زبان خلا میں جنم نہیں لیتی ہر لسانی عمل کسی نہ کسی تہذیبی عمل کے ساتھ ربط رکھتا ہے۔زبان اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے اور ماضی الضمیر بیان کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ زبان ہے۔جس طرح انسان اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور کرتا ہے۔اسی اسرار میں سے ایک بحث زبان بھی ہے۔زبان معاشرے کے تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے مربوط ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"زبان کا استقلال اور آئندہ کی زبان چار ستونوں کے استقلال پر مُنحصر ہے۔قوم کا ملکی استقلال ، سلطنت کا اقبال ، اس کا مذہب اور تعلیم و تہذیب۔اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ایک یا زیادہ جتنے کم زور ہوں گے اتنی ہی زبان زیادہ ضعیف ہوتی جائے گی۔یہاں تک کہ مر جائے گی۔"(28)

یہ سرزمین مختلف علاقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ہر دور کا سفر نامہ نگار اپنے عہد کی ثقافت کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس کے دور کی تہذیب و ثقافت حوالوں اور کتابوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔سیاح اپنے دور کے حالات ، رسم و رواج اور تہذیب و سماج کو پیش کرتا ہے۔سفر نامہ نگاروں کی تحریروں میں ، تصورات ، زبان و ثقافت اور تاریخ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔صوبہ سندھ ایک بڑا صوبہ ہے۔یہاں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دیگر مذاہب اور اقوام کے لوگ پائے جاتے ہیں۔اکثریت کی زبان سندھی ہے۔سندھی زبان اس علاقے کا سب سے قیمتی ورثہ ہے۔صوبہ سندھ اور ریاست خیر پور میں لوگوں کی اکثریت سندھی بولتی ہے۔اُردو بولنے والے مہاجر ہیں جو سندھ و خیر پور میں اُردو بولنے والے کثیر التعداد لوگ موجود ہیں۔یہاں مادری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔گجراتی کل آبادی کا 2 فیصد راجستھانی 4 فیصد اور بروہی ، 5 فیصد ہیں۔مارواڑی ، سرائیکی جو راجستھانی اور سندھی کی بولیاں ہیں اس کے علاوہ یہاں ہندی ، شمال مغربی قبائلی زبانیں جنوبی ہند کی زبانیں ، گجراتی مہاجرین کے ساتھ آئی ہیں۔اچھوت اور مہاجرین راجستھانی بولتے ہیں۔صوبہ سندھ میں کچھی ، اُردو ، پنجابی ، گجراتی ، سندھی ، پشتو ، راجستھانی ، بلوچی ، ہندی ، فارسی ، بنگالی ، انگریزی ، کشمیری وغیرہ بولی جاتی ہیں۔

> "راجستھانی زیادہ تر اچھوتوں اور قدرے مہاجرین کی زبان ہے اور بروہی جتوئی بلوچی قبائلوں کی۔ مارواڑی اور سرائیکی جو علی الترتیب راجستھانی اور سندھی کی بولیاں ہیں۔ ساٹھ ساٹھ ہزار سے زیادہ کی مادری زبانیں ہیں اور بڑی زبانوں کی میزان میں شامل ہیں۔"(29)

سندھی صوبے کی بڑی زبان ہے۔ سندھی اُردو اور انگریزی عام طور پر لکھی اور پڑھی جانے والی زبانیں ہیں۔

سندھ کو جب عربوں نے فتح کیا اور یہاں ان کی حکمرانی اور تسلط قائم ہوا تو ان کی زبان عربی بھی یہاں آئی مگر سندھ کے عوام میں عربی زبان مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور یہاں کے لوگوں نے اپنی زبان کو ترک کرنے کی بجائے قائم رکھا۔ حالاں کہ شمالی افریقہ اور اسپین کے علاقے جب عربوں نے فتح کیے تو اُنھوں نے وہاں تہذیبی اور ثقافتی طور پر اپنا اثر ڈالا کہ ان کی زبانیں ختم ہو گئیں اور عربی رواج پکڑ گئی اور ان کی مادری زبان عربی ہو گئی۔

جب کہ ایران، خراسان اور وسط ایشیا کے علاقوں میں عربی زبان مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور قدیم فارسی زبان یا دوسری زبانیں قائم رہیں۔ اسی طرح سندھ میں بھی عربی زبان عروج حاصل نہ کر سکی صرف مذہبی سطح پر عربی زبان کی حیثیت بر قرار رہی باقی سندھ کی اپنی زبان زندہ رہی۔ کیوں کہ عرب علاقوں سے سندھیوں کا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں تھا، اس لیے یہ اپنی زبان پر قائم رہے۔

> "عربی زبان کی اہمیت ان علاقوں میں صرف مذہبی زبان کی تھی سندھ میں عربی زبان بھی اس وجہ سے نہیں آ سکی۔ اس کا عرب علاقے سے بلاواسطہ تعلق نہیں رہا۔"(30)

سندھی میں عربی، فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ جیسے جبل (پہاڑی)، بُقر (پیاز)، اُبو (باپ)، تھوم (لہسن)، سے چیز اور گل (تمام) سنسکرت الفاظ بھی سندھ میں دائماً استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے سائیں (جناب)، ککڑ (مرغا)، جس (جے، فتح) اور اپار (بے انت) حیدر آباد، وچولو یا وسط علاقے میں بولی جانے والی زبان خالص سندھی ہے۔ حیدر آباد وچولو کا سماجی مرکز ہے۔ ضلع حیدر آباد کے تینوں شمالی تعلقے اُتر کہلاتے ہیں اور ان کی زبان اُترادی ہے۔ جو شکار پوری سے مشابہ ہے۔ شکار پور میں اچھے خاصے مقبول عام الفاظ ہیں جو اُردو

کا اثر ظاہر کرتے ہیں۔ بہت سے مخصوص الفاظ ایسے ہیں جو شکار پور میں اچھے خاصے مقبول ہیں۔ جیسے دھوبی کی جگہ "کھاتی" اور بھنگی "جمعدار" کہلاتے ہیں۔

ایک اور ممیز بولی تھریلی ہے۔ جسے صحرائے تھر کے خانہ بدوش اور بیابانی بولتے ہیں۔ یہ سندھی مارواڑی اور دیگر اجزا کا آمیزہ ہے بعض پیرائیہ ہائے بیان میں سندھی انتہائی خوش اُسلوب ہے۔ یہ احترام، عقیدت اور مذہبی وجد کے جذبات کے اظہار کے لیے بے انتہا موزوں ہے۔ دیامر اور کوہستان کے یہ علاقے جہاں یہ کوہستانی افراد ہیں۔ تاریخوں میں "درستان" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بنیادی طور پر گلہ بان اور چرواہے تھے۔

ڈاکٹر عباس برمانی لکھتے ہیں:

> "دردی زبانیں قدامت کے لحاظ سے قدیم فارسی اور سنسکرت کی مقابل ہیں۔ متعدد ماہرین لسانیات سرائیکی اور سندھی زبانوں کو یا تو دردستانی زبانیں قرار دیتے ہیں یا دردین کثرت کی حامل کہا جاتا ہے۔ جب کہ سرائیکی اور سندھی ایک ہی زبان تھیں جو گزشتہ ایک ہزار سال کے عمل سے علیحدہ زبانیں بنیں اگرچہ دوسرے سے کافی مشابہت رکھتی ہیں۔"(31)

جٹکی (سرائیکی) ڈیرہ غازی خان کے جنوب میں آباد، جعفر پٹھانوں اور کھترانوں کے علاقے سے لے کر مشرق میں بہاولپور اور جنوب میں سندھ سے لے کر شمال میں کشمیر تک بولی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکردو سے سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھو سائیں کے کناروں پر بسنے والے لوگ یا تو دردستانی زبانیں بولتے ہیں یا دردستانی اثرات کی حامل زبانیں یہ مانتے ہیں۔

یوں تو پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے جو تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ مگر پاکستان کے تمام علاقوں میں ذرا ذرا کے لہجے کے فرق کے ساتھ بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن پر رضا علی عابدی نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہاں کے رہنے والوں کی ثقافت کو مُنفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ لداخ سے اُنھوں نے یہ سفر شروع کیا اور شاہ بندر جہاں دریا سمندر میں جا ملتا ہے، وہاں تک کے سفر کو اپنے سفر نامہ "شیر دریا" میں قلم بند کیا ہے۔

سفر نامہ نگار لداخ، بلتستان کے تمام علاقے چلاس، سرحد، پنجاب سے ہوتا ہوا یہ دریائے سندھ جب سکھر کے مقام پر پہنچا تو سکھر سے لاڑکانہ اور موہن جودڑاو تک کا سفر دریا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ان علاقوں کی

مادری زبان سندھی ہے اور یہاں 85 فیصد سندھی اور 10 فیصد اُردو اور 5 فیصد پنجابی وغیرہ بولی جاتی ہے۔ دادو، سیہون شریف، سجاول یہاں کی زبان سندھی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ حیدر آباد، بدین، ٹھٹھہ سب دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ شاہ بندر جہاں سندھ کا دریا اور پاکستان کی زمین ختم ہوتی ہے۔ یہاں تک بسنے والے لوگ صوبہ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھی اور اُردو زبان بولتے ہیں۔

سندھی سندھ میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ سندھ کے لوگ خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں مگر سندھی زبان ان کی مادری زبان ہے۔

بقول سید سلیمان ندوی:

> "یہاں کی موجودہ زبان "سندھی" ہے۔ جس میں یہاں کی موجودہ زبان عربی اور فارسی کے لفظ ملے ہوئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی اضلاع کا لہجہ الگ الگ ہے۔" (32)

کراچی پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر ہے۔ جہاں اُردو سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ جتنا بڑا شہر ہے وہاں مختلف قوموں اور علاقوں کے لوگ آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی میں پاکستان کے ہر علاقے کی زبان بولنے والے لوگ موجود ہیں۔ یہاں ملک کے ہر حصے سے لوگ آ کر بسے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں زبانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایم زمان کھوکھر نے سندھ کی طرف سفر کرتے ہوئے چولستان اور وادی سندھ کی ثقافت کو بھی سامنے لانے میں معاون کردار ادا کیا ہے۔

کراچی کے حوالے سے ایم زمان کھوکھر لکھتے ہیں:

> "کراچی دُنیا کا ساتواں بڑا شہر ہے اور آبادی کے لحاظ سے دُنیا کے نقشے پر کئی ملکوں سے بڑا ہے۔ ان گنت خصوصیت کا حامل ایک بین االاقومی شہر ہے۔ جہاں پاکستان کے تمام شہروں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ یہ ایک کاسموپولیٹین شہر ہے۔ کراچی میں پاکستان کے ہر علاقے کی زبان بولنے والے آباد ہیں۔"(33)

ضلع تھرپارکر میں زبانوں کے کئی ایک لہجے ہیں۔ ریگستانی علاقے کے ساتھ ملنے والے علاقے کی بولی پر ڈھاٹی زبان کا اثر ہے۔ باقی حصّے میں سندھی صاف بولی جاتی ہے۔ جو لکھنے پڑھنے میں آتی ہے۔ یہاں کی علاقائی

زبان سندھی ہے۔ جب کہ اُردو قومی زبان ہے، اس کے علاوہ یہاں پنجابی، سرائیکی، مکرانی، راجستھانی، میواتی، پنجابی اور پشتو زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ تھر کی بولی اگرچہ ڈھاتکی ہے لیکن سندھی بھی یہاں بولی جاتی ہے۔

> "بلوچی سرائیکی، مکرانی، راجستھانی، میواتی، پنجابی اور پشتو زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ ضلع تھرپارکر کا کلچر اکثر دو زبانوں سندھی اور ڈھاتکی میں ملتا ہے۔"(34)

ضلع ٹھٹھہ کیٹی بندر کے علاقے کے لوگ لاڑی سندھی بولتے ہیں۔ ٹھٹھہ کے لوگوں کی ثقافت بولنے کے انداز اور لہجے کے ساتھ ادائیگی بھی مُنفرد اور مختلف ہے۔ سندھی میں اربع بدھ کو کہا جاتا ہے۔ کینجھر جھیل جہاں "نوری جام تماچی" داستان نے جنم لیا ٹھٹھہ سے 20 کلو میٹر پہلے ہے۔ اسی تھرپارکر کا قصبہ "بھالوہ" "عمر ماروی" رومانی داستان کے حوالے سے مشہور علاقہ ہے۔ ان چیزوں سے ثقافتی عناصر کھل کر سامنے آئے ہیں، جس سے سندھ کے کلچر کا پتہ چلتا ہے۔

iii. خوراک / خوردونوش:

دُنیا کے ہر خطے کی طرح پاکستان کے تمام صوبوں کی ثقافت بھی الگ الگ رنگ کی ہے۔ ہر علاقے کی آب و ہوا کے ساتھ ساتھ وہاں پر بسنے والے لوگوں کی، زبان، عادات، رہن سہن، خوراک، رہائش، پیشے سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا یہی فرق انھیں مُنفرد بناتا ہے۔ ایک جیسی چیزیں طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔ تبدیلی کائنات کا اصول ہے زندگی متحرک ہو جائے تو جمود طاری ہو جائے گا جو موت کی علامت ہے۔ تحریک ہی زندگی بخشتی ہے۔ کسی علاقے کی ثقافت ہی وہاں کے لوگوں کو اُبھار کر سامنے لانے کا ذریعہ ہے۔ ثقافت کو اُبھارنے میں وہاں کے لوگوں کی خوراک بھی اَثر انداز ہوتی ہے۔ سندھ میں عموماً لوگوں کی خوراک سادہ ہے۔ لوگ وہی اناج کھاتے ہیں جو ان کے علاقے میں پیدا ہوتا ہے۔

جواری اور باجری اس خطے کے بیش تر حصّوں کی اہم خوراک ہے۔ لاڑکانہ، سکھر اور جیکب آباد چاول کی پیداوار میں سب سے اہم ہیں۔ گندم عموماً صاحبِ استطاعت کھاتے ہیں۔ امیر لوگ جواری باجری بالکل استعمال نہیں کرتے۔ گندم، جواری اور باجری فطیری روٹیوں یا چپاتیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہیں۔ جو سبزیوں، مصالحوں اور دہی، لسی، گھی اور کبھی کبھی گوشت یا مچھلی سے مزے دار بنالیتے ہیں۔ مرغی اور مچھلی بھی سبھی کھاتے ہیں۔ بکری کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ ساحلی علاقوں کے لوگ مچھلی کے شوقین ہیں۔

تھرپارکر کے خانہ بدوش جنگلی بطخیں اور دیگر شکار کھاتے ہیں۔ جاٹ جو گھومتے پھرتے ہیں، ان کا گزارہ اپنی اونٹنیوں کے دودھ پر ہوتا ہے اور کوہستانی بلوچی اپنی بھیڑوں بکریوں کے دودھ پر گزرا وقات کرتے ہیں۔ صاحبِ حیثیت لوگوں کی خوراک میں دالیں، پھل، مٹھائیاں اور غربا کی نسبت زیادہ سبزیاں شامل استعمال ہیں۔ پہلے ہفتے میں لوگ صرف ایک بار گوشت کھاتے تھے، اب تو تقریباً روز ہی کھاتے ہیں۔ دن میں دو بار کھانے کا رواج ہے۔ رات کے کھانے کے بعد گرم دودھ کا گلاس مفید سمجھا جاتا ہے چائے کا رواج عام ہے۔ لیکن ہر جگہ نہیں تمباکو نوشی کا بھی رواج ہے۔ بعض لوگ بیڑی، سگریٹ پیتے ہیں۔ چائے عموماً ناشتے میں موسم سرما میں استعمال کرتے ہیں۔ کافی کا استعمال بہت ہی کم کرتے ہیں۔

> ”کچھ عرصے سے معیارِ زندگی بہت بڑھ گیا ہے اور بہت سے لوگ جو پہلے ہفتہ میں ایک بار گوشت کھاتے تھے اب اسے روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر دن میں دو بھرپور کھانے ہیں۔“(35)

ہر علاقے کی اپنی تہذیب، ثقافت، رہن سہن، طرزِ تعمیر ہوتی ہے اور انہی کے ملاپ سے ہم آہنگی سے شہر وجود میں آتے ہیں۔ اہلِ دانش کہتے ہیں۔ جس طرح ہر علاقے کی ثقافت ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر شہر کی بھی اپنی ایک الگ پہچان ہوتی ہے اور ہر شہر کی شناخت کو سامنے لانے میں سب سے اہم کردار تاریخ دانوں اور سفر نامہ نگاروں کا ہے۔ ہمارے ملک کے چپے چپے سے صحیح معنوں میں روشناس کرانے والے اُردو سفر نامہ نگار ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ جنھوں نے سفر نامہ ”اور سندھ بہتا رہا“ کے نام سے ایک ایسا معلوماتی خزانہ اُردو اَدب کو بخشا ہے جو تاریخ و ثقافت کا سنگم ہے۔ وہ اپنی پہلی صبح جو اُنھوں نے سکھر میں آنکھ کھولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”ہم اس آنکھوں کو ہریاول اور شبنم سے نم کرنے والی سویر سے واپس آئے تو وہاں ناشتے کے کچھ بدوبست تھے۔۔۔ میٹھی دودھ بھری سویاں، پراٹھے اور ایسی مدبھری چائے کہ ایک گھونٹ بھرو تو آسمان کی سیر کرو۔“(36)

مستنصر حسین تارڑ کو سندھ سے بہت محبت تھی اور اسی دل چسپ سیاحت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اس سندھ یاترا کے دوران مُنفرد پکوانوں سے بھی محظوظ ہوئے۔ سکھر کی سردائی بہت مشہور اور لذیذ ہے۔ اس کو شربت، میوہ جات اور خشخاص ڈال کر بنایا جاتا ہے۔ سندھ کے لوگ نہایت ہی محبتی اور ملنسار ہیں اور مستنصر

حسین تارڑ صاحب جو ملک کا ایک بڑا نام ہیں اور اُنھوں نے لوگوں کی محبتوں کو دل کھول کر سمیٹا اور سفر نامے میں ان ہی واقعات کو پیش کیا جس سے ان کی ثقافت بھی عیاں ہوئی۔ وہاں کے مشہور و مقبول پکوان بھی سامنے آئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"زبیر میرے لیے سندھی حلوہ بنوا کر لایا تھا۔۔۔ایسا انوکھا ذائقے والا کہ۔۔۔میں بھی اِدھر چاند کو جاتا ہوں۔"(37)

ہر علاقے کے کچھ روایتی پکوان ہوتے ہیں جنھیں وہ مخصوص مواقع پر بناتے ہیں جیسے تہوار، شادی بیاہ، مہمان کی آمد یا تحفتاً کہیں لے جانے کے لیے پکوان خاص بنائے جاتے ہیں۔ یہی خصوصیات سندھیوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

محمد خالد کا سفر نامہ "یاترا" سرزمین تھر کے سفر نامے کی رُوداد ہے۔ یہ سفر نامہ اُنھوں نے اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ کیا اور نوکوٹ، اسلام کوٹ، وجوٹھو اور مٹھی کے علاقوں کی سیر کو نکلے ان علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی رہتے ہیں۔ جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ایک دوسرے کے حقیقی دوست، ہم درد ہیں۔ مل جل کر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب سب طرف فسادات کی ہوا چلی یہ علاقہ تب بھی امن کا گہوارہ رہا۔ یہاں بسنے والے ہندو خود کو یہاں کا ہی باسی مانتے ہیں۔ اسلام کوٹ جو صوبہ سندھ کے بارڈر پر واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان مثالی بھائی چارہ قائم ہے۔

اس سفر نامے "یاترا" میں سفر نامہ نگار محمد خالد اختر اپنے ایک ہندو دوست لچھمن داس کے گھر ٹھہرے اور ہاں اُنھوں نے لذیذ اور سادہ خوارک کھائی اور ایسی لذیذ اور سادہ خوارک جو واقعی صرف ان ہی علاقوں میں مل سکتی ہے۔ یہاں کی خوراک میں سبزیاں زیادہ کھائی جاتی ہیں کیوں کہ ہندو گوشت کو کھانا پسند نہیں کرتے۔ آلو، ٹنڈے، پھلیاں اور خاص گھی کے پراٹھے جو کہ لاجواب ہیں۔

وہ اپنی "یاترا" کے اس لذیذ کھانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سکھدیو اور اس کے لڑکے نے ہمارے سامنے لوہے کے برتنوں میں بھوجن پروسا، آلو، ٹنڈوں (وہ اسے مسیھے کہتے ہیں اور بارشوں میں صحرا میں یہ خود رو میہے بکثرت ہوتے ہیں) اور گوار پھلی کی لذیذ بھاجیاں خالص گھی کے پراٹھے ہم نے صبح سے سوائے دو تین چائے کی پیالیوں کے کچھ نہیں کھایا تھا،

اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑے اور یہ کسی دیوتاؤں کے لائق ضیافت تھی۔"(38)

اسلام کوٹ کے لوگ پھل کھانے کے زیادہ شوقین نہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں پھل مہنگے داموں بکتا ہے۔یہاں کے بازاروں میں سب سے کثرت سے سبزیاں بکتی ہیں۔ٹینڈے یہاں بہت کھائے جاتے ہیں۔سادہ خوراک کھاتے ہیں ناشتہ بھی سادہ کرتے ہیں۔دھرم داس کا ناشتہ بالکل سادہ ایک پراٹھا، ادھورے دہی کا کٹورا، شہد اور یہی ناشتہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی کراتے ہیں۔مہمانوں کو بھی اسی طرح ناشتہ کرایا جاتا ہے۔چائے بھی پیش کی جاتی ہے۔یہاں کے لوگ صبح اشنان ضرور کرتے ہیں اس کے بعد ناشتہ کرتے ہیں۔

محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

"لوٹ کر میں ضروریات سے فارغ ہونے باہر جاتا ہوں واپس آکر اشنان کرتا ہوں۔میرا ناشتہ دوہے ہوئے دودھ کا گلاس اور ایک موسمی پھل ہوتا ہے۔چینی دودھ میں نہیں ڈالتا، نہ صبح کی چائے میں ایک آدھ خالص نگر کے شہد کی چمچی دودھ میں ڈالتا ہوں، دوپہر کو چپاتی سبزی۔"(39)

تھر ریتیلا علاقہ ہے۔یہاں گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی بہت زیادہ پڑتی ہے۔تھر میں خاص طور پر مسلمان، اچھوت اور ہندو رہتے ہیں، جن کی کئی ذاتیں ہیں۔ان کی خوراک سادہ ہے۔لوگ مال مویشیوں پر گزارہ کرتے ہیں۔زیادہ تر باجرہ کھاتے ہیں۔اگرچہ یہاں پر باجرہ، تل، مونگ، گوار، تربوز، چبھڑ کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔جب قحط پڑتا ہے تو لوگ ایک مخصوص قسم کے بیج پکا کر کھاتے ہیں۔یہ ڈتھ نامی گھاس کہلاتی ہے۔تھر کے دیہاتوں میں لوگ بہت پس ماندہ ہیں البتہ شہروں میں حالات اس کے برعکس ہیں۔وہاں لوگوں کے پاس کافی دولت ہے۔نوکوٹ سے مٹھی تک پکے روڈ بن چکے ہیں موٹر گاڑیاں عام ہیں۔مگر لوگ اپنے اسی طریقے پر قائم ہیں۔لباس اور خوراک سادہ استعمال کرتے ہیں۔

"ان کی سادہ خوراک ہے زیادہ تر باجرہ کھایا جاتا ہے۔قحط سالی میں ڈتھ نامی گھاس کے بیجوں کو پکا کر کھاتے ہیں اور کچے چبھڑ سکھا کر رکھ لیتے ہیں جن کا سالن پکایا جاتا ہے۔"(40)

اُردو سفر نامہ نگاروں نے سرزمین تھر پر خصوصی توجہ دی ہے اور اپنی تحریروں سے تھر کی سرزمین کو صحیح معنوں میں اُجاگر کیا ہے۔ایسے ہی ایک سفر نامہ نگار شکیل الدین صدیقی ہیں۔جنھوں نے "ماروی کے

دیس میں" میں سفر نامہ لکھ کر تھر کی روداد کو اوراق کی زینت بخشی۔ تھر کی زمین تاریخ و ثقافت اور تہذیب و تمدن کی سر زمین ہے۔ اُنھوں نے نو کوٹ ڈگری، جھڈو، ٹنڈو جان محمد، اسلام کوٹ، کاسبو گوتھ کی ثقافت کو نمایاں کیا ہے۔ سندھ کی ثقافت سے وہاں کی تہذیب سے انھیں جنون کی حد تک پیار ہے۔

یہاں کے لوگ مچھلی کے بہت شوقین ہیں۔ پلہ مچھلی یہاں کے لوگوں کی نہایت پسندیدہ خوراک ہے۔ سندھی آم کے بھی بہت شوقین ہیں۔ دریا کے کنارے بہت سے گاؤں آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مچھلی کے شکار کے ماہر ہیں اور نہایت شوق سے مچھلیاں تناول کرتے ہیں۔

"ماروی کے دیس میں" شکیل الدین صدیقی لکھتے ہیں:

> "صدیوں پہلے ابنِ بطوطہ کا سندھ سے گزر ہوا تو اس نے لکھا یہاں کے لوگ پلہ مچھلی اور آم نہایت شوق سے کھاتے ہیں۔ آج بھی پلہ مچھلی اور آم سندھیوں کا کھاجا ہے۔"(41)

رضا علی عابدی کا سفر نامہ "شیر دریا" ایسا سفر نامہ ہے جس کا ہر ایک ورق معلومات کا خزانہ ہے۔ رضا علی عابدی نے لداخ کے لوگوں کی خوراک سے لے کر دریا کے آخری کنارے کیٹی بندر تک کے لوگوں کی ثقافت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ یہ سفر نامہ چلتا پھرتا معلومات کا خزانہ بن گیا ہے۔ ثقافتی عوامل کو روشناس کرانے والا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے وہاں بسنے والے لوگوں کو جس طرح سے متعارف کرایا ہے۔ یہ ان کا بے مثال کارنامہ ہے۔

ڈیرہ غازی خان، بھکر، ملتان یہ پنجاب کے وہ علاقے ہیں، جن پر سندھی تہذیب کے بھی اثرات ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی خوراک سادہ ہے، کھجوروں کی بہتات ہے، بہترین کھجوریں یہاں پائی جاتی ہیں۔ جس میں گٹھلی نہیں ہوتی۔ ڈیرہ غازی خان میں ڈیرے کا حلوہ بہت مشہور ہے۔ یہاں کی مقبول غذا ساگ ہے۔ یہ سب سے سستی اور لذیذ سبزی ہے۔ گوشت غریب لوگوں کی دسترس میں نہیں ہے۔ ساگ اور دال یہاں کی مقبول غذائیں ہیں۔

ڈیرہ غازی خان اور سندھ کھجوروں کے لیے مشہور علاقے ہیں۔ یہاں ہر طرح کی کھجوریں پائی جاتی ہیں۔ لاڑکانہ مشہور ترقی یافتہ شہر ہے۔ یہاں سردیوں میں چکن کارن سوپ فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دال چاول کھائے جاتے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان میں ساگ کھایا جاتا ہے اور تازہ پھلوں کے جوس بھی پیے جاتے ہیں۔

بقول رضا علی عابدی:

> ”میں نے بھی اس شام لاڑکانہ والوں کی طرح چینی سوپ پیا جس پر دیسی مصالحوں کا سفوف چھڑکا گیا تھا چاول کے خشکے اور گرم گرم دال کا دور چلا۔اس کے بعد تازہ پھلوں کا ٹھنڈا جوس پیا۔“(42)

دریائے سندھ کا آخری مقام کیٹی بندر یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا مچھلی اور جھینگا ہے۔یہاں کے لوگ ماہی گیر اور مزدور پیشہ ہیں۔یہ غذا انھیں مفت میں مل جاتی ہے،اس لیے غریب لوگ کثرت سے اس کا استعمال کرتے ہیں۔شاہ بندر آخری ٹھکانہ ہے۔جہاں سے دریا سمندر برد ہو جاتا ہے۔یہاں کے غریب لوگ زیادہ تر اُونٹ چرا کر گزارہ کرتے ہیں اور معمولی خوراک کھاتے ہیں۔

کراچی کے لوگوں کا بہترین مشروب لسّی ہے۔کراچی کے لوگ لسّی کے شوقین تھے۔انگریزوں کی آمد کے بعد چائے کا ایسا رواج پڑا کہ لوگ لسّی کو فراموش کر بیٹھے۔

کیمی پوا اپنے سفر نامے ”سفر نامہ پاکستان“ میں لکھتی ہیں:

> ”ان دنوں برطانوی لوگوں کا پسندیدہ مشروب ”چائے“ تھا اور مسلمان لسّی پیتے تھے۔جلد ہی چائے پینے کی عادت سارے ملک میں پھیل گئی۔مسلمان بھی اس سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔کراچی کے لوگ اسے دل سے پیتے ہیں اور لسّی فراموش ہو چکی ہے۔“(43)

سکھر کے قریب شاہ بیلو کا جنگل آتا ہے،جسے دیکھنے کے لیے گاڑی کی رفتار بے ساختہ آہستہ ہو جاتی ہے۔چھوٹے چھوٹے جنگلات بکھرے پڑے ہیں۔یہاں مختلف اقسام کے پھل جن میں کیلا،آم،کھجور،امرود اور ناریل پائے جاتے ہیں۔مشہور فصلیں گیہوں،چاول،جو،باجرہ،مکئی اور چنا وغیرہ ہیں۔یہ سب چیزیں سندھ کے لوگوں کی خوراک کا حصّہ ہیں۔

iv. لباس:

لباس بھی ثقافتی عوامل میں سے ایک ہے جو کسی علاقے کی ثقافت کو نمایاں کرنے میں اہم مقام رکھتا ہے۔ہر علاقے کا لباس دوسرے علاقے سے مختلف ہوتا ہے۔یہ انفرادیت وہاں کی آب و ہوا،رہائش،روزگار وغیرہ کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔سندھ کی آب و ہوا اگرچہ معتدل ہے جس کا اندازہ وہاں کے لوگوں کے لباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔صوبہ سندھ ایک قدیم تاریخی خطہ ہے جہاں بہت سی قومیں آج بھی آباد

ہیں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں۔سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ۔اس کے علاوہ ہندو بھی بکثرت ہیں۔ان میں برہمن، شودر سبھی موجود ہیں اور اپنے لباس سے خود کو نمایاں کرتے ہیں جو 5 بڑے گھرانوں میں تقسیم ہیں۔یہ لوہانہ، بھائیہ، سہتہ، ویشیہ اور پنجابی ہیں۔برہمن سب سے اُونچی ذات ہے ہندوؤں میں۔یہ لوگ سفید یا سرخ عمامہ، سوتی کپڑا اور دھوتی جو کبھی کبھار رنگین ہوتی ہے کمر کے گرد زنار باندھتے ہیں۔کندھوں پر شال یا چادر ڈال لیتے ہیں اور چمڑے کے علاوہ کسی بھی شے کی بنی چپلیں ہوں وہ استعمال کرتے ہیں۔اس کے برعکس بلوچی جو سندھ میں رہائش پذیر ہیں۔ان کا لباس یا پھر عربوں سے کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ان کی کمر پتلی اور جسم سخت اور ٹھوس ہوتا ہے، جس پر واسکٹ پہنتے ہیں اور عربوں کے لباس کی طرح اپنے لباس پر اسلحہ، پیٹیاں اور سفوف کی بوتلیں بھی باندھتے ہیں۔جن کے ساتھ تلواریں، ڈھال اور توڑے دار بندوقیں بھی ہوتی ہیں۔گرمیوں میں بلوچ بنیان پہنتے ہیں۔اس کے علاوہ ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے ہیں۔سردیوں میں کابلی کپڑے کا بنا ہوا گرم چوغہ پوستین اور قمیض بھی پہنتے ہیں۔اس کے علاوہ کمر پر پٹی بھی باندھتے ہیں۔پورے خیر پور میں یہی لباس پہنا جاتا ہے۔بلوچی عورتیں پورا پیٹی کوٹ پہنتی ہیں۔جو ان کی کمر کے گرد آجاتا ہے۔وہ پاجامے اور اس کے ساتھ ایسی قمیض پہنتی ہیں جو گلے اور بازوؤں سے تنگ ہوتی ہے، ساتھ ہی دوپٹہ بھی استعمال کیا جاتا ہے جو سر پر اوڑھا جاتا ہے۔یہ لوگ بہت گندے ہیں۔صفائی کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔اسی لیے زیادہ تر نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں تاکہ ان کی گندگی ظاہر نہ ہوسکے۔

نیگرو نسل کے لوگ بھی سندھ میں آباد ہیں۔یہ لوگ مسقط اور عرب کے دیگر علاقوں سے بڑی تعداد میں زنجباری (غلام) اور حبشی لوگ سندھ میں آکر آباد ہوگئے۔ان کی موجود نسلیں اپنی حربی صلاحیتوں اور شراب کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔سندھ میں جو افریقی آباد ہیں وہ تو بالکل جاہل اور ان پڑھ ہیں۔سندھیوں کی طرح لباس زیب تن کرتے ہیں۔

سندھیوں کے کردار کی طرح سے ان کا لباس بھی غیر ملکی عادات کا امتزاج ہے۔جیکٹ تو یہ ہندوستانی فیشن کی پہنتے ہیں اور ٹوپی ایرانی فیشن کی استعمال کرتے ہیں، پاجامے ترکوں کی طرح تنگ پہنتے ہیں، عماموں کا رواج عام ہے۔پہلے دور میں لمبے لمبے چوغے پہننے کا رواج تھا مگر اب یہ فضول روایات دم توڑ چکی ہیں۔ڈھیلی ڈھالی قمیض گھٹنوں تک کے پاجامے اور کپڑے یا سوتی ٹوپی پر مشتمل لباس پہنا جاتا ہے۔ٹوپی کا استعمال بھی لازمی ہے جو ہیٹ سے ملتی جلتی ہے۔عورتیں بھی ایسا ہی لباس زیب تن کرتی ہیں، ٹوپی کی جگہ چولی استعمال کرتی ہیں، سر کو ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔اجنبیوں سے ملتے وقت چہرہ چھپانے کے لیے نقاب کرتی ہیں۔

”مردوں کا لباس ڈھیلی ڈھالی قمیض، گھٹنوں تک کے پاجامے اور کپڑے یا سوتی ٹوپی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ٹوپی کافی حد تک ہیٹ (Hat) سے ملتی جلتی ہوتی ہے اور اس کے کناروں پر سوت یا زری کے پھول ہوتے ہیں۔ عورتوں کا لباس بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ اس میں ٹوپی نہیں ہوتی۔ اس کی جگہ وہ چولی استعمال کرتی ہیں جو پیچھے کی جانب ڈوریوں سے باندھی جاتی ہے۔“(44)

خطہ سندھ اپنے اندر ایک قدیم تہذیب سموئے ہوئے ہے۔ سندھ کا چپہ چپہ وہاں کی عظیم ثقافت کا علم بردار ہے۔ سندھ کے یہی ثقافتی عوامل سفر نامہ نگاروں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بسنے والے باشندے ایک عظیم ثقافت کی علامت ہیں۔ کہیں سندھو سائیں کہیں شیر دریا کے نام سے جانا جانے والا یہ عظیم دریا اس علاقے کو اور بھی اہمیت بخشتا ہے۔ موہن جوڈارو کی عظیم ثقافت یہاں کی قدیم تہذیب، ثقافت کو روشناس کراتی ہے۔ سندھ جیسے عظیم خطے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں اُردو سفر نامہ نگاروں کا کردار قابلِ ستائش ہے جنھوں نے گھر بیٹھے قاری کو سندھ کی قدیم ثقافت سے متعارف کرا دیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ سندھ ”اور سندھ بہتا رہا“ اسی نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ جس میں قاری کو سفری احوال کے ساتھ ساتھ تاریخ، ثقافت اور اَدب سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور ”سندھ بہتا رہا“ پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ یوں بہاتا لے جاتا ہے کہ ایک ہی نشست میں اسے ختم کیے بنا اُٹھنا محال ہو جاتا ہے۔ عمر کوٹ صحرائے تھر کا ایک قدیم شہر، یہ ایک صحرائی شہر ہے۔ تارڑ نے یہاں کے راجپوتوں، یہاں کے قلعوں، یہاں کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھا اور بیان کیا۔ یہاں کے لوگوں کا لباس تقریباً بقیہ سندھ سے ملتا جلتا ہے۔ مگر چوں کہ یہاں کے لوگ پس ماندگی میں ذرا آگے ہیں۔ یہاں کے مرد بڑی بڑی مونچھیں رکھنا بہت فخر سمجھتے ہیں اور اسے اپنی مردانگی تصور کرتے ہیں۔ رنگین پگڑیاں باندھتے ہیں۔ عورتیں رنگین گھاگھرے پہنتی ہیں اور بڑے بڑے گھونگٹ نکالتی ہیں۔ یہ بیچاریاں سخت گرمی میں بڑے بڑے گھونگٹ نکال کر کام کاج میں لگی رہتی ہیں۔ ان کے گھاگھرے شیشوں کے کام سے مزین ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

”عمر کوٹ کے قلعے کے صحرائی داخلے کے باہر کچھ عسرت زدہ پیوند زدہ اگرچہ رنگین گھاگھروں میں گھونگٹ نکالے کچھ ہندو عورتیں جیسے زیبائش کے لیے سجی بے چاری سی گڑیائیں ہوں۔“(45)

سندھ کی خواتین شوخ رنگوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ رنگین لباس زیب تن کرتی ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین شوخ رنگ کے لباس پہن کر کام کرتی ہیں اور مرد ان کی رکھوالی کرتے ہیں۔ سندھ میں خواتین سانولے رنگ کی ہیں مگر کپڑے نیلے پیلے گلابی رنگ کے پہنتی ہیں۔ ان کے کپڑوں کی شوخی سے ان کے مزاج کی شوخی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے مسائل کچھ بھی ہوں وہاں کی عورتیں زندہ دل ہیں۔ ڈاکٹر عباس برمانی نے اپنے سفر نامے "سندھو سائیں" میں دریا کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے دریا کے کناروں پر آباد لوگوں کی ثقافت کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر عباس برمانی لکھتے ہیں:

> "گندم کے کھیتوں میں کٹائی ہو رہی تھی اور انتہائی شوخ رنگوں کے لباسوں میں ملبوس خواتین مصروف کار تھیں جب کہ مرد حضرات ان کی نگرانی میں مشغول تھے۔"(46)

سندھیوں کا لباس سادہ تھا اور دھوتی اور چادر پر مشتمل تھا۔ سندھی مرد سانولے رنگ کے ہیں لیکن مجموعی طور پر بہت خوب صورت نظر آتے ہیں۔ اچھے قد و قامت کے مالک ہیں۔ سندھی عورتوں کا حُسن بھی بے مثال ہے ان کا حُسن مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ سندھی عورتیں اپنے سانولے رنگ اور تیکھے نقوش کی وجہ سے جاذب نظر لگتی ہیں۔ چہرے دل ربا اور جسم متوازن و متناسب تھے زیادہ تر خواتین اسی حیلے کی نظر آتی ہیں۔ عورتیں جو لباس زیب تن کرتی ہیں ان میں کڑھے ہوئے لباس سب سے زیادہ مشہور اور جاذبِ نظر ہیں۔ وہ اپنی قمیض کے نیچے ایک ریشمی جیکٹ پہنتی تھیں جو جسم کے مطابق بنی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے ڈوریاں لگی ہوئی تھیں۔ جنھیں تسمے بھی کہا جا سکتا ہے۔ باہر نکلتے وقت ساڑھی یا چادر پہنتی ہیں اور پلو سر پر رکھتی ہیں جب کہ مرد ایک کھلی قمیض اور سوتی کپڑے کی ٹوپی پہنتے ہیں۔

ہنری پوٹنگر سفر نامہ "بلوچستان و سندھ" میں لکھتے ہیں:

> "مردوں کا لباس ایک کھلی قمیض، ایک شلوار جو ٹخنوں پر چنٹ دار ہو اور ایک روئی دار سوتی یا کپڑے کی ٹوپی ہے جس کے ارد گرد ریشم یا سونے کے پھول کڑھے ہوئے ہوں۔"(47)

سندھی عورتیں اجنبیوں سے پردہ کرتی ہیں۔ چہرہ ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ سندھ کا کلچر قدیم روایتی ہے اور آج بھی لوگ اپنی روایات میں ہی سمٹ کر رہتے ہیں۔ آج بھی وہ لوگ جن میں قدامت پسندی کے اثرات ہیں۔ اپنی روایات کی پاس داری کرتے ہیں۔ شلوار قمیض کو ترجیح دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید جمیل حسین "سندھو کنارے" میں لکھتے ہیں:

> "وہ لوگ جن میں قدامت پسندی کے اثرات آج بھی پوری طرح سے موجود ہیں وہ آج بھی اس شہر کی روایات اور طرزِ زندگی کو اپنائے ہوئے ہیں اور اب تک وہ شلوار قمیض پہننے کو ترجیح دیتے ہیں۔"(48)

اُردو سفر نامہ نگاروں نے سندھ کی ثقافت کے تمام پہلوؤں کو جس طرح اُجاگر کیا ہے سندھ ایک کھلی کتاب کی طرح عیاں ہو گیا ہے۔ لوگ گھر بیٹھے سندھی ثقافت سے روشناس ہو گئے ہیں۔ تھر کا ریگستان بھی سفر نامہ نگاروں کی بدولت عیاں ہو گیا۔ تھر کے اہم علاقے مٹھی، اسلام کوٹ، ڈیپلو، چھاچھرو، گڈڑو، چیلہار ہیں۔ یہ تھر کے مشہور ترین علاقے ہیں۔ سفر نامہ نگاروں نے ان دوپار علاقوں کا بھی دورہ کیا اور وہاں کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو پوری طرح اُجاگر کیا۔ یہ پس ماندہ اور دور پار علاقے سفر نامہ نگاروں کی بدولت دُنیا کے سامنے آ گئے۔ ورق ورق پر ان پس ماندہ علاقوں کے نقوش اُبھر گئے۔ غیر ملکی سیاحوں نے بھی اس خطے میں بے حد دل چسپی لی اور ان علاقوں کو سفر ناموں کی شکل میں محفوظ کر دیا۔ خالد اختر ایک منجھے ہوئے سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کا اسلوب جان دار ہے۔ اُنھوں نے اپنے سفر نامے "یاترا" میں اسلام کوٹ کی "یاترا" کو سامنے لانے کی بہترین کاوش کی ہے۔ اسلام کوٹ میں ہندوؤں کی کثرت آج بھی آباد ہے۔ وہ اور مسلمان اس طرح مل جل کر رہتے ہیں کہ کوئی گُمان نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ ہم مذہب نہیں ہیں۔ اسلام کوٹ کے لوگ اچکن اور کوٹ پہنتے ہیں اور اکثر لوگ پگڑیاں بھی باندھتے ہیں۔ کچھ لوگ دھوتی بھی پہنتے ہیں۔ سندھی سادہ لوح ہیں۔

خالد اختر سفر نامہ "یاترا" میں لکھتے ہیں:

> "بہت اچھے خاصے بھلے آدمیوں کو، جن میں بعض نے اچکن اور کوٹ پہن رکھے تھے اور چند ایک پگڑیاں باندھے تھے، بنال چند کے بلاک کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔"(49)

تھر کی عورتیں زیورات کی بے حد شوقین ہیں۔ لمبے چوڑے قد کاٹھ کی عورتیں زیورت پہنے دکھائی دیتی ہیں۔ سندھ کا صحرا تہذیب و ثقافت کا مرقع ہے۔

سفر نامہ نگار رضا علی عابدی نے سفر نامہ "شیر دریا" میں دریائے سندھ کے ساتھ چلتے چلتے ان کے کناروں پر آباد بستیوں اور علاقوں کے ثقافتی پس منظر سے اپنے سفر نامے کو جلا بخشی۔ ان کا اندازِ تحریر شگفتہ، اُسلوب جان دار ہے۔ لداخ سے لے کر شاہ بندر تک تمام لوگوں کے طور طریقے، اندازِ زندگی، لباس، خوراک، زبان، آب و ہوا اور اندازِ رہائش وغیرہ سب کو سامنے لانے کی بے مثال کوشش کی ہے۔ وہ لداخ، بلتستان، کوہستان، کالاباغ وغیرہ کے پہاڑوں سے اُتر میدانی علاقوں میں آتے ہیں۔ تھاکوٹ، میانوالی، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، بھکر وغیرہ کی ثقافت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کے لوگ سادہ لباس قمیض شلوار اور چادر پہنتے ہیں۔ شاہ بندر میں بوڑھے ادھیڑ عمر، جوان اور بچے سب نے لمبے لمبے کرتے اور شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔

لڑکوں کے لمبے بال آنکھوں تک آ گئے تھے۔ بوڑھوں نے اپنی داڑھیاں بنائی ہوئی تھیں اور خواتین سادہ لباس زیب تن کر کے پردے سے گھروں میں رہتی ہیں۔

اجرک اور روایتی لباس سندھ کی ثقافت کے علم بردار ہیں۔ اجرک والے ڈیزائن کی قمیض بہت پسند کی جاتی ہے نہ صرف سندھ بلکہ ملک کے باقی شہروں میں بھی اس کی بہت مانگ ہے۔ لوگ بہت شوق سے اجرک والی قمیض کرتے پہنتے ہیں۔ سندھی ٹوپی شیشوں سے مزین جاذب نظر لگتی ہے جسے لوگ شوق سے پہنتے ہیں۔

شکیل الدین صدیقی "ماروی کے دیس میں" لکھتے ہیں:

"اجرک اور دوسرے روایتی لباس صدیوں سے پہنے جا رہے ہیں۔"(50)

اُردو سفر نامہ نگاروں کی ایک بڑی کہکشاں ہے۔ جنھوں نے ملک کے چپے چپے کو عیاں کر کے معلومات سے اُردو اَدب کا دامن بھر دیا ہے۔ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی سفر نامہ نگاروں نے بھی ہماری اس سرزمین کو یہاں کی تہذیب، ثقافت، بودوباش کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا ہے کہ یہ معلومات اُردو اَدب کے لیے خزانے کی مانند ہیں۔ کیمی پوا کا سفر نامہ "سفر نامہ پاکستان" اسی طرح کا ایک سفر نامہ ہے۔ اس میں اُنھوں نے پورے ملک کی سیاحت کی رُوداد پیش کی ہے۔

کراچی کی سیر کرتے ہوئے وہاں کے لوگوں کے بارے میں کیمی پوا لکھتی ہیں:

"سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی ہوئی باپردہ خواتین آپ کے پاس سے گزرتی ہیں۔ ساڑھی میں یا شلوار قمیض میں ملبوس عورتیں اس خطہ ارض پر لباس کے مشرقی طرز کی تصویر پیش کرتی ہیں۔"(51)

کیمی پوانیویارک سے پاکستان کی سیاحت کے لیے آئی تھیں۔اُنھوں نے ملک کی سیاحت کا شوق جوش و خروش سے پورا کیا۔اپنے اس سفر نامے میں اُنھوں نے چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی قلم بند کیا ہے۔پاکستان چوں کہ ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں پردہ کا رواج ہے۔اس پردے کی حامل خواتین کے لباس نے انھیں خاصا متاثر کیا اور اسے اُنھوں نے اپنے سفر نامہ میں پیش کیا ہے۔یہاں تک کہ اُنھوں نے ماہی گیروں کے لباس پر بھی توجہ دی۔کراچی کے ماہی گیر اپنے مخصوص و دل کش لباس شلوار قمیض میں ملبوس ہوتے ہیں۔

اس سفر نامے کو محمد حسن نے ترجمہ کیا ہے۔پاکستان کی ثقافت کو سفر نامہ نگاروں نے جس طرح پیش کیا ہے۔یہ ان کا کمال ہے۔اُنھوں نے ملک کے گوشے گوشے سے متعارف کرا دیا ہے۔

.V پیشے:

یوں تو پیشے بھی کسی خطے کی ثقافت کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور سفر نامہ نگار ان ثقافتی عوامل کو سامنے لانے میں موثر ثابت ہوئے ہیں۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے پاکستان کے چپے چپے کو صفحہ قرطاس کی زینت بنا دیا ہے۔ رضا علی عابدی ایک ایسے ہی سفر نامہ نگار ہیں۔جنھوں نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بسنے والے والوں کی ثقافت کو صفحات پر اس طرح بکھیرا ہے کہ جیسے آسمان پر ستارے بکھرے ہوتے ہیں۔اور اپنی روشنی سے ساری دُنیا کو منور کرتے ہیں۔بالکل اسی طرح اُنھوں نے اُردو اَدب کو معلومات سے منور کیا ہے۔رضا علی عابدی کا سفر نامہ ”شیر دریا“ ایک ایسا ہی سفر نامہ ہے جو ثقافت سے بھرپور ہے۔یوں تو اُنھوں نے لداخ سے سفر شروع کیا۔پہاڑوں سے ہوتے میدانوں تک پہنچے اور اپنے سفر نامے کو ثقافتی عوامل سے مالا مال کرتے رہے۔دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے کرتے سفر نامہ نگار سکھر پہنچا۔سکھر میں روزگار کے مواقع زیادہ ہیں کیوں کہ یہ بڑا شہر ہے۔اس لیے آس پاس کے علاقوں کے لوگ بھی اُدھر کا رُخ کرتے ہیں۔یہاں کارخانے اور فیکٹریاں ہیں، یہاں کپڑا بننے کے کارخانے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں کوئی بیراج پر کام کرتا ہے، کوئی گورنمنٹ ملازم ہے، کوئی پھل بیچ رہا ہے کوئی ماہی گیری کا کام کر رہا ہے۔مردوں کے ساتھ ساتھ یہاں عورتیں بھی کشتی چلانے کا کام کرتی ہیں اور بطور ملاح خوش اسلوبی سے اپنا کام سر انجام دیتی ہیں۔لاڑکانہ میں کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔حیدر آباد سندھ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔یہاں بھی صنعتیں ہیں جو لوگوں کے روزگار کا ذریعہ ہیں۔یہاں کی چوڑیوں کی صنعت بہت مشہور ہے۔حیدر آباد جیسی چوڑیاں کہیں نہیں ملتیں۔ان صنعتوں میں روزانہ 12 سے 13 گھنٹے کام کیا جاتا ہے۔

بقول رضا علی عابدی:

”کانچ کی جیسی اور جتنی اچھی چوڑی حیدر آباد میں بنتی ہے ، کہیں نہیں بنتی۔“(52)

کیٹی بندر میں زمینداری اس علاقے کے باشندوں کا پیشہ ہے۔اس علاقے کی آدھی آبادی ضلع ٹھٹھہ کی ہے۔یہاں کے لوگ کاشتکاری ، ماہی گیری اور مزدوری کرتے ہیں۔زیادہ تر لوگ کاشتکاری اور ماہی گیری سے وابستہ ہیں۔شاہ بندر جہاں سفر نامہ نگار کا سفر اختتام کو پہنچا یہاں کے لوگ شتر بان ہیں اور اُونٹ لے کر پھرتے ہیں اور مزدوری پر وزن اُٹھانے اور لوگوں کو اُونٹ کی سیر کرانے کو بطور روز گار اپنائے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ ماہی گیری کا کام بھی کر لیتے ہیں۔

وادی سندھ کے لوگ ہنر مندی اور دستکاری میں بے مثال تھے۔یہاں کے کوزہ گر بہترین مٹی کے برتن بناتے تھے مورتیاں بناتے تھے۔ایسے ہی ایک ماہر کوزہ گر اُستاد پٹھانے خان بھی تھے۔اصل میں تو وہ کوزہ گر تھے مگر قدرت نے انھیں سُر بخشے تھے کہ وہ گانے والے اُستاد کے نام سے جانے جانے لگے۔

ڈاکٹر عباس برمانی سفر نامہ ”سندھو سائیں“ میں لکھتے ہیں:

”اسی سندھ کنارے ایک کوزہ گر رہتا تھا اور ن م راشد کے حسن کوزہ گر کی طرح مٹی کے برتن بناتا، انھیں رنگتا، ان پر نقاشی کرتا اور مورتیں اُبھارتا تھا جانے اس کی کونسی ادا سُر کلا کی دیوی کو ایسی بھائی کہ اس نے اس کوزہ گر کو سُروں کا وردان دیا اس کے گلے میں سات سروں کی کہکشاں اُبھر آئی اس نے خواجہ فرید کا کلام گانا شروع کیا اور پھر اس پر خواجہ سائیں کی نظرِ عنایت یوں ہوئی کہ سندھ کنارے بسنے والا ایک گم نام کمہار دُنیا کے گوشے گوشے میں اُستاد پٹھانے خان کے نام سے مشہور ہوا۔“(53)

مال مویشی چراگاہوں میں چرتے پھرتے تھے چراگاہیں بھینسوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں سے گونجتی تھیں۔یہاں کے لوگ بطورِ پیشہ جانوروں کو چراگاہوں میں چرانے کا کام کرتے ہیں۔بروہی لوگ سندھ اور بلوچستان کے پہاڑوں سے بھیڑ لا کر یہاں کی منڈی میں بیچتے ہیں۔یہ بروہی دراصل دراوڑی ہیں وادی سندھ کے اصل مالک یہی تھے۔لاڑکانہ کی زمین زرخیز ہے۔وہاں کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔مٹھائی، میوہ جات، پھلوں اور پھولوں کی دُکانیں سڑک کے اطراف تھیں یہاں لوگوں نے مختلف قسم کے روز گار اپنائے ہوئے

ہیں۔ منچھر جھیل ایشیا کی چند بڑی جھیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ جھیل وہاں بسنے والوں کو روزی دینے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ مچھلی اور پرندے بیچے جاتے ہیں۔

یہاں بطورِ پیشہ شکار بھی کھیلا جاتا ہے۔ مرغابی شکار کر کے اسے بیچتے ہیں۔ مِٹھی تھر کا ایک نمائندہ صحرائی شہر ہے۔ یہاں پر لوگ اُونٹوں پر سواری کرتے ہیں۔ یہاں پر اُونٹوں کو خوب سجایا جاتا ہے۔ تھری اپنے اُونٹوں کو گھر والی نسبت کی زیادہ ہار سنگھار کرتے تھے۔ رنگین جھالریں، پھندنوں کی لڑیاں، منکوں اور موتیوں کے ہار، یہ سمندری گھونگوں کی مالائیں یہ سب چیزیں اُونٹوں کے سنگھار میں استعمال کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے ''اور سندھ بہتا رہا'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس کے بھیڑ بھرے بازاروں میں جہاں وڈیروں اور پیروں کی سیاہ لینڈ کروزرز ہجوم میں راستہ بناتی سرکتی تھیں۔ وہاں اُونٹ بھی شان تفاخر سے محوِ خرام تھے اور وہ یقیناً ان لینڈ کروزرز کی نسبت کہیں خوب صورت لگتے تھے اور ان پر سوار تھری رنگین پگڑیوں والے بھی ان لینڈ کروزرز میں پوشیدہ وڈیروں اور پیروں کی نسبت زیادہ شکل والے تھے۔''(54)

سندھ ہمیشہ سے اپنی گھریلو دستکاریوں کی مہارت اور تنوع کے لیے مشہور رہا ہے۔ یہاں ایک خاص قسم کا ریشم بھی ہوتا ہے۔ جس سے کئی قسم کے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں مویشی بہت ہیں۔ بالخصوص بھینسیں بھی بہت زیادہ ہیں اور بہت سے جہاز ان کی کھالوں سے لدے مختلف بندر گاہوں کو جاتے ہیں۔ ان سے وہ بہت خوب صورت چمڑا بناتے ہیں۔ جنھیں پرتگیز ''سندھی چمڑا'' کہتے ہیں۔ جس سے میز پوش، پردے، گدے، رضائیاں بنائی جاتی ہیں۔ سندھ میں تجارت بھی کی جاتی ہے۔ روزی حاصل کرنے کے لیے تجارت کرنا معقول روزگار ہے۔ سندھ بندرگاہ ہے۔ لہٰذا یہ کام بخوبی ہوتا ہے۔

بقول ہنری پوٹنگر:

> ''جب سندھی مکران عربوں کے تسلط سے آزاد ہوئے تو اُنھوں نے ٹھٹھہ کو اپنا صدر مقام بنایا اور یہ جلد ہی ایشیا کا ایک عظیم ترین شہر بن گیا اور جزیرہ نمائے ہند اور شمالی اور مغربی ایشیا کے درمیان تجارت کا سب سے بڑا مرکز بنا۔''(55)

سندھ کا قدیم علاقہ ٹھٹھہ جہاں لوگ زراعت، معماری اور بڑھئی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ ٹھٹھہ کا مستقل پیشہ ماہی گیری ہے۔ کیمی پوا "سفر نامہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

"ٹھٹھہ کے باہر، مشہور کانجھر اور سنہری جھیلوں میں تیراکی اور مچھلی پکڑنے کا لُطف اُٹھایا جاسکتا ہے۔"(56)

سندھ میں کشتی رانی ذریعہ معاش کا ایک وسیلہ ہے۔ کراچی میں بھی لوگوں نے کشتی رانی کو بطورِ روزگار اپنایا ہوا ہے۔ سمندری علاقوں میں لوگ اس روزگار کے ذریعے بھی گزر بسر کرتے ہیں۔ سمندری علاقے جیسے کلفٹن کا ساحل ہی لیجئے یہاں خوانچہ فروشوں کی ایک لمبی لائن نظر آتی ہے۔ جہاں مختلف چیزیں ملتی ہیں اور ساتھ ہی اُونٹ کی سواری بھی۔ یہ کام اب بطورِ پیشہ لوگوں نے اپنا لیے ہیں۔

کیمی پوا اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان" میں لکھتی ہیں:

"جونہی آپ سمندر کے کنارے ریتلی زمین پر پہنچیں گے آپ کو خوانچے والوں کی ایک لمبی قطار نظر آئے گی۔ جن کے خوانچوں میں ایسی خوب صورت اشیار کھی ہیں جو چمکیلے رنگین سیپ اور گھونگے سے تیار کی گئی ہیں آپ ایک روپیہ خرچ کر کے سیپ کی بنی ہوئی چوڑیاں، بالیاں، ہار، ایش ٹرے اور چھوٹی چھوٹی بطخیں خرید سکتے ہیں۔ کلفٹن کے خوانچے والے سے سودا خریدنا بڑا منافع بخش ہوتا ہے اور ایک اور سودا بھی ہے اور وہ اُونٹ کی سواری۔"(57)

کراچی شہر میں دواسازی کی فیکٹریاں شامل ہیں۔ ٹیکسٹائل ملز ہیں اور ایسے کارخانے ہیں جو ضرورت کی ہر شے تیار کرتے ہیں۔ ایک ملین سے زیادہ جرابیں یہاں تیار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں اُونی کمبلوں، سوتی کپڑے، ریشمی کپڑے بھی بنائے جاتے ہیں اور ہزاروں لوگ ان ملوں میں کام کر کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسی طرح حیدر آباد بھی صنعتی شہر ہے، جہاں کے نفیس پارچات، نایاب ڈیزائن کے کپڑے، اُونٹ اور گھوڑوں کی کاٹھیوں کے لیے دیدہ زیب کشیدہ کاری کا کام اور گھریلو اور صنعتی استعمال کے لیے تعمیراتی سامان بنایا جاتا ہے۔ ہزاروں لوگوں کا یہی روزگار ہے۔ یہ کارخانے ان کا اور ان کے بچوں کا پیٹ پالنے کا ذریعہ ہیں۔ مچھلیاں وادی سندھ کی معیشت کو پروان چڑھانے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ گانڈن، پالہ، جرگی، کھگو اور

گوچہ مچھلیاں کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ مچھلی وادی سندھ کی معیشت کو ترقی دینے میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔اس کے ذریعے دس ہزار مچھیروں کو روزگار ملتا ہے۔حیدر آباد اور خیر پور ڈویژن میں برسات کے موسم میں روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔یہ مچھلیاں سمندر سے دریائے سندھ میں آجاتی ہیں اور مون سون کے دنوں میں تیرتی ہوئی سکھر تک آجاتی ہیں۔ مچھلی کے کاروبار کی بدولت ہزاروں لوگوں کو روزگار ملتا ہے اور یوں ان کا گزر بسر ہوتا رہتا ہے۔

بقول کیمی پوا:

"مچھلی زیریں وادی سندھ کی معیشت کے لیے کافی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ اس کے ذریعے تقریباً دس ہزار مچھیروں کو روزگار ملتا ہے۔حیدر آباد اور خیر پور ڈویژن میں موسم کے دوران روزانہ ایک لاکھ سے اُوپر مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔مچھلیاں سمندر سے دریائے سندھ میں آجاتی ہیں اور مون سون کے دوران تیرتی ہوئی نیچے سکھر بیراج چلی جاتی ہیں۔"(58)

ٹھٹھہ کے باہر مشہور کانجھر اور سنہری جھلیں بھی مچھلیاں پکڑنے کا اہم ذریعہ ہیں۔صوبہ سندھ مچھلی کی صنعت کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔روہڑی ایک بڑا شہر ہے جو سکھر کے مقابل آباد ہے۔جو دریا کے کنارے سے شروع ہوتا ہے۔سندھ کا بہترین سوتی کپڑا یہاں بنتا ہے۔یہ بہت ہی قدیم صنعت ہے۔روہڑی اپنے شان دار باغات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔یہاں پر آم اور کھجوروں کے بکثرت درخت ہیں۔ کھجور پر ہی 3،4ماہ غریب لوگ گزارا کرتے ہیں۔حیدر آباد میں درختوں کی بہتات ہے۔حیدر آباد کے ہر کونے میں پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔حیدر آباد کو پھولوں کا شہر کہا جاتا ہے۔روہڑی کپڑے کی صنعت کی وجہ سے مشہور ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

"یہ شہر پہاڑیوں کے ٹیلوں پر واقع ہے۔جو دریا کے کنارے سے شروع ہوتا ہے۔اسی وجہ سے اس کے بعض گھر دریا کے اُوپر لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔سندھ کا بہترین سوتی کپڑا یہاں تیار ہوتا ہے یہ صنعت بہت قدیم ہے۔"(59)

سندھ کا ایک گاؤں بھالوا ہے زرد صحرا میں یہ رنگین گاؤں ہے۔ یہاں کا کلچر بہت ہی دل کش ہے۔کسانوں کے ساتھ خواتین بھی کھیتی باڑی کرتی نظر آتی ہیں۔یہاں کی عورتیں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

بقول ماجد فرید ساٹی :

> "کسانوں کے ساتھ خواتین بھی کھیتی باڑی کرتی نظر آئیں گی۔ان کے رنگ برنگے کپڑوں اور ہاتھوں میں پہنے سفید چوڑے دیکھ کر آپ کیمرے کی طرف ہاتھ بڑھادیں گے۔"(60)

تھر کا صدر مقام مٹھی ہے یہاں کوئلے کے ذخائر ہیں۔کارونجھر کی پہاڑیوں سے گرینائیٹ نکلتا ہے جو ٹائل بنانے کے کام آتا ہے۔سلفر کے ذخائر بھی موجود ہیں۔اس شہر میں گھریلو صنعتیں عروج پر ہیں۔جو یہاں کے باسیوں کا روزگار ہیں۔کارونجھر سندھ کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔گورکھ ہل اسٹیشن یہاں بھی یہ کثرت سے پائی جاتی ہے۔

vi. رہائش گاہیں:

اندرون سندھ کی طرف نکل جائیں تو سندھ ابھی تک ایک دیہاتی ، شبانی اور خانہ بدوشانہ معاشرہ ہے۔عام دیہاتی ایک چھوٹی سی پست جھونپڑی رکھتا ہے جس کی دیواریں کیچڑ یا ٹھاٹ کی ہیں اور چھت گھاس پھونس کی جس کے گرد ایک باڑ ہوتی ہے۔ جس کے اندر جانوروں کا ایک باڑہ ہوتا ہے۔جو بوقت ضرورت اس کے دوستوں کے لیے استقبالیہ کمرے کا کام دیتا ہے۔اس کے برعکس زمینداروں کا معیارِ زندگی بلند ہے۔ان کے گھر ڈھنگ کے بنے ہوئے ہیں۔بہت سے بلوچوں کو ٹھوس عمارات میں رہنے سے خوف آتا ہے۔چاہے وہ کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں وہ گھاس پھوس کے حجروں میں رہتے اور سوتے ہیں۔میرپور کا خاندان آخر تک اسی ریت پر چلتا رہا۔

معیارِ زندگی بلند ہونے کی وجہ سے سندھ کے تمام طبقوں کی رہائش گاہوں میں واضح طور پر تبدیلی نظر آتی ہے۔پختہ اینٹوں بلکہ پتھر کے مکانات دیہاتوں میں عام ہو گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا رہن سہن اور سازوسامان بھی بہتر ہو رہا ہے۔دومنزلہ مکانات دیہاتی اتنا پسند نہیں کرتے اور ایک منزلہ مکان کو فوقیت دیتے ہیں۔امیر لوگوں کے تو کراچی اور حیدرآباد میں بہت عمدہ عمدہ مکانات ہیں۔

”دو منزلہ مکانات ابھی بھی کم یاب ہیں اور ہمسائے کی بے پردگی کے خوف سے انھیں پسند نہیں کرتے۔“(61)

ٹھٹھہ ایک بڑا شہر تھا۔ جہاں مکانات ہی مکانات تھے۔ دریا کے سیلاب نے وہ تباہی مچائی کہ گھر شکستہ شکل اختیار کر گئے۔ دریا کے کنارے آباد لوگ مٹی اور گھاس پھونس سے جھونپڑے تیار کرتے ہیں جو ان کھیتوں میں ہی بنا لیے جاتے ہیں جن کو یہ کاشت کرتے ہیں۔ شمالی سندھ کی زمین مصر کی طرح زرخیز ہے۔ امیروں کے بڑے بڑے گھروں میں چھتوں پر ہلکی لکڑی کا کام ہے۔ سرمایہ دار لوگوں کے ہاں اس کام کو مصوری سے بھی سجایا جاتا ہے۔ دیواریں موٹی بنائی جاتی ہیں ان میں طاق بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ ان میں گھریلو اشیا سجائی جاسکیں۔ گھروں کے باہر رنگ بھی کیا جاتا ہے، جو بہت اچھا لگتا ہے۔ کمروں کے بالائی حصّے میں کمروں کے بارچھپے بنائے جاتے ہیں جس پر موسم گرما میں مرد و عورت سبھی سوتے ہیں۔ جب کہ عام طبقے سادے گھر بناتے ہیں فرش جلی ہوئی اینٹوں کے بنتے ہیں۔ گھر کی دیواریں عام سی بنائی جاتی ہیں۔ اور ان پر ایک ہی بار سفیدی کی جاتی ہے۔ سندھ کی مٹی سے پلاستر بہت اچھا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب اس میں گھاس، ملا کر پلاستر ہو تو وہ مضبوط رہتا ہے۔

”فرش جلی ہوئی اینٹوں سے بنائے جاتے ہیں مگر زیادہ تر مٹی سے بنائے گئے ہیں بعض پر تو محض دریائی مٹی لیپ دی گئی ہے۔ یہ وہ مٹی ہے جو اس وقت جب کہ پانی اپنے آثار چھوڑ جاتا ہے اسے مزدور یا بھشتی اُٹھا کر لے آتے ہیں سندھ کی مٹی سے پلاستر بہت اچھا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب اس میں گھاس ملا دی جائے جو اسے خشک ہونے پر ٹوٹنے سے روکتی ہے۔“(62)

اُردو سفر نامہ نگاروں نے سندھ کے ثقافتی رنگوں سے اُردو اَدب کے اوراق کو رنگینی بخشی ہے اور اُردو اَدب کے وقار کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ محمد خالد اختر نے اپنے سفر نامے ”یاترا“ میں تھر کے ان علاقوں سے روشناس کرایا ہے جن کے بارے میں عام انسان کو علم نہیں۔ مٹھی کیفے وجوٹھو، اسلام کوٹ کی سفر نامہ نگار خالد اختر نے اس طرح سیر کرائی کہ ہمارے ملک کے یہ قدیم اور قدامت پسند حصے ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔

نوں کوٹ سے خالد اختر نے اپنے سفر تھر کا سفر شروع کیا نوں کوٹ کو تھرپارکر کے صحرا کا دروازہ کہا جاتا ہے اور یہاں سے ٹرک نما لاریاں ڈیپلو، مٹھی، اسلام کوٹ، نگر پارکر، چھاچھڑو اور دوسرے صحرائی حصّوں کو جاتی ہیں۔

محمد خالد اختر نے دورانِ سفر چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی غور و فکر کیا ہے اور تمام سفری رُوداد کو من و عن بیان کر دیا ہے۔ مکانوں کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ گھاس پھونس کی جھونپڑیاں جنھیں وہ اپنی زبان میں "گوپے" کہتے ہیں۔ ان گوپوں میں رہنے والے سادہ لوح معصوم لوگ اپنی اپنی زندگی میں مگن اور خوش رہتے ہیں۔

محمد خالد اختر اپنے سفر نامے "یاترا" میں لکھتے ہیں:

"کسی فراخ وادی میں کوئی ٹیلا سطح مرتفع کے طور کا ہوتا ہے جس پر سنگل فائل میں جمائی گھاس پھوس کی گول جھونپڑیاں روح کو لبھاتیں (ان جھونپڑیوں یا مکانوں کو گوپے کہتے ہیں اور ان کی ٹاپ مخروطی ہوتی ہے اور وہ رہنے والوں کے لیے محلوں سے ہزاروں درجہ بہتر ہیں کیوں کہ خوشی ان گوپوں میں رہتی ہے اور آدمی کا دل کبھی بیمار نہیں ہوتا)۔"(63)

سفر نامہ نگار نے اپنے دورۂ سندھ کے دوران تھر کے علاقوں کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ نوں کوٹ، وجو کوٹھے، مٹھی اور اسلام کوٹ کی الگ الگ ثقافت کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب تک نو کوٹ کے لوگوں کی رہائش کی صورتِ حال سامنے آئی ہے۔ آگے سفر نامہ نگار نے اسلام کوٹ کی رہائشی صورتِ حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اسلام کوٹ میں گھروں کے دروازے لمبے اور چوڑے رکھے جاتے ہیں۔ ریتیلے فرش نظر آتے ہیں۔ گھروں میں صحن ہیں اسلام کوٹ میں ہندو کثرت سے نظر آتے ہیں۔ دو گھروں کے درمیان کچھ لوگ دروازے بنا لیتے ہیں تا کہ ایک دوسرے کے حصّے میں آ جا سکیں۔ پرانے ہندوؤں کی ساجھے کی کنبہ داری ابھی تک ان خاندانوں میں رائج ہے۔ صحن کے چبوترے بھی ہیں، جہاں بستر لگا کر آرام کرنے کی جگہ بنا دی گئی تھی اس کے علاوہ آرام کرنے کے لیے کرسیاں اور میز بھی لگے ہوئے ہیں۔

بقول محمد خالد اختر:

"صحن کے چبوترے پر تین چوڑے کھاٹوں پر بستر لگے تھے دو آرام کرسیاں اور ایک میز۔" (64)

اسلام کوٹ میں رہائش پذیر لوگ اچھے مکانوں میں رہتے ہیں۔ کشادہ حویلیاں وہاں موجود ہیں۔ اسلام کوٹ میں دروازے عموماً گائے کے اندر باہر لے جانے کے لیے اُونچے اور چوڑے بنائے جاتے ہیں تا کہ بے فکری سے انھیں لے جایا جا سکے۔ اسلام کوٹ میں لوگ گاڑھے رنگوں کو پسند کرتے ہیں۔ راجستھان

میں بھی اسی نوعیت کے گھر ہیں اور بالکل اسی قسم کی بود و باش ہے۔ فنِ تعمیرات بھی ایک جیسی ہیں۔ کیوں کہ ثقافت ایک جیسی ہے اس لیے ہر اشیا میں ایک ہی ثقافتی رنگ جھلکتا ہے۔ بازار میں دونوں اطراف دُکانیں ہیں۔ درمیانی فاصلہ چوڑا تھا۔ اینٹ اور سیمنٹ کی کھلے فرنٹ کی دُکانیں تھیں۔ کنکریٹ کی سلوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف سندھ کے یہ علاقے تھے اور ایک طرف نوں کوٹ تھا جہاں کیچڑ سے لت پت دلدلی بازار تھا۔ سفر نامہ نگار نے ان چیزوں کو دیکھا، غور کیا اور اپنے سفر نامے "یاترا" میں بیان کیا ہے، جس نے قاری کے علم میں اضافہ کیا۔ محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

"اور یقیناً اسلام کوٹ میں ہونا ایسا ہی تھا جیسے تم راجستھان میں ہو۔ وہی فن عمارات، وہی لوگ ، یہ گلی ہمیں ایک سہ راہ ہے اور بازار تک لے آئی؛ بازار جس کے دورویہ اینٹ اور سیمنٹ کے کھلے فرنٹ کی دُکانیں تھیں۔"(65)

ہمارے اُردو سفر نامہ نگار ایسے ہمت والے ہیں جنھوں نے دور پار کے ان علاقوں کی سیاحت بڑے عزم و حوصلے سے کی اور اُردو اَدب کو ناقابلِ فراموش معلومات سے ہم کنار کیا۔ اس ضمن میں مستنصر حسین تارڑ کی خدمات بھی قابلِ تحسین ہیں۔ اُنھوں نے دریائے سندھ کے ساتھ اپنی محبت اور "سندھ بہتا رہا" کے رُوپ میں دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ "تھر" جیسا دور افتادہ پس ماندہ علاقہ جہاں اُردو سفر نامہ نگاروں نے اپنے قدم گاڑھے اور وہاں کی خوب صورت ثقافت سے اُردو اَدب کا دامن بھر دیا۔ تھر کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دُنیا کا سب سے آباد صحرا ہے۔ یہ بے آباد اور خالی نہیں ہے۔ اس صحرا میں بستیاں ہیں آبادیاں ہیں۔ بے شک وہ کبھی بھوک سے مر جاتے ہیں لیکن وہ بہتر آسائشوں کی خواہش میں اپنا صحرا نہیں چھوڑتے اور کہیں اور جانے کا خیال بھی نہیں کرتے۔ حالاں کہ یہاں کا فرش ریت ہے اور گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سرد۔ یہاں صحرائی گھاس سے درجنوں جھونپڑے تعمیر ہیں۔ دیواریں بھی گھاس سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ گھاس اور مٹی کے بنے گھروندے تھر کی مقامی زبان میں "چونرو" کہلاتے ہیں۔ ایسے گھر موسمی اثرات کو پیشِ نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں۔ گھاس سے گرم ہوا داخل ہوتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح خَس کی چک میں سے داخل ہونے والی گرم ہوا خوش گوار محسوس ہوتی ہے۔ یہ جھونپڑے بھی بالکل اسی طرز کے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "اور سندھ بہتا رہا" میں رقم طراز ہیں:

"دائیں جانب ایک بلند ریتلے ٹیلے پر وہ صحرائی گھاس سے تعمیر کردہ درجنوں جھونپڑے تھے۔ کمر تک آنے والی کچھ گول دیواروں کے اُوپر ایستادہ، گھاس

کی مخروطی ٹوپیاں اوڑھے جھونپڑے تھے۔ جنھیں مقامی زبان میں ”چونرو“ کہا جاتا ہے اور بائیں جانب سڑک کے کناروں پر اس گاؤں کے وہی گھاس اور مٹی کے گھروندے تھے اور سر شام تھے۔۔۔

اور یہ جھونپڑے بھی تھر کے گرم موسموں کو جھیلنے کے لیے سینکڑوں برسوں کے رہاشی تجربوں کے بعد اس شکل میں وجود میں آئے۔۔۔“(66)

پرانے وقتوں اور آج میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ معاشرہ کافی حد تک تبدیل ہو گیا ہے۔ صنعتی ترقی نے دُنیا کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ اس کے کچھ اثرات ہمارے ملک کے دیہاتوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ صوبہ سندھ قدیم صوبہ ہے۔ پہلے عمارتوں میں پتھر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اب ٹائیلیں، ماربل استعمال ہوتے ہیں۔ مکانات کی مٹی سے لپائی ہوتی تھی۔ ٹھٹھہ شہر بڑا شہر معلوم ہوتا ہے۔ مکانات مٹی سے رنگے نظر آتے تھے۔ اصل میں یہ شہر دریائے سندھ میں آنے والے سیلاب سے ہر سال متاثر ہوتا تھا اور شہر کا نقشہ بدل جاتا تھا۔ گھروں کی جگہ گری ہوئی دیواریں اور مسجدوں کے ڈھیر خوب صورت رہائش گاہ کا پتہ دیتے تھے۔ یہاں کے مکانات تین چار مزلہ عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ بہت سے بہتر مکانات لکڑی کے ڈھانچے پر اینٹ اور گارے سے بنے ہوئے ہیں۔ ان گھروں کی بھاری بھر کم چھتیں ہیں۔ اگر دیواروں میں دو تین لکڑیاں کم زور ہو جائیں تو ساری عمارت گر جاتی ہے۔

ٹھٹھہ شہر کی اسی صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے ہنری پوٹنگر اپنے سفر نامے ”سفر نامہ بلوچستان و سندھ“ میں لکھتے ہیں:

”یہاں کے مکانات کا نقشہ مجھے کسی اور ملک میں نظر نہیں آتا۔ ان کی دیواریں اندر سے کھوکھلی ہیں۔ ان کے اندر لکڑی کے ایک چھوٹے سے ڈھانچے کے بیرونی سروں سے چھوٹی چھوٹی چھڑیاں آر پار گزاری گئی ہیں جو آٹھ سے سولہ انچ تک لمبی ہیں اور مٹی یا گارے سے لپائی کے بعد ایک ٹھوس دیوار کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اس اصول پر بنی ہوئی بعض عمارات تین چار منزلہ ہیں۔“(67)

سندھ کے وہ علاقے جو دریا کے ساتھ ساتھ ہیں۔ کچھ گھرانے تو ایسے ہیں جو دریائے سندھ میں کشتی رانی جیسے روز گار سے وابستہ ہیں اور یہ کشتیاں ہی ان کا گھر ہیں۔ ان میں ہی سوتے ہیں اور صبح کو اسی کو مزدوری

کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جھیلوں کے کنارے بستیاں آباد ہیں۔ منچھر جھیل ہزاروں لوگوں کو روزگار فراہم کرتی تھی۔ یہاں مچھلی، پرندے، جڑی بوٹیاں، مختلف قسموں کے پودے اور پھول تھے۔ منچھر جھیل کے دونوں اطراف جھونپڑے تھے۔ بانسوں اور سرکنڈوں سے بنے یہ جھونپڑے انتہائی خوب صورت تھے اور ان جھونپڑوں کو رنگ بھری ''رلیاں'' ڈال کر سجایا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ جھونپڑے انتہائی خوب صورت نظر آتے تھے۔ اس خوب صورتی کو ہمارے سامنے لانے کا سہرا اُردو سفر نامہ نگاروں کے سر ہے۔ اُنھوں نے ان قدیم خطوں کو ہمارے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی جزئیات، رسوم و رواج، عادات و اطوار سب کھل کر سامنے آگئی ہیں۔

ڈاکٹر عباس برمانی ہمارے اُردو سفر نامہ نگاروں کی کہکشاں کا ایک روشن ستارہ ہیں۔ اُنھوں نے سکردو سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ جو سندھ پہنچ کر ختم ہوا۔ پہنچنا انھیں کیٹی بندر تھا جہاں دریا اور سمندر کا ملاپ ہوتا ہے مگر ان کا یہ سفر بھنبھور کے مقام پر ختم ہوا۔ منچھر جھیل کے گرد رہائشیوں کا اپنے سفر نامے ''میرا سندھو سائیں'' میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منچھر کی یہ آبی شاہراہ ایک بستی کے بیچ میں سے گزری دونوں اطراف جھوپڑوں کے لا متناہی سلسلے تھے۔ بانسوں اور سرکنڈوں سے بنے یہ جھونپڑے انتہائی خوب صورت تھے ان پہ رنگوں بھری ''رلیاں'' آویزاں کر کے انھیں سجایا گیا تھا۔''(68)

سندھ قدیم خطہ ہے۔ اس کی قدامت پسندی ہی نے اسے اہمیت بخشی ہے۔ تھر، حیدر آباد، سکھر، ٹھٹھہ، موہن جوڈارو وغیرہ ایسے علاقے ہیں جو ہمیشہ سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی سیاحوں کو بھی ان علاقوں کی بھرپور اور مُنفرد ثقافت سے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ سیاحوں میں ایک سیاح کیمی پوا ہیں جن کو نیویارک سے اس سرزمین کی سیاحت نے آنے پر مجبور کیا اور اُنھوں نے ''سفر نامہ پاکستان'' کے نام سے اپنا سفر قلم بند کیا۔

حیدر آباد کے جنوب میں شاہ لطیف آباد کالونی، مشرق میں صنعتی علاقہ اور حیدر آباد شہر کے شمال مغرب میں جام شورو ہے۔ یہاں پر پرانے زمانے کے بنے ہوئے مکانات اب بھی موجود ہیں۔ جو سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز ہیں اور ان کو دیکھ کر اس علاقے کی ثقافت پوری طرح عیاں ہوتی ہے کہ لوگ کس طرح کے تھے اور کیسے ماحول میں رہائش پذیر تھے۔ ہوا کے گھروں میں آنے کے لیے منفرد طریقہ کار تھا یہاں کے

لوگوں کا جسے وہ بادکش کہتے تھے۔اس میں کمرے کی چھت پر لکڑی اور پلاسٹر کے بادکش بنائے جاتے ہیں اوپر جنوب اور مغرب کی جانب حصہ کھلا رکھا جاتا ہے جو ہوا کو کھینچتا ہے۔اس طرح ہوا کے آنے کا انتظام کیا جاتا ہے، اسے ''بادکش'' کہتے ہیں جو گرمیوں میں لوگوں کے لیے ایک نعمت ہے۔یہاں تمام مکانات بادکش بنے ہوئے ہیں۔پرانے زمانے کی جھلک لیے ہوئے ان نئی آبادیوں کی تعمیر سے حیدر آباد کا رقبہ پھیل گیا ہے اور خوب صورتی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔یہ تمام چیزیں جن سے ایک قاری گھر بیٹھے معلومات حاصل کرلیتا ہے یہ سب سفر نامہ نگاروں کی مرہونِ منت ہے۔اُنھوں نے باریکی سے ایک ایک جز پر روشنی ڈالی ہے۔جس کی بدولت یہ قدیم علاقے اپنی ثقافت کے ساتھ عیاں ہو گئے ہیں۔حیدر آباد کے طرزِ رہائش سے متعلق اپنے سفر نامے ''سفر نامہ پاکستان'' میں کیمی پوار قم طراز ہیں:

> ''حیدر آباد کے مکانات بے حد دل چسپ ہیں، بیش تر مکانات پتھر کے ہیں اور جنوب کی جانب بنے ہیں، جس طرف سے گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔کمروں میں ٹھنڈی ہوا حاصل کرنے کا یہ ان کا انفرادی طریقہ ہے کمرے کی چھت پر لکڑی اور پلاسٹر کے بادکش بنائے جاتے ہیں۔اُوپر جنوب اور مغرب کی جانب کا حصّہ کھلا رکھا جاتا ہے۔جو ہوا کو کھینچتا ہے اور اس طرح ہوا خود بخود نیچے کھلے ہوئے راستے کے ذریعے کمرے میں داخل ہوتی رہتی ہے۔گرمیوں کے جھلسانے والے دنوں میں بادکش لوگوں کے لیے ایک نعمت ہیں۔سردیوں میں لکڑی کے تختے سے چھت کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔''(69)

خیر پور کے مکانات اگر دیکھے جائیں تو وہ بہت ہی گھٹیا درجے کے ہیں اور بڑی ہی بے قاعدگی سے بنے ہوئے ہیں۔دریائے سندھ کے قریب ہونے کی وجہ سے طغیانی کے وقت یہ سارا علاقہ زیرِ آب آ جاتا ہے۔سندھ کا شہر سکھر بڑے بڑے گھروں پر مشتمل ہے۔ان گھروں میں برآمدے اور کھڑکیاں بھی موجود ہیں۔لاڑکانہ سندھ کا ایک بڑا شہر ہے۔جہاں نئے مکانات بڑے بڑے بنائے گئے ہیں۔بہت زیادہ مکانات یہاں بڑے بڑے سائز کے ملتے ہیں۔جب کہ چھوٹے گھر پرانی طرز پر ہی قائم ہیں۔سندھ کے دیہات جو دریا کے قریب ہیں۔وہاں کے مکانات بہت خراب ہیں۔یہاں پر عمارتیں پتھروں کے بغیر بنائی جاتی ہیں۔نچلے درجے کی جھونپڑیاں مٹی اور گھاس پھونس کی بنائی جاتی ہیں۔حیدر آباد جو کبھی سندھ کا دارالحکومت تھا یہ ایک

چھوٹے سے جزیرے کے وسط میں ہے۔ یہاں پر ڈھلوانی چھتوں والے جھونپڑے اور سپاٹ چھتوں والے گھر بھرے پڑے ہیں۔ بڑے گھر دو منزلہ یا دو سے بھی زیادہ منزلہ ہیں جو بہت وسیع ہیں۔ تقریباً تمام گھروں میں بر آمدے ہیں۔ سندھ میں رہنے والے ہندوؤں کے مکانات بہت بڑے بڑے اور کشادہ ہیں۔

vii. سندھیوں کا طرزِ زندگی، لوگوں کی عادات واطوار:

سندھ کی آبادی بہت زیادہ ہیں۔ یہاں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ بلوچ حلب سے براستہ خلیج فارس کے ساتھ ساتھ مکران آئے اور وادی سندھ میں پھیل گئے۔ بلوچی قبائل رند، ڈومبکی، جھکرانی، لاشاری، چانڈیا، کرمطی، کورائی، جتوئی، بُردی، کھوسہ، جمالی، عمرانی، بگٹی، مری اور مزاری سمت قبائل کے بعد بلوچی موجودہ سندھ کی آبادی کا اہم ترین عنصر ہیں۔

سادات قبیلہ سندھ میں ان کے ساتھ گہری عقیدت رکھی جاتی ہے۔ یہ سید حسنی یا حسینی کہلاتے ہیں۔ قریشی کہلانے والے سندھی قبائل شیخ، صدیقی، تونیا، پیر زادہ، داؤد بونہ، شجرہ، نانچ اور بھایا ہیں۔ سندھ میں خوجے جو اسماعیلی شیعہ مذہب کے ہیں۔ جاٹ بحیثیت قبیلہ سندھی ہیں (اور غالباً سیتھی الاصل ہیں) سندھ میں مسلمان ماہی گیر موہانو کہلاتے ہیں۔ سرائے یہ وہ لوگ ہیں جو پنجاب سے آکر سندھ میں آباد ہو گئے۔ جو شکارپور اور لاڑکانہ میں آباد ہیں۔ سندھ میں ہندو خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ساہتا ایک تاجر پیشہ ہندو ذات ہے۔ لوہانو ایک ذات ہے جن میں ایک گروہ سرکاری ملازم دوسرا ساہوکار۔ اچھوت میں کم ترین ذات (ہندوؤں کی) کولی جو عموماً دہاڑی پر کام کرتے ہیں۔ ایک عام سندھی اپنا دن اس طرح گزارتا ہے قریباً عام طبقوں میں بیوی کو گھر کے کام نمٹانا پڑتے ہیں۔ صبح سویرے اُٹھنا، پانی لانا، اناج پیسنا، چاول صاف کرنا، کپڑے دھونا، بکری کا دودھ دوہنا، شوہر کو کھانا کھلانا، بچوں کو سنبھالنا اور محنت مزدوری کر کے گھر چلانے میں میاں کا ہاتھ بٹانا اس کے علاوہ چھڑیاں اکٹھا کرنا اور اُپلے بنانا بھی اسی کے کاموں میں شامل ہے۔ سندھی کسی معاملے میں اتنے فیاض نظر نہیں آتے جتنے وہ سیدوں کو کھانا کھلانے کے معاملے میں ہیں۔ اسی طرح عید کے تہوار کو جس جوش سے مناتے ہیں ایسا جوش ان میں کہیں نظر نہیں آتا۔ مقبروں کی رہائش جیسا ذوق ان جیسا کہیں نظر نہیں آتا۔

کھجوریں یہاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ جو غذا کی طرح سو کھا کر رکھی جاتی ہیں۔ اُونٹوں کو چرانے کا کام خانہ بدوش کرتے ہیں۔

"سندھی کسی بات میں اتنی فیاضی نہیں دکھاتا جتنی سیدوں کے کھلانے میں
کسی امر میں اتنی مستعدی ظاہر نہیں کرتا جتنی مذہبی معاملات میں کسی امر
میں اتنا جوش نمایاں نہیں کرتا جس قدر عید کی خوشی میں۔"(70)

سندھی امن پسند وخاموشی سے بسر کرنے والے رحم دل اور وفادار لوگ ہیں۔ان کی راست بازی اور دیانت داری اس درجے تک ہے کہ کبھی ان پر حرف نہیں رکھا جا سکتا۔عربی اقوام سے ملنے جلنے کا یہ اثر ہے۔اس لیے کہ عرب کے صحرا نشینوں کی راست بازی اور دیانت داری آج تک ضرب المثل ہے۔

اُردو سفر نامہ نگاروں نے ہر خطے کے لوگوں کی خصوصیات سے اَدب کو معلومات کا ایک نادر خزانہ عطا کیا ہے۔اُنھوں نے ہر خطے کا دورہ کیا وہاں کے لوگوں کی معمولی سے معمولی عادات واطوار کو بھی صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے اَدب کا دامن وسیع تر معلومات سے معمور کر دیا۔

رضا علی عابدی بھی ایسے ہی سفر نامہ نگار ہیں جنھوں نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہر علاقے کی خصوصیات کو اس طرح مزین کیا کہ گھر بیٹھے قاری ایسی معلومات سے دوچار ہوا جس نے اسے حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے پر مجبور کیا کہ وطن عزیز کا گوشہ گوشہ نہ صرف حسین ہے بلکہ تہذیب وثقافت کا ایک روشن باب ہے۔سفر نامہ نگار نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ لداخ سے سفر شروع کیا اور شاہ بندر جہاں پاکستان کی سرزمین ختم ہوتی ہے۔وہاں تک کا یہ سفر نامہ ہے۔لداخ سے چلتے چلتے جب وہ سندھ کی سر زمین پر پہنچا تو اس نے سکھر کے لوگوں کو دیکھا کہ سکھر کے لوگوں کا رویہ ، طرزِ عمل اور سلوک سندھ کے دوسرے علاقوں کے لوگوں سے بالکل الگ ہے۔یہاں رواداری، بھائی چارہ بہت ہے۔لوگ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ایک دوسرے کی ثقافت ، روایات اور عقیدے کا احترام کرتے ہیں۔اختلاف بہت کم کرتے ہیں۔

سکھر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ صوبہ سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔یہ تاریخی شہر عجیب وغریب جگہ واقع ہے۔صوبہ پنجاب ، بلوچستان اور سرحد اس کے قریب ہیں۔دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سفر نامہ نگار لاڑکانہ پہنچا۔جہاں اس کا واسطہ بہت اچھے اور مہمان نواز لوگوں سے ہوا۔ان کے مزاج میں سیاست کا عنصر بہت زیادہ ہے۔پیار کا جواب پیار سے دیتے ہیں اور جو ان سے تلخ یا ترش رویہ رکھے گا یہ اسے بھی ویسا ہی جواب دیں گے۔

رضا علی عابدی اپنے سفر نامے "شیر دریا" میں لکھتے ہیں:

"ان کی ایک خصوصیات یہ ہے کہ ان کے مزاج میں سیاست بہت ہے کیوں کہ یہ علاقہ ہمیشہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے تو یہاں ہر آدمی کے ذہن میں سیاست ہے اور سیاست کے ساتھ پیار بھی۔ مطلب یہ کہ پیار کا جواب پیار سے دیتے ہیں۔ کوئی شخص لاڑکانہ کے کسی فرد یا برادری سے اچھا سلوک کرے گا تو یہ لوگ اس سے بڑھ کر اچھا سلوک کریں گے۔ اسی طرح اگر رویہ ترش یا تلخ ہو گا تو اس کا جواب زیادہ کرخت ہو گا۔"(71)

لاڑکانہ کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتے۔ اگر کسی فرد یا جماعت کو نقصان پہنچانا ہو تو اس کے لیے انھیں باہر سے لوگ بلوانا پڑتے ہیں۔ اگر سندھ کی تاریخ دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ لاڑکانہ کے لوگ اپنے لوگوں کے ساتھ بے حد وفادار ہیں۔ یہاں کے لوگ دریا سے خوش ہیں۔ سفر نامہ نگار لکھتے ہیں: دریائے سندھ کے کنارے اس طویل سفر میں یہ پہلا پڑاؤ تھا۔ جہاں لوگوں نے کہا دریا سے انھیں بڑا فیض پہنچا ہے۔ لاڑکانہ کو "سندھ کا گلزار" لکھا گیا ہے اور بعض کتابوں میں لاڑکانہ کو "سندھ کا پیرس" کہا گیا ہے۔ لاڑکانہ کے بعد دریائے سندھ قریب آنے لگا اور موہن جو دڑو کا علاقہ آیا اور یہاں ساڑھے چار ہزار سال پہلے بسنے والے لوگوں کے آثار ملتے ہیں۔ پھر یہاں سے سفر نامہ نگار سہیون اور حیدر آباد پہنچا۔ حیدر آباد سندھ کا دوسر بڑا شہر ہے۔ یہاں صنعتیں، کارخانے ہیں۔ لوگ محنتی اور جفاکش ہیں۔ 12،12 گھنٹے فیکٹریوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ پھر سجاول ہے وہاں دریائے سندھ ہتھیلی کی طرح پھیل جاتا ہے۔ یہاں سے سفر نامہ نگار چلتا چلتا ٹھٹھہ پہنچا۔ یہاں کے لوگ انتہائی شریف النفس اور امن پسند ہیں۔ شہر میں جرائم کا رُجحان بہت بڑھا ہوا ہے۔ ٹھٹھہ پرانا شہر ہے اور اسے درویشوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ کیٹی بندر بندرگاہ ہے۔ سفر نامہ نگار یہاں پہنچا یہاں بلوچ بستے ہیں۔ دریائے سندھ کا یہ آخری پڑاؤ ہے۔ جہاں چوری چکاری، ڈاکا، مار پیٹ اور تشدد عام ہے۔ لوگ سیدھے سادے ہیں، سکون ہے۔ محنت مزدوری کرتے ہیں آپس کے تعلقات خوش گوار رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ سب مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کے دُکھ درد، خوشی غمی سب میں شریک ہوتے ہیں۔

رضا علی عابدی اس ضمن میں سفر نامہ "شیر دریا" میں رقم طراز ہیں:

"سادگی ہے پھر آپس کے تعلقات ہیں۔ جسے آپس میں رشتہ داری ہوتی ہے
یہ نہیں سمجھتے کہ ہم فلاں ہیں، فلاں ہیں یا بلوچی ہیں یا سندھی۔ ہم سب
مسلمان ہیں ہم سب مسلمان ہیں، بھائی ہیں۔"(72)

سندھیوں کی یہ خصوصیات ہیں کہ وہ بہت عزت واحترام سے ملتے ہیں۔ سندھ میں اگر کسی کو یہ جواب دے دیا جائے کہ "گھر پر نہیں ہے۔" تو وہ اسے توہین سمجھتے ہیں اور اس حرکت کا سخت برا مناتے ہیں۔ ان کی یہ عادتیں انھیں انفرادیت بخشتی ہیں اور دوسرے خطوں کے لوگوں سے مُنفرد بناتی ہیں۔ سندھی مرد سانولے رنگ کے ہونے کے باوجود خوب صورت مانے جاتے ہیں۔ اسی طرح سندھی عورتوں کا حُسن بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے چہرے خوب صورت اور جسم متوازن اور متناسب ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عادات واطوار میں بڑ بولے ہیں یعنی صاف گو ہیں اور سندھی وفاداری میں بالکل کورے ہیں۔ یہ دوسروں کے لیے وفادار نہیں صرف اپنے لوگوں کے ساتھ وفا نبھاتے ہیں۔

ہنری پوٹنگر اپنے سفر نامے "بلوچستان وسندھ" میں لکھتے ہیں:

"عادات واطوار وہ عموماً بڑ بولے اور ناتراشیدہ ہیں۔ ذہن میں کُند اور نااہل
ہیں اور مہمان نوازی اور وفا کشی میں بے لحاظ اور کورے ہیں۔"(73)

بنا ضرورت سندھی حرکت نہیں کرتے سارا دن اِدھر اُدھر بیٹھ کر وقت گزار دیتے ہیں اور ساری رات تمباکو نوشی اور باتوں میں گزارتے ہیں۔ تمام سندھی نشہ بھی کرتے ہیں، بھنگ چوں کہ سستی ہے اور لیے وہ عام ہے۔

پرانے وقتوں کے سندھی زیادہ اکھڑ اور جاہل تھے۔ مگر اب بدلتے وقت کی رفتار نے انھیں بھی اخلاقیات سے باشعور کر دیا ہے۔ ہنری پوٹنگر نے جب سندھ کا دورہ کیا اس وقت کے سندھ اور آج کے سندھ میں کافی کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔

سندھی کے خدوخال پر روشنی ڈالتے ہوئے ہنری پوٹنگر رقم طراز ہیں:

"سندھی مرد سانولے رنگ کے ہیں لیکن مجموعی طور پر بے حد خوب
صورت ہیں۔ وہ اہلِ ایشیا کے درمیانی قدو قامت سے بلند ہیں اور اچھے
خدوخال اور قوی اعضاو جوارح کے مالک ہیں۔"(74)

تھر کے سندھی قدرے باقی سندھیوں سے مختلف ہیں۔ تھر کے سندھی سانولے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اخلاقی طور پر اچھے کردار کے مالک ہیں۔ پڑوس کا بڑا لحاظ کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں۔ تھر میں تعلیم کم ہے یہاں لوگ رسم و رواج کے بڑے پکے ہیں۔ تھر میں مسلمان، ہندو اور اچھوت رہتے ہیں۔ ان کے لباس، رہائش میں فرق ہے۔ لوگ بہت توہم پرست ہیں، ٹونے ٹوٹکوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ بیماریوں کا علاج جڑی بوٹیوں اور تعویز گنڈوں سے کرتے ہیں۔

تھرپارکر میں لوگوں کا حلیہ دیکھ کر ایتھوپیا کے قحط زدہ علاقے کا خیال آتا ہے۔ جن لوگوں کو غربت کا سامنا ہے۔ ان کے حالات ناخوش گوار ہیں۔ ان کا حلیہ دیکھ کر وہاں کی زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے اور "سندھ بہتا رہا" میں رقم طراز ہیں:

"ایک بچی جو شاید آٹھ برس کی ہو گی، چہرہ دھوپ جلا ہونٹ سوکھے ہوئے، بدن پر ماس بہت کم، میلی کچیلی، بالکل جھجکتی نہ تھی، بے دھڑک اپنی درانتی لہراتی ہوئی کچھ ہم سے کہتی تھی۔۔۔"(75)

تھر کے لوگ مجموعی طور پر اچھے ہیں۔ ان کی بقا ہی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے سے ہے۔ یہاں کے لوگوں کا طرزِ رہائش بھی اچھا ہے۔ اگر حکومت ان علاقوں کی بہبود کے لیے کام کرے تو آئندہ سالوں میں یہ علاقے بہترین نوعیت کے بن سکتے ہیں۔

viii. طرزِ زندگی:

کسی بھی علاقے کے لوگوں کی طرزِ زندگی سے ہی وہاں کی ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقے، رسوم و رواج جو انھیں دوسرے علاقے کے لوگوں سے ممیز کرتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قوم کی ثقافت کو جاننے کے لیے وہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی جاننا بے حد ضروری ہے۔ لوگوں کا میل ملاپ اُٹھنا بیٹھنا، مہمان نوازی سے ان کی عادات، رسوم و رواج کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی رسومات، کھیل، تفریحات کا پتہ چلتا ہے۔ پیدائش، مرگ کی رسوم کیا ہیں یہ تمام عناصر کسی بھی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے ہم ایک خطے کی ثقافت کو دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں۔

ix. مہمان نوازی:

صوبہ سندھ کے لوگوں میں بھی مہمان نوازی کا مادہ ہے۔ مہمان کی خاطر مدارت، اس کا مرتبہ دیکھ کر کی جاتی ہے۔ کوئی بھی مہمان آئے اسے یہ کہہ دینا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ ملاقات کا یہاں انوکھا طریقہ ہے۔ مہمان آمد کی اطلاع کرتا ہے اور میزبان باہر آکر مہمان سے ملتا ہے۔ اس سے مہمان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر مہمان اعلیٰ مرتبے کا مالک ہو تو کمرے میں موجود تمام لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلام وڈعا بڑی طویل و تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ رُخصتی کے وقت سلام دعا اسی طرح ہوتی ہے جس طرح داخلے کے وقت ہوتی ہے۔ اگر مہمان کے ساتھ میزبان بھی اس کو چھوڑنے کے لیے چلا جائے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی "سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

> "ملاقات کا طریقہ یوں ہوتا ہے کہ کسی کے گھر پہنچ کر آمد کی اطلاع دی جاتی ہے اور گھر کا مالک باہر آکر مہمان سے ملتا ہے اس سے مہمان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔"(76)

پورے سندھ میں مہمانوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی خاطر داری بھی اچھی طرح سے کرتے ہیں۔ تھرپارکر جیسا علاقہ جہاں کے مسائل ان کی پس ماندگی، بے مائیگی قابلِ رحم ہے، وہ بھی مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے "اور سندھ بہتا رہا" میں علاقہ تھرپارکر کے مکینوں کی مہمان نوازی کو بیان کیا ہے۔ جو لوگ ذرا اچھے حالات کے مالک ہیں وہ اس مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اسی صورتِ حال کا ذکر مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "اور سندھ بہتا رہا" میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "تھر میں بارشیں ہوتی ہیں اور اس کی ریت میں سے پھول پھوٹتے تو دور دراز کے لوگ اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں، تھر کا سفر اختیار کرتے ہیں۔۔۔ وہ اگرچہ بن بلائے مہمان ہوتے ہیں۔ پر میں ان کی میزبانی بخوشی کرتا ہوں۔۔۔ تو ہم یہاں غلط موسموں میں آگئے تھے۔۔۔"(77)

یہاں جس طرح ہماری مہمان نوازی کی گئی قابلِ تعریف ہے۔ کھانا ایسا لذیز اور مُنفرد کہ پیٹ بھر جاتا ہے لیکن دل نہیں بھرتا اسی کیفیت کا اظہار ہمیں مستنصر حسین تارڑ کے ہاں بھی ملتا ہے وہ اپنے سفر نامے "اور سندھ بہتا رہا" میں لکھتے ہیں:

> "جب دو خادموں نے بکرے کا سٹر کچرا اُٹھا کر ہمارے سامنے رکھا اور رستم صاحب نے اس کے پیٹ میں دم پخت چاولوں کو مٹھی پر کر اپنے دہن میں ڈالا تو ہم سب نے ان کی پیروی میں بکرے کے پارچے نوش کرنے شروع کر دیئے۔ رستم کا وہ روسٹ شدہ بکرا جس کا ابھی تک سلگتا گوشت خستہ اور نمکین تھا ذائقے میں ایسا کہ کاش دُنیا بھر کے سب بکرے ہی روسٹ ہو جاتے۔۔۔"(78)

سفر نامہ نگاروں نے دُنیا کے ہر خطے کی طرح صوبہ سندھ کی ثقافت کو بھی بھرپور انداز میں روشناس کرایا ہے۔ سفر نامہ نگاروں نے تمام ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سندھ کے باسیوں کی ثقافت کے چھوٹے چھوٹے اجزا سامنے لانے کا سہرا سفر نامہ نگاروں کے سر ہے۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا شوق ہمارے کئی ایک سفر نامہ نگاروں کو ہے۔ جس کا برملا اظہار ہمیں ان کے سفر ناموں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک سفر نامہ نگار عباس برمانی ہیں، جنھوں نے سفر نامہ "میرا سندھو سائیں" رقم کیا ہے۔ کشتی میں دریائے سندھ کی سیر کرتے ہوئے سفر نامہ نگار کی ان سندھیوں نے بھرپور مہمان نوازی کی ڈاکٹر عباس برمانی "میرا سندھو سائیں" میں رقم طراز ہیں:

> "دوپہر کے وقت کشتی ایک جزیرے پر روک لی گئی اور کھانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ مٹر پلاؤ اور مرغی پلاؤ کا سالن بنایا جا رہا تھا۔ مرغی ہمارا ایک ساتھی دریا کی ایک بڑی شاخ عبور کر کے لایا تھا۔ سرور اور ماما اپنے ٹوکرے جال اُٹھا کر مچھلی کی تلاش میں نکل گئے۔"(79)

سندھ میں تھر کا علاقہ اسلام کوٹ ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں ہندو کثیر تعداد میں ہیں۔ مسلمانوں کے جیسے لباس پہنتے ہیں۔ ان ہی کی طرح زبان استعمال کرتے ہیں۔ دیکھنے میں پتہ نہیں چلتا کہ ہندو مسلمان کا فرق۔ ہندو مسلمان کے مہمان بنتے ہیں اور ہندو ان کی خوب خاطر مدارت بھی کرتے ہیں۔ ایسے ہی ہندوؤں کے بارے میں محمد خالد اختر نے اپنے سفر نامے "یاترا" میں لکھا ہے کہ سائیں کچھمن داس نے کس طرح ان کی

خاطر داری کی تب بھی وہ خوش اور مطمئن نہیں تھا۔ وہ اسی سوچ میں مخمور تھا کہ ان کی اچھی خاطر داری نہیں ہو رہی۔ اپنا آرام چھوڑ کر لمحہ بہ لمحہ وہ ان کے ساتھ رہا۔ محمد خالد اختر اپنے سفر نامے "یاترا" میں لکھتے ہیں:

> "کھانا خالص ویشنو تھا مگر بہت لذیذ۔ امرت کے بعد اس کا خوب لطف آیا یہ لوگ اچھی رسوئی بنانا جانتے ہیں گفتگو ہلکی تھی۔ ضیا اور سائیں اپنے مٹھی کے دنوں کی پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ اسلام کوٹ میں ہماری یہ یادگار رات تھی دُنیا میں کسی جگہ تم اتنے شفیق میزبان پا سکتے تھے؟"(80)

x. حال کی رَسم:

سندھ میں بھی "حال کی رَسم" کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سندھ میں مقامی باشندوں کا آپس میں سلام کرنے کا طریقہ مخصوص ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بہت سادہ اطوار کے لوگ ہیں۔ سب سے پہلے دونوں ایک دوسرے کی صحت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے خاندان کا حال پوچھا جاتا ہے۔ مکان اور جائیداد کے احوال کے بعد صحت کے بارے میں بار بار پوچھنے کا رواج ہے۔ کیا حال ہے؟ بالکل ٹھیک ہے؟ اچھا ہے؟ بالکل اچھا ہے؟ خوش ہو؟ بہت خوش ہو؟ تمہیں یقین ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو؟ ان سب باتوں کا اطمینان بخش جواب دیا جاتا ہے۔ دونوں فریقین اسی طرح حال پوچھتے رہتے ہیں۔ یوں سلام دُعا میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ کسی بھی مجمع میں سب سے پہلے وہ شخص آگے بڑھ کر ملتا ہے جو مقام و رُتبے میں سب سے معمر ہوتا ہے۔ سڑک پر گزرتے ہوئے حال احوال کیے بغیر نہیں رہتے۔ مشرقی ممالک میں سندھ ہی وہ واحد خطہ ہے جہاں اس طرح سے سلام و دُعا کر کے معلومات لی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی "سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

> "کوئی سندھی جب سڑک پر گزر رہا ہو تو وہ کسی اجنبی سے ہرگز اس طرح حال احوال کیے بغیر نہیں رہتا وہ اس میں بہت دل چسپی کا اظہار کرتا ہے اور اس سے احوال پوچھتا ہے۔ یہ رواج قابلِ ذکر ہے۔"(81)

تھر کے لوگوں میں بھی حال کی رسم کا رواج ہے۔ تھری رات کو ایک جگہ بیٹھ کر بیٹھک لگاتے ہیں۔ سارے دن کے حالات ایک دوسرے کے گوش گزار کرتے ہیں۔ دُکھ، بیماریاں ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں۔ دُکھ سُکھ ہوتا ہے۔ تھر کے لوک شاعروں نے اپنی ڈھاٹکی بولی میں گیت بنائے ہیں جو ان بیٹھکوں

میں گاتے ہیں اور لوگ ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ بزرگ ہستیوں کے عرس اور میلے ہوتے ہیں۔ جن میں شرکت لازمی ہے۔

> ''تھری لوگ رات کو ایک جگہ اکھٹے بیٹھ کر کچہری کرتے ہیں۔ سارا دن گزرے ہوئے حالات ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ دُکھ بیماری کی باتیں ہوتی ہیں اور پھر ایک دوسرے سے پرولیوں (بجھارتوں) کے سوال جواب ہوتے ہیں۔''(82)

پاکستان بننے سے پہلے یہاں سندھی زبان کے ساتھ ساتھ سکولوں اور مدرسوں میں گجراتی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ مگر اب گجراتی کی جگہ اُردو نے لی ہے۔ 1990ء سے توڈھانکی زبان میں کتابچے بھی چھپنے لگے ہیں۔ ڈھانکی زبان 33 حروف پر مشتمل ہے۔

xi. توہم پرستی / علاج کے طریقے:

سندھی بطور قوم توہم پرست ہیں۔ جن، بھوت، پریت پر یقین رکھتے ہیں اور ان امراض کے علاج کے لیے مزارات پر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سندھ میں اس طرح کے بہت سے مزارات ہیں۔ جن سے لوگوں کو فیض حاصل ہوتا رہا ہے۔ خطہ سندھ کا نسلی مطالعہ اتنا ہی ابتدائی نوعیت کا ہے جتنا پتھر کے قدیم و جدید ادوار کی تہذیب کا سائنسی مطالعہ۔ سندھ میں بڑے بڑے بزرگ اولیا ہستیوں میں لال شہباز قلندر، عبدالطیف بھٹائی، سچل سرمست، شاہ عقیق، نوری جام تماچی وغیرہ۔ ان مزارات سے لوگ خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ یہاں پر صوفیوں اور مجاوروں کی قبروں کی تعداد تین ہزار ہے۔ جن میں 74 کے غیر فانی نام ہیں۔ اور تو اور یہاں سندھ میں ہندوؤں کے مندر ہیں۔ جن سے لوگ خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ بھان سید آباد کی ایک گلی میں ایک عمارت پر لگی ایک تختی پر لکھا تھا: ''دیوی ماتا شیوا منڈلی۔'' یہ شیوجی اور لکشمی جی کا مندر ہے۔ یہاں سیتلا کے علاج کے لیے ہندو مسلمان آتے تھے اور دیوی کی مورتی کے چرنوں میں رکھے چراغوں کی راکھ پر دودھ ڈال کر لے جاتے ہیں اور مریض کو پلاتے ہیں اور راکھ اس کے جسم پر مل دیتے تھے۔ جس سے مریض اچھا ہو جاتا تھا۔

اہلِ ہند بھی ان توہم پرستانہ اور جاہلانہ باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ ان کا اہم تہوار دیوالی، جس کی نقالی میں مسلمانوں نے شب برات کا تقدس بھی پامال کر دیا ہے اور اس اہم عبادت کے دن آتش بازی کا مظاہرہ ہوتا ہے جو کہ درست وطیرہ نہیں ہے۔

سفر نامہ نگار عباس برمانی سفر نامہ "میر اسندھو سائیں" میں لکھتے ہیں:

"دیوان بھاون داس نے بتایا کہ یہاں سیتلا کے علاج کے لیے ہندو مسلمان سبھی آتے ہیں۔ دیوی کی مورتی کے چرنوں میں رکھے دیئے کی راکھ اور شیولنگ پر دودھ ڈال کر لے جاتے ہیں۔ دودھ مریض کو پلاتے ہیں اور راکھ اس کے جسم پر ملتے ہیں اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔"(83)

سندھیوں میں توہم پرستی کا رجحان ہونے کی وجہ ان کی جہالت ہے۔ علم کی کمی انھیں توہم پرستی اور وہمات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سندھی قوم مزاروں سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ بزرگوں کے عرس بڑی شان و شوکت سے مناتے ہیں۔

xii. کشتی کو دریا میں اُتارنے کی رسم:

صوبہ سندھ میں چوں کہ دریا ان کی روزی کا ذریعہ ہے، اس لیے یہاں کے لوگ اس کی بہت قدر کرتے ہیں اور جب کوئی کشتی تیار کرتے ہیں تو اسے دریا میں اُتارنے کی رسم اس طرح دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ کشتی کی دریا سے شادی کرنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ دیگیں پکتی ہیں، دریا کے کنارے ڈھول بجتا ہے، رقص کیا جاتا ہے۔ سندھی اس دن کو خوب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ کیوں کہ یہ کشتی ہی ان کا سب کچھ ہے روزی بھی گھر بھی۔

اس رسم کے بارے میں ڈاکٹر عباس برمانی اپنے سفر نامے "میر اسندھو سائیں" میں لکھتے ہیں:

"کشتی تیار ہو جاتی ہے تو اسے دریا میں اُتارنے کی رسم ادا ہوتی ہے۔ کشتی کی دریا کے ساتھ شادی کی جاتی ہے۔ کشتی کو سہروں، گجروں اور زر تار لڑیوں سے سجایا جاتا ہے۔ دیگیں پکتی ہیں، رقص و سرور کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور جب کشتی کو دریا کے اندر اُتارا جاتا ہے۔ تو کشتی سازوں کو دھکا دے کر پانی میں گرا دیا جاتا ہے۔ دریا کنارے ڈھول کی تھاپ اور رقص کی لے تیز ہو جاتی ہے اور کشتی آگے بڑھ جاتی ہے۔"(84)

پورے سندھ میں یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔شادی کا سماں ہوتا ہے ،ڈھول باجے بجتے ہیں ، رقص وموسیقی کا اہتمام ہوتا ہے اور اس کے بعد دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔

xiii. تفریحات (کھیل / موسیقی):

سابقہ سندھ تفریحات، کھیل کود سے اتنا مانوس نہیں تھا لیکن اب تو ہر دیہات میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کھیلے جاتے ہیں۔ جن میں لڑکے لڑکیاں حصّہ لیتے ہیں۔کچھ مقامی کھیل جو ہر جگہ کھیلے جاتے ہیں۔ جیسے گلی ڈنڈا، جیسے گلی ڈا کر کہتے ہیں۔یہ تیزی سے اُچھلنے کودنے کا کھیل ہے۔پتنگ بازی جس میں بوڑھے، بچے، جوان سبھی حصّہ لیتے ہیں۔بڑے بڑے پہلوانوں کی مقابلہ بازی کرائی جاتی ہے۔ایک گاؤں کا دوسرے گاؤں سے مقابلہ کرانا ایک عام بات ہے۔پہلوان بازی کے کھیل کو ملاکھڑو کہا جاتا ہے۔ایک پہلوان دوسرے کو کمر کے نیچے سے پکڑ کر گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ اسے گرا کر اس کے دونوں کندھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی زمین سے لگالے تو وہ جیت جاتا ہے۔ملاکھڑو کے بعد دوسرے نمبر کی قومی تفریح مرغ بازی، تیتر بازی اور بٹیر بازی ہے۔سندھی نشانہ بازی اور تلوار بازی میں بھی بہت ماہر ہیں۔ تلوار بازی وہ اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لیے عموماً کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی ”سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ “میں لکھتے ہیں:

> ” وہ نشانہ بازی اور تلوار بازی میں بہت ماہر ہیں۔ تلوار بازی کا استعمال وہ اپنی قوت بازو ثابت کرنے کے لیے بھی کرتے ہیں اور اپنی لچک سے بہت اچھے نشانے لگالیتے ہیں اور اچھی تیر بازی بھی کر لیتے ہیں۔یہ چیزیں وہ کھیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔“(85)

سندھ ہی ایسا ملک ہے جسے ہندوستان میں اونٹوں کا وطن کہا جا سکتا ہے۔یہاں پر کچھ قبیلے ایسے ہیں جو اونٹوں کی ریس لگواتے ہیں۔سارے خطے میں اونٹوں کی بہت کثرت ہے۔اس کے علاوہ مسلمانانِ سندھ کبوتر بازی، مرغ بازی، کنکوے بازی، بٹیر بازی کا بھی شوق رکھتے ہیں۔اہلِ سندھ مینڈھوں کی بھی لڑائی کراتے ہیں۔مرد تو مرد عورتیں بھی کھیلوں کی شوقین ہیں۔قمار بازی میں بھی سندھی کافی ماہر ہیں۔

> ”اہلِ سندھ کو مینڈھے لڑانے میں بھی بڑی دل چسپی ہوتی ہے۔جوئے کا سندھ میں بڑا رواج ہے۔مرد تو مرد عورتیں تک ہار جیت کے کھیلوں پر دیوانی ہیں۔“(86)

خطہ سندھ کی ثقافت کو سامنے لانے میں اہم کردار سفر نامہ نگاروں کا بھی ہے۔ اُنھوں نے چھوٹی چھوٹی جزئیات سے بھی قاری کو ہم کنار کیا ہے۔ رضا علی عابدی ایسے سفر نامہ نگار ہیں۔ جنھوں نے "شیر دریا" سفر نامے میں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بسنے والی آبادیوں کی ثقافت کو سامنے لانے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے لداخ سے کیٹی بندر تک کے سفر کی رُوداد پیش کی ہے۔

سندھ کا علاقہ ٹھٹھہ جو قدیم شہر ہے، یہاں تفریح کا ذریعہ شکار ہے۔ یہاں بطخ کا شکار کیا جاتا ہے۔ یہاں کا کھیل شکار کرنا ہے۔ رضا علی عابدی "شیر دریا" میں لکھتے ہیں:

"کیا کرتے ہیں؟ یہاں کیسے وقت گزارتے ہیں ؟ "

"شکار کھیلتے ہیں۔"

"کس چیز کا شکار کھیلتے ہیں؟ "

" بطخ کا"

" اور یہاں کچھ تفریح وغیرہ ہوتی ہے؟ "

"اور کچھ تفریح نہیں ہے رات کو ٹھہرتے ہیں ، صبح کو شکار کھیل کے چلے جاتے ہیں۔"(87)

سندھی شکار کے بہت شوقین ہیں۔ یہ ان کا کھیل ہے۔ مرغابیاں ، بطخیں ، بٹیرے ، مور ، کبوتر وغیرہ۔ اُنھوں نے شکار کرنے کے لیے مختلف آلات بنا رکھے ہیں۔ وہ بندوق کا استعمال نہیں کرتے۔ گھوڑے کی سواری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ گھوڑے ایک مخصوص انداز میں چلاتے ہیں جو ناہموار زمین کے لیے نہایت موزوں ہے۔

کیمی پوا نے حیدر آباد کے سندھیوں کی تفریح اور کھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان "میں لکھتی ہیں:

"دریا کے کنارے رہنے والے موہن قبائل اور دوسرے سندھی آبی جانوروں کے شکار کے لیے بندوق استعمال نہیں کرتے اور اُنھوں نے لکڑی پھینکنے ، بھالے ، دام ڈالنے اور پانی سے بطخ پکڑنے کے اپنے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔"(88)

علاقہ تھر کے کھیل باقی سندھ سے قدرے مختلف ہیں ان میں وانجھی، کبڈی، مک لکوٹی، بلاڈر، موریریو، ملھ، گلی ڈنڈا اور گیند وغیرہ ہیں۔ ہرن، خرگوش، تیتر اور تلوار کا شکار خوب ہوتا ہے۔ اکثر لومڑ بھی مل جاتا ہے۔ یہاں مویشیوں کو باندھ کر نہیں رکھا جاتا وہ کھلے عام پھرتے رہتے ہیں۔ زیادہ تعداد میں ہونے کی وجہ سے ان کے اجسام پر مخصوص نشانات داغ دیئے جاتے ہیں، جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ تمام صحراؤں کا یہی اُصول ہے۔ چولستان میں بھی اسی طرح کیا جاتا ہے۔

موسیقی ایک پسندیدہ تفریح ہے۔ شادیوں اور میلوں میں گھومتے پھرتے گویے پائپ نواز اور ڈھول باز اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ یک تارو ایک سادہ سا لوہے کا بنا ہوا گٹار ہے جو پورے سندھ میں مشہور ہے۔ دیہاتیوں کی ایک مقبول تفریح ناچ بھی ہے۔ سندھی بہت ہی خوب صورت ناچتے ہیں۔ گھر کے اندر شطرنج کھیلا جاتا ہے جو بہت مقبول ہے۔ شطرنج کو بلا شہادت سندھی ایجاد کہا جاتا ہے۔ سندھی میں خوشی کے اظہار کے لیے مختلف موقعوں پر ڈھول، موسیقی اور ناچ گانے کا رواج بھی رہا ہے۔

محمد بن قاسم کی آمد پر سندھیوں نے اس کا استقبال ڈھول اور موسیقی سے کیا تھا جس سے ثابت ہوا کہ یہ سندھیوں کا کلچر ہے اور ان کی ثقافت کا یہ اہم پہلو ہے۔

کیمی پوا اپنے سفر نامہ "سفر نامہ پاکستان" میں لکھتی ہیں:

> "تاریخ کے اوراق پلٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی سندھ کے سامن لوگوں نے محمد بن قاسم کا بہت زور و شور سے رقاصوں اور ڈھول کی موسیقی سے استقبال کیا جو شادیوں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر بجائی جاتی ہے۔ محمد بن قاسم اس استقبال سے اس قدر متاثر ہوا کہ عرصہ تک اس کا چرچا رہا۔"(89)

موسیقی، رقص پاکستان کے تمام صوبوں کی ثقافت کا حصّہ ہے۔ مگر سندھیوں کا یہ کلچر بہت قدیم ہے۔ 712ء میں محمد بن قاسم کی آمد ہوئی۔ اس وقت بھی سندھ کی سرزمین موسیقی اور رقص جیسی تفریحات سے آشنا تھی۔

xiv. مسلمانی رسوم ورواج:

انسانی زندگی مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔ جیسے پیدائش، شادی اور موت کی تقریبات سنیوں اور شیعوں میں ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ خطہ سندھ میں بھی ان رسوم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان میں نام رکھنا، بچے کا سر منڈانا یعنی بال اُتارنا، ختنہ، عقیقہ وغیرہ۔

بچے کا نام رکھنا:

باقی تمام صوبوں کی طرح صوبہ سندھ میں بھی جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا باپ بچے کے کان میں اذان دیتا ہے۔ اگر باپ اس وقت موجود نہ ہو تو یہ فرض چچا، دادا یا کوئی معمر رشتہ دار بخوبی ادا کرتا ہے۔ "اللہ اکبر" تاکہ بچہ دُنیا میں سب سے پہلے آواز اللہ تعالیٰ کا نام سنے، اس کے بعد اس کا والد اس کا نام رکھتا ہے۔ لڑکا ہو تو عموماً دادا کا نام رکھتے ہیں۔ یہ عربوں کے ہاں کے رسوم ورواج ہیں جو کہ سندھ میں بھی عائد ہیں۔

> "لڑکا ہو تو عموماً دادا کا نام رکھتے ہیں۔ عربوں میں یہ عام رواج ہے اور سندھی رسوم ورواج پر عربوں کا کافی اثر ہے۔"(90)

تقدیر لکھنے کی رسم:

صوبہ سندھ میں بچے کی پیدائش سے پہلے ہی رسمیں اور ٹوٹکے شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ رسمیں قدیم ہونے کی وجہ سے اب تک استعمال میں ہیں۔ سندھ میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے سرہانے ایک تختی رکھنے کا رواج ہے تاکہ بچے کی تقدیر اچھی طرح لکھی جائے اور وہ بہت خوش قسمت ہو بچے کو نہلانے کے بعد کسی خوش قسمت کامیاب بزرگ کے استعمال کیے ہوئے کپڑے سے تیار کردہ کُرتا جسے وہ وہ جبلا کہتے ہیں، پہنایا جاتا ہے تاکہ یہ بچہ بھی ان ہی کی طرح خوش نصیب نکلے۔

منڈی کنڈی کی رسم:

لڑکی کی پیدائش کو سندھ میں اچھا نہیں سمجھا جاتا آئندہ لڑکی نہ ہو اس کے لیے ایک چھلا دھاگے میں ڈال کر لڑکی کے گلے میں پہنا دیتے ہیں۔ اس رسم کو منڈی کنڈی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ لڑکی کی پیدائش کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔

دہل:

لڑکے کی پیدائش پر سندھی بہت خوش اور فخر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور میراثی بلوا کر اعلان کراتے ہیں کہ لڑکا ہوا ہے۔ یہ اعلان دہل کہلاتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش پر سندھی بڑی خوشی مناتے ہیں اور صاحب حیثیت مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔

"لڑکے کی پیدائش پر بڑی خوشی اور فخر کا اظہار کیا جاتا ہے اور میراثی ڈھول بجا کر اعلان کرتا ہے کہ لڑکا ہوا ہے۔ اس اعلان کو دہل کہتے ہیں۔"(91)

چھلّہ اور دست بند:

اگر کسی خاندان میں لڑکے کی پیدائش بہت عرصہ دراز کے بعد ہو تو اس کے کان میں چھوٹا سا سوراخ کر کے سونے یا چاندی کا چھلّہ ڈال دیتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کوڑیاں پرو کر ہاتھ پر باندھ دیتے ہیں۔ یہ دست بند کہلاتا ہے۔ یہ چھلّہ اگلا بچہ ہونے پر اُتارتے ہیں۔

چھٹی:

بچہ پیدا ہونے کے چھٹے دن چھٹی کی رسم کی جاتی ہے۔ ماں اور بچے کو نہلایا جاتا ہے۔ لڑکی کی چھٹی چھٹے دن اور لڑکے کی ساتویں دن ہوتی ہے۔ اگر پہلا بچہ ہو تو ماں کو شادی کا جوڑا پہنا کر دُلھن بنایا جاتا ہے۔ رشتہ دار اور دوست احباب بچے کے لیے کپڑے اور تحفے تحائف لاتے ہیں۔ اس دن مہمانوں کو کھلانے اور تقسیم کرنے کے لیے ایک سندھی پکوان بنایا جاتا ہے، جسے "دارو" کہتے ہیں۔ اسے گیہوں کا دلیا بنا کر گڑ میں پکایا جاتا ہے۔ صاحب حیثیت لوگ دارو کے علاوہ زردہ بھی کھلاتے ہیں اور میوہ اور مٹھائی مہمانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

بال اُتروائی:

بال مُنڈنے کی رسم بچے کی پیدائش کے ساتویں چودھویں، اکیسویں دن کی جاتی ہے۔ لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کے لیے ایک بکرا قربان کیا جاتا ہے اور ان کا گوشت پکا کر رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہڈیاں سالم رکھ لیتے ہیں اور بالوں کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں۔ بالوں کو سونے یا چاندی میں تول کر صدقے کے طور پر دیا جاتا ہے۔ عزیز رشتے دار بچے کے سر پر سے پیسے اُتار کر حجام کو دے دیتے ہیں، اسے غور کہتے ہیں۔

گزیٹیئر سندھ میں "سورلے" سندھ کے رسوم و رواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ساتویں، چودھویں، اکیسویں یا چالیسیوں دن بچے کا سر منڈا جاتا ہے۔ کچھ عجیب و غریب رسموں کے ساتھ جو کفارہ کی قربانی کی علامت معلوم دیتی ہیں۔ بچے کے لیے دو بے داغ و بے نقص بکرے اور بچی کی صورت میں ایک بکرا قربان کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا گوشت پکا کر رشتہ داروں اور دوستوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔"(92)

عقیقہ:

سندھ میں جلد از جلد عقیقہ کر دینے کا رواج ہے اور 40 دن کے اندر اندر یہ رسم ادا کر دی جاتی ہے۔ بکرا جب قربانی کے لیے آتا ہے تو ملّا ان کے کان میں کہتا ہے وہ بچے کا بدلہ ہیں اور ان کا ایک عضو بچے کی جگہ صدقہ دیا جارہا ہے۔ بکرے ذبح کر کے گوشت پکا کر رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہڈیاں بالوں کے ساتھ دفن کر دی جاتی ہیں۔

ختنہ:

صوبہ سندھ میں کچھ لوگ تو بچے کے ختنے چھٹے دن کرتے ہیں۔ ختنہ کے لیے کوئی عمر کی قید نہیں ہے۔ لیکن عموماً لڑکپن میں کیا جاتا ہے۔ غریب لوگوں کا خرچ کی وجہ سے ٹل جاتا ہے۔ حیثیت والے لوگ تقریب کے دن لڑکے کو لباس پہنا کر ہار ڈال کر گھوڑے پر بٹھا کر ڈھول کے ساتھ قصبے میں پھرا کر حجام اور عزیز و اقارب کی موجودگی میں یہ رسم ادا کر دیتے ہیں۔ حجام کو جو اجرت (غور) دی جاتی ہے۔ وہ لڑکے کے باپ کے داہنے پاؤں کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بچے کے پرانے کپڑے بھی دیئے جاتے ہیں۔ رشتہ دار احباب لڑکے کے سر پر پیسے وارتے ہیں۔

"یہ تقریب بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ عزیز و اقارب جمع ہوتے ہیں دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ پہلے بچے کو نہلاتے، اچھے کپڑے اور پھول پہناتے اور گھوڑے پر بٹھا کر باجے کے ساتھ گاؤں کا گشت کراتے ہیں عموماً گاؤں کا نائی ختنہ کرتا ہے۔"(93)

XV. رسوم و رواج

سر پر چکی کا پاٹ اور قرآن رکھنے کی رسم:

شمالی سندھ میں یہ رواج ہے کہ جب نائی لڑکے کا ختنہ کرنے لگتا ہے تو ماں اپنے سر پر چکی کا پاٹ لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ایک رشتہ دار اس پر پانی ڈالتا ہے۔ اس رسم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ بری نظر یا حادثہ سے محفوظ رہے۔ لیکن جنوبی سندھ میں ماں کی بجائے باپ کھڑا ہوتا ہے۔ باپ پانی کے ایک برتن میں پاؤں ڈال کر اور سر پر قرآن رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بچہ دس دن کے اندر ٹھیک ہو جاتا ہے اور گیارہویں دن لڑکے کا باپ اپنے تمام رشتہ داروں اور دوستوں کی بہت بڑی دعوت کرتا ہے۔ یہ دعوت لازمی جزو ہے۔ غریب آدمی کو بھی یہ رسم نبھانا پڑتی ہے۔ مہمان اس دعوت میں تحفہ (پاہٹ) بھی لاتے ہیں۔ امیر اس دعوت کو شان و شوکت سے کرتے ہیں:

> ”شمال میں حادثہ روکنے کے لیے ایک عجیب رسم ہے کہ بے تاب ماں دوران رسم اپنے سر پر چکی کا ایک پاٹ اُٹھا کر کھڑی رہتی ہے اور ایک مرد رشتہ دار اس پر پانی ڈالتا رہتا ہے۔ لیکن جنوب میں ماں کی جگہ باپ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے سر پر قرآن اور پاؤں میں پانی ہوتا ہے۔“[94]

یہ تمام رسمیں خطہ سندھ میں بچے کی پیدائش کے موقع پر رائج ہیں۔ یہ رسمیں بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہیں۔ دعوتیں کرنا، خوشیاں منانا سب کچھ عقیدت اور جوش سے مناتے ہیں۔ اور یوں بچے کی پیدائش پر خوشیاں منانے کا سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔

شادی بیاہ کی رسوم و رواج:

رسوم و رواج ہی کسی علاقے کی ثقافت کو سمجھنے کا موجب بنتے ہیں۔ ہر خطے کے اپنے اپنے رسوم و رواج ہیں۔ شادی بیاہ کی رسومات ہر علاقے کی مختلف ہیں۔ یہ رسومات اپنے اپنے علاقے کی ثقافت کو سامنے لاتی ہیں۔ سندھ میں یہ رواج ہے کہ خاندان کے سربراہ گروہ یا قبیلے کے سردار کے ذریعے رشتے کی بات چلائی جاتی ہے۔ جب رشتہ طے ہو جاتا ہے تو لڑکا اور لڑکی دونوں کے گھروں کی بڑی بوڑھی عورتیں ایک دوسرے کے گھر جاتی ہیں اور منگنی کی رسم اور جہیز وغیرہ کے بارے میں بات چیت کرتی ہیں۔

ماں باپ کی رضامندی:

لڑکے کے گھر کی عورتیں رشتہ لے کر لڑکی کے گھر جاتی ہیں۔ اگر لڑکی کے والدین رضامند ہوں تو رشتہ مانگنے والی عورتوں کو شکر دیتی ہیں، اس کو پدری یا رضامندی کہتے ہیں۔ شکر کا مطلب لڑکی والے رضامند ہیں۔

خاندان میں رشتہ طے کرنا:

جب کوئی لڑکا شادی کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اپنے خاندان میں رشتہ داروں میں اپنے قبیلے میں لڑکی ڈھونڈتا ہے۔ اگر وہ قبیلے سے باہر شادی کرلے تو اس صورت میں اسے اپنے درجے سے نیچے گرنا پڑتا ہے۔ سید کی بیٹی سید سے شادی کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔

شادی کی عمر:

مردم شماری سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ مجموعی طور پر طبقوں کی اکثر لڑکیاں دس سال کی عمر میں بیاہ دی جاتی ہیں اور عموماً 10 سے بھی کم عمر لڑکیاں بیاہ دی جاتی ہیں۔

> ”مردم شماری کے گوشواروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر طبقوں کی اکثر لڑکیاں دس سال سے پہلے بیاہ دی جاتی ہیں۔“(95)

کھیر پلانا:

بات پکی ہو جانے کے بعد ایک دن مقرر کر کے لڑکے کے رشتہ دار لڑکی کے گھر جاتے ہیں وہاں ان کو دودھ کا شربت پلایا جاتا ہے۔ اس کو کھیر پلانا کہتے ہیں۔ لڑکے کے والدین شربت والے برتن میں لڑکی کے لیے پیسے ڈال دیتے ہیں۔ جو کہ شگن کہلاتا ہے۔ اس کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھ کر دُعا کی جاتی ہے۔

منگنی:

سندھ میں منگنی کو ”منگڑوں“ اور ”منگز“ کہتے ہیں۔ سندھ میں بھی نازائیدہ بچوں کی منگنیوں کا رواج ہے۔ بچپن میں اور بچے کی پیدائش سے پہلے اس کا رشتہ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسی منگنیاں ٹوٹ بھی جاتی ہیں جو تنازعے کا سبب بنتی ہیں۔ منگنی کی دُعا کے بعد لڑکی کی ناک چھیدی جاتی ہے۔ شادی کا چھلّہ پہنانے کے لیے ناک چھیدی جاتی ہے۔ اس کے بعد منگنی کو توڑنا غیر شریفانہ سمجھا جاتا ہے۔ دھوم دھام سے منگنی کی جاتی ہے۔ دولھا کے گھر دولھن کو تحفے دیتے ہیں، انگوٹھی پہناتے ہیں۔

میوے بھی دولھا والے لاتے ہیں جس کو موڑو کہا جاتا ہے اس میں ناریل، مصری، نبات، چھوارے اور خشک میوہ ہوتا ہے۔

"دولھا والے موڑو بھی لاتے ہیں۔ جس میں ساتھ تازہ ناریل نو خشک ناریل
نبات، مصری، چھوارے اور خشک میوہ ہوتا ہے۔"(96)

یہ موڑو دُلھن کی گود میں رکھا جاتا ہے اور پھر سونے یا چاندی کی سوئی سے اس کی ناک چھید دی جاتی ہے۔ ناک چھیدنے والی عورت کا سہاگن ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس رسم کو نک ٹوپن کہتے ہیں۔ سندھ میں ناک کی کیل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ سہاگ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ جس کو عورت بیوہ ہونے پر ہی اتارتی ہے۔ اس رسم کے بعد منگنی پکی ہو جاتی ہے اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔

بالغ لڑکا لڑکی:

منگنی خواہ کتنی بھی پہلے کر دی جائے مگر شادی اس وقت نہیں کرتے جب تک لڑکا لڑکی بالغ نہ جائے۔ البتہ دیہاتوں میں شادی بہت ہی جلد کر دینے کا رواج ہے۔

تتھ باندھنا یا بکی ڈالنا کی رسم:

سندھ میں شادی کی تاریخ کو مقرر کرنے کو تتھ باندھنا کہتے ہیں۔ منگنی ہو جانے کے بعد شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ منگنی اور شادی کے درمیان کم از کم چار عیدین گزاری جاتی ہیں اور ان عیدوں پر دولھا کی طرف سے دُلھن کو عیدیاں بھیجی جاتی ہیں۔ جس میں کپڑے، زیور، میوہ، مٹھائیاں حسبِ حیثیت گزارنا لازمی ہے۔ شادیاں زیادہ تر شعبان کے پہلے پندرہ دنوں میں کی جاتی ہیں۔ بزرگ مل کر شادی کی تاریخ طے کر کے مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ یہ رسم بکی ڈالنا کہلاتی ہے۔

"شادیاں زیادہ تر شعبان کے مہینے میں ہوتی ہیں اور عموماً اس مہینے کے پہلے
پندرہ دنوں میں کوئی تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ دونوں خاندانوں کے بزرگ
مل کر کوئی تاریخ مقرر کر لیتے ہیں اور اس کے بعد مٹھائی تقسیم کی جاتی
ہے۔ اس رسم کو بکی ڈالنا کہتے ہیں۔"(97)

ونواہ:

شادی کی تاریخ سے نو دن پہلے ایک مخصوص تال میں ڈھولک بجانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخ سے سات دن پہلے دولھا کے گھر کی عورتیں دُلھن کو گھر لے جا کر اسے ونواہ یا مانجھا (جسے مائیوں کہا جاتا ہے پنجاب میں) بٹھانے کی رسم ادا کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سہاگن اور بچوں کی ماں کو عموماً سات دن بٹھایا جاتا ہے۔ کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ بیس دن تک بٹھانے کا رواج ہے۔ اس دوران دُلھن مکمل پردے میں رہتی ہے۔ اس رسم کے لیے دولھا کے گھر سے آٹا، گھی، چھوارے، تیل، کیسو کے پھول، مصری، ناریل، دُلھن کے لیے حلوہ بنانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ جسے سات سہاگنیں جو اولاد نرینہ سے نوازی ہوئی ہیں وہ حلوہ کھلاتی ہیں تاکہ انہی سہاگنوں کی طرح دُلھن بھی رہے۔

> "ونواہ کی رسم کے لیے دولھا کے گھر سے آٹا، گھی، چھوارے، تیل کیسو کے پھول، مصری اور ناریل بطورِ تحفہ دُلھن کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ دُلھن کے لیے حلوہ تیار کیا جاتا ہے اور ایسی سات سہاگنیں جن کے اولاد نرینہ ہوتی ہے ایک ایک لقمہ دلھن کے منہ میں ڈالتی ہیں۔"(98)

دُلھن ان دنوں اپنے کمرے میں رہتی ہے اور دولھا کا بھیجا ہوا برقعہ اوڑھے رکھتی ہے اور صرف چورو کھاتی ہے۔ جو گندم کے آٹے کی فطیری روٹی گھی میں گوندکر کھانڈ ملا کر ایک صفرادی حریرہ بنایا جاتا ہے۔ یہ حریرہ جلد کو نرم ونازک بناتا ہے۔

مہندی:

مہندی کی رات دولھا کے گھر سے مہندی کا سجا ہوا تھال بھیجا جاتا ہے اور پھر دُلھن کو یہی مہندی سات سہاگنیں لگاتی ہیں اور مہندی کی رسم کے بعد دولھا کے گھر سے دُلھن کے لیے آئی ہوئی چیزوں کی نمائش کی جاتی ہے۔

دُلھن کا سنگھار:

نائن یا مشاطہ ہر روز دُلھن کے گھر آکر اسے نہلاتی ہے۔ گندم کا آٹا اور تیل اس کے جسم پر ملتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں کو مُوسَگ (اخروٹ کے چھلکے) سے رنگا جاتا ہے اور ہتھیلیوں اور تلوؤں کو مہندی (حنا) سے رنگین بنایا جاتا ہے۔

بارات:

لڑکے والے بارات لے کر آتے ہیں اور نکاح لڑکی کے گھر ہوتا ہے۔ بارات دھوم دھام سے گانے بجانے کے ساتھ آتی ہے۔

رسم نکاح:

شادی سے تین دن پہلے دولھا کو بھی اسی طرح تیار کر کے پھرایا جاتا ہے۔ اگر استطاعت ہو تو گھوڑے پر ورنہ ایسے ہی پیدل دولھا کو شادی کا جوڑا جو سُسر کی طرف سے آتا ہے، پہنایا جاتا ہے۔ دولھا کو پگڑی اور سہرہ پہنانا ضروری ہوتا ہے۔ حق و مہر طے ہو جانے کے بعد انتخاب و قبول کی رسم ادا ہوتی ہے۔ لڑکی کی طرف سے اجازت کی رسم ماں کرتی ہے۔ پھر نکاح کیا جاتا ہے۔

> ''حق مہر کا فیصلہ کرنے کے بعد ایجاب و قبول کی رسم ہوتی ہے جب لڑکی سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ خود جواب نہیں دیتی بلکہ لڑکی کی طرف سے اس کی ماں جواب دیتی ہے پھر نکاح پڑھا جاتا ہے۔''[99]

رسمِ لادن:

نکاح کے بعد دولھا دُلھن کو آمنے سامنے بٹھا کر آہستہ سے تین مرتبہ ان کا سر ٹکرایا جاتا ہے۔ بعض دفعہ مذاق میں دونوں کے سر زور سے ٹکرا دیئے جاتے ہیں لیکن یہ خوشی کا موقع ہے اس لیے کوئی شکایت کسی کو نہیں ہوتی۔ اس رسم کو ''لادن'' کہتے ہیں اور اسے ''مِتھا میٹر'' بھی کہا جاتا ہے۔

> ''ان میں سے ناگزیر ترین ''مِتھا میٹر'' ہے جس کے تحت خاندان کی کوئی شادی شدہ خاتون دولہا دُلھن کے سروں کو آہستہ سے آپس میں ٹکراتی ہے۔ جب کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے ہیں۔''[100]

آرسی مصحف:

اس رسم میں دُولھا، دلھن کے درمیان قرآن پاک رکھ دیا جاتا ہے۔ دونوں آنکھیں بند کر کے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان کے سروں پر ایک کپڑا ڈال دیا جاتا ہے اور قرآن کی جگہ آئینہ رکھ دیا جاتا ہے۔ اس میں دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں۔ ایک گلاس دودھ لاتے ہیں جو دولھا کو پہلے اور پھر دُلھن کو پلاتے ہیں۔ شہ بالا کی خوب درگت بنتی ہے۔ خوب ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ دولھا کی ماں خوب بن ٹھن کر آتی ہے اور دُلھن کی ماہ سادہ کپڑے پہنتی ہے۔

دعوت اور رخصتی:

دُلھن کی رخصتی شادی کے دن نہیں ہوتی اور یہ رات سب دلھن کے گھر گزارتے ہیں۔سب رسمیں ہو جانے کے بعد دُلھن، دولھا کو اکیلے چھوڑ دیتے ہیں۔دولھا کے قریبی رشتے دار بھی دُلھن ہی کے گھر رکتے ہیں اور دوسرے دن دُلھن کے ہی گھر میں دولھا کی طرف سے سب کی دعوت ہوتی ہے۔کچھ لوگ صبح ہی دلھن کو رُخصت کرا لیتے ہیں اور اپنے گھر سب کی دعوت کرتے ہیں۔اسی کو ولیمہ بھی کہا جاسکتا ہے۔تھر کے علاقے مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔شادیاں دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔رسوم ورواج میں یہ لوگ بہت حساس ہیں اور خوش دلی سے رسمیں نبھاتے ہیں۔یہاں شادی بیاہ میں گھر گھر کھانا بانٹنے کا رواج ہے۔

بقول ماجد فرید ساٹی :

> ”یہاں لوگ ایک دوسرے کے تہواروں میں خوشی سے شریک ہوتے
> ہیں۔شادی بیاہ میں گھر گھر کھانا بانٹتے ہیں۔“(101)

تھر میں ہندو کثیر تعداد میں آباد ہیں مگر ہندو مسلمان نہایت محبت سے مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے تہواروں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔

وٹے سٹے کی شادی:

پنجاب اور بہاول پور کی طرح سندھ میں بھی شادی کے لیے لڑکیوں کا تبادلہ کرنے کا طریقہ جاری ہے۔لڑکی کو لے کر لڑکی دی جاتی ہے اور جو لڑکی کے بدلے لڑکی نہیں دے سکتے ان کی شادی کرنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے بلوچستان کے ولور کی طرح نقد رقم دینا پڑتی ہے۔لڑکی کی عمر، ذات، شکل وصورت کی بنا پر رقم کم یا زیادہ ہوتی ہے۔

بن بیاہی بیوہ:

سندھ میں یہ رواج عام ہے کہ بچپن میں بچوں کی منگنی کر دی جاتی ہے اور اگر اس کا منگیتر مر جائے تو لڑکی کو بیوہ فرض کر لیا جاتا ہے۔سندھ کے کئی علاقوں میں یہ رسم موجود ہے۔

قرآن سے شادی کر دینے کی رسم:

خطہ سندھ قدیم روایات میں جکڑا ہوا پس ماندہ علاقہ ہے۔یہاں ذات پات کی تفریق بہت زیادہ ہے۔یہ لوگ برادری سے باہر شادیاں نہیں کرتے۔سیدوں میں اپنی بیٹی دوسری ذات میں بیاہنا بدترین ذلت سمجھی جاتی ہے۔سیدوں میں ایک بدترین رسم ہے کہ اگر کسی لڑکی کے لیے کوئی اچھا سید لڑکا نہ ملے تو اس لڑکی کی شادی قرآن پاک سے کر دی جاتی ہے۔لڑکی کا باپ بڑا بھائی یا کوئی اور بزرگ قرآن لے کر آتا ہے اور لڑکی کو نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہنا کر قرآن اس کے ہاتھ میں دے کر کہا جاتا ہے کہ تمہاری شادی اس سے ہو گئی ہے اور اب تم اپنی عظمت و عزت کی حفاظت خود کرو۔

تدفین کی رسومات:

خطہ سندھ تہذیب و ثقافت کے زیر اثر رہا ہے۔سندھ میں یہ رواج ہے کہ جب ایک مسلمان بستر مرگ پر ہو دم توڑنے لگتا ہے تو اس کے منہ میں چند قطرے شہد ٹپکا دیے جاتے ہیں اور ارد گرد کھڑے لوگ قرآن پاک کی آیتیں اور کلمہ طیبہ پڑھنے لگتے ہیں اور دُعا مانگتے ہیں کہ اس کی موت کی تکلیف آسان ہو جائے اور اس کا دم نکل جائے اور اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔

قریب المرگ شخص کے لیے کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے کان میں کلمہ طیبہ کی آواز جاتی رہے اور خود بھی وہ کلمہ پڑھتے موت کی آغوش میں جائے۔اگر ایسا نہ ہو سکے تو سمجھا جاتا ہے کہ مرنے والے کی موت افسوس ناک حالت میں ہوئی ہے۔مردے کے سرہانے قرآن مجید رکھنے کا بھی رواج ہے۔

> ”جب ایک مسلمان بستر مرگ پر ہو تو اس کے منہ میں چند قطرے شہد کے ڈالے جاتے ہیں ارد گرد کھڑے ہوئے رشتے دار قرآن شریف کی مناسب سورتیں پڑھتے ہیں اور اس کی مغفرت کے لیے کلمہ شریف اور نماز پڑھتے ہیں ایسی موت افسوس ناک سمجھی جاتی ہے۔“(102)

غسال یا مُلّا جن کا کام ہے مردے نہلانا وہ مردے کو نہلا کر کفن پہنا دیتے ہیں اور عطر لگا کر عرقِ گلاب چھڑکا جاتا ہے۔مردے کو دفن کرنے کے بعد ٹیو، چالیو اور بارو یعنی سیوم، چالیسی اور برسی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔تدفین کے بعد چالیس دن تک مولوی قبر پر قرآن پڑھتا ہے۔چالیسویں دن تک یعنی چالیو یا چالیسی تک ہر جمعے کی دعوت کی جاتی ہے۔قریبی رشتہ دار بھی ایک ایک مرتبہ مردے کے گھر جا کر سب کو کھانا کھلاتے ہیں یعنی ایک ایک جمعہ چالیسویں تک رشتہ دار کرتے ہیں اور طعام کا انتظام کرتے ہیں۔چالیسویں کے دن بڑی نیاز ہوتی ہے۔قرآن خوانی کرا کے کھانا کھلایا جاتا ہے اور مرُدے کا سوگ ختم کر دیا جاتا ہے۔آخری

دعوت برسی کے موقع پر ہوتی ہے بعض لوگ تو دسواں اور چھ ماہی بھی کرتے ہیں۔ برسی کی رسم لازماً ہے جس کو پورے سندھ میں سبھی کرتے ہیں۔

پردے کا رواج:

سندھ کے جو معزز گھرانے ہیں وہاں پردے کا رواج ہے۔ اُونچے خاندان اپنی عورتوں کو پردہ کراتے ہیں۔ یہ عورتیں گھونگٹ کاڑھ کے کسی کے سامنے آتی ہیں چہرہ غیر مردوں سے ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ ان اُونچے گھرانوں میں سید، مغل اور کچھ بلوچی تال پوری اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت محتاط رویہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مزدور پیشہ عورتیں پوری آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں اور اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کرتیں کہ کسی راہ گیر سے اپنا چہرہ ہی چھپالیں۔

"سندھ کے معزز خاندانوں میں پردے کا رواج ہے اور بعض طبقے جیسے سید، مغل اور کچھ بلوچی تال پور اپنی عورتوں کو پردے میں رکھنے میں انتہائی محتاط ہیں۔"[103]

بدکاری کی سزا:

سندھ میں عورتوں کو کافی آزادی حاصل ہے۔ شادی کے بعد عورت ہر جمعے کو اپنے میکے جاتی ہے۔ پہلے بچے کی پیدائش تک اس کا یہی معمول رہتا ہے۔ عورت کی بے وفائی کو سندھی معاف نہیں کرتے یہاں اس طرزِ عمل پر کارکاری کی سزا دی جاتی ہے۔ بیوی کی بے وفائی کی صورت میں سزا طلاق نہیں بلکہ قتل ہے۔ عورت اور اس کے عاشق کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ بلوچوں میں بھی یہی اُصول ہے۔

یہ باب ان سفر ناموں اور ان سے متعلقہ کتب پر مشتمل ہے۔ یہ باصلاحیت سفر نامہ نگار ہیں جنھوں نے سندھ جیسے قدیم اور عظیم صوبے کو اپنی سیاحت کے لیے منتخب کیا۔ سفر نامے ہمارا ثقافتی سرمایہ ہیں۔ ان سفر ناموں نے ہمیں سندھ کی تاریخ، تہذیب، مذہب، سیاست، معاشرت، ثقافت، بودوباش، لباس، زبانوں، رسوم ورواج اور دیگر اہم معلومات سے ہم کنار کیا ہے۔ سفر نامہ "یاترا"، "اور سندھ بہتا رہا"، "سفر نامہ پاکستان"، "شیر دریا"، "بلوچستان وسندھ"، "میرا سندھو سائیں"، "ماروی کے دیس میں"، "مناظرِ پاکستان" یہ ایسے سفر نامے ہیں، جنھوں نے قاری کو خطہ سندھ سے اچھی طرح متعارف کرایا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ ایک منجھے ہوئے سفر نامہ نگار ہیں۔ان کی شخصیت و قابلیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔اُنھوں نے سفر نامہ ”اور سندھ بہتا رہا“ میں تھر کی ثقافت سے قاری کو اس طرح ملایا ہے کہ تھر کا صحرا اس کے لیے شناسا ہو گیا ہے۔

اسی طرح سفر نامہ ”شیر دریا“ رضا علی عابدی کا دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بسی آبادیوں کا معلوماتی خزانہ ہے۔اُنھوں نے لداخ سے سفر شروع کیا اور وہاں پہنچ کر ختم کیا۔جہاں پاکستان کی سر زمین ختم ہو جاتی ہے۔شاہ بندر کا مقام جہاں دریا، سمندر بُرد ہو جاتا ہے۔”شیر دریا“ ایسا معلوماتی دل چسپ سفر نامہ ہے کہ قاری ساتھ ساتھ چلتا ہے۔جہاں سفر نامہ ختم ہو تا ہے قاری کا تجسس بھی وہیں ختم ہو تا ہے۔

اسی طرح کیلاش برمانی ”میرا سندھو سائیں“ یہ سفر نامہ سکردو سے بھنبور تک کا ہے۔اُنھوں نے سفر نامہ میں دریائے سندھ کے ساتھ آباد بستیوں کے ثقافتی رنگوں سے اُردو اَدب کو گہنا دیا ہے۔

”یاترا“ محمد خالد اختر کا ”تھر“ پر لکھا سفر نامہ ہے جس میں اُنھوں نے تھر کے علاقے اسلام کوٹ میں بسنے والوں کی ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔اُنھوں نے نوں کوٹ وجو کوٹھے اور اسلام کوٹ کا سفر کر کے قارئین کو ان علاقوں کی ثقافت سے بہرہ ور کیا ہے۔

کیمی پوا جھوں نے ”سفر نامہ پاکستان“ میں پاکستان کا مفصل حال پیش کیا ہے اور ساتھ ہی پورے پاکستان کی ثقافت، تہذیب، موسم، بود و باش وغیرہ کو اپنے سفر نامے میں پیش کیا ہے۔

”ماروی کے دیس میں“ سندھ کے علاقوں کی ثقافت نظر آتی ہے۔یہ سفر نامہ بھی معیاری سفر ناموں میں شمار ہو تا ہے۔

”سندھو کنارے“، ”سندھ گزٹیئر“، ”تاریخ سندھ“، ”سندھ کے اضلاع“، ”پاکستانی رسوم و رواج“، ”سندھ کیا ہے؟“ اور ”سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ“ ان تمام کتب نے صوبہ سندھ کو اُجاگر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس باب میں سندھ کی اُردو سفر ناموں میں ثقافت کو پیش کیا گیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ اَدب کے قاری اس مفید معلومات سے فیض یاب ہو سکیں۔

حوالہ جات

1. عبدالحلیم شرر ، تاریخ سندھ ، سٹی بک پوائنٹ ، نوید سکوئر اُردو بازار ، کراچی ،ص:9
2. سید محمد تقی، مسلم کلچر، مشمولہ: منتخب مضامین،ص:124
3. سرمورٹیمر وھیلر ،ترجمہ: زبیر رضوی ،بک ہوم ، 46 مزنگ روڑ ،لاہور ، ص:8
4. ایضاً،ص:27
5. ایضاً،ص:28
6. محمد ادریس صدیقی ،وادی سندھ کی تہذیب ، محکمہ آثارِ قدیمہ ، کراچی ،ص: 64
7. ایضاً،ص:80
8. ایضاً،ص:130
9. ماجد فرید ساٹی ، مناظر پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ، ص:203
10. سرمورٹیمر وھیلر ،ترجمہ: زبیر رضوی ،بک ہوم ، 46 مزنگ روڑ ،لاہور ، ص:65
11. محمد ادریس صدیقی ،وادی سندھ کی تہذیب ، محکمہ آثارِ قدیمہ ، کراچی ،ص:133
12. ماجد فرید ساٹی ، مناظر پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ، ص:204
13. ایضاً،ص:204
14. ذوالفقار علی احسن ، اُردو سفر نامے میں جنس نگاری کا رُجحان ، مغربی پاکستان اُرُدو اکیڈمی ، ص:141
15. شان الحق حقی ، شیر دریا از رضاعلی عابدی ، سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1994ء ،بیک فلیپ
16. مستنصر حسین تارڑ ، میر اسندھو سائیں از ڈاکٹر عباس برمانی ، بیک فلیپ
17. سہیل احمد خان ، سویرا(20)، چوتھی سہ ماہی ،نیا ادارہ ،لاہور ، 1993ء،ص:72

18. محمد موسیٰ بھٹو،(پیش لفظ)، ماروی کے دیس میں از شکیل الدین صدیقی ،ادیب پبلی کیشنز ، حیدر آباد ،2003ء،ص:4
19. عبدالحلیم شرر ، تاریخ سندھ ، سٹی بک پوائنٹ ، نوید سکوئر اُردو بازار ، کراچی ،ص:16
20. علامہ سید ندوی ، تاریخ سندھ ،دارلاشاعت اُردو بازار ، کراچی ،ص:10
21. کامران اعظم سوہدوری ،سندھ کے اضلاع ، تخلیقات 6، بیگم روڈ ،لاہور ، ص:490
22. مبارک علی ،ڈاکٹر ،سندھ کی تاریخ کیاہے؟ ،فکشن ہاؤس ، 18 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:38
23. لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر ، ترجمہ: انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ بلوچستان وسندھ ، نساٹریڈرز 7 جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ، ص:159
24. جمیل حسین ، سید ،ڈاکٹر ، سندھو کنارے ، پروفیسر جمیل سٹی آف ایجوکیشن اینڈ کلچر جیمس آباد ، A 23 سجاد حسین ،ہاؤسنگ سوسائٹی جام شورو روڈ ،حیدر آباد ،سندھ ،ص:96
25. کیمی پوا ، ترجمہ : محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، بک ہوم بک سٹریٹ ، 46 مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:62
26. مبارک علی ،ڈاکٹر ،سندھ کی تاریخ کیاہے؟ ،فکشن ہاؤس ، 18 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:17
27. ماجد فرید ساٹی ، مناظر پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ، کراچی ، ص:209
28. محمد حسین آزاد ، مولانا ، سخن دانِ فارس ،ص:45
29. ٹی۔ایچ سورلے ،ترجمہ :انور رومان ،پروفیسر ،سندھ گزیٹیئر ،بے نظیر انٹر پرائزز ،زرعون روڈ ،کوئٹہ ،ص:30
30. مبارک علی ،ڈاکٹر ،سندھ کی تاریخ کیاہے؟ ،فکشن ہاؤس ، 18 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:61
31. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میر اسندھو سائیں ، سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:
32. علامہ سید ندوی ، تاریخ سندھ ،دارلاشاعت اُردو بازار ، کراچی ،ص:11
33. ایم زمان کھوکھر ،گلگت سے کراچی تک ، میرا پیاراوطن پاکستان ،امتیاز فیاض پرنٹنگ پریس ، لاہور ، 2009ء،ص:176
34. کامران اعظم سوہدوری ،سندھ کے اضلاع ، تخلیقات 6، بیگم روڈ ،لاہور ، ص:24

35. ٹی۔ایچ سورلے ،ترجمہ :انوررومان ،پروفیسر ،سندھ گزیٹیئر ،بے نظیر انٹر پرائزز ،زرعون روڈ ،کوئٹہ ،ص:299
36. مستنصر حسین تارڑ ، اور سندھ بہتا رہا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:21
37. ایضاً،ص:21
38. محمد خالد اختر ،مجموعہ خالد اختر ، سفر نامے : اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس ،38 سیکٹر ، 15 کورنگی انڈسٹریل ایریا،کراچی ،ص:307
39. ایضاً،ص:303
40. کامران اعظم سوہدوری ،سندھ کے اضلاع ،تخلیقات 6، بیگم روڈ ،لاہور ، ص:85
41. شکیل الدین صدیقی ، ماروی کے دیس میں ، ادیب پبلی کیشنز ،حیدر آباد ، 2003ء،ص:32
42. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:253
43. کیمی پوا ، ترجمہ : محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، بک ہوم بک سٹریٹ ، 46 مزنگ روڈ ،لاہور ، ص: 22
44. مبارک علی ،ڈاکٹر ، مترجم : سردار عظیم اللہ خان ،سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ ، تاریخ پبلی کیشنز ،بک سٹریٹ 68 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:75
45. مستنصر حسین تارڑ ، اور سندھ بہتا رہا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:116
46. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ، سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص: 147
47. لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر ، ترجمہ : انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ بلوچستان وسندھ ، نسا ٹریڈرز 7 جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ، ص: 178
48. جمیل حسین ، سید ،ڈاکٹر ، سندھو کنارے ، پروفیسر جمیل سٹی آف ایجوکیشن اینڈ کلچر جیمس آباد ، A 23 سجاد حسین ،ہاؤسنگ سوسائٹی جام شورو روڈ ،حیدر آباد ،سندھ ،ص: 187
49. محمد خالد اختر ،مجموعہ خالد اختر ، سفر نامے : اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس ،38 سیکٹر ، 15 کورنگی انڈسٹریل ایریا،کراچی ،ص: 22
50. شکیل الدین صدیقی ، ماروی کے دیس میں ، ادیب پبلی کیشنز ، حیدر آباد ، 2003ء،ص: 34

51. کیمی پوا، ترجمہ : محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، بک ہوم بک سٹریٹ ، 46 مزنگ روڈ ،لاہور ، ص: 18

52. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:287

53. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:117

54. مستنصر حسین تارڑ ، اور سندھ بہتا رہا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:117

55. لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر ، ترجمہ: انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ بلوچستان وسندھ ، نساٹریڈرز 7 جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ، ص:150

56. کیمی پوا ، ترجمہ : محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، بک ہوم بک سٹریٹ ، 46 مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:53

57. ایضاً،ص:53

58. ایضاً،ص:49

59. مبارک علی،ڈاکٹر،مترجم: سردار عظیم اللہ خان،سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ، تاریخ پبلی کیشنز،بک سٹریٹ68مزنگ روڈ،لاہور،ص:78

60. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ، کراچی ، ص: 205

61. ایضاً،ص:212

62. ٹی۔ایچ سورلے ،ترجمہ :انور رومان ،پروفیسر ،سندھ گزیٹیئر ،بے نظیر انٹر پرائزز ،زرعون روڈ ،کوئٹہ،ص:289

63. محمد خالد اختر، مجموعہ خالد اختر، سفر نامے: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 38 سیکٹر، 15 کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، ص:286

64. ایضاً،ص:366

65. ایضاً،ص:318

66. مستنصر حسین تارڑ ، اور سندھ بہتا رہا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:130

67. لیفٹینٹ ہنری پوٹنگر ، ترجمہ: انور رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ بلوچستان وسندھ ، نساٹریڈرز 7 جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ، ص:152

68. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:191

69. کیمی پوا ، ترجمہ : محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، بک ہوم بک سٹریٹ ، 46 مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:60

70. مبارک علی ،ڈاکٹر ، مترجم :سردار عظیم اللہ خان ،سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ ، تاریخ پبلی کیشنز ،بک سٹریٹ 68 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:16

71. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:216

72. ایضاً،ص:318

73. لیفٹینٹ ہنری پوٹنگر ، ترجمہ: ایم رومان ، پروفیسر ،سفر نامہ بلوچستان وسندھ ، نساٹریڈرز 7جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ، ص:178

74. ایضاً،ص:170

75. مستنصر حسین تارڑ ، اور سندھ بہتا رہا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:84

76. مبارک علی،ڈاکٹر،مترجم: سردار عظیم اللہ خان،سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ، تاریخ پبلی کیشنز،بک سٹریٹ68مزنگ روڈ،لاہور،ص:80

77. مستنصر حسین تارڑ،اور سندھ بہتا رہا،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،ص:41

78. ایضاً،ص:84

79. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:122

80. محمد خالد اختر ،مجموعہ خالد اختر ، سفر نامے : اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس ،38 سیکٹر ، 15 کورنگی انڈسٹریل ایریا،کراچی ،ص:286

81. مبارک علی ،ڈاکٹر ، مترجم :سردار عظیم اللہ خان ،سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ ، تاریخ پبلی کیشنز ،بک سٹریٹ 68 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:90

82. کامران اعظم سوہدری ،سندھ کے اضلاع ، تخلیقات ، 6 بیگم روڈ ،لاہو ر ،ص:86

83. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:128

84. ایضاً،ص:128
85. مبارک علی ،ڈاکٹر ، مترجم :سردار عظیم اللہ خان ،سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ ، تاریخ پبلی کیشنز ،بک سٹریٹ 68 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص:70
86. ایضاً،ص:19
87. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:19
88. کیمی پوا ، ترجمہ : محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، بک ہوم بک سٹریٹ ، 46 مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:58
89. ایضاً،ص:59
90. شاہد حسین رزاقی ، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج کی تاریخ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:59
91. ایضاً،ص:58
92. ٹی۔ایچ سورلے ،ترجمہ :انور رومان ،پروفیسر ،سندھ گزیٹیئر ،بے نظیر انٹر پرائزز ،زرعون روڈ ،کوئٹہ،ص:308
93. شاہد حسین رزاقی ، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج کی تاریخ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:62
94. ایضاً،ص64
95. ٹی۔ایچ سورلے ،ترجمہ :انور رومان ،پروفیسر ،سندھ گزیٹیئر ،بے نظیر انٹر پرائزز ،زرعون روڈ ،کوئٹہ،ص:309
96. ایضاً،ص:310
97. شاہد حسین رزاقی ، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج کی تاریخ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:142
98. ایضاً،ص:143
99. ایضاً،ص:144
100. ایضاً،ص:145

101.ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ، کراچی ، ص:
208

102.ٹی۔ایچ سورلے ،ترجمہ :انور رومان ،پروفیسر ،سندھ گزیٹیئر ،بے نظیر انٹر پرائزز ،زرعون روڑ ،کوئٹہ،ص:313

103.ایضاً،ص:313

باب چہارم:

اُردو سفر ناموں میں صوبہ پنجاب کی علاقائی ثقافت کی پیش کش

مشرق میں کوئی ملک پانچ دریاؤں کے علاقے جیسی خصوصیات اور اقسام کا حامل نہیں ہے۔ یہاں کی سیاحت کرنے والے یہاں کے سرسبز وشاداب راستوں اور وسیع و عریض سرسبز میدانوں سے گزرتے ہوئے انتہائی بنجر اور خشک صحراؤں تک پہنچتے ہیں۔ پنجاب کے دریا، پہاڑ، آب و ہوا اس علاقے کو جاذبیت بخشتی ہے۔ شمالی علاقوں سے گزرتے ہوئے وہ پنجاب کو ایک باغ کی طرح خیال کرتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ جنوب میں جنوب مغربی جانب ویران ریتلی سطح مرتفع، جنوب مشرق میں حصار کے ویرانوں بیچ دوآب کے بار تک پہنچتا ہے تو اس کو عجیب و غریب منظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ منفرد قسم کے ثقافتی رنگ نظر آتے ہیں:

> "سیاح اس کے سرسبز وشاداب راستوں اور وسیع و عریض سرسبز میدانوں
> سے گزرتا ہوا انتہائی بنجر اور خشک صحراؤں اور خاردار جنگلوں تک پہنچتا
> ہے۔ شمالی راستوں سے گزرتے ہوئے وہ پنجاب کو ہندوستان کا باغ خیال کرتا
> ہے۔"(1)

وہ دورانِ سفر پنجاب کے لامتناہی ویرانے، بیابان اور کھلے میدان دیکھتا ہے۔ جن پر گھاس پھونس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں۔ دوآبوں کے مراکز میں بے انتہا چراگاہیں ہونے کے باعث یہاں اعلیٰ نسل کے مویشی، بھینس، بھیڑیں اور بکریاں پالی جاتی ہیں۔ اُونٹ جو پنجاب اور افغانستان کے درمیان باربرداری کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان لامتناہی چراگاہوں میں پالے جاتے ہیں۔ یہ علاقے گھوڑوں کے لیے کثیر چارہ مہیا کرتے ہیں۔ یہ چراگاہیں ریلوے، بڑے شہروں، قصبہ جات اور برطانوی چھاؤنیوں کے لیے ایندھن کی لکڑی کا بڑا ذریعہ ہیں۔

جزیرہ نما ہندوستان کے لیے بہ حیثیت قدرتی دروازے کے پنجاب کی حالت اور اس کی زمین اور آب وہوا کی خوبیوں، وسیع و عریض شاداب میدانوں، سرسبز وادیوں اور بافراط پانی کی فراہمی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے والی ابتدائی قومیں، نسل انسانیت کی اولین آباد کاری کرنے والی قوموں میں شمار ہوتی ہیں۔

پنجاب فارسی زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ ”پنج“ جس کے معنی پانچ اور ”آب“ کا معنی پانی ہے۔ یعنی پانچ دریاؤں کی سر زمین۔ ان پانچ دریاؤں میں سندھ، جہلم، چناب، ستلج اور راوی شامل ہیں۔ چناب پنجاب سے گزرنے والے دریاؤں میں سب سے بڑا ہے اور راوی سب سے چھوٹا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ پنجاب ہے۔ پنجاب کے ابتدا میں دو حصے تھے۔ ایک 1947ء میں پاکستان کا حصہ بن گیا اور دوسرا حصہ بھارت کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وادی انڈس کی تہذیب و ثقافت میں ہڑپہ کی تہذیب قابلِ تعریف ہے۔ اس میں جنوبی ایشیا اور افغانی ثقافت کا اثر غالب تھا۔ انیسویں صدی تک پنجاب پر فارسی زبان کے اثرات نظر آتے رہے۔ پورے پنجاب میں فارسی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن انیسویں صدی میں برطانوی حکومت نے برصغیر کو اپنے تسلط میں لے لیا اور اس زبان کا اثر ٹوٹ گیا۔ 712ء میں محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا۔ پنجاب اور سندھ کو محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ مغلیہ حکومت کے بعد سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ انگریز زیادہ توجہ پنجاب پر دیا کرتے تھے۔ پنجاب سب سے زیادہ زرخیز اور گنجان صوبہ ہے۔ یہاں فصلیں کاشت ہوتی ہیں۔ پنجاب کا دارالحکومت لاہور ہے۔ پنجاب آبادی کے لحاظ سے سب بڑا اور رقبے کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ صوبہ پنجاب مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ پنجاب کے 136 - اضلاع اور 127 تحصیلیں ہیں۔ پنجاب کے اضلاع میں اٹک، بھاولپور، بھاولنگر، بھکر، چکوال، چنیوٹ، ڈیرہ غازی خان، فیصل آباد، گوجرانوالہ، گجرات، حافظ آباد، جھنگ، جہلم، قصور، خانیوال، خوشاب، لاہور، لیہ، لودھراں، منڈی بہاؤالدین، میانوالی، ملتان، مظفر گڑھ، ناروال، ننکانہ صاحب، اوکاڑہ، پاک پتن، رحیم یار خان، راجن پور، والپنڈی، ساہیوال، سرگودھا، شیخوپورہ، سیالکوٹ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، وہاڑی شامل ہیں۔ پنجاب کی آب و ہوا معتدل ہے۔ یہاں اپنی ثقافت کے لحاظ سے ہر تہوار منایا جاتا ہے۔ بسنت، میلے ٹھیلے جو پنجاب کی بھرپور ثقافت ہیں۔ پورے جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں۔ پنجاب کی ثقافت بہت جاندار ہے۔ یہاں کا کلچر علوم و فنون، اخلاقیات، عادات و اطوار، جن کا تعلق طرزِ زندگی سے ہے۔ انفرادیت کا حامل ہے۔

ای.جی ٹیلر کلچر کے اصطلاحی مفہوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”کلچر علوم و فنون، عقائد و رسوم، اخلاقیات، قوانین، عادات و اطوار سے مملو وہ طرزِ زندگی ہے۔ جس کا اکتساب انسان معاشرے کے افراد کی حیثیت سے کرتا ہے۔“(2)

ثقافت کا تعلق علوم و فنون سے ہے۔ کلچر کی اصطلاح ان تمام اشیا کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ جو نشوو نما پاتی ہیں۔ پنجاب کی ثقافت کے خوش رنگ پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں اُردو سفر نامہ نگاروں نے بہت مثبت کردار ادا کیا ہے۔ انہی سفر نامہ نگاروں کی بدولت ملک کا چپہ چپہ گھر بیٹھے آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔

اس باب کا مقصد اُردو سفر ناموں میں پنجاب کی ثقافت کو سامنے لانا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے صوبہ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اپنی رنگارنگ ثقافت کے حوالے سے صوبہ پنجاب ایک اہم صوبہ ہے۔ ایک سفر نامہ نگار جب کسی ملک کا سفر قلیل مدت میں کرتا ہے تو اسے وقت کی کمی کی وجہ سے اس ملک و قوم کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے مخصوص دریچے کھولنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ سیاحت کے دوران سفر نامہ نگار جن شہروں، علاقوں اور مقامات کی سیر کرتے ہیں۔ انھیں بیان کرنے کی وہ عمدہ کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کی اس کوشش نے قاری کے لیے علم و دانش کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سفر نامہ نگاروں کی بدولت وہ خطے جن کے بارے میں کسی نے سوچا نہ ہو گا۔ اپنی تہذیب، تاریخ اور ثقافت کے ساتھ بھرپور انداز میں دُنیا کے سامنے عیاں ہو گئے ہیں۔ اُردو سفر نامہ نگاروں نے سرزمین پنجاب جیسی قدیم سرزمین جسے 326 ق م میں سکندر جیسے عظیم فاتح کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کی ثقافت کس قدر قدیم ہے۔ پنجاب کے تمام شہر، قصبے اپنی قدامت کی روداد بیان کرتے ہیں۔ یہاں کی ثقافت منفرد ہے۔ اس باب میں اُردو سفر ناموں میں پنجاب کی ثقافت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آب و ہوا، خوراک، مذہب، زبان، رہن سہن، پیشے، رسوم و رواج ان تمام ثقافتی عوامل کو اُردو سفر نامہ نگاروں نے بہت خوب پیش کیا ہے۔ ہمارا مقصد صوبہ پنجاب کے تمام اصلاع کی ثقافت کی پیش کش ہے۔ اس باب میں موضوع کی مناسبت سے مندرجہ ذیل سفر ناموں کو شامل کیا ہے۔ ان میں "جو کالیاں"، "لاہور آوارگی"، "مناظر پاکستان"، "سفر نامہ پاکستان"، "ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ"، "نئی منزلیں ہیں پکارتی"، "منزل نہ کر قبول"، "میرا پاکستانی سفر نامہ"، "شیر دریا" ہیں۔ یہ سفر نامے صوبہ پنجاب کی ثقافت کو اُبھارنے میں معاون رہے ہیں۔

سفر نامہ "ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور" کے عنوان سے ہے۔ اس سفر نامے کو احمد ندیم قاسمی نے عمدہ اُسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے اس سفر نامے میں ایک ایسے غیر ملکی سیاح کی سیاحت کو

بیان کیا ہے۔ جس نے شہر لاہور میں چند روز قیام کیا اور پھر اپنے تاثرات ایک کتابی صورت میں پیش کیے۔ اس نے دوران سیاحت یہاں کی معاشرت پوری تہذیب اور تمدن کا کچا چٹھا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔

اس سفر نامہ میں لاہور کی ثقافت کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک دل چسپ اور ثقافتی عوامل سے بھرپور سفر نامہ ہے۔ اگر کوئی لاہور کی ثقافت سے شناسا ہونا چاہے تو یہ سفر نامہ اس کے لیے ایک سنگِ میل ہے۔ "میرا پاکستانی سفر نامہ" یہ سفر نامہ بلراج ساہنی کی پاکستانی یاترا پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے گاؤں "بھیرہ" جانا چاہتے تھے اپنی بچپن کی یادوں سے لپٹ کر اپنا دل ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ جو تقسیم کی وجہ سے ان سے بچھڑ گیا تھا۔ بھیرہ ان کے آباؤ اجداد کی سر زمین اور راولپنڈی ان کی جنم بھومی ہے۔ سو یہ دونوں شہر ان کی یادوں کے محور رہے۔ بلراج کے سفر پاکستان کا مقصد بھیرہ اور راولپنڈی کا پھیرہ تھا۔ بلراج ساہنی اپنے سفر نامے میں لاہور، جھنگ، سرگودھا اور راولپنڈی کے ثقافتی رنگ قاری پر اُبھارتا گیا۔ کیمی پوا کا "سفر نامہ پاکستان" ایک معلوماتی سفر نامہ ہے۔ اس نے پاکستان کے جن جن علاقوں کی سیاحت کی ان کی تہذیب و ثقافت کو خوب بیان کیا۔ ان کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔ سندھ، پنجاب، بلوچستان، سرحد، گلگت سب علاقوں کا اس نے دورہ کیا اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کو بھی بیان کیا۔ یہ سفر نامہ ہمیں ماضی سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ محمد داؤد طاہر کا سفر نامہ "نئی منزلیں ہیں پکارتی" پنجاب کے علاقوں کی روداد ہے۔ ان میں اسلام آباد، فیصل آباد موٹروے اور اس کے نواح میں واقع کئی مقامات ہیں جن کی سیاحت کے احوال پر یہ سفر نامہ مشتمل ہے۔ ان مقامات میں ننکانہ صاحب، گنگا پور، کوٹلی، مقبرہ، شیخوپورہ، چنڈیالہ شری خان، فاروق آباد، سچا سودا، جھنگ، اٹھارہ، ہزاری، چنیوٹ، وادی سون سیکسر، بھیرہ، احمد آباد، پنڈی بھٹیاں وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس سفر نامے میں لوک داستانیں، ہندو، مسلم سکھ تہذیبوں کا تذکرہ، پنجابی صوفی شعرا کے حضور نذرانہ عقیدت، خانقاہوں پر موجود مجاوروں سے گفتگو، تاریخی قلعوں کے چوکیدار اور کھنڈرات پر کھیلتے بچوں سے پوچھ گوچھ نے تلاش کی نئی منزلیں اور نئے راستے کھول دیے ہیں۔ طاہر داؤد نے مٹتے تاریخی نقوش کی اہمیت پھر سے زندہ کر دی۔

بقول پروفیسر فتح محمد ملک:

> "جناب محمد داؤد طاہر کے ساتھ ساتھ جب ہم ایک سے بڑھ کر ایک تاریخی اور تہذیبی یادگار کی سیر کر رہے ہوتے ہیں۔ تو ہمیں یہ احساس بھی مسلسل دامن گیر رہتا ہے کہ ہمارے شان دار ماضی کے یہ مٹتے ہوئے آثار توجہ

طلب ہیں۔ اگر ان کی تعمیر و مرمت اور مناسب دیکھ بھال کا اہتمام ہوتا رہے تو ہمارے اندرون ملک سیر و سیاحت کی روایت جڑ پکڑ سکتی ہے اور سرسبز شاداب رہ سکتی ہے۔ ہمارے اس تاریخی اور تہذیبی ورثہ کی مسلسل نگہداشت ہمارے ماضی کو بھی زندہ رکھے گی۔ ہمارے حال کو ماضی سے کٹ کر رہ جانے سے بچائے گی اور یوں ہم بڑے اعتماد کے ساتھ مستقبل کی جانب گامزن رہ سکیں گے۔"(3)

اس سفر نامے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں قارئین کو بہت سارے ادبا سے ملنے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ان کی شخصیت سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

طارق عزیز لکھتے ہیں:

"دیگر خانہ نگاروں کی نسبت محمد طفیل اس اعتبار سے مختلف بھی ہیں اور ممتاز بھی کہ وہ جس کا خاکہ لکھنا چاہتے ہیں۔ اسی کا خاکہ لکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ خاکہ کسی اور کا ہو ذکر اذکار سب اپنا دوسرے کے خاکے میں اپنی ذات کو کم سے کم شامل کرتے ہیں۔ یہ امر غیر ارادی نہیں بلکہ وہ اس سلسلہ میں دانستہ طور پر نہایت محتاط ہیں انھیں اس کا احساس بھی ہے اور پاس بھی۔"(4)

محمد طفیل نے اس ادیبوں کے شیش محل میں مختلف ادبا کے آئینے سجائے ہیں۔ جس میں ان کی تصویریں اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہیں۔

محمد داؤد طاہر کا سفر نامہ "منزل نہ کر قبول" پاکستان کے اسفار پر مبنی رودادِ سفر ہے۔ یہ سفر اٹک خورد سے شروع ہو کر لاہور تک جی ٹی روڑ اور اس کے گرد و نواح میں موجود آباد بستیوں، قصبوں اور شہروں کی روداد ہے۔ جس علاقے میں گئے ہیں، وہاں کے لوگوں سے بات چیت کی اور وہاں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور لوگوں کے رویوں کے تذکرے شامل کیے۔۔

بقول مستنصر حسین تارڑ:

"داؤد طاہر بھی ایک مجذوب ہے جو سفر نامہ نگاری کے کوچے میں آیا ہے اور سفر نامہ نگاروں کی طنزیہ آمیز مسکراہٹوں کے جواب میں ایک نعرہ درویشانہ کے ساتھ کہتا ہے کہ پھر دیکھو، سفر نامہ کیسے لکھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ یہ سفر نامہ لکھ کر خاک نہیں ہوا بلکہ دیگر سفر ناموں کو حسد سے

خاک کیا ہے اور سفر نامے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کرنے میں کام
یاب ہو گیا ہے۔"(5)

داؤد طاہر کے سفر ناموں میں تاریخ کا گہرا شعور موجود ہے۔ وہ اپنے سفر ناموں میں تاریخ گوئی کی روایت کو اُجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو اس ملک کے باشندوں تک سفر ناموں کے ذریعے منتقل کر رہے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی کا سفر نامہ "مناظرِ پاکستان" ایسا سفر نامہ ہے۔ جس میں اُنھوں نے پورے ملک کی سیاحت کو قلم بند کیا ہے۔ وہ وہاں کی تہذیب و ثقافت کو اُبھارنے کی کوشش میں محو ہیں۔ "پنجاب" میں ماجد فرید ساٹی نے نتھیا گلی، ٹھنڈا پانی، حسن ابدال، ٹیکسلا، اشکومن، پھسو، کلر کہار، ہریالی، ہڑپا، صحرائے چولستان، ملکہ کوہسار مری، سون سیکسر اور لاہور کے خطوں کی سیاحت کی اور یہاں کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

بقول محمود شام:

"ماجد فرید ساٹی کے لطیف پیرائے، خوب صورت الفاظ اور مدھر لہجے میں لکھے ہوئے مضامین یقیناً اپنے ہم وطنوں کو ذہنی طور پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی رنگینیوں، شادابیوں اور خوب صورتیوں کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکل پڑیں اور روح پرور مضامین پر مشتمل یہ کتاب پاکستان کی تمام لائبریریوں میں پاکستانی سفارت خانوں میں موجود رہنی چاہیے۔"(6)

مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ "جو کالیاں" سٹوپوں کا شہر سوات اور پنجاب کا واٹر چیلیانوالہ اور جو کالیاں کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ ٹلہ جو گیاں جو بالناتھ جو گی، بابا گرونانک کا مسکن رہا ہے۔

پورن بھگت، ہری بھرتری، ہیر رانجھے کی روحیں ٹلہ جو گیاں کی چوٹی پر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ یہ ٹلہ جو گیاں نہ جانے کتنے اللہ والوں کا مسکن رہا ہے۔ ان میں ہندو، سکھ، مسلمان سب شامل تھے۔ اس سفر نامے میں ثقافتی عناصر قدرے کم ہیں تاریخی اور معلوماتی عوامل زیادہ ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور سفر نامہ لاہور آوار گی ہے اور اس سفر نامے کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک عاشق کی داستان ہے۔ جس کو اپنے شہر سے عشق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں لاہور شہر میں پیدا ہوا۔ پلا بڑھا اس کے رنگ رنگ سے محبت میرے وجود کا حصہ ہے اور اسی محبت کا اظہار اُنھوں نے لاہور شہر کی سیاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

محمد علی کا پاکستان کے مختلف علاقوں کے سفر پر مشتمل سفر نامہ ہے۔اُنھوں نے1944ء میں پاکستان میں امریکی سفارت خانے میں ملازمت کے فرائض انجام دیئے۔اسی دوران محمود علی نے پاکستان کے بہت سے علاقوں کا سفر کیا اور پھر اپنے سفر نامے کے اندر ان کو محفوظ کر کے قارئین کی نظر کر دیا۔اس سفر کے پہلے حصّے میں محمود علی ضلع میانوالی کے سفر کو نکلتے ہیں اور اس کی روداد کو اپنے سفر نامے کا حصہ بناتے ہیں۔میانوالی کے رسم ورواج کے حوالے سے اُنھوں نے مفصل معلومات سفر نامے میں پیش کی ہیں۔

i. آب وہوا:

آب وہوا کو ہی لیجیے۔صوبے کے تمام اضلاع اور تحصیل میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے۔یوں تو صوبہ کی آب وہوا معتدل ہے۔مگر آب وہوا کسی علاقے کی ثقافت کو نمایاں کرنے والے عوامل میں سے ایک اہم عنصر ہے۔کیوں کہ آب وہوا وہ اہم عنصر ہے جو لوگوں کی خوراک، رہن سہن، لباس، طرزِ زندگی پر سب سے زیادہ اَثر انداز ہوتی ہے اور آب وہوا ہی کی مناسبت سے لوگ اپنی زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دیتے ہیں۔ ضلع خوشاب کو ہی لیجیے تو ضلع خوشاب آب وہوا کے لحاظ سے پانچ موسموں پر مشتمل ہے۔ ضلع خوشاب اپنے محل وقوع کے لحاظ سے پنجاب کے مرکز میں واقع ہے۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ ہوتا ہے۔اس ضلع میں ہر قسم کے موسم پائے جاتے ہیں۔ضلع خوشاب کو جغرافیائی لحاظ سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1. پہاڑی علاقہ
2. دامن پہاڑ
3. تھل کاریگستان
4. نہری علاقہ
5. وادی جہلم گدھی

پہاڑی علاقہ (وادی سون) : یہاں درجہ حرات کم رہتا ہے۔آب وہوا خوش گوار ہے۔**دامن پہاڑ:** جسے مقامی طور پر" دندہ " کہتے ہیں۔موسم برسات میں نالے بہنے لگتے ہیں۔یہاں کی آب وہوا بہت اچھی ہے۔**تھل کاریگستان :** ریگستانی علاقے پر مشتمل ہے۔یہاں گرمی شدت کی ہوتی ہے۔**نہری علاقہ:** یہاں کی

آب وہوا ابھی گرم ہے۔ **وادی جہلم یا گدھی :** یہ علاقہ دریائے جہلم کی آب وہوا مختلف علاقوں کی مختلف ہوتی ہے۔ تھل کے علاقے کی آب وہوا گرم خشک ہے۔ دن سخت گرم اور ریت کی وجہ سے رات نسبتاً ٹھنڈی ہوتی ہے۔ پہلے تو بہت سخت آندھیاں آتی تھیں۔ جن میں دن کو بھی رات کا سماں لگتا تھا۔ میدانی علاقے سردیوں میں سخت سرد، گرمیوں میں سخت گرم ہوتے ہیں۔ پہاڑوں پر برف پڑتی ہے۔ اس لیے پہاڑی علاقوں کا موسم خوش گوار ہوتا ہے۔

"میدانی علاقے میں سردیوں میں سخت سردی ہوتی ہے اور گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ پہاڑی علاقے میں گرمیاں اچھی ہوتی ہیں لیکن سردیوں میں سخت سردی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی سیکسر کے آس پاس برف باری بھی ہوتی ہے میدانی اور پہاڑی علاقے کے درجہ حرارت میں دس درجے کا فرق ہوتا ہے۔ سردیوں میں جب میدانی علاقے میں دھند ہوتی ہے۔ پہاڑی علاقے میں بالکل نہیں ہوتی وہاں موسم صاف ہوتا ہے۔"(7)

ضلع خوشاب ایک ایسے علاقے کا نام ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے بڑی فراوانی سے ہر قسم کے جغرافیائی علاقے عطا کیے ہیں۔

پنجاب کی آب وہوا میں گرمی اور سردی شدت کی ہوتی ہے۔ جنوب مغربی مون سون ہواؤں کی وجہ سے بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن پہاڑوں اور سمندر سے دور کافی فاصلے پر واقع مقامات پر گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے اور بارشیں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔ یہاں اپریل سے موسم گرما شروع ہوتا ہے۔ تپش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جھلسا دینے والی ہوائیں چلتی ہیں۔ ملتان میں گرمی اس قدر شدید پڑتی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ لاہور کی گرم آب وہوا بہت اذیت اور تکلیف دیتی ہے۔ گرمی کی شدت اتنی ہے کہ لوگوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ ایک قسم کی گرم ہوا بہاول پور اور بلوچستان کے صحراؤں سے چلتی ہے جو وہاں کے مقامی باشندوں اور سیاحوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ ستمبر کے وسط میں گرمی کی تپش قدرے کم ہو جاتی ہے اور اکتوبر کے مہینے میں موسم میں خاصی تبدیلی آ جاتی ہے۔ دن گرم ہوتا ہے البتہ راتیں ٹھنڈی ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں موسم برسات تقریباً تین ماہ تک جاری رہتا ہے۔

"گرم موسم خاص طور پر اپریل سے شروع ہو جاتا ہے۔ موسم گرما میں تپش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جھلسا دینے والی ہوائیں چلتی ہیں۔ زمین میں دراڑیں پڑ

جاتی ہیں، سبزہ مرجھا جاتا ہے اور بہت سے درخت پتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ملتان میں انتہائی جنوب مغربی جانب گرمی اس قدر شدت اختیار کر جاتی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ لاہور میں مصنوعی طور پر ٹھنڈے کیے گئے خیمے میں تھرمامیٹر 112 ڈگری درجے تک بلند ہو جاتا ہے۔ برنیئر عربی صحرا کے جھلسا دینے والے تجربے کے ہمراہ لاہور اور کشمیر کے درمیان آب و ہوا کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ اس موسم میں بڑی اذیت اور تکلیف پائی جاتی ہے۔ وہ اپنا خود کا ذکر بھی کرتا ہے کہ ہر صبح کو شام تک ایسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کا بچنا محال ہے۔"(8)

پنجاب کے میدانی علاقوں میں گرمی کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہی صورتِ حال موسم سرما کی بھی ہے۔ جنوری کے آغاز سے موسم سرد اور خنک ہو جاتا ہے۔ یخ ہوائیں عام ہیں اور صوبے کے تمام حصوں میں رات کے وقت پانی واضح طور پر منجمند ہو جاتا ہے۔

شیخوپورہ اپنی قدیم اور اعلیٰ روایات کا نشان ہے۔ اسے مغل بادشاہوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے اور جہانگیر عرف شیخو کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ اس شہر کے درمیان سے ایک سڑک گزرتی ہے جو صوبے کے دیگر اہم شہروں اور علاقوں کو ملاتی ہے۔ شیخوپورہ پاکستان کے ماتھے کا جھومر ہے۔ اس ضلع کی آب و ہوا سردیوں میں سرد خشک اور گرمیوں میں گرم خشک رہتی ہے۔ گرمی سے تنگ آ کر لوگ کمروں سے باہر سوتے ہیں۔ خالد پرویز ملک "تاریخ شیخوپورہ" میں لکھتے ہیں:

"اس علاقہ میں موسم سرما میں سخت سردی اور موسم گرما میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ موسم برسات میں مون سون چلتی ہے اور موسم خوش گوار رہتا ہے۔ عام طور پر آب و ہوا گرم خشک ہے۔" (9)

پورے پنجاب کی آب و ہوا گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد رہتی ہے۔ ڈیرہ غازی خان یہ وہ علاقہ ہے۔ جہاں دریائے سندھ ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے۔ مارچ اور اپریل کے مہینے یہاں قدرے خوش گوار ہوتے ہیں۔ جب بہار اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ کیوں کہ گرمیوں میں تو یہاں کے چٹیل میدان اور خشک پہاڑیاں ایسی ہیں کہ لگتا آگ برسا رہی ہیں۔ ڈیرہ غازی اور ملتان میں

گرمی کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ڈیرہ غازی خان کی گرمی کو محسوس کرتے ہوئے "شیر دریا" میں رضا علی عابدی لکھتے ہیں:

"یہاں بہت گرمی ہے اور یہ ریگستانی علاقہ ہے۔"(10)

بہاول پور کی مشرقی پٹی پر صحرائے چولستان جگمگاتا نظر آتا ہے۔سمہ سٹہ سے صحرائی گرد و غبار کے ذرے چولستان کے راستے کا اشارہ دیتے ہیں۔بہاول پور کے علاقے میں موسم سرما انتہائی خوش گوار رہتا ہے ،زیادہ سردی نہیں ہوتی۔

بقول ماجد فرید ساٹی:

"موسم سرما میں یہاں خوش گوار ہوائیں چلتی ہیں اور ایک مخصوص صحرائی خوشبو فضا کو معطر رکھتی ہے۔"(11)

صوبہ پنجاب کی گرمی تو شدت کی ہوتی ہے۔البتہ موسم سرما کی شدت تمام علاقوں میں ایک جیسی نہیں ہوتی۔لاہور شہر ہی دیکھیں۔وہاں موسم سرما میں سردی کی لہر وہاں کے لوگوں کو خوش گوار احساس دلاتی ہے۔دھند جو شہر کو گھیرے رکھتی ہے۔بارشوں سے دھل جاتی ہے اور تیز سردی اور بارش سیاحوں کو بے حد متاثر کرتی ہے اور سردی کے باعث انھیں موسم انتہائی سہانا لگتا ہے۔مگر کیچڑ بارش کی سوغات ہے۔لاہور شہر جتنا قدیم ہے۔اسی طرح بارش کے بعد ہونے والے کیچڑ کا مسئلہ بھی بہت قدیم ہے۔مگر یہ موسم ایک سیاح کو سیاحت پر اکساتا ہے۔جب ہوا میں نمی محسوس ہوتی ہے اور دھوپ کی تپش ایک سکون سا مہیا کرتی ہے۔

اسی کیفیت کو مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ "لاہور آوارگی" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ جو موسم سرما کے ٹھٹھرتے دن ہیں۔میرے صحن میں سر بلند چیڑ کا درخت دُھند میں ملفوف ہو جاتا ہے۔دھند اس کی شاخوں اور باریک بالوں سے لپٹتی ہے۔تو نمی میں بدل جاتی ہے اور آنسوؤں کی صورت فرش پر گرا کر اسے گیلا کرتی ہے۔۔۔صبح کی سیر کے لیے پارک میں جاتا ہوں۔تو سب شجر، جھاڑیوں اور سیر کرتے لوگ دُھند کی سفید عبا میں لپٹے اس میں روپوش ہو جاتے ہیں۔اور جب دھوپ نکلتی ہے۔تو اس کی زردی بدن کو بھلی لگتی ہے۔تو ان دنوں مجھے لاہور کا قدیم اندرون بلاتا ہے۔"(12)

حسن ابدال اٹک کا معروف شہر ہے۔ یہاں سے کئی راستے نکلتے ہیں۔ ایک سڑک ہزارہ ایبٹ آباد سے ہوتی ہوئی کشمیر تک نکل جاتی ہے۔ یہاں کئی تہذیبیں مٹتی اور پرورش پاتی رہیں۔ حسن ابدال کا موسم پورا سال خوش گوار رہتا ہے۔ سردیوں میں دھوپ سکون کا باعث بنتی ہے۔ گرمیوں میں بھی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ ٹیکسلا حسن ابدال سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر علاقہ پوٹھوہار میں واقع گندھارا تہذیب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ شہر اچھا ہے۔ آب و ہوا صاف شفاف ہے۔ مگر گرمیوں میں ٹیکسلا بھی قدرے گرم علاقہ ہے۔ البتہ سردیوں کا موسم ٹھنڈا مگر خوشگوار ہوتا ہے۔

بقول ماجد فرید ساٹی :

> ”حسن ابدال کا موسم پورا سال خوش گوار رہتا ہے۔ سردیوں میں سکون آور دھوپ میں بیٹھ کر لوگ خوش گپیاں لگاتے ہیں۔“(13)

مستنصر حسین تارڑ، اَدب کی دُنیا کا ایک روشن ستارہ ہیں۔ ان کا سفر نامہ ”جوکالیاں“ ایک منفرد سفر نامہ ہے۔ اس میں اُنھوں نے ٹیلہ جوگیاں جو کہ اب ٹلہ جوگیاں کہلاتا ہے۔ پہنچنے کا عزم کیا اور بالآخر وہ ٹھکانہ جہاں جوگی بالناتھ پورن بھگت، ہری بھرتری، بابا گرونانک وغیرہ اور مسلمان صوفی عبادت کرتے تھے ۔ ان صوفیوں کی عبادت گاہ تک پہنچے اور اپنے مشن میں کام یاب ہوئے۔ اس سفر نامے میں انہی کا ذکر ہے۔ ٹلہ جوگیاں روہتاس قلعے سے تقریباً چوبیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگرچہ یہ ٹیلہ آبادی سے ہٹ کر ہے۔ چوں کہ یہ بلندی پر ہے۔ اس لیے یہاں کی آب و ہوا میں ٹھنڈک ہے۔ گرمیوں میں بھی یہ علاقہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے جہلم کی راتیں بھی ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ آب و ہوا ثقافت کا ایک مؤثر پہلو ہے۔ کیوں کہ موسم کی شدت انسان کی شخصیت کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اس سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ نے ثقافتی عوامل کے بیان پر کم توجہ دی ہے۔ منظر نگاری کو فوقیت دی ہے۔

بقول مستنصر حسین تارڑ:

> ”ٹلہ جوگیاں سطح سمندر سے تقریباً ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور وہاں کی آب و ہوا میں خنکی نمایاں ہے اور انگریزوں کے زمانے میں شدید گرمیوں میں جہلم کے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ٹلہ جوگیاں میں منتقل ہو جایا کرتے تھے۔“(14)

اپنے مذہبی جغرافیائی حالات اور موسم کے مطابق رہنا، پہننا، بولنا، کھانا پینا، عبادت کرنا اور اس کے اقدار و روایات اور رواج قائم کرنا، ثقافت کہلاتا ہے، انھی عناصر کو تہذیب و تمدن بھی کہا جاتا ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے ان ثقافتی عوامل کو سامنے لانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔بیش تر سفر نامہ نگار منظر نگاری کے ساتھ ساتھ ثقافتی پہلوؤں کو بھی صفحہ قرطاس کی زینت بناتے رہے اور یوں معلومات کا ایک وسیع خزانہ ہمارے سامنے آ گیا۔صوبہ پنجاب مجموعی طور پر گرم علاقوں پر مشتمل ہے۔لاہور میں بھی سخت گرمی پڑتی ہے۔دسمبر سے مارچ تک لاہور میں خاصی سردی پڑتی ہے۔اپریل کے بعد موسم بدل جاتا ہے۔جولائی اور اگست مون سون کے مہینے ہیں۔سردیاں اچھی خاصی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

لاہور کی آب و ہوا کو بیان کرتے ہوئے کیمی پوا اپنے سفر نامے ”سفر نامہ پاکستان“ میں لکھتی ہیں:

> ”دسمبر سے مارچ تک لاہور میں اچھی خاصی سردی پڑتی ہے۔موسم گرما کی گرم گرم دھوپ میں سارا شہر نہا جاتا ہے اور سردیوں میں بھی زور دار دھوپ چمکتی ہے۔اپریل کے بعد موسم گرم ہو جاتا ہے لیکن یہ گرمی بھی صحت بخش ہے۔جولائی اور اگست میں بارش ہوتی ہے۔“(15)

نتھیا گلی مری سے اوپر ایبٹ آباد سے تقریباً بیس میل کی دوری پر ہے۔پاکستان کی یہ گلیاں برف کے ڈھکے پہاڑوں کا مسکن ہیں۔یہ گہری شاموں، صحت مند لوگوں، سردیوں میں برف اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا علاقہ ہے۔نتھیا گلی یکم مئی سے 20 ستمبر تک مسحور کن اور دل کش دنوں اور راتوں کا سنگم ہے۔پہاڑوں کی تازہ ہوا قدرت کا انمول تحفہ ہے۔نتھیا گلی میں سورج کے غروب ہونے کا منظر دیکھنے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔یہاں کی صحت افزا آب و ہوا اور خنکی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

”سفر نامہ پاکستان“ میں کیمی پوا رقم طراز ہیں:

> ”یہاں کی صحت افزا آب و ہوا اور خنکی جب کہ کراچی اور لاہور گرمی سے بھاڑ کی طرح جھلس رہے ہوتے ہیں، ان لوگوں کو کھینچ لاتی ہے۔“(16)

نتھیا گلی میں کبھی کبھی مدھم مدھم بارش ہوتی ہے۔بارش رکتی ہے تو ہر طرف سنہری دھوپ سی پھیل جاتی ہے۔بلند و بالا درختوں کی وجہ سے موسم گرما میں بھی بہت ٹھنڈک ہوتی ہے۔یہاں کے لوگ اسی آب و ہوا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا طرزِ زندگی اختیار کرتے ہیں اور اپنی خوراک، لباس، روزگار وغیرہ متعین کرتے ہیں۔

خطہ پنجاب ایک طرف مری، گلیات جیسے پُر افزا مقامات پر مشتمل ہے تو دوسری طرف ملتان جیسا گرم علاقہ بھی اس خطے میں موجود ہے۔ملتان قدیم ترین شہر اور قدیم ثقافت کا امین ہے۔ملتان میں گرد کی آندھیاں چلتی ہیں۔موسم میں شدت پائی جاتی ہے۔اسلام کی آمد سے پہلے یہ مقام ایشیا کا دولت مند ترین شہر سمجھا جاتا تھا۔

بقول خالد بیگ:

> "جنوبی پنجاب موسمی طور پر گرم ترین مگر زرخیز علاقہ ملتان پورے ملک کی اقتصادی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔گندم کی کٹائی شروع ہونے سے پہلے ہی گرد آلود آندھیاں اس شہر کو گھیر لیتی ہیں۔یہ موسمی گرد تو اپنی جگہ لیکن شہر کی زیادہ تر ٹوٹی سڑکوں اور گلیوں میں پڑے گٹروں کی بدولت اُڑنے والی دھول سارا سال اس شہر کے باسیوں کا مقدر بنی رہتی ہے۔"(17)

ملتان سے آگے بھاول پور، بھاول نگر، صحرائے چولستان بھی ملتان سے درجہ حرارت کے معاملے میں تھوڑا آگے ہی ہیں۔وہاں بھی گرمی کی شدت اسی طرح روح پرور ہے۔

ii. زبان:

زبان عطیہ خداوندی ہے کیوں کہ یہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ زبان ثقافت کے عوامل میں سے ایک اہم عنصر ہے کیوں کہ انسان جو سوچتا ہے، اس کا اظہار کرنے کے لیے زبان ہی وہ ذریعہ ہے جو اس کے کام آتی ہے۔جیسی انسان کی سوچ ہوتی ہے ویسی ہی اس کی ثقافت ہوتی ہے۔ان تمام ثقافتی عناصر کو سامنے لانے میں ہمارے اُردو سفر نامہ نگاروں نے بہت مثبت کردار ادا کیا ہے۔زبان کسی علاقے کی تہذیب کی علم بردار ہے۔

خالد پرویز ملک لکھتے ہیں:

> "ثقافت انسان کی سوچ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔جیسی انسان کی سوچ ہو گی۔ویسی ہی ثقافت ہو گی۔ثقافت کی دوڑ کبھی انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کبھی انسان ثقافت کی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ثقافت انسان کی سوچ و فکر مزاج و عمل کردار کا نچوڑ ہوتی ہے۔"(18)

پنجاب ایک قدیم صوبہ ہے اور پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ جہاں کی مادری زبان پنجابی ہے۔ پاکستان میں بولی جانے والی 60 فیصد لوگوں کی زبان پنجابی ہے۔ پنجاب کی کل آبادی 12 کروڑ ہے۔ 10 کروڑ لوگ پنجابی بولتے ہیں۔ پنجاب میں 27 پنجابی زبان کے لہجے بولے جاتے ہیں۔ پاکستان میں شاہ مکھی رسم الخط کے تحت لکھا بولا جاتا ہے۔ یہ پنجابی کا رسم الخط جیسا ہے جو حروف تہجی پر مشتمل ہے۔ یہ حروف تہجی 38 ہیں اور باقی ان میں بھاری حروف 10 ہیں۔ ٹوٹل ملا کر یہ 48 حروف تہجی ہیں۔ جن کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے: ا، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی، ے۔ بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڑھ، ڈھ، کھ، گھ۔ یہ حروف تہجی اُردو میں بھی مستعمل ہیں۔ جب کہ گُرمکھی ہندوستان کے پنجاب میں لکھی بولی جاتی ہے۔ 75 فیصد لوگ پنجابی سمجھتے ہیں۔ پنجابی زبان کو دو حصوں میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ شاہ مکھی یا گُرمکھی اس کا رسم الخط ہندی ہے۔ جس کو وہ بآسانی بول اور سمجھ لیتے ہیں۔ دُنیا میں 14 سے 15 کروڑ لوگ پنجابی بولنے والے ہیں۔ 10 کروڑ پاکستان کے لوگ ہیں جو پنجابی بولتے ہیں۔ 1999ء کی مردم شماری ہوئی۔ جس سے پتہ چلا کہ پنجابی اور ہندی دُنیا میں بولی جانے والی گیارہویں بڑی زبان ہے۔ ہندو مت، سکھ مت، اسلام اور مسیحیت کے پیروکار پنجابی بولنے والے ہیں۔ ہندو مت کے علاوہ باقی تینوں مذاہب میں پنجابی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پنجابی زبان کی بنیاد پراکرت سے ہوئی۔

بابا فرید گنج شکر سے ابتدا ہوئی بعد ازاں بابا گرونانک سے پنجابی کا حوالہ آتا ہے۔ ٹکسالی مادری لہجہ کہلاتا ہے۔ لاہور، گجرانوالہ، شیخوپورہ کے اطراف میں پنجابی بولی جاتی ہے۔ ملتان اور بھاول پور کے لوگ سرائیکی زبان بولتے ہیں:

> ”گلستان اور بھاول پور میں آبادی کی غالب اکثریت سرکاری زبان بولتی ہے۔ مگر یہاں دیگر زبانیں پنجابی ہریانی اُردو بولتے ہیں۔“(19)

انڈیا میں امرت سر، گرداس پور، چندی گڑھ پنجابی زبان بولنے والے علاقے ہیں۔ پنجاب کا لفظ ابنِ بطوطہ کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ابنِ بطوطہ نے اپنی کتاب چودھویں صدی عیسویں میں اس علاقے کا دورہ کرتے وقت لکھی۔ سولھویں صدی میں شیر شاہ سوری کی کتابوں میں بھی اس زبان کا ذکر موجود ہے۔ پنجابی ثقافت کی روایات بہت خوب صورت ہیں۔ پنجابی زبان پورے پنجاب میں بولی جاتی ہے بس صرف فرق اتنا ہے کہ ہر علاقے کا لہجہ دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔ کیوں کہ پنجابی زبان کے کئی ایک لہجے ہیں جو پنجاب کے مختلف

علاقوں میں بولے جاتے ہیں۔اُردو سفر نامے ایک علاقے کی سماجی زندگی اور ثقافتی رنگارنگی کے عمدہ عکاس ہیں۔ایک علاقے کی زبان، لہجہ، بول چال علاقے کی ثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔راولپنڈی کے علاقے میں جو زبان سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔وہ پنجابی ہے۔راولپنڈی کی اگرچہ خالص زبان پنجابی ہے۔مگر یہاں کے لوگوں کا لہجہ پوٹھوہاری ہے۔یہاں ہندکو بھی بولی جاتی ہے۔اُردو بولنے والے بھی بکثرت ہیں۔اسلام آباد دار الحکومت ہے۔اس لیے یہاں انگریزی، جرمن اور فرانسیسی بولنے والے بھی نظر آتے ہیں۔راولپنڈی اسلام آباد ماحول کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

کیمی پوا اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان" میں لکھتی ہیں:

> "گو پنجابی یہاں کی خالص زبان ہے پھر بھی پنڈی کے بیش تر لوگ انگریزی کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی بھی بولتے ہیں۔"(20)

ملتان کی سرزمین اپنی قدامت کے اعتبار سے ہمیشہ سے سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز رہی ہے۔1951ء کے مطابق عربی اور سندھی بولی جاتی تھی۔صوفیا کی آمد نے یہاں فارسی کو پروان چڑھایا اور فارسی کا یوں چلن عام ہوگیا کہ صدیوں تک یہ سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔انگریزی بھی بولی جاتی ہے۔ہندوؤں میں مذہبی اعتبار سے سنسکرت بھی رائج تھی۔لیکن اب موجودہ ملتان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان پنجابی اور سرائیکی ہے:

> "یہاں عربی اور سندھی بولی جاتی تھی۔صوفیا کی یہاں آمد سے فارسی کا بھی رواج ہوا اور اس قدر رواج ہوا کہ صدیوں تک یہ سرکاری زبان رہی۔انگریزی عہد میں تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے لگا۔ہندوؤں میں مذہبی اعتبار سے سنسکرت کو تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ملتانی زبان کے آثار گیارھویں صدی عیسویں سے تحقیق کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں۔"(21)

ملتان قدیم تہذیب وتمدن کا مرکز ہے اولیاؤں کی سرزمین ہے۔یہی چیزیں سیاح کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔یہاں اُردو، بنگالی، پنجابی، انگریزی بولنے والے بھی ملیں گے مگر یہاں کی مخصوص زبان سرائیکی ہے۔سرائیکی بڑی ہی پیاری اور میٹھی زبان ہے اور سننے والا اس کی مٹھاس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

کیمی پوا اپنے سفر نامہ پاکستان میں ملتان کی سیاحت کے دوران اپنے سفر روداد میں لوگوں کی زبانوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

"اس کی پیچیدہ سیڑھیوں پر اُردو، بنگالی اور پنجابی مزدوروں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، یہ ایک قسم کا مینارہ بابل معلوم ہوتا تھا۔"(22)

تھوڑا آگے بڑھیں تو ڈیرہ غازی خان کا علاقہ آتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی زبان سرائیکی ہے۔ 70 میل کے فاصلے پر راجن پور ہے۔ یہاں بھی سرائیکی بولی جاتی ہے۔ راجن پور سے 9 میل کے فاصلے پر دریائے سندھ اور پنجاب کے پانچ دریاؤں کا سنگم کوٹ مٹھن ہے۔ یہاں بھی سرائیکی زبان بولی جاتی ہے۔ گلی، محلے، سڑک، ہوٹل، بازار، پبلک مقامات سب جگہ سرائیکی زبان کا دور دورہ ہے۔ پنجاب اور سندھ کے سنگم پر پنجاب کا آخری شہر صادق آباد ہے۔ اس کے بعد سندھ کا ریتی اسٹیشن آتا ہے۔ یہاں کے لوگ بھی سرائیکی بولتے ہیں۔ یہاں پنجابی بولنے والے بھی بکثرت ہیں۔ ماجد فرید ساٹی اپنی سفر نامے "مناظر پاکستان" میں لکھتے ہیں:

"یہاں کی زیادہ تر آبادی سرائیکی زبان بولتی ہے۔ یہاں سے صرف 9 میل کے فاصلے پر دریائے سندھ اور پنجاب کے پانچ دریاؤں کا سنگم کوٹ مٹھن ہے۔ یہاں خواجہ غلام فرید نے 1901ء میں وفات پائی۔ اسی پٹی پر سفر کرتے ہوئے گلیوں اور سڑکوں، ہوٹلوں اور پبلک مقامات پر سرائیکی زبان ہمیں محظوظ کرتی ہے۔"(23)

بھکر میں بھی سرائیکی ہی بولی جاتی ہے۔ جو آریائی برصغیر آئے یہ ایران، افغانستان یا برصغیر کے دوسرے علاقوں میں آباد ہوئے۔ ان کی زبانوں میں خارجی تبدیلیاں آئیں۔ دراوڑی اور سامی اثرات ان میں داخل ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انڈو آرین اور انڈوایرانین زبانوں نے فروغ پایا۔ دردی زبانوں میں بہت کم تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ دردی زبانیں کئی ایک زبانوں کا مکسچر ہیں۔ ان زبانوں میں بروشسکی، شنا اور کھوار شامل ہیں۔

سندھی اور سرائیکی ملتی جلتی زبانیں ہیں بلکہ انھیں ایک ہی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ماہرین لسانیات سرائیکی اور سندھی زبانوں کو درستانی زبانیں قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس برمانی اپنے سفر نامے "سندھو سائیں" میں اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"جارج گریئر سن لکھتے ہیں کہ دردی زبانیں قدامت کے لحاظ سے قدیم فارسی اور سنسکرت کی مدِ مقابل ہیں۔متعدد ماہرین لسانیات، سرائیکی اور سندھی زبانوں کو یا تو دردستانی زبانیں قرار دیتے ہیں یا دردستانی اثرات کی حامل کہا جاتا ہے کہ سرائیکی اور سندھی ایک ہی زبان تھیں جو گزشتہ ایک ہزار سال کے عمل سے علیحدہ زبانیں بنیں۔اگرچہ اب بھی ایک دوسرے سے خاصی مشابہت رکھتی ہیں۔"(24)

ایک جگہ ڈاکٹر عباس برمانی ڈیرہ غازی خان میں بولی جانے والی زبان کے حوالے سے سفر نامے "سندھو سائیں" میں لکھتے ہیں:

"جیوکس نے اپنی ڈکشنری میں لکھا ہے کہ جٹکی (سرائیکی) ڈیرہ غازہ خان کے جنوب میں آباد جعفر پٹھانوں اور کھترانوں کے علاقے سے لے کر مشرق میں بھاولپور اور جنوب میں سندھ سے لے کر شمال میں کشمیر تک بولی جاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکردو سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھو سائیں کے کناروں پر بسنے والے لوگ یا تو دردستانی زبانیں بولتے ہیں یا دردستانی اثرات کی حامل زبانیں۔"(25)

سرائیکی زبان پنجاب کے ان علاقوں میں جو زمانہ قدیم میں سندھ میں شامل تھے وہاں اب بھی سرائیکی ہی بولی جاتی ہے۔

زبان وہ محرک ہے جو کسی علاقے کے لوگوں کے نظریات کا پتہ دیتا ہے انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔اپنے علاقے سے اپنی مادری زبان سے محبت ایک فطری عمل ہے۔ایسا ہی فطری اثر ہمیں بلراج ساہنی کے سفر نامے "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں نظر آتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ ہندوستان چلے گئے مگر ان کے اندر اپنے آبائی وطن سے دوری ایک تشنگی بن کر ڈستی رہی اور وہ بالآخر پاکستان آئے اور اپنے باپ دادا کے وطن کی مٹی کو چوم کر اپنے بے قرار دل کو چین دیا۔اُنھوں نے لاہور، بھیرہ، جھنگ، فیصل آباد، راولپنڈی کا سفر کیا۔ بھیرہ ان کا باپ دادے کا وطن اور رالپنڈی ان کی جائے پیدائش تھی۔

اس سفر نامے میں بلراج ساہنی نے اپنی پنجابی زبان سے محبت کا جس طرح اظہار کیا وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔بلراج ساہنی "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں لکھتے ہیں:

"بھیرہ ہمارا پرانا باپ دادے کا وطن ہے جی۔میں راولپنڈی میں پیدا ہوا تھا۔(بھیرہ ساڈا پرانا پیو دادے دا وطن ایں جی میں راولپنڈی جما آں)"[26]

پنجاب کے باسی اپنی مادری زبان پنجابی پر ناز کرتے ہیں۔بالکل ایسا ہی حال بلراج ساہنی کا بھی ہے۔جس نے ان علاقوں کی سیاحت کے دوران یہاں کی زبان، لہجے کو بھی واضح کیا ہے۔اُنھوں نے وارث شاہ کے کلام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کے اپنی مادری زبان سے محبت کے اظہار کو بھی واضح کیا ہے۔

جھنگ کی زبان کے بارے میں بلراج ساہنی "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں رقم طراز ہیں:

"تقریباً ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ذرا دیر آنکھ لگتی اور پھر سوچوں کے اکھاڑے میں دھینگا مشتی شروع ہو جاتی۔اس کا ایک مزیدار پہلو بھی تھا۔میں نے دیکھا کہ میرا دل جھنگ کی بولی بولنے لگا۔جیسے اس نے کان پڑی آوازوں کا ریکارڈ بنالیا ہو۔

کیڈیاں اُمیداں کے گھروں ٹریا ساں۔پتا تاں نائی ناریت دے ٹلعیاں دا کن ڈیہہ دین جے دھمائیں مینڈی ایتھوں خیری مہری کوچ تھی وجے تاں ، مائی ہیر تینڈے ناں اتے اکو تر سو نفل۔۔۔"[27]

بلراج ساہنی کا یہ سفر نامہ "میرا پاکستانی سفر نامہ" پاکستان کی ثقافت کی جھلک دکھاتا ہے۔اس میں اس دکھ کی درد کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جو تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہوئی تھی۔

پنجاب کے شہر میانوالی، بھکر، داؤد خیل یہ سب علاقے ایک پٹی میں جڑے ہوئے ہیں۔یہاں کے لوگ سرائیکی بولتے ہیں۔ان علاقوں کی ثقافت ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔

رضا علی عابدی "شیر دریا" میں لکھتے ہیں:

"یہاں عام لوگوں کی زبان سرائیکی ہے تو یہ لوگ اپنی حد تک اور اپنی سطح تک سرائیکی میں شعر کہتے ہیں۔"[28]

کندیاں میانوالی کے ساتھ ہے۔یہاں کی زبان بھی سادہ ہے۔سرائیکی یہاں بھی بولی جاتی ہے۔سرائیکی میٹھی زبان ہے اور پنجاب کا وہ حصہ جو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ان سب علاقوں کی زبان بولنے والے پنجابی زبان کے ہیں یا سرائیکی زبان سے تعلق نظر آتا ہے۔پنجاب بہت پیارا

زرخیز صوبہ ہے۔ بہاول پور پنجاب کا ایک وسیع و عریض علاقہ ہے جو تھوڑا آگے جا کر چولستان سے مل جاتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ ریاست بہاول پور کہلاتی تھی۔ رہاست کے مقامی لہجے کچھ اس طرح سے ہیں:

1. ملتانی یا مغربی پنجابی
2. پنجابی (جانگلی یا او بھیچار)
3. سندھی
4. مارواڑی راٹھی

ملتانی یا مغربی پنجابی چولستان تک بولی جاتی ہے۔ اسے بھی بھاول پوری ہی کہا جاتا ہے۔ یہ اور ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ اضلاع میں بولے جانے والے لہجے ایک جیسے ہیں۔ یہاں کی بولی یعنی پنجابی (جانگلی یا او بھیچار) وسطیٰ پنجاب میں بولے جانے والے لہجے سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

سندھی اور بہاول پوری عام لہجے ہیں۔ چولستان میں بولی جانے والی زبان یا لہجہ مارواڑی کہلاتا ہے۔

> "ملتانی یا مغربی پنجابی خیر پور کے مغرب سے لے کر احمد پور لما کے نواح تک دریا کے ساتھ ساتھ واقع پٹی میں بولی جاتی ہے۔ جو جنوب میں چولستان تک جاتی ہے۔ اسے بھاول پوری بھی کہتے ہیں۔" (29)

زبانیں کسی بھی علاقے کی ثقافت کی علم بردار ہیں اور اس علاقے کی ثقافت کو کھوجنے میں مصرفِ عمل ہیں۔

iii. خوراک:

دُنیا کا ہر خطہ اپنی ثقافت، تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح پاکستان کے تمام صوبے بلحاظ ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کی یہی انفرادیت انھیں ایک دوسرے سے منفرد بناتی ہیں۔ ہمارے ملک کے تمام صوبوں کی روایات، رسوم ورواج منفرد ہیں۔ ان علاقوں کی ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کی یہی انفرادیت انھیں جاذبیت بخشتی ہے۔ پنجاب کی ثقافت بہت پرُکشش ہے۔ اسی جاذبیت کو اُردو سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں پیش کیا ہے۔ سفر نامے کسی بھی علاقے کی ثقافت کو اُبھارنے میں اہم ثابت ہوئے ہیں۔ سفر نامہ نگاروں نے ان علاقوں کی بھی سیاحت کا شرف حاصل کیا ہے جو دور افتادہ اور پس ماندہ ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل تھے۔

پنجاب کے لوگ پنجابی بولتے ہیں اور اپنی روایات کی پاس داری کرتے ہیں۔ پنجاب میں یہ رواج ہے کہ عورت خاوند کا کھانا لے کر کھیتوں میں جاتی ہے۔ سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی، مکھن کے ساتھ کھانے کا دیہی علاقوں میں بہت رواج ہے۔

> "پنجابی مٹیار اپنے ہاتھوں میں شوہر کے لیے کھانا لے کر کھیتوں میں لے کر جاتی کسان کا دھیان پہلے ہی اس کی آمد کی طرف لگا ہوتا۔ جب پنجابی مٹیار اپنے ہاتھوں میں شوہر کے لیے کھانا لے کر کھیتوں میں آئی تو سورج کی شعاعوں سے اس کی ناک میں پہنا لونگ کا لشکارا دور دور تک جاتا جس سے کسان کو اندازہ ہو جاتا کہ اس کی بیوی کھانا لے کر آرہی ہے۔"(30)

پہلے وقتوں میں پنجاب میں صرف دو وقت روٹی کھاتے تھے۔ اب تو تین وقت ہو گئے ہیں۔ دن کو کھانا پکانے کا رواج نہیں تھا رات کو بھی کبھی کوئی کبھی کوئی پکاتا تھا۔ اگر کوئی مہمان آجاتا تو پڑوس میں سے سالن مانگ لینا برا نہیں سمجھتے تھے۔ دن کو کھانا پکانے کا رواج نہیں تھا۔ دن میں لسی یا چٹنی یا پیاز یا پانی میں نمک مرچ ڈال کر سالن سمجھ کر اسی طرح کھا لیتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ وہاں کے لوگوں کی صحت اچھی ہوا کرتی تھی۔

> "دن کو ہانڈی پکانے کا رواج نہیں تھا۔ رات کو بھی کوئی پکاتا تھا۔ اگر کوئی مہمان آجاتا تو ہمسایہ سے بلا تکلف سالن مانگ لیا جاتا۔"(31)

پنجاب میں اچھی خوراک کھانے کا رواج ہے۔ پراٹھے، چوری، شکر چیزیں عام ہیں۔ مائیں بچوں کو چوری بنا کر دیتی ہیں۔ سردیوں میں مائیں بچوں کو گھروں میں طرح طرح کی چیزیں بنا کر دیتی ہیں۔ چوری روٹی کو باریک کر کے شکر ملا کر دی جاتی ہے۔ اب شکر کی بجائے گڑ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ضلع خوشاب کے علاقوں میں عورتیں گھروں میں ٹکڑے بناتی ہیں۔ گھی میں تل کر بنا لیتی ہیں اور ضرورت کے وقت دودھ کے ساتھ ان کا استعمال کرتی ہیں۔ اسے "گوگا" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے میووں کے لڈو بنانے کا رواج ہے۔ بچے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ بہت ہی غذائیت بخش خوراک ہے۔ اس کے علاوہ عورتیں حلوے بناتی ہیں۔ لڈو بناتی ہیں۔ اس میں دودھ کا کھویا، اخروٹ، بادام، میوہ ہوتا ہے۔ جسے بچے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ غذائیت بخش اور صحت بخش خوراک ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ غذا استعمال کرتے ہیں۔ پنجاب کے دیہاتوں میں بھی یہی غذا کھائی جاتی ہے۔ عورتیں صبح سویرے اُٹھ کر دہی بلوتیں مکھن نکال کر لسی بناتیں مرد کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔ باسی روٹیاں، لسی کا چٹورا اور مکھن ان کو کھیتوں میں پہنچایا جاتا۔ یہی صبح کا ناشتہ ہوتا

تھا۔ غریب لوگ، سالن بنانے کی استطاعت نہیں رکھتے لہٰذا سردی ہو یا گرمی گھروں میں اچار ڈال کر روٹی کے ساتھ کھانے کا عام رواج ہے۔ اچار کا رواج شہر اور دیہات دونوں طرف ہے۔ دوپہر کی روٹی ساگ یا دال یا اچار سے کھائی جاتی ہے۔ گرمیوں کے موسم میں چٹنی بنا کر اس سے گزارہ کرتے ہیں اور بعض جو زیادہ غریب ہیں وہ پیاز کاٹ کر اس میں نمک ڈال کر روٹی کھا کر شکر ادا کرتے ہیں۔ جب کہ شہروں میں اچھا کھانا کھانے کا رواج ہے۔ متوسط طبقہ بھلے، کچوریاں، پکوڑے وغیرہ سے گزارا کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں کچھ دودھ سے روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ دالوں میں چنا، ماش، مسور، موٹھ، اڑر مشہور ہیں۔ ساگ، بھوا، دیسی پالک، اکڑوڑی، سرسوں کی گندلیں، اسوں، میتھی، قلفہ وغیرہ من پسند ہیں۔ گوشت شہروں میں زیادہ کھایا جاتا ہے۔ دیہاتوں میں کم البتہ حلال جنگلی جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھا لیتے ہیں۔ گندم کی روٹی دیہاتوں میں کم کھائی جاتی ہے۔ مکی، جوار، باجرہ، جو، منڈوا، بیسن کی روٹیاں غریب لوگ کھاتے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے چاول چنا، گندم کو مکس کر کے ملیدہ بنا کر کھاتے ہیں۔ اسے باٹ کہتے ہیں یہ بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں گھُگھنی بھی شوق سے کھائی جاتی ہے۔ چنے اُبال کر نمک مرچ، کھٹائی ڈال کر کھائی جاتی ہیں۔ شہر کے لوگ اسے ہضم نہیں کر سکتے۔ گاؤں کے لوگ محنتی، جفاکش ہیں۔ جو سب کھا سکتے ہیں۔

> ”عموماً سردیوں کے موسم میں عصر کے وقت چنے، مکی، جوار بھون کر کھائی جاتی۔ گندم اُبال کر اس میں شکر ملا کر کھاتے تھے۔ اسے مقامی زبان میں گھُگھنی کہا جاتا تھا۔“(32)

موسم گرما میں تربوز، خربوزہ، ککڑی، کھیرا اور کھجوریں بھی بطور خوراک استعمال ہوتی ہیں۔ کدو، پالک، بینگن، ٹینڈے، آلو پیدا ہوتے ہیں اور شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ غریب لوگ پیلوں، جوار، بھکڑا اور دیگر جڑی بوٹیاں بھی اُبال کر کھاتے ہیں۔ اندرون پنجاب کے دیہاتوں کی بھی یہی صورتِ حال ہے۔

ہر ملک و قوم کی ثقافت کے کچھ اشاریے کنایئے ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اسرار و رموز ہوتے ہیں کچھ راز و نیاز ہوتے ہیں۔ جسے مقامی لوگ ہی جانتے ہیں۔ اس لیے سیاح جب مقامی لوگوں سے ملتے ہیں۔ تو ان پر اس علاقے کی ثقافت آشکار ہوتی چلی جاتی ہے۔ بلراج ساہنی جب پاکستان آئے اپنے آبائی شہر بھیرہ کی یاترا کے لیے تو ان کا یہاں کی ثقافت سے واسطہ پڑا۔ جسے اُنھوں نے اپنے سفر نامے ”میرا پاکستانی سفر نامہ“ میں رقم طراز کیا ہے۔ ”جھنگ“ کے لوگ خوش دلی کا مظاہرہ کرنے والے لوگ ہیں۔ پنجاب کے لوگ زندہ دل کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ اہتمام کے ساتھ کھانے کا رواج ہے۔ صبح ناشتے میں بھی خاصا اہتمام کیا جاتا

ہے۔ پر تکلف ناشتے پنجاب کی سوغات ہیں۔ انڈے پراٹھے، ٹوسٹ، آملیٹ، پھل، میٹھائی، چائے وغیرہ عام ناشتہ ہے۔

بلراج ساہنی "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں لکھتے ہیں:

> "ٹیلی فون کی مصروفیت سے فارغ ہونے سے پہلے ہی گھر کے اندر سے ناشتے کی طشتریاں آنا شروع ہو گئیں۔۔۔ آملیٹ، ٹوسٹ، سیب، انگور، کیلا، مٹھائی، چائے۔" (33)

جھنگ، سیالکوٹ، فیصل آباد، لاہور وغیرہ سے کچھ لوگ تقسیم کے وقت چلے گئے تھے اور جو یہاں رہ گئے تھے، ان کے طور طریقے وہی پرانے تھے۔ اس معاشرے کے کچھ اثرات ابھی ابھی ان لوگوں کے عادات و اطوار میں جھلکتے ہیں۔ ہندوستان میں پان کھانے کا بہت رواج ہے۔ گھر گھر پان دان ہیں۔ لوگ ہر کھانے کے بعد پان ضرور کھاتے ہیں۔ بلراج ساہنی نے اپنے اس سفر نامے میں اپنے اسی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ جب اُنھوں نے لوگوں کے پاس پان دان دیکھے تو انھیں دہلی اور لکھنو کا ماحول یاد آ گیا۔

بلراج ساہنی لکھتے ہیں:

> "ناشتے کے بعد پان دان بھی سامنے آ گیا۔ دہلی اور لکھنو کے لوگ بڑی تعداد میں جھنگ آ کر آباد ہو گئے اور پان خوب زور و شور سے عام کر دیا ہے۔" (34)

پنجاب کی ثقافت روایات میں رچی بسی ہے۔ چاہے وہ پنجاب پاکستان کا ہو یا ہندوستان کا اپنے ثقافتی عوامل کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ امرتسر، انبالہ، ہوشیارپور، جالندھر، گرداس پور، ہو یا لاہور، گجرانوالہ، گجرات، جھنگ، بھیرہ، ملتان، راولپنڈی وغیرہ ہو اپنی روایات کے امین ہیں۔ پنجاب میں الائچی اور دار چینی کی چائے سردیوں کی سوغات ہے۔ کھانا پینا، چائے، حقہ، لسی پنجاب کی ثقافت کو بیان کرنے والے عناصر ہیں۔ بارش کو بھی بڑے زور و شور سے منایا جاتا ہے اور خصوصی پکوان بنائے جاتے ہیں۔

سردیوں کی بارشوں میں عورتیں سردی سے بچنے کے لیے الائچی اور دار چینی کی چائے بنا کر اہلِ خانہ کو پلاتی ہیں اور یہ رواج صدیوں سے آج تک قائم ہیں۔ پنجاب میں اچھا غذائیت بخش ناشتہ کرنے کا رواج ہے۔ بلراج ساہنی جب اپنی پاکستان یاترا پر اپنے آبائی علاقوں میں گئے تو وہاں کی ثقافت اور روایات کو دیکھ کر

انھیں اپنا بچپن یاد آ جاتا۔ اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سفر نامہ ”میرا پاکستانی سفر نامہ“ میں لکھتے ہیں:

> ”ہمارے گھر کی طرح ہی، کڑیوں والی چھت، جس کی اینٹوں پر سفیدی کے دوران پڑی ہوئی چھینٹیں، جن میں مجھے بھانت بھانت کی مزیدار تصاویر نظر آیا کرتی تھیں اور پھر جب چائے تیار ہو کر آئی تو اس میں چھوٹی الائچی اور دار چینی کی خوشبو بارش والے دن میری ماں جی کو بھی ایسی ہی چائے بنانے کا شوق تھا اور یہ سب دیکھ کر میری آنکھوں نے برستی گھٹاؤں کا سا انداز اپنا لیا۔“(35)

پنجاب میں دودھ کاڑھنے کا بھی رواج ہے۔ خواتین دودھ ہلکی آنچ پر رکھ کر اس میں بادام، چھوہارے، الائچی، خشخاص، چار مغز ڈال کر خوب پکاتی ہیں۔ شام تک یہ دودھ ابل ابل کر سرخ ہو جاتا ہے جو کہ انتہائی لذیذ اور صحت بخش ہوتا ہے۔ لسّی پنجاب کی خوب صورت ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ لسی پنجاب کے مشروبات میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح چائے کی بجائے ٹھنڈے مشروبات کو فوقیت دیتے ہیں اور مہمان نوازی کے لیے دودھ سوڈا پیش کرتے ہیں۔ محمد داؤد طاہر نے سفر نامہ ”نئی منزلیں ہیں پکارتی“ میں پنجاب کے اسی ماحول کی کہیں کہیں عکاسی کی ہے۔ وہ سفر نامہ ”نئی منزلیں ہیں پکارتی“ میں اسی حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ”بصدق دل ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے ملازم کو ہمارے لیے دودھ سوڈا لانے کو کہا۔ جب ہم نے عذر پیش کیا تو اُنھوں نے مسکرا کر کہا آپ شاید چائے کے شوقین ہوں۔ لیکن سچ پوچھیں تو میں نے لمبے عرصے سے چائے بالکل چھوڑ رکھی ہے۔ یہ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی لہٰذا دودھ سوڈا پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اگر آپ کو چائے ہی پسند ہے تو اس کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔“(36)

صوبہ پنجاب کا دل ”لاہور“ پنجاب کی رنگا رنگ ثقافت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ لاہور کے لوگ زندہ دل کھانے کھلانے کے شوقین ہیں۔ ان کے ناشتے ان کے کھانے ان کی روایات کے علم بردار ہیں۔ جونہی کوئی سیاح لاہور شہر میں داخل ہوتا ہے تو اسے لاہوریوں کی زندہ دلی ان کی تہذیب، روایات، ثقافت بے حد متاثر

کرتی ہے۔ جگہ جگہ کھانے کے ڈھابے، ناشتے کے ڈھابے، ہوٹل اور ان سے اُٹھنے والی مختلف کھانوں اور پراٹھوں کی لذیذ خوشبوئیں سیاح کو اپنی طرف کھینچی ہیں۔ سری پائے، حلوہ پوڑی، نان چھولے سیاحوں کی دل چسپی کا خصوصی مرکز بنتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ لاہور کی گندگی کے ڈھیروں سے جس قدر مایوس ہیں وہاں کے ناشتوں سے اتنے ہی مرعوب ہیں۔ اپنے سفر نامہ "لاہور آوارگی" میں لکھتے ہیں:

> "ایک حلوہ پوڑی کی دُکان پر اتنا ہجوم تھا کہ شاید آخری گاہک کی باری شام کو آنی تھی۔۔۔ شیخ ایوب نے بتایا کہ یہ ایک سینکڑوں برس پرانی دُکان ہے جس کی پوڑیوں کی خستگی اور ذائقے کا کوئی جواب نہ تھا۔۔۔ سری پائے او مغز وغیرہ کے علاوہ وہاں ناشتے کی ایک ایسی خوراک تھی جو معدوم ہو جانے کے قریب تھی۔۔۔ انھیں داس کلچہ کہا جاتا ہے۔ انھیں چنوں، اچار اور لونچڑوں کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ لونچڑے بوند نما چھوٹے چھوٹے پکوڑے ہوتے ہیں۔ ایک صاحب کڑاہی کے آگے آلتی پالتی مارے یہ لونچڑے تل رہے تھے۔ بسم اللہ تارڑ صاحب۔ ذرا ہمارا ایک لونچڑا تو چکھ لو۔۔۔ مُنہ میں گھل جائے گا میں نے ایک نہیں بہت سے لونچڑے چکھے اور واقعی ان کا ذائقہ عام پکوڑوں سے جدا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم شہر کے اندر اب صرف ایک تندور باقی ہے۔ جہاں داس کلچے لگتے ہیں۔ تندورچی بہت عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔ اس کے رخصت ہونے پر داس کلچوں کی سینکڑوں برس پرانی روایت بھی رخصت ہو جائے گی۔"(37)

لاہور شہر میں رات کو بھی دن کا سماں محسوس ہوتا ہے جگہ جگہ ٹھیلے کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹال لگے ہیں۔ سموسے، کچوریاں وغیرہ لاہوری بے حد شوق سے کھاتے ہیں۔ لاہور کے بارے میں کہا جاتا ہے "جس نے لاہور نہیں ویکھا او جمیا ہی نہیں اے" (جس نے لاہور نے دیکھا وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا)۔ قیمہ اور بند گو بھی بھرے قتلمے، انڈوں سے مزین چنے بھی وہاں ناشتے میں کھائے جاتے ہیں جو کہ بے حد لذیذ ہوتے ہیں۔ چھٹی کے دن قدیم کوچہ و بازار میں صرف دکانوں پر ہی نہیں بلکہ تھڑوں اور ریڑھیوں کے گرد بھی

ہجوم تھا۔ جہاں سے صبح کے لذیذ ناشتے دستیاب تھے۔ لاہور کے کوچے و بازار لذیذ ناشتوں کے لیے مشہور ہیں۔ لاہور کے پُر کیف ناشتوں میں قیمہ بھری روٹیاں بھی خاصی پسندیدہ ڈش ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> "لوہاری کے آغاز میں ہر جانب خوراکوں اور مٹھائیوں کی دُکانوں پر اس سویر بھی لاہوریوں کے ہجوم تھے، دُنیا کے بہترین کھانے، حلوہ پڑی، نہاری، سرخ بوٹی، سری پائے اور جانے کیا کیا۔"(38)

لاہور اندرون شہر جہاں کہیں بھی ناشتے کے مقام ہیں وہ سب کے سب بہترین ہیں اگر وہ بہترین نہ ہوتے تو ان کا کاروبار تو بالکل ہی ٹھپ ہو جائے۔ ایک لاہوری کی یہ شان ہے کہ اگر کسی لاہوری کو ناشتہ پسند نہ آئے تو وہ سری پائے کے شوربے والا پیالہ دُکان دار کے چہرے کی طرف اچھال دیتا ہے۔ اس لیے یہاں ناشتے کا ہر مقام بہترین ہے۔

بقول مستنصر حسین تارڑ:

> "پوڑیوں کی خستگی، حلوے کی شیرینی، آلو چنوں کی نمکینی، اچار میں گھلی ہوئی۔ قیمے کی ٹکیوں، سری پائے کے شوربے میں مغز کی گھلاوٹ، قلچوں کی سوندھی گرماہٹ، گھنی لسّی کے گلاسوں میں دہی کی موٹی بالائی کی تہہ۔۔۔"(39)

شہر لاہور کو پاکستان کا دل کہا جاتا ہے۔ یہ دل والوں کا شہر ہے۔ لاہور تاریخی شہر ہے۔ یہاں کی تاریخ و تاریخی مقامات سب قابلِ دید ہیں۔ تاریخ دانوں اور سفر نامہ نگاروں نے لاہور شہر کی دل کش تصاویر صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے اردو ادب کے سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ حلوہ پوڑی، سری پائے، چنے قلچے، نہاری وغیرہ جگہ جگہ لاہور میں ان اشیا کی دُکانیں، ٹھیلے، ریڑھیاں، ڈھابے نظر آتے ہیں اور ان کی خوشبوئیں لوگوں کو بے چین و بے قرار کرتی ہیں۔ تاریخی جگہوں، تاریخی مسجدوں کے باہر بھی دُکانیں اور خوانچہ فروش بکثرت ملتے ہیں۔ لاہور کی رونقیں فراموش کرنا آسان نہیں ہے۔

بقول رضا علی عابدی:

> "کھانے پینے کا تو یہ حال ہے کہ میں رکشہ پر بیٹھ کر کہیں جا رہا تھا، معلوم ہوا کہ آگے مجمع کی وجہ سے سڑک بند ہے پوچھنے پر پتہ چلا کہ کڑھاؤ سے گرم

جلیبیاں نکل رہی ہیں یا کھولتے ہوئے سموسے اتر رہے ہیں اور سامنے کھڑا ہوا مجمع کھانے میں منہمک ہے۔"(40)

ہڑپا ساہیوال سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ساہیوال کا شہر سرسبز درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ یوں تو ہڑپہ کا قصبہ خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے مگر اس خاموشی میں بھی ایک داستان چھپی ہوئی ہے۔ ہڑپا قدیم ثقافت کا امیں ہے ہڑپا میں بھی لوگوں میں پنجاب کا خاص رنگ نظر آتا ہے۔ یہی رنگ ہمیں یہاں کے لوگوں کی خوراک میں ملتا ہے۔ حلوہ پوڑی، یہاں کا بھی مرغوب ناشتہ ہے۔ لوگ قطاروں میں کھڑے ہو کر بھی اسی ناشتے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ساہیوال کے تہذیبی و ثقافتی رنگ تو اسٹیشن سے ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ ماجد فرید ساٹی جنھوں نے پورے پاکستان کا سفر کیا اور ہر علاقے کی تاریخ و ثقافت کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ سفر نامہ "مناظر پاکستان" میں لکھتے ہیں:

"عام طور پر گاڑی جب صبح کے وقت یہاں رکتی ہے تو ناشتہ کرنے کے لیے مسافر اُتر پڑتے ہیں اور بکھرے ہوئے ٹھیلے والوں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جو انھیں تلی ہوئی سونے کے رنگ کی پوڑیاں اور میٹھا حلوہ پیش کرتے ہیں۔"(41)

ڈیرہ غازی خان میں کھجوروں کی بہتات ہے۔ ہر علاقے کی اپنی خصوصی روایات اور ثقافت ہوتی ہے۔ ڈیرہ غازی خان کا حلوہ بہت مزے دار بنتا ہے۔ کلر کہار ایک پُر فضا مقام ہے۔ یہ علاقہ چکوال اور تلہ گنگ دو تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال میں اٹک اور روالپنڈی اور جنوب میں جہلم ہے۔ یہاں پر مرغ چھولے بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کا رواج ہے۔ ہوٹلوں کے باہر بکرے اور مرغی کے گوشت ٹنگے نظر آتے ہیں۔ چوں کہ یہ شہر راولپنڈی سے جہلم سے قریب ہے۔ اسی لیے یہاں ڈھابوں پر کڑاہی گوشت بھون کر پیاز اور گرم نان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ٹیکسلا کے کھنڈرات ایک تہذیب کا اثاثہ ہیں۔ بدھ مت اور بدھ تہذیب کے اس گہوارے کے آثار اور کھنڈرات کی کھدائی سے بر آمد ہونے والی اشیا اور تبرکات نے اس علاقے کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ جاپان، فلپائن، تھائی لینڈ، برما، سری لنکا اور دُنیا کے وہ سب ممالک جہاں بدھ مت کے ماننے والے ہیں جوق در جوق یہاں کا رُخ کرتے ہیں۔ ٹیکسلا کا میوزیم نوادرات کا خزانہ ہے۔ چوں کہ یہاں سیاح کثرت سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہاں قدم قدم پر ریستوران بنے ہوئے ہیں۔ یہاں پر مزے کے کھانے

دستیاب ہیں۔ یہاں کی کڑاہی گوشت بہت ہی لذیذ ہے۔ماجد فرید ساٹی نے "مناظرِ پاکستان" اس سفر نامے میں پورے ملک کی سیاحت کا احوال پیش کیا ہے۔اُنھوں نے ٹیکسلا کے میوزیم کی بھی سیر کی ان تمام کھنڈرات کو بغور دیکھا اور مفید معلومات کو سفر نامے کی زینت بنایا وہ یہاں کے کڑاہی گوشت سے بہت مرغوب ہوئے اور لکھتے ہیں:

"مختلف اقسام کے کھانے بآسانی مل جاتے ہیں۔خصوصاً یہاں کے کڑاہی گوشت کا جواب نہیں۔"(42)

حسن ابدال جہاں کا گوردوارہ سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز ہے۔پنجہ صاحب کی زیارت کے لیے دور دور سے عقیدت مند آتے ہیں۔یہاں ہر سال بیساکھی کا میلہ ہوتا ہے۔جس میں ہزاروں کی تعداد میں سکھ یاتری آتے ہیں۔یہاں ٹھیلوں پر پھل بیچنے والے بکثرت نظر آتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے کئی ریستوران ہیں۔جہاں لذیذ کھانے دستیاب ہیں۔کڑاہی گوشت، قیمہ، نان، چھولے یہاں کی پسندیدہ ڈش ہیں۔چائے کے ہوٹل اور کھوکھے بھی جگہ جگہ ہیں۔پورا سال موسم خوش گوار رہتا ہے۔سیاح یہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔سفر نامہ نگار ماجد فرید ساٹی اپنے سفر نامے مناظرِ پاکستان میں یہاں کے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ٹھیلوں اور پتھاروں پر پھل بیچنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔شہری علاقوں کے پان اور سگریٹ کے رسیا ان پھلوں کا ذائقہ چکھ کر رس پیتے ہوئے سوچتے ہیں کہ کاش یہ لمحات طویل تر ہو جائیں۔بازاروں میں چھوٹے چھوٹے ریستوران کھلے رہتے ہیں۔جن میں کڑاہی گوشت، دال، قیمہ نان اور کلچے کھانے والوں کا رش رہتا ہے۔"(43)

ضلع گجرانوالہ جو کہ پہلوانوں کا شہر کہلاتا ہے۔یہاں کے لوگ صحت مند تندرست اور توانا ہیں۔یہ شہر صحت مند اور محنت کش لوگوں کا شہر ہے۔یہ پنجاب کی ثقافت کو سامنے لانے والے اہم شہر ہیں۔یہاں دیسی گھی کے پراٹھے، ساگ مکئی کی روٹی، مکھن مارکے، دودھ ملائی کے پیڑوں والا پینے کا رواج ہے۔گاؤں دیہاتوں میں تو لوگوں کی غذا صحت بخش ہے۔سبزیاں، پھل، دالیں، گوشت، دودھ، مکھن وغیرہ یہاں کے روایتی کھانے ہیں۔گوجرانوالہ میں بکنے والی باداموں کی ٹھنڈی سردائی گرمیوں کا تحفہ ہے۔یہاں کی بریانی، پالک گوشت، مرغ چنے، کڑاہی قابلِ ذکر کھانے ہیں۔

جس طرح باقی جگہوں پر مشروبات بکتے ہیں۔اسی طرح گجرانوالہ میں جگہ جگہ سڑکوں کے کنارے دودھ فروخت ہوتا ہے۔گجرانوالہ خوش حال شہر ہے۔یہاں کے لوگ اچھی خوراک کھاتے ہیں اور اپنی صحت وخوراک کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔گجرانوالہ کے لوگوں کی خوراک سے متعلق خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے رضا علی عابدی اپنے سفر نامے ”جرنیلی سڑک“میں رقم طراز ہیں:

> ”جیتا جاگتا، ہشاش بشاش، چاق و چوبند شہر، اس راستے میں واحد شہر جہاں سڑکوں کے کنارے ٹھنڈا دودھ فروخت ہوتا ہے۔جگہ جگہ ٹنکیاں ، مٹکے اور گڑھے آراستہ ہیں جن کی دودھ جیسی رنگت ہے اور لوگ بڑے بڑے گلاس بھر بھر کر دودھ پی رہے ہیں۔“(44)

ضلع بھاول پور یہاں عام طور پر دن میں دو کھانے کھائے جاتے ہیں۔صادق آباد، ضلع رحیم یار خان، خان پور وغیرہ کے اضلاع میں بھی اسی طرح کے رواج ہیں۔ایک دوپہر کو دوسرا عشا کے وقت یا سورج غروب ہونے کے بعد یہ پنجاب کے گرم ترین علاقے ہیں۔جہاں درجہ حرارت 49 ڈگری گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔بھاول پور میں گرم موسم دوپہر کے وقت گندم کی روٹی لسی کے ساتھ اور رات کو روٹی دودھ (کھیر) کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔اگر گندم سارا سال ملتی رہے تو گندم کی روٹی ورنہ جوار اور باجری کا آٹا استعمال ہوتا ہے۔تھوڑی سی مکئی بھی بھاول پور میں اُگائی جاتی ہے۔لسی یا کھیر اور کبھی کبھار سبزیاں دالیں بھی کھائی جاتی ہیں۔خصوصی کھانوں میں ڈھوڈا (پیاز کے ساتھ بھی کھایا جاتا ہے) ساگ، یا دال شامل ہے۔خوش حال لوگ چوپڑی روٹی شکر کے ساتھ ملا کر کھاتے ہیں جو کہ بہت غذائیت بخش ہے۔دیہاتی دال چنا یا ماش ملا کر کدو توری اور کریلہ کھاتے ہیں جو کہ یہاں بکثرت پیدا ہوتا ہے:

> ”لسّی یا کھیر کے ساتھ روٹی جٹوں کی بنیادی غذا ہے بالخصوص ابھا میں کبھی کبھار دالیں اور سبزیاں بھی کھائی جاتی ہیں۔لیکن زیادہ تر سرد موسم میں جب شلجم، مولی، سرسوں وغیرہ وافر ہوتے ہیں۔خصوصی کھانوں میں ڈھوڈا ساگ یا دال شامل ہے اور یہ شہری لوگوں کے علاوہ بالائی طبقات کے افراد بھی کھاتے ہیں۔ڈھوڈا باجری کے آٹے سے بنتا ہے۔“(45)

یہاں چاول بھی اُگایا جاتا ہے اور چاول کی روٹی بھی بنائی جاتی ہے۔ خان پور اور صادق آباد میں موسم سرما میں مچھلی بھی بکثرت کھائی جاتی ہے۔ موسم سرما میں کھجوریں بھی کھائی جاتی ہیں۔ گوشت خاص موقعوں پر کھایا جاتا ہے۔ یہاں دیہاتوں میں بہت غربت ہے۔ اسی حساب سے وہ اپنی خوراک بھی ترتیب دیتے ہیں۔

بھاول پور سے ہی چولستان نکل جاتے ہیں۔ یہاں غربت کی وجہ سے لوگ بہت ہی معمولی خوراک کھاتے ہیں۔ بغیر چائے کے گائے کے دودھ سے روٹی کھائی جاتی ہے۔ صحرائی چھار "پھوگ" کی سبزی بنائی جاتی ہے جو کہ بہت لذیز بنتی ہے۔ لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ کھمبی کا سالن بھی مرغوب غذا ہے۔ یہاں کے لوگ معمولی خوراک کھاتے ہیں جو خوش حال ہیں وہ بکرے کا گوشت استعمال کرتے ہیں۔ چولستانی چھوٹے بکرے کا گوشت کھانا فخر سمجھتے ہیں۔ بڑا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے۔ دال خوری بھی وہ معیوب سمجھتے ہیں:

> " یہاں بغیر چینی ڈالے گائے کے دودھ سے روٹی کھانے کا رواج عام ہے۔ اسے سرائیکی میں "کھیر سُرکن" کہتے ہیں۔ صحرائی جھاڑی "پھوگ" کے پھولوں سے حاصل کردہ پھگوسی کا بھوجن بھی بڑا مقبول ہے۔ اس کے علاوہ کھمبی کا سالن "سنگریاں" اور سیٹو چولستانی بہت پسند کرتے ہیں۔ صحرائی پودے "لاڑان" کی ایک قسم "بگالاڑاں" کے پھل کو جمع کرکے اس کی روٹی پکائی جاتی ہے۔"(46)

پنجاب کا یہ کلچر ہے کہ لوگ صحت بخش خوراک کے عادی ہیں۔ گائے کے دودھ سے روٹی کھانا پنجاب کے دیہاتوں میں عام سمجھا جاتا ہے۔ پنجاب کے دیہات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں، بہت ترقی کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں کی ثقافت بہت جان دار نظر آتی ہے۔

iv. طرزِ رہائش:

صوبہ پنجاب کو پانچ دریاؤں کی نسبت سے جانا جاتا ہے۔ پنجاب کو پانچ دریاؤں کی سرزمین کے حوالے سے بہت اہمیت حاصل ہے۔ کسی بھی جگہ کا لباس، خوراک، اندازِ رہائش وہاں کے موسم کے مرہون منت ہیں۔ رہائش گاہیں عموماً آب و ہوا کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔ مری کی آب و ہوا ٹھنڈی ہے۔ برف باری ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں گھر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ چھتیں ٹین کی چادروں کی ہوتی ہیں اور ترچھی بنائی جاتی ہیں۔ تاکہ بارش اور برف بہہ کر نکل جائیں۔ ثقافت سے مراد کسی خاص انسانی گروہ کی زبان، لباس، رہائش،

رسوم و رواج، اعتقادات، شعر و موسیقی، کھیل، تہوار، سامان، زیبائش، دستکاریاں اور آداب گفتگو کا تذکرہ اور احاطہ کرنا ہے۔

صوبہ پنجاب کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ دیہاتوں کا رہن سہن شہروں سے بالکل الگ ہے۔ دیہاتوں میں عام طور پر لوگ کچے مکانات بنا کر رہتے ہیں۔ اب تو دیہاتوں میں بھی آہستہ آہستہ ماحول بدل رہا ہے اور جابجا پکے مکانات بنتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ دیہات تو قصبوں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ جہاں بہترین پکے مکانات ہیں اور وہ تمام ضروریاتِ زندگی سے بھرپور ہیں شیخوپورہ زیادہ تر دیہاتی علاقوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے چھوٹے چھوٹے شہر دیہات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ یہاں پہلے دیہاتوں میں کچے مکانات تھے جو اب آہستہ آہستہ پکے مکانات میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

بقول خالد پرویز ملک:

> "دیہاتوں میں عام طور پر لوگ کچے مکانوں میں رہتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ کچے مکانات کی جگہ پختہ مکانات بنتے جا رہے ہیں۔"(47)

پہلے دیہاتوں میں لوگ دو منزلہ مکان بنانا معیوب سمجھتے تھے مگر اب تو دیہاتوں میں بھی بکثرت دو منزلہ مکانات نظر آتے ہیں۔ اکثر دیہات آج بھی ایسے ہیں جہاں چھپر موجود ہیں۔ ان دیہاتوں میں لوگوں کا معیار زندگی بہت پست ہے۔ پنجاب کے بیش تر گاؤں ایسے ہیں جہاں لوگ مٹی اور گارے کے مکانات بنا کر رہائش پذیر ہیں۔ جس کے پاس مویشی ہیں وہ اپنے گھر میں ایک کمرہ مویشوں کے لیے ضرور بناتا ہے۔ غریب لوگ اپنی رہائش کے لیے صرف ایک بڑا سا کمرہ بناتے ہیں۔ مکان عموماً کچے مٹی گارے کے بناتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں گارے کے ساتھ ساتھ پتھر بھی استعمال میں لے آتے ہیں۔ ضلع خوشاب میں بھی اسی طرز کے مکان بنائے جاتے ہیں۔ امیر لوگ اپنے گھر بڑے بناتے ہیں۔ تین سے چار کمرے ہوتے ہیں۔ ایک بڑا ہال وہ اگلا کوٹھا کہتے ہیں۔ گھروں میں ایک چارپائی بچھا کر اس پر سارے بستر اکھٹے کر کے رکھے جاتے ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں صرف ایک کمرہ ہوتا ہے۔ وہ سامنے والی دیوار پر ایک چبوترہ بنا کر اس میں برتن رکھتے ہیں۔ گھروں کا ڈیزائن ایسا رکھا جاتا ہے کہ گھر کے صحن میں درخت ضرور ہوں کیوں کہ گرمیوں میں دن کے وقت لوگ درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھا کر سوتے ہیں۔ پنجاب کا کلچر بہت پیارا ہے۔ گھر سادے مگر بارونق ہوتے ہیں:

> ”گھر کے صحن میں چھاؤں کے لیے درخت لگالیا جاتا، اکثر بکائن کے ہوتے، ان کی چھاؤں گھنی ہوتی۔ دوپہر کو اس کے نیچے چارپائیاں بچھا کر سوتے اگر گھر میں درخت نہ ہوتا تو گھر کے قریب جو بڑا شیشم یا بڑ کا درخت ہوتا لوگ وہاں چارپائیاں لے جاتے اور وہاں شغل میلہ ہوتا۔“(48)

اُردو سفر نامہ نگاروں نے پاکستان کے کونے کونے کو اپنے سفر ناموں کے ذریعے اس طرح پیش کیا ہے کہ جس کو پڑھ کر ان کی عقلِ سلیم کو داد دینا پڑتی ہے کہ اُنھوں نے ان خطوں کو بھی صفحہ قرطاس کی زینت بنا دیا جن علاقوں کے بارے میں عام انسان نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ تو ان اُردو سفر نامہ نگاروں کا کارنامہ ہے۔ جنھوں نے سفر ناموں کو ثقافتی رنگوں سے مزین کیا ہے۔

رضا علی عابدی نے اپنے سفر نامے ”جرنیلی سڑک“ میں تہذیب و ثقافت، مذہب و سیاست کو اولیت دی ہے۔ اُنھوں نے دورانِ سفر مختلف علاقوں کے لوگوں کو دیکھا کیوں کہ دیکھے بغیر ملے بغیر کسی بھی علاقے کی ثقافت اُجاگر نہیں ہوتی۔ رضا علی عابدی نے اس سفر نامے میں سڑک کے کنارے آباد لوگوں کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ یہ سڑک پشاور سے شروع ہوتی ہے اور اس کی آخری حد واہگہ ہے۔ اُردو سفر نامہ نگاروں نے جس طرح سے پاکستان کے خطوں کو اُجاگر کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ رضا علی عابدی نے عمدہ اُسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کا ہر لفظ جاذبیت کے رنگ میں گھلا ہوا ہے۔ گجرانوالہ شہر کی ثقافت بڑی ہی منفرد ہے۔ یہاں اب کچھ مکانات نظر نہیں آتے پکے، آرام دہ مکانات کا دور دورہ ہے۔ ہر گھر میں کار، موٹر سائیکلیں موجود ہیں۔ گجرانوالہ شہر اب بہت ترقی کر چکا ہے اور گوجرانوالہ کے گاؤں بھی خاصے ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔ رضا علی عابدی اپنے سفر نامے ”جرنیلی سڑک“ میں لکھتے ہیں:

> ”شہر کے جو نئے علاقے آباد ہو رہے ہیں ان میں اچھے اور آرام دہ مکان ہیں اور مکانوں میں زندگی کی ایسی آسائشیں موجود ہیں کہ دیکھا ہی کیجیے۔ ہر گھر میں کار کھڑی ہے نوجوانوں کے لیے موٹر سائیکلیں ہیں۔ واک مین ہیں۔ کاسپکٹ کیمرے ہیں اور ورزش کی پرانی روایت کا اب یہ حال ہے کہ صاحبِ حیثیت لوگوں کے گھروں میں وہ بائیسکل آگئی ہے جو اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوڑا کرتی ہے۔“(49)

گجرانوالہ شہر نے بہت ترقی کرلی ہے۔پہلے یہ ہی شہر پس ماندہ تھا۔اب تو قصبے بھی شہر کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔پہلے تو شاذونادر ہی کوئی مکان قریب نظر آتا تھا۔اب تو مکانات میلوں تک پھیل گئے ہیں۔گزشتہ کچھ سالوں میں اس ضلع نے بہت ترقی کی ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں کی خدمات قابلِ تحسین ہیں کہ اُنھوں نے قریب تو قریب دور کے علاقوں کو بھی کھوج دیا اور ان کی ثقافت کے رنگوں سے اُردو اَدب کو رنگ دیا۔

نہ صرف اپنے ملک کے بلکہ غیر ملکی سیاحوں نے بھی ”سرزمین پاکستان“ کی یاترا کو لفظوں میں بند کر کے جس طرح اوراق پر اتارا کہ ان کا یہ رویہ قابلِ آفرین ہے۔انہی سیاحوں میں ایک سیاح کیمی پوا ہیں جنھوں نے ”سفر نامہ پاکستان“ کے عنوان سے سفر نامہ تحریر کیا وہ جہاں جہاں گئی وہاں کی تاریخ، تہذیب، ثقافت کو قلم بند کرتی گئی اور یہ سفر نامہ پورے ملک کی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔کیمی پوا ایک منجھی ہوئی ”سفر نامہ نگار“ ہیں۔اُنھوں نے ملک کے چپے چپے کو بغور دیکھا اور ان تمام تاثرات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔”سفر نامہ پاکستان“ میں رہائش گاہوں کے حوالے سے کیمی پوا شہر لاہور کے انداز رہائش کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ”نوے ایکڑ کے علاقے میں جو ہندوستان کی سرحد سے صرف چار میل دور ہے۔خوب صورت مکانات بنے ہوئے ہیں۔عملہ کے پچاس فیصد لوگ کمپنی کے گھروں میں رہتے ہیں۔گھروں کے گرد پھول لہلہاتے ہیں۔پچھلے صحن میں مرغیاں اور بکریاں پالی جاتی ہیں اور پھولوں کے ساتھ ساتھ سبزیاں اُگی ہوئی ہیں۔“(50)

صوبہ پنجاب آبادی کے لحاظ سے ایک بڑا صوبہ ہے اور رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا دوسرا صوبہ ہے۔اندرونِ پنجاب ابھی بھی بہت پس ماندہ ہے۔پرانے مکانات کچے مٹی کے لپائی ہوئے مکان ابھی بھی دیہاتوں میں نظر آتے ہیں۔حضرو کا ایک چھوٹا سا قصبہ غور غشی جسے لوگ چھوٹا انگلستان کہتے تھے، بظاہر باہر سے پنجاب اور ہزارہ کے قصبوں جیسا تھا۔اینٹوں کے مکانات تھے گندی گلیاں تھیں مگر جو مکان ٹھیک حالت میں نظر آرہے تے۔ان کے تو اندر جا کر دیکھا تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کے پھٹی رہ گئیں اندر کی دُنیا بالکل ہی مختلف تھی۔آرام دہ کمرے، جدید طرز کے غسل خانے اور گھریلو استعمال کا سامان، پختہ فرش، اچھے قالین، ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنز غرض تمام سہولیات زندگی آراستہ مکان دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اور خوشی ہوئی۔اصل میں یہاں کے بیش تر لوگ انگلستان میں رہتے ہیں۔اس لیے مکانات جدید سہولتوں سے مزین ہونا

لازم ہے۔ رضا علی عابدی اپنے سفر نامے "شیر دریا" میں حضرو کے قصبے غور غشی کی رہائش گاہوں سے متعلق رقم طراز ہیں:

"یہ بات سنتے ہی اپنی کار سے اتر گیا اور اب غور غشی میں داخل ہوا تو وہاں منظر ہی دوسرا تھا باہر سے تو وہ ایسا ہی قصبہ تھا جیسے پنجاب اور ہزارہ کے قصبے ہوتے ہیں۔ اینٹوں کے مکان، گندی نالیاں اور کھلی زمینوں پر گرے ہوئے پرانے مکانوں کے ملبے کے ڈھیر۔
لیکن جو مکان سالم کھڑے تھے ان کے اندر جا کر دیکھا تو وہاں کی دُنیا ہی مختلف تھی۔ آرام دہ کمرے، آراستہ نشست گاہیں، خوش نما خواب گاہیں، جدید طرز کے غسل خانے اور گھریلو استعمال کا بجلی کا سارا سامان موجود تھا۔"(51)

پنجاب کا علاقہ ہنڈ بھی اسی طرح پس ماندہ ہے۔ پتھروں اور اینٹوں کے بنے ہوئے پرانے مکانات اس علاقے میں جابجا موجود ہیں۔ کچھ گلیاں جن میں بجلی کے کھمبے تھے۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی دُکانیں نظر آتیں تھیں۔ پرانے قلعوں کے کھنڈر نظر آتے تھے۔ عمارتیں کھنڈرات میں بدل چکی تھیں۔ سپاٹ دیواروں والے مکانات اور بے رونق گلیاں ہنڈ شہر کی صورتِ حال تھی۔

رضا علی عابدی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"دریا کے اُونچے کنارے پر پتھروں اور اینٹوں کے بنے ہوئے پرانے مکان تھے۔ کچھ گلیاں تھیں جن میں لگے بجلی کے کھمبے تھے۔"(52)

گاؤں، دیہاتوں میں نہایت سادہ ماحول تھا۔ آج بھی پس ماندہ گاؤں ایسے ہیں جہاں کا کلچر پرانے سادہ لوح لوگوں کے مطابق بالکل ہی سادہ سا تھا۔ بڑے بڑے کمرے، صحن ہوتے تھے۔ صحن میں چارپائیاں بچھی ہوتی تھیں اور چلم بھر کر حقہ رکھا ہوتا تھا۔ اب تو حالات کافی بدل گئے ہیں۔ مگر وہ گاؤں جو ابھی پس ماندہ ہیں وہاں کا ماحول اب بھی یہی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایسے ہی گاوں "جوکالیاں" میں لکھتے ہیں:

"ہم صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔۔۔بے شک جوکالیاں اب کچھ کچے کوٹھوں کا ایک گاؤں نہ رہا کرتا تھا۔ یہ بھی شہر ہو گیا تھا۔ لیکن ہمارا گھر تقریباً اصل حالت میں موجود تھا۔"(53)

لاہور شہر ایک بڑا شہر ہے، یہاں کی آبادی بھی کافی زیادہ ہے۔ پنجاب کے باقی اضلاع میں سے بڑا ضلع لاہور ہے۔ چوں کہ لاہور قدیم تاریخی شہر ہے، یہاں ڈھیروں گلیاں، مساجد ہیں۔ جو کسی نہ کسی معروف شخصیت کے نام پر رکھی گئی ہیں۔ جیسے گلی سرجن سنگھ، سُرجن سنگھ پرانے لاہور کے ایک معروف حکیم اور شاعر تھے۔ وہ یہاں رہا کرتے تھے یہ دُنیا کی تنگ ترین گلی ہے۔ یہاں بہت سے خاندان رہتے ہیں۔ یہاں پر بنے مکانات نہایت شکستہ ہو چکے ہیں۔ اب تک کسی سفر نامہ نگار نے لاہور کی ایک ایک گلی کا حوالہ نہیں دیا۔ جس طرح مستنصر حسین تارڑ نے دیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے سفر نامے "لاہور آوارگی" میں ان گلیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لاہور شہر میں پرانے مکانات بکثرت موجود ہیں۔ جن کی از سرِ نو تعمیر ہوتی رہی ہے۔ جن کے پاس پیسہ ہے وہ مکانوں کی شکل بدل دیتے ہیں۔ بہت سے پرانے مکانات جب نئے بنائے گئے تو اتنے شان دار کہ ان سے نظر نہ ہٹتی تھی۔ حویلی دینا ناتھ ایک قدیم حویلی تھی۔ حویلی اتنی بڑی تھی کہ اس کے اند بھول بھلیاں تھیں۔ اس کے اندر ڈھیروں خاندان آباد تھے۔ نیم تاریک چھوٹی اینٹوں کی سیڑھیاں تھیں۔ دروازے چوکھٹیں انتہائی بوسیدہ تھیں اور اپنی قدامت کی داستان سناتی تھیں۔

بقول مستنصر حسین تارڑ:

> "حویلی دینا ناتھ کے اندر بھول بھلیاں تھیں، درجنوں خاندان آباد تھے۔ نیم تاریک چھوٹی اینٹوں کی سیڑھیاں تھیں۔ ایسے سال خوردہ دروازے تھے جن کی چوکھٹ پر زمانوں کے اتنے قدم پڑ چکے تھے کہ وہ دم توڑنے کو تھیں۔" (54)

پتھروں والی حویلی کی ہی مثال لیجیے۔ اس کا اصل نام حویلی ثانی نواب میاں خان جو کہ مشہور پتھر واں والی حویلی کے نام ہے۔ یہ موچی دروازے کے علاقے کی مشہور و معروف مسجد ہے چوں کہ اس عمارت میں کالا پتھر استعمال ہوا تھا۔ اس لیے اسے پتھراں والی کہتے ہیں۔ اس حویلی تک پہنچنے کے لیے ایک تنگ گلی سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تنگ اندھیری گلی، جہاں لوگ کس طرح پس ماندہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اندھیاری، سیلن زدہ کوٹھریاں جن مکانوں کے کوٹھے ہوتے ہیں۔ وہاں تو لوگ دھوپ میں چلے جاتے ہیں اور جہاں نہیں ہوتے وہاں لوگ اسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اتنی تنگ گلیاں کہ کوئی مر جائے تو ایک چارپائی تک نہیں گزر سکتی۔ مُردے کو کندے پر اُٹھا کر باہر تک لاتے ہیں۔ ایسے ہی مکانوں کا ذکر مستنصر حسین تارڑ نے "لاہور آوارگی" سفر نامے میں بھی کیا ہے کہ آج بھی زندگی ان بوسیدہ علاقوں میں سسک رہی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ "لاہور آوارگی" میں لاہور کی ان تنگ اور بوسیدہ گلیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایسے نیم اندھیارے مکانوں میں جو قیام کیے جاتے ہیں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔زیادہ تر ایسے جن کے پاس حیات بسر کرنے کا کوئی اور متبادل مقام نہیں ہوتا اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شہر کی ان تنگ گلیوں۔۔۔"(55)

ایسی ہی بہت سی گلیاں راولپنڈی شہر میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔لیکن ان میں مکانات بدل گئے ہیں۔چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں میں شان دار مکانات ہیں۔تین منزلہ،چار منزلہ البتہ خال خال کچھ قدیم مکانات بھی نظر آتے ہیں جو ہندوانہ طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔کمیٹی چوک،بھابڑا بازار،صدر وغیرہ کی اندرونی چھوٹی چھوٹی گلیاں اوران میں طرزِ تعمیر مکانات وہاں کے لوگوں کی ثقافت کا پتہ دیتے ہیں۔

لاہور شہر کی آئے دن کی بڑھتی ہوئی آبادی نے لاہور کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔پرانی اقدار مٹتی جا رہی ہیں۔بارش برسنے کے بعد جگہ جگہ کھڑا پانی اس شہر کو جو نقشہ پیش کرتا ہے ،وہ انتہائی بھیانک ہے۔تنگ گلیاں ،ڈبہ نما مکانات جہاں زندگی مشکلات سے دوچار ہے۔خلیل طوق اُر اپنے سفرنامے "پیارا ملک ہے پاکستان" میں لاہور شہر کی قدیم مٹتی ہوئی روایات پر افسوس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> " یہاں میرے ددھیال کا گھر تھا اور جہاں مستقل ایک منزلہ باغیچہ والے گھر ہوا کرتے تھے خیر جیسا کہ میں نے کہا بس یاد دلاتا ہے کیوں کہ آج وہاں ان گھروں کی جگہ پانچ چھ منزلہ عمارتیں بلند ہو چکی تھیں۔ثمینہ پنجرے کو کہا کرتی تھی یا شاید ہماری پرانی تہذیب جو ہمارے ملک میں دن بدن مٹتی چلی جاتی ہے اس کی جھلکیاں لاہور میں دکھائی دیتی ہیں۔"(56)

مری صوبہ پنجاب کا سب سے بلند ترین مقام ہے۔پتریاٹہ کی چیئر لفٹ میں بیٹھ کر مری کی بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔صوبہ پنجاب کا ایک صحت افزا مقام مری ہے اور یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور عمدہ ہل سٹیشن ہے۔مری کے لوگوں کی زندگی خاصی مشکل ہے۔لوگوں کے مکانات پہاڑوں پر بنے ہوئے

ہیں۔ڈھلوان پر بنی چھتیں ہیں جن پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی ہیں جو بارشیں اور برف باری کی صورت میں گھروں کو نقصان نہیں دیتیں۔ان چھتوں پر برف ٹھہرتی نہیں ہے، نیچے گر جاتی ہے۔کشمیر میں بھی اسی طرز کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔اب تو مری میں بھی تین تین منزلہ شان دار مکانات پہاڑوں پر بنے نظر آتے ہیں۔

مری کے مکانات سے متعلق کیمی پوا اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

> "چھانگلا گلی کے چھوٹے سے بازار میں پھلوں کی دُکانیں اور چائے خانے ہیں اور تھوڑی دیر رُک کر کچھ کھانے پینے کے لیے اچھی جگہ ہے۔یہاں سے پتھریلی سڑک کے راستے گاف کلب ہوٹل جایا جاسکتا ہے۔اس کی ڈھلوان پر بنے ہوئے مکانات بالکل کشمیر کے مکانوں کی طرح ہیں۔"(57)

صوبہ پنجاب ایک بڑا صوبہ ہونے کی وجہ سے کئی اضلاع پر مشتمل ہے اور ان تمام اضلاع کی ثقافت میں اچھا خاصا تضاد ہے۔کہیں کے لوگ کچھ ہیں اور کہیں کے کچھ۔ان کا طرزِ زندگی الگ ہے۔دوسروں کا الگ ،پہاڑی علاقوں کے لوگ اپنی آب وہوا کے مطابق رہائش پذیر ہیں۔ملتان، جھنگ، فیصل آباد، ساہیوال، بھاول پور، بھکر وغیرہ میں موسم گرم ہوتا ہے اور سردیوں میں ٹھنڈا کہیں معتدل آب وہوا ہے۔

گاؤں، دیہاتوں میں غریب لوگ چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں جب کہ متوسط طبقے کے پھر بھی بڑے گھر ہوتے ہیں۔ صحن بڑا ہوتا ہے۔اگرچہ کمرے کم ہوتے ہیں۔ بھیرہ اپنے گاؤں کی سیاحت کرتے ہوئے سفر نامہ نگار بلراج ساہنی خوش بھی تھے اور افسردہ بھی۔جب اُنھوں نے گاؤں میں اپنا مکان دیکھا تو حیران رہ گئے۔اتنا چھوٹا۔شاید پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔گاؤں دیہاتوں میں غربت اس قدر ہے کہ دیکھ کر دل دکھتا ہے۔

بلراج ساہنی اپنے سفر نامے "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں رقم طراز ہیں:

> "مجھے دھچکا سا لگا کیا ہمارا گھر واقعی چھوٹا اور غریبانہ تھا؟ میں نے اسے غیر جانب دارانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی واقعی اتنا چھوٹا تھا کہ اس سے چھوٹا مکان شاید ہی میں نے دیکھا ہو۔سونے بیٹھنے کے لیے ایک ہی ڈھنگ کا کمرہ تھا۔اس میں۔۔۔وہ جس کا فرش اکھڑ چکا تھا اس میں ہم کیسے سارے گھر والے گزر بسر کرتے ہوں گے۔بڑی انوکھی سی بات لگی۔"(58)

بھیرہ یوں تو ایک درمیانے درجے کا گاؤں ہے مگر جن لوگوں کے حالات اچھے ہیں۔ان کے مکانات دیکھنے کے لائق ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے مکانات شہری طرز پر بنے ہیں۔گھروں میں ٹی وی، ڈش، فریج، ائیر کنڈیشنز اور تمام ضروریات زندگی موجود ہیں۔گھروں میں لکڑی کا بہترین کام کیا گیاہے۔کھڑکیاں شیشوں سے مزین ہیں۔غرض یہ کہ ان کے مکانات اچھے طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔

سفر نامہ نگار داؤد طاہر نے اپنے سفر نامے "نئی منزلیں ہیں پکارتیں" میں پنجاب کی سیاحت کے احوال درج کیے ہیں۔وہ بھیرہ کے مکانات دیکھنے کے شوقین ہیں۔داؤد طاہر رقم طراز ہیں:

"سُنا ہے یہاں کے قدیم مکانات پر لکڑی کا کام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔"(59)

ٹیکسلا کی طرف نکل جائیں تو وہاں کا ماحول مختلف ملے گا۔ٹیکسلا کا پہلا نام ٹکشیلا تھا جس کے معنی پتھروں کے شہر ہیں۔یہاں خوب صورت اور ہوادار سفیدی شدہ اینٹوں سے مکانات بنائے گئے ہیں۔ان گھروں میں چمنیاں ہیں۔دیواروں پر الماریاں بنی ہوئی ہیں۔صاف ستھرا پر اُمن شہر ہے۔یہاں پر پتھر کی دیواروں سے مکانات بنے ہوئے ہیں۔مکانوں کو بنانے میں بلاکوں کو استعمال کیا گیا ہے۔پاکستان کے تمام علاقوں کا کلچر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔بھاول پور، بھاول نگر، رحیم خان جہاں گرمی بہت شدید پڑتی ہے۔سردیوں میں ٹھنڈک بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔بھاول پور میں مسلمانوں کے مکانات عموماً کچے ہیں۔مٹی سے لیپ کر بنائے جاتے ہیں۔جو خوشحال لوگ ہیں۔ان میں سے کچھ پکے مکانات بناتے ہیں اور کچھ کچے ہی بناتے ہیں۔نسبتاً بہتر طبقات کے لوگوں کی رہائش گاہیں ایسی ہیں جن میں مکانات کی عموماً ایک ڈیوڑھی یا داخلے کا کمرہ ہوتا ہے۔جو راہ داری میں کھلتاہے۔صحن کے پار مرکزی عمارت آتی ہے۔اس میں ایک برآمدہ، دلان یا ہال اور دو کوٹھریاں ہوتی ہیں۔گلی کا رخ جنوب کی طرف ہوتا ہے تاکہ جنوب کی طرف سے ہوا آسکے۔شہروں میں غریب لوگوں کے مکان اسی طرح بنتے ہیں۔بس ان میں گلی اور ڈیوڑھی نہیں ہوتی۔بھاول پور میں ہندو بھی کافی تعداد میں بسے ہوئے ہیں۔کراڑ طبقہ عموماً کئی منزلہ پکے مکانات میں رہتے ہیں۔لیکن کمرے زیادہ تر نیچی چھت والے تنگ اور ہوا کے ناقص استعمال والے ہوتے ہیں۔غریب ہندو مٹی کے بنے مکانوں میں رہتے ہیں۔مسلمانوں کی جھونپڑیاں کانوں سے بنی ہوئی ہیں مگر ہندوؤں کی صرف مٹی سے بنی ہوتی ہیں:

"اُصولی طور پر وہ سبھی کچے ہیں اور ریاست میں کبھی کبھار کی بارش آنے پر اکثر ڈھے جاتے ہیں۔ دیہات میں مسلمانوں کے مکانات عموماً محض کانے سے بنی جھونپڑیاں ہیں۔ جنھیں سہل یا سہل کھسی کہا جاتا ہے۔"(60)

بھاول پور سے تھوڑا آگے نکل جائیں تو چولستان کا صحرائی علاقہ آ جاتا ہے۔ سمہ سٹہ سے چولستان کا راستہ نکلتا ہے۔ تین راستے ہیں چولستان میں داخلے کے۔ بھاول پور کی مشرقی پٹی پر صحرائے چولستان جگمگاتا نظر آتا ہے۔ جس کے دوسری طرف راجستھان کی ریاستیں جیسلیمر اور بیکانیر واقع ہیں۔ چولستان کو مقامی طور پر روہی کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں پرانے دور کے اُونچے اونچے مکان بھی موجود ہیں۔ زیادہ آبادی تو مٹی کے بنے کچے مکانوں میں رہتے ہیں جب کہ صاحب حیثیت اچھے مکانات میں رہائش پذیر ہیں۔ سفر نامہ نگار فرید ساٹی چولستان کی سیر کے دوران وہاں کی سیاحت سے محظوظ ہو کر اپنے سفر نامے "مناظر پاکستان" میں لکھتے ہیں:

"قدیم طرز کے بلند و بالا مکان نور محل کے ساتھ ایک سڑک باغوں کے بیچ میں سے ہو کر ریلوے لائن کی طرف جاتی ہے۔"(61)

چولستانی اپنے گھر میں کُھڈی (مرغی کا ڈربہ)، کلھوٹی (گندم ذخیرہ کرنے کا گودام جسے گھروں کے اندر بناتے ہیں یہ انسانی قد جتنا لمبا بنتا ہے)، گھڈرا (چار کونوں والا کمرہ جسے اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے)، گڑوانی (پانی رکھنے کے لیے مٹی کی بنی ہوتی ہے)، تنور (روٹی بنانے کے لیے) چولستان کا یہ رواج تمام گھروں میں رائج ہے۔

پنجاب کا ایک شہر "نندنا" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کلر کہار، پنڈ دادنخاں وغیرہ میں ہی آتا ہے۔ یہاں کا تاریخی قلعہ نندنا اپنے وقت کا یادگار ہے۔ پہاڑوں پر سیڑھیاں تعمیر کی جائیں تاکہ ہمارا قومی ورثہ محفوظ رہ سکے۔ یہاں کے مکانات پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔

بقول ایم زمان کھوکھر:

"ماضی میں یہ شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا لوگوں کے مکان پتھر کے بنے ہوئے تھے۔"(62)

آج بھی بہت سے مکانات پتھر کے ہیں۔ حالاں کہ اب زمانے کی ترقی کا اثر یہاں بھی نظر آتا ہے۔ مگر غریب لوگوں کی طرزِ رہائش اسی طرح ہے۔

V. پیشے:

پیشے یعنی روز گار بھی کسی علاقے کے رہنے والوں کی ثقافت کا پتہ دیتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کے لوگ سخت کوش ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے مشکل کام کر لیتے ہیں۔ جب کہ مختلف علاقوں میں بسنے والے ایسے روز گار کے متحمل نہیں ہو سکتے جن کو پہاڑی علاقوں والے بآسانی کر لیتے ہیں۔ جب کہ میدانی علاقوں میں بسنے والے ایسے روز گار کے متحمل نہیں ہو سکتے جن کو پہاڑی علاقوں والے بآسانی کر لیتے ہیں۔ اُردو سفر نامہ نگاروں نے دُنیا کے چپے چپے کی سیاحت کی اور وہاں کے ثقافتی عوامل کو سامنے لانے کا موجب بنے ہیں۔ پنجاب کا بیش تر حصہ میدانی ہے۔ یہاں گرمی اور سردی کی شدت رہتی ہے۔ صرف پہاڑی علاقے جہاں کا موسم گرما میں خوش گوار اور سرما میں سخت سرد رہتا ہے۔ پنجاب چوں کہ زرعی علاقہ ہے دیہاتوں میں لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ زراعت کے پیشے سے منسلک ہیں۔ حضرو ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں کے لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ یہاں ہر قسم کی پیداوار ہے۔ یہ علاقے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہر قسم کی یہاں پیداوار ہے۔ آب پاشی کے لیے کنویں استعمال ہوتے ہیں۔

رضا علی عابدی اپنے سفر نامے "شیر دریا" میں لکھتے ہیں:

"یہاں زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں بہت زیادہ مکئی اور گندم بھی خوب ہوتی ہے۔ اب لوگ سبزیوں کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔"(63)

زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتیں بھی ہیں۔ جن سے گھر کا کچھ نہ کچھ خرچہ ہو ہی جاتا ہے۔ ہنڈ یہ بھی پنجاب کا ایک شہر ہے۔ جہاں سے دریائے سندھ گزرتا ہے۔ ہنڈ میں لوگ جنگل کا کاروبار کرتے ہیں۔ کچھ مویشی پالتے، اور نسل بڑھا کر فروخت کرتے ہیں۔

بقول رضا علی عابدی:

"یہ دریا بہت سے لوگوں کا ذریعہ ہے کچھ لوگ تو دریا کے پانی اور ریت سے سونا نکالتے ہیں۔ انھیں سونا نکالنے کا طریقہ آتا ہے۔ کچھ لوگوں کے روز گار دریا پار کے جنگل میں ہیں۔ وہاں وہ مویشی پالتے ہیں اور اس کی نسل بڑھاتے ہیں او فروخت کرتے ہیں۔ یہاں کے جانور لے جا کر وہاں پالتے ہیں اور خشک لکڑی لا کر فروخت کرتے ہیں۔"(64)

یہاں کے لوگ دریائے سندھ سے سونا نکالتے ہیں۔ ہزاروں لوگوں کا روزگار اس دریا سے وابستہ ہے۔ ہفتوں سخت تپتی دھوپ میں بیٹھ کر دریا کی خاک چھانتے ہیں۔ تب کہیں جا کر چند ذرے سونے کے ہاتھ آتے ہیں۔ یہ محنت کش لوگ دن بھر محنت کرتے ہیں اور پھر جا کر چار پیسے ملتے ہیں۔

دریائے چناب کے پار وزیر آباد جو کسی زمانے میں پنجاب کا بہترین شہر کہلاتا تھا یہ وہ شہر تھا جسے رنجیت سنگھ مہاراجہ نے اپنے فرنگی جرنیل ابوطویلہ کے حوالے کیا تھا جو اٹلی کا باشندہ تھا۔ شہر بسانے اور گلی کوچے بنانے کا فن اٹلی والوں سے بڑھ کر کسی کو نہیں آتا۔ چناں چہ اس نے وزیر آباد کو از سرِ نو آباد کیا۔ وزیر آباد میں چاقو اور قینچیاں بنانے کی پرانی صنعت تھی۔ فوج کو بھی یہ چیزیں فراہم کرنے والا شہر یہی تھا۔ اگرچہ اب تو چاقو، چھری شہر شہر بننے لگے ہیں۔ مگر وزیر آباد کی اپنی اہمیت ہے۔ ہزاروں لوگ ان صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں عمارتی لکڑی کا کاروبار بھی کیا جاتا ہے۔ وزیر آباد اپنے کھانوں کے حوالے سے بھی خاصا مشہور ہے۔ وزیر آباد کو ضلع گوجرانوالہ کے صنعتی شہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گجرات، لاہور اور سیالکوٹ سے قریب ہے۔

رضا علی عابدی سفر نامہ "جرنیلی سڑک" میں رقم طراز ہیں:

> "پنجاب کے پار وزیر آباد جنکشن پر کبھی ریل گاڑی رُکا کرتی تھی تو چمکتی ہوئی قینچیاں اور بھانت بھانت کے چاقو ٹھیلوں پر سجائے کتنے ہی پھیری والے ساتھ ساتھ چلانے لگتے تھے: لو جی وزیر آباد کے چاقو، لو جی وزیر آباد کی قینچیاں۔"(65)

وزیر خان نے جب وزیر آباد تعمیر کیا تھا تو اس کے گرد ایک فصیل بنوائی تھی اور 4 دروازے بنوائے تھے۔ ایک لاہور دروازہ، جس کا رُخ لاہور کی طرف ہے دوسرا گجراتی دروازہ گجرات کی طرف جانے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ تیسرا رسول نگری دوازہ رسول نگر قصبہ کی طرف جانے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ چوتھا دروازہ سیالکوٹ کی جانب تھا۔ سیالکوٹ شہر میں جانے کے لیے بنوایا تھا۔ یہ شہر رچنا دوآب میں آتا ہے۔

وزیر آباد میں لوگ زراعت کے شعبے سے بھی منسلک ہیں۔ یہاں چاول گندم، گنا کاشت کیا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ شہریوں تو صحت مند پہلوانوں کا شہر ہے۔ گجرانوالہ صنعتی شہر ہے۔ جس نے پانچ لاکھ لوگوں کو روزگار فراہم کر رکھا ہے۔ 6500 چھوٹے بڑے کاروباری ادارے، 25 ہزار کاٹیج یونٹ اور چھوٹے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں موجود ہیں۔ یہاں کا اسٹیل اور گلاس کا کام پوری دُنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ گوجرانوالہ

لوہے اور اسٹیل کے حوالے سے ملک کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ بجلی کی مصنوعات بنانے والے 150 سے زائد یونٹ یہاں موجود ہیں۔ کپڑا، سوت اور دیگر ٹیکسٹائل کا سامان بھی یہاں تیار کیا جاتا ہے۔ دیگر مصنوعات میں پنکھے، ائیر کولر، مشینیں، واشنگ مشین، پلاسٹک، کٹلری، شیشے کا سامان، چمڑے کا سامان، زرعی سامان، کیڑی، جراحی کا سامان، فوجی استعمال کے لیے مشینیں، گھریلو سامان، ساتھ ساتھ کھانے پینے کی اشیا موٹر سائیکلیں بنانے کے کارخانے موجود ہیں۔ جن میں لاکھوں لوگ کام کرتے ہیں۔ گوجرانوالہ بہترین چاول پیدا کرنے میں پنجاب میں پہلے نمبر پر ہے۔ بہترین زرعی فصلیں گندم پیدا کرنے میں گوجرانوالہ اہم شہر ہے۔ گوجرانوالہ کو اسلحہ بنانے میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔

رضا علی عابدی "جرنیلی سڑک" میں رقم طراز ہیں:

"اس شہر کے بارے میں بہت کچھ سنا جاتا ہے۔ مثلاً پہلوانوں کا، باڈی بلڈروں کا اور کھلاڑیوں کا شہر ہے یا شاعروں کا، ادیبوں کا دانش وروں اور مدبروں کا شہر ہے اور یہ بات تو بہت سنی کہ بہترین کاریگروں کا شہر ہے جو اپنے چھوٹے چھوٹے ورکشاپوں میں دنیا کی بڑی بڑی مشینیں بنا سکتے ہیں۔ آپ انھیں کیسی ہی مشین دکھا دیجیے وہ آپ کو ویسی ہی مشین بنا کر دیں گے۔"(66)

گوجرانوالہ کے لوگ محنت کش اور ہنر مند ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی ہنر مندی ہی ان کا روز گار ہے۔ ہزاروں لوگ اس روز گار سے جڑے ہوئے ہیں۔ شہر سیالکوٹ میں کھلونے بنانے کی ایک بڑی صنعت ہے جس میں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کا کھیلوں کا سامان دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ ملتان کے لوگ دستکاری میں ماہر ہیں۔ ملتان کے دستکاروں اور ہنر مندی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ملتان میں معماری کا کام کرنے والے ماہر معمار موجود ہیں۔ کاشی گری، نقش کاری اور قالین بانی کے کام میں ملتان کے لوگ بہت ماہر ہیں۔ ہزاروں لوگ اس روز گار سے وابستہ ہیں۔ پہلوانی کو بھی ملتان کے لوگوں نے بطور روز گار اپنایا۔ زوار پہلوان اور زمن پہلوان بھی ملتان کی پہچان بنے۔

بقول محمد اسلم میتلا:

"ملتان کی دست کاریوں میں کاشی گری، نقش گری، قالین بانی، پارچہ بانی، میناکاری، عاج کاری، چوب کاری، اسلحہ سازی، تیر کمان، سازی اور معماری

میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ملتان کے دست کاریوں اور ہنر مندی کا
ایک زمانے معترف ہیں۔ملتان کے معماروں کو ہی لیجیے کہ تاج محل، آگرہ کی
تعمیر کے لیے شاہ جہاں نے ملتان کے معماروں کی خدمات حاصل کیں اور
اس طرح معماروں نے ایسی عمارت تعمیر کی جو آج تک سیاحوں کی دل چسپی کا
مرکز بنی ہوئی ہے۔"(67)

ملتان جیسے قدیم اور تاریخی شہر میں لوگوں کی ہنر مندی اور کاریگری قابلِ رشک ہے۔یہاں کی منڈی میں آپ کو ایک فٹ کی کھال کے لیمپ ملیں گے۔یہاں کثرت سے اونٹ موجود ہیں۔ایک شتر بان اپنے اونٹ کی موت سے اتنا دل براشتہ ہوا کہ اس نے اونٹ کی کھال اتار کر اس سے متعدد اشیا بنا لیں اور یاد گار کے طور پر رکھ لیں یوں یہ سلسلہ چل نکلا اور یوں کاریگروں نے اونٹ کی کھال سے مصنوعات بنانا شروع کر دیں اور یہ اشیا صرف ملتان کے کاریگروں نے ہی بنائی ہیں۔اس کے علاوہ یہاں کی منڈی میں کامدانی جوتے بھی ملتے ہیں۔جس میں یہاں کے کاریگروں کا ہنر جھلکتا ہے۔ان جوتوں پر سونے اور چاندی کے تاروں کا کام ہے۔اس کے علاوہ چینی مٹی کے ظروف ایسے ہیں۔جن کی خوب صورتی قابلِ دید ہے۔اس کے علاوہ سفید پتھر کے ٹکڑوں سے مزاروں اور قبروں کی قابلِ دید لوحیں بناتے ہیں۔یہاں کے کاریگر اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

کیمی پوا"سفر نامہ پاکستان" میں لکھتی ہیں:

"اس قدیم شہر میں جہاں اونٹ کثرت سے ہیں مشہور ہے کہ ایک شتر بان
اپنے اونٹ کی موت سے اتنا غم زدہ ہوا کہ وہ اس کی جدائی برداشت نہ کر
سکا۔آخر اس نے اونٹ کی کھال اتار کر اپنے پاس رکھ لی اور اس سے گدیاں
اور لیمپ تیار کر لیے تاکہ دونوں چیزیں دوست کی یادگار کے طور پر محفوظ
رہیں۔یہ خیال عام ہو گیا اور بات چل نکلی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اونٹ کی
کھال کے لیمپ سب کے سب ملتان کے کاریگر ہی تیار کرتے ہیں۔" (68)

ملتان برتن سازی اور اب ٹائل سازی میں بھی سر فہرست ہے۔مٹی کے برتن تیار کرنے والی بہت سی بھٹیاں ملتان شہر میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔مٹی کے برتنوں کی تیاری نے یہاں ہزاروں لوگوں کو روزگار مہیا

کر رکھا ہے۔ مٹی کے برتنوں اور ڈیکوریشن پیس ایسے نادر ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لباس میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ فنِ تعمیر میں بھی ماہر ہیں۔

بقول بشیر محمود:

> "ملتان فنِ تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت پکی اینٹوں کا خوب صورت استعمال ہے۔ یہ سرخ چپٹی اور ریتلی اینٹیں بالکل ویسی ہی ہیں جیسی اس سے پہلے رومیوں نے استعمال کی تھیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ملتان کی اکثر عمارتیں گہرے اور ہلکے نیلے رنگوں کی چمک دار ٹائلوں سے مزین نظر آتی ہیں۔ اسی طرح دیواروں میں لکڑی کا استعمال بھی ملتانی تعمیر کا خاصا رہا ہے۔ جس طرح دیواروں میں لکڑی کے کھڑے شہتیرا استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ دروازے کھڑکیاں اور جھروکے بھی لکڑی کے بنے ہیں۔ جن پر خوب صورت کام کیا گیا ہے۔"(69)

صادق آباد پنجاب اور سندھ کے سنگم پر واقع ہے۔ صادق آباد سے بھارت کی سرحد 20 میل کے فاصلے پر ہے۔ قصبہ بھونگ جس کو بھونگ مسجد نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اس مسجد کی تعمیر 60 سال مسلسل ہوتی رہی۔ غازی صاحب نے اٹلی، آسٹریا، ہنگری اور دوسرے مختلف ممالک سے سنگِ مر مر، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ اور سنگِ سرمئی منگوایا۔ اس وقت صادق آباد بھونگ تک کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ تمام سامان اونٹوں اور خچروں پر لاد کر جایا جاتا۔

اور یوں اس مسجد کی تعمیر کے دوران کاریگروں اور ہُنر مندوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ہزاروں تک پہنچ گئی۔ فنِ تعمیر میں یہاں کے لوگ خاصے ماہر ہیں اور بہت سے لوگوں کا یہی پیشہ ہے۔ ہڑپا ساہیوال سے 30 کلو میٹر کے فاصلے پر آباد شہر ہے۔ یہاں پر کئی صنعتیں عروج پر ہیں۔ ساہیوال بھی صنعتی علاقہ بن گیا ہے۔ آٹا پیسنے، چمڑا رنگنے، قالین بانی اور کپڑا بنانے کی صنعتیں روزگار کا ذریعہ ہیں۔ یہاں کے لوگ ان صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ لوگ ہڑپا میں چوڑیاں بنانے کا کام کرتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی ساہیوال کا ذکر اپنے سفر نامے "مناظرِ پاکستان" میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شہر میں آٹا پیسنے، چمڑا رنگنے، قالین بانی اور کپڑا بنانے کی صنعتیں عروج پر ہیں۔"(70)

مری، پنجاب کا آب و ہوا کے لحاظ سے سب سے خوش گوار علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا روز گار یہ کہ وہ گھروں کو ایک سال کے لیے کرائے پر چڑھا دیتے ہیں اور یوں وہ کافی پیسہ لے لیتے ہیں۔ ہوٹلوں اور گاڑیوں والوں کو بھی خاصا منافع ملتا ہے۔ مری کے بازار جہاں لوگ وہاں کا ثقافتی سامان شوق سے خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ وادی میں کاشت کاری بھی ہوتی ہے۔ مویشی چرانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ لوگ محنت کش ہیں۔ پہاڑوں پر رہتے ہیں محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے ہیں۔ وادی سون سیکسر کلر کہار سے ایک طرف چکوال اور دوسری طرف وادی سون جانے کا راستہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا روز گار کھیتی باڑی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں معدنی ذخائر بھی ہیں۔ جپسم، کوئلہ، شیشہ وغیرہ۔ کے وسیع ذخائر ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔

ماجد فرید ساٹی "مناظرِ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

"پہاڑوں کے نیچے دامن میں مقامی لوگ کھیتی باڑی کرتے نظر آتے ہیں۔"(71)

تقریباً پورے پنجاب میں کھیتی باڑی عام روز گار ہے۔ شہروں میں البتہ لوگ ملازمتِ پیشہ، کاروبار، دکانیں، کارخانے وغیرہ مختلف طرز کے کاموں میں سرگرم عمل ہیں۔

گجر قوم جس نے گجرات بسایا۔ گجرانوالہ اور گوجر خان بھی انہی کی علامت ہیں۔ پنجاب میں یہ گجر ابھی بھی پہاڑوں میں ملتے ہیں۔ ان گجروں کا کام گائے، بھینسیں پالنا اور دودھ مکھن بیچنا ہے۔

بلراج ساہنی سفر نامہ "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں بیان کرتے ہیں:

"گجر قوم نے گجرات بسایا۔ پنجاب میں گجرات، گجرانوالہ، گجر خان وغیرہ شہر بھی اسی قوم کے نشانات ہیں۔ پنجاب میں گجر لوگ پہاڑوں میں ابھی تک ملتے ہیں۔ ان کا کام گائے، بھینسیں پالنا اور دودھ، مکھن بیچنا ہے۔"(72)

جھنگ کے لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ بسوں میں سفر کرتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بسوں میں آتے جاتے ہیں۔ فیصل آباد جو کہ کبھی لائل پور کہلاتا تھا، کپڑے کی 50 کے لگ بھگ ملیں جہاں کپڑا بنتا ہے اور یہ کپڑا صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ بہت سا کپڑا باہر کے ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ کوہِ نور ان میں سب سے بڑی مل ہے۔ جس میں دس ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ یوں ان چٹ پٹ کاموں سے لوگوں کا روز گار جڑا ہوا ہے۔

بلراج ساہنی سفر نامہ "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں لکھتے ہیں:

"مسافروں میں اکثریت کسانوں کی تھی جو ہر سٹاپ پر اترتے، چڑھتے، دھیرے دھیرے جھنگ کی سریلی بولی سنائی دینے لگی۔"(73)

قدیم قلعہ نندنا البیرونی نے اسے دُنیا کا مرکز قرار دیا ہے۔ یہاں قدرتی چشموں کے کنارے کئی تہذیبوں نے جنم لیا۔ اس خطے میں کلر کہار، شری راج کٹاس چوا، سیلے شاہ کھیوڑہ، پنڈ داد نخاں دھریا جالب، جلال پور شریف، گرجاگھر روال کے علاوہ یہاں نندنا جیسی پرانی تہذیبیں ہیں۔ نندنا یہ دُنیا کا قدیم ترین قلعہ تھا کسی زمانے میں اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ پنجاب کا دارلحکومت بھی رہا ہے۔ صدیوں سے ٹھنڈے میٹھے پانی کے تین اُبلتے چشموں کی وجہ سے اس علاقے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ باغا تو الہ میں چشمے کا پانی بڑی تیزی سے بہتا ہے۔ اس چشمے کے پانی پر لوگوں نے جگہ جگہ غسل خانے بنا رکھے ہیں۔ زرعی مقاصد کے لیے لوگوں کو 200 روپے فی گھنٹہ پانی بھرنا پڑتا ہے۔

بقول ایم زمان کھوکھر:

"زرعی مقاصد کے لیے چشمے کے مالکان 200 روپے فی گھنٹہ کے حساب سے پانی فروخت کرتے ہیں۔"(74)

یہاں جو اثر رسوخ والے لوگ ہیں، اُنھوں نے پانی پر قبضہ کر کے اس کو بیچنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں کسان تین گھنٹہ پانی لے کر زمینوں کو سراب کرتا ہے۔

شیخوپورہ ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر طویل و عریض ضلع ہے۔ یہ شہر مختلف قبیلوں کا ایک گل دستہ ہے۔ جس میں پھول اور کانٹے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین بہت زرخیز ہے۔ یہاں کے بیش تر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔ کسان کاشت کاری کے لیے اپنے روایتی طریقے استعمال کرتے ہیں۔

بقول خالد پرویز ملک:

"زراعت کے پیشے سے وابستہ کاشت کاری کے لیے روایتی طریقے استعمال کرتے تھے۔ کسان منہ اندھیرے بیلوں کی جوڑی لے کر بغیر ناشتہ کیے کھیتوں میں ہل چلانے نکل جاتا ہے۔ تاکہ دھوپ تیز ہونے سے پہلے کام ختم کر لے۔"(75)

دیہاتوں میں معاشی حالات ہمیشہ سے ابتر رہے ہیں ، لوگ بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ دیہات کے مردوں نے اپنی عورتوں کو زندگی کی سبھی ضرورتوں سے محروم کرر کھا ہے۔ سارا دن محنت مزدوری کر کے شام کو مردوں کا بچا کچھا کھانا کھا کر پیٹ کا دوزخ بھرتی ہیں۔ دیہاتی عورتیں محنت مزدوری بھی کرتی ہیں۔ سلائی، کڑھائی، قالین سازی کی کھڈیوں پر بیٹھی ہیں۔ کھیس وغیرہ بُن کر شہر لا کر بیچ دیتی ہیں۔ جس کا معاوضہ ان کی محنت کا ایک تہائی بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب لوگ شہروں کی طرف زیادہ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ پنجاب کے تین تہائی لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ بھاول پور کو ہی دیکھ لیجیے۔ یہاں کی 77 فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے۔ سبھی لوگ تقریباً زراعت کے پیشے سے جڑے ہوئے ہیں اور لوگ کسی اور پیشے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

بقول ملک محمد الدین:

> "3 چوتھائی سے زیادہ لوگ (77 فیصد) کا روزگار زراعت سے وابستہ ہے اور کوئی بھی دوسرا پیشہ خصوصی اہمیت کا حامل نہیں۔"(76)

لاہور پنجاب کا دل ہے۔ جہاں لوگوں کے شغل میلے دیکھتے ہوئے بھی کئی روزگار وجود میں آئے ہیں۔ جیسے دریائے وادی میں کشتی رانی کرنا۔ لاہور میں پنجاب کے ہر شہر میں مارچ تک سردی رہتی ہے۔ اپریل سے موسم گرم ہونے لگتا ہے۔ کشی رانی کی ابتدا انیسویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ہوئی تھی۔

بقول کیمی پوا:

> "ایک اور مقبول مشغلہ دریائے راوی میں کشتی رانی ہے۔ یہی دریا بل کھاتا ہوا میلوں دور چلا جاتا ہے۔ دریا میں جگہ جگہ کشتیاں بھی رکھی ہوئی ہیں۔"(77)

کشتی رانی کے سبھی اچھے خاصے پیشے ہیں۔ یوں یہ مشغلہ باقاعدہ پیشے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور میں ہر سال "ہارس شو" ہوتا ہے۔ اس پہ بھی سرمایہ کار لاکھوں کماتے ہیں۔ منگلا ڈیم یہ علاقہ بھی بہت زرخیز ہے۔ یہاں بیش تر کسان رہتے تھے۔ جن کے پاس گائیں، بھینسیں، بیل اپنی زمین تھی۔ انھیں اپنی جگہ سے ہٹانا آسان نہیں تھا۔ سبزیاں، مرغیاں، پھل، اُگائے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ زراعت پیشہ ہونے کی وجہ سے اپنی زمینوں سے کسی نہ کسی صورت وابستگی رکھتے ہیں۔

کیمی پوا لکھتی ہیں:

"منگلا کے پرانے اور نئے لوگ اب مطمئن ہیں۔ پچیس ایکٹر میں پھیلے ہوئے نام سے انھیں سبزیاں، مرغیاں اور انڈوں کے علاوہ پھول بھی ملتے ہیں۔ جو پاکستانیوں کو بہت بھاتے ہیں۔"(78)

راولپنڈی ایک بڑا اور صنعتی شہر ہے۔ پنجاب کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں صنعتیں فیکٹریاں سب موجود ہیں۔ صنعتیں چھوٹی بڑی فیکٹریاں یہاں بکثرت ہیں۔ کپڑے کے کارخانے، ٹوکریاں، لکڑی کا کام، سوٹ کیس اور خوب صورت کشیدہ کاری کی شاخیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ بوہڑ بازار دوائیوں کا مرکز ہے۔ منڈی میں طرح طرح کی منفرد اور مناسب چیزیں مل جاتی ہیں۔

کیمی پوا نے اس سفر نامے میں بڑی تفصیل سے پاکستان کے تمام علاقوں کی سیاحت کا بڑا عمیق جائزہ لیا اور اپنے سفر نامے کو ایسا وجدان عطا کیا ہے جو معلومات کا خزانہ ہے۔

vi. لباس:

ثقافتی عوامل کے عناصر میں سے ہی ایک عنصر لباس بھی ہے جو کسی علاقے کی روایات، تہذیب اور ثقافت کو بیان کرنے کا موجب بنے ہیں۔ اس ثقافتی جائزے کو زبان دینے والے تاریخ دان اور اُردو سفر نامہ نگار ہیں۔ جنھوں نے نہایت باریک بینی سے کام لے کر ادب کو گہنا دیا ہے۔ لباس کے تعین میں سب سے زیادہ آب و ہوا اثر انداز ہوتی ہے۔ کیوں کہ جیسی آب و ہوا ہوتی ہے ویسا ہی لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ ثقافت کسی بھی علاقے کی ہو خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ وہ اس علاقے کی انفرادیت کو پیش کرتی ہے۔ پہلے شہروں کو بھی وہ سہولتیں حاصل نہ تھیں جو کہ اب دیہاتوں کو حاصل ہیں۔ عام طور پر دیہاتیوں کا لباس تہہ بند، کُرتا، پگڑی تھا، اسے صوبائی لباس کہتے ہیں۔ بعض بزرگ حضرات کاندھے پر صافہ بھی رکھتے تھے۔ جہاں کہیں زمین پر بیٹھنا پڑ جاتا تو گوٹھ مار کر اس کو گھٹنوں کے ارد گرد لپیٹ لیتے۔ جس سے تھکاوٹ نہ ہوتی۔ پگڑی باندھتے تھے۔ جس کا شملہ اونچا رہے۔ غریب لوگ ننگے بدن پھرتے تھے۔ پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں کرتے اور جوتے پہننے کی عادت نہیں رہی تھی۔ اگر کرتہ مل جاتا تو اسے لپیٹ کر بغل میں دَبا لیتے۔ یہی حال جوتوں کا بھی کرتے تھے۔ پہلے دھوتی کا رواج تھا۔ اب تو لوگ شلوار پہنتے ہیں۔ دھوتی کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اب تو لوگ پتلون پہنتے ہیں لڑکیاں بھی پتلون پہننے لگی ہیں۔ آہستہ آہستہ پردہ

رخصت ہوتا جارہا ہے۔ جوتیاں پہلے دیسی موچی سے بنوائی جاتیں تھیں۔ امیر لوگ زری والا کھوسہ پہنا کرتے تھے۔ سردیوں میں غریب لوگ سویٹر یا کوٹ لینے کی اسطاعت نہ ہونے کی وجہ سے بڑے کھیس یا چادر اوڑھ کر گزارہ کرتے تھے۔ بچے سردی سے بچنے کے لیے دو دو تین کرتے پہن لیتے تھے۔ لباس زیب تن کرتے تھے۔ عورتیں سوت کے کپڑے اپنے ہاتھ سے کات کر جولاہے سے بنواتی تھیں۔ اس کے علاوہ لحاف اور تلائیاں بھی عورتیں بناتی تھیں۔ غرض یہ کہ دیہاتوں کی زندگی خاصی دشوار گزار تھیں اور عورتوں کو بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔

> "لباس بھی اگرچہ ایک جیسا ہی ہوتا تھا لیکن استعمال میں بہت فرق تھا۔ تہہ بند، کرتا، پگڑی عام لباس ہوتا تھا۔ بعض بزرگ ایک کندھے پر صافہ بھی رکھتے تھے۔ جہاں کہیں زمین پر بیٹھنے کی نوبت آتی تو گوٹھ مار کر اس کو گھٹنوں کے اردگرد لپیٹ لیتے جس سے تھکاوٹ نہ ہوتی۔ پگڑی دیہاتی ثقافت کا خاص نشان ہوتی تھی۔ اس کے باندھنے کے بھی بہت سے طریقے تھے۔"(79)

پورے پنجاب کا کلچر ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے کے لوگوں سے جو فرق نظر آتا ہے وہ حالات کے برعکس ہے۔ خوش حال اور بد حال لوگوں کے معیار زندگی میں واضح فرق نظر آتا ہے۔

ساہیوال اور ملتان کے درمیانی تاریخی شہر ہڑپہ کی مثال لیجیے۔ یہ شہر لاہور سے ایک سو اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں کے لوگ پگڑیاں باندھتے ہیں۔ جیسے ان کے آباؤ اجداد چار ہزار سال سے باندھتے آ رہے ہیں۔ یہ عام اور سادہ لباس زیبِ تن کرتے ہیں۔ تہہ بند باندھتے ہیں لمبا کرتا پہنتے ہیں اور کمر کے گرد چادر لپیٹ لیتے ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہڑپہ کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تہذیب کے اندر نیک دل دھڑکتے ہیں۔ یہاں کا پر سکون ماحول ہے۔

سیاح کیمی پوا اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

> "ان لوگوں کا لباس کمر کے گرد لپٹی ہوئی چادر اور لمبا کرتا ہے۔"(80)

ٹیکسلا کے لوگ بھی زراعت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ یہاں کا لباس بھی بقیہ پنجاب جیسا ہی ہے۔ تہہ بند، کرتا اور پگڑی دیہات کا ثقافتی لباس ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ لوح اور محبت سے پیش آنے والے لوگ ہیں۔

کیمی پوا ان لوگوں کے متعلق لکھتی ہیں:

"راستے کے ساتھ ہرے بھرے کھیت ہیں۔ دہقانی کپڑوں میں ملبوس گاؤں کے لوگ شرماتے ہوئے آنے والوں کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جن سے دوستی جھلکتی ہے۔"[81]

ملتان پر نظر ڈالیں تو ملتان ایک قدیم اور زندہ شہر ہے۔ اس کا ذکر یونانی لٹریچر میں بھی ملتا ہے۔ ملتان ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں ہر چیز کے کاریگر، ماہر حضرات موجود ہیں۔ یہاں بہترین کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ بہترین کپڑا تیار کرنے کے ماہرین موجود ہیں۔ جو موتیوں سے مزین لباس ایسے تیار کرتے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ گاؤں، دیہاتوں میں تو سادہ لباس زیبِ تن کیا جاتا ہے۔ البتہ شہروں میں زرق برق اور کام دار کپڑوں کا بھی رواج ہے۔ یہاں کے خوب صورت جوتے ان کارخانوں کی سوغات ہیں۔ ملتانی کُھسہ لوگ بے حد پسند کرتے ہیں۔ دوسرے شہروں میں ملتان کے ثقافتی عناصر بہت شہرت رکھتے ہیں:

"ملتانی کُھسہ بڑے ذوق و شوق سے استعمال کیا جاتا ہے۔ خواتین کے لیے زرق برق لباس بھی ماہرین تیار کرتے ہیں۔ جو موتیوں سے مزین ہوتے ہیں اور ان کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔"[82]

اب شہر لاہور کی طرف چلتے ہیں۔ لاہور والے "زندہ دلان پنجاب" کہلاتے ہیں۔ اس بیان میں کسی صورت شک نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ خطاب اپنے وقت کے سب سے بڑے "زندہ دل" سر سید احمد خان کا دیا ہوا ہے۔ لاہور شہر میں ہر طرح کا لباس پہنا جاتا ہے۔ مرد کیا عورتیں بھی آزاد منش ہیں۔ ہر قسم کا فیشن لاہور شہر سے نکلتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہاں خواتین پیرا شوٹوں کے سلک کے لباس بنوا کر زیب تن کرتی تھیں۔ ہر دور میں لاہور کے لوگوں کا لباس منفرد طرز کا حامل ہوتا تھا۔ دیہاتوں کا لباس تو یہاں بھی وہی لمبا کرتا، تہہ بند اور پگڑی تھا مگر شہروں میں پتلون، شرٹ اور نفیس شلوار قمیض کا رواج عام تھا۔

مستنصر حسین تاڑر اپنے سفر نامے "لاہور آوارگی" میں لاہور کی فیشن ایبل اور جدید خواتین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لاہور کی فیشن ایبل اور جدید خواتین جن میں میری چھوٹی خالہ بھی شامل تھیں ان کلیوں کے ٹانکے ادھیڑ کر خالص سِلک کے اپنے پیراہن سلواتیں

اور یہ تب لاہور کی سب سے بڑی فیشن سٹیٹ منٹ تھی کہ فلاں لڑکی نے کلیوں کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی۔ان پیراشوٹوں کو کلیاں غالباً اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کا رنگ موتیوں کے پھولوں ایسا ہوتا تھا تو یہ موتیے کی کلیاں تھیں۔"(83)

لاہور چوں کہ ایک مشہور شہر ہے۔قدیم دور میں بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔یہاں پر ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں۔اگر ہم یہاں کے لباس پر بات کریں تو یہاں شہری اور دیہاتی دونوں طرح کے لباس پہنے لوگ نظر آئیں گے۔دیہاتوں میں لوگ دھوتی باندھتے ہیں اور بعض لوگ تو دھوتی رات کو بھی باندھ کر سوتے ہیں۔یہ سادہ اور آرام دہ لباس ہے۔کرتا اور لُنگی صافہ دیہاتیوں کا لباس ہے۔پگڑی بھی کچھ دیہاتوں میں لازمی باندھی جاتی ہے۔شہروں میں پڑھا لکھا طبقہ زیادہ ہے اور جو نہیں بھی پڑھے لکھے ہیں وہ پڑھے لکھوں کی پیروی ضرور کرتے ہیں۔پڑھے لکھے اپنا قومی لباس قمیض،شلوار شوق سے پہنتے ہیں۔ان پڑھ تو اسی لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔پڑھا لکھا وہ طبقہ جو ملازمت پیشہ ہیں وہ تو پتلون بوشٹ کو فوقیت دیتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا سفر نامہ "ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور" ثقافتی عناصر پر مبنی ہے۔اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے لاہور کی ثقافت پر روشنی ڈالی ہے۔لباس کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

"میں نے یہاں لوگوں کو ملکی اور غیر ملکی دونوں لباسوں میں ملبوس دیکھا ہے۔مجھے معلوم ہوا کہ جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ غیر ملکی لباس پہنتے ہیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ اپنے ملک کے لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔دوسرے طبقے کے لوگوں میں دھوتی ایک بہت مقبول لباس ہے۔یہ ان سلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے۔جسے لوگ اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے ہیں۔کئی لوگ رات کو سوتے وقت بھی دھوتی باندھ کر سوتے ہیں۔"(84)

لوگوں کا یہ حال ہے دیہاتوں میں کوئی مہمان آجائے تو اسے بھی دھوتی دیتے ہیں۔رات کو باندھنے کے لیے یہ بھی نہیں سوچتے کہ اسے باندھنا بھی آتی ہے یا نہیں دیہاتوں میں لوگ سادہ ہیں اور سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

لاہور کے باسی اپنے شہر سے بہت محبت کرتے ہیں ساری دُنیا گھوم آئیں دوسرے ممالک کی خوب صورتی سے متاثر بھی ہوتے ہیں لیکن جہاں بھی جائیں آخر میں یہ ضرور کہتے ہیں کہ مشرق ہو یا مغرب لاہور،

لاہور ہے۔ پنجاب کے نوجوان شلوار قمیض پہنے پاکستان کے کونے کونے میں پھرتے ہیں۔ انگریزی لباس پہنے مردوں کے ساتھ ساڑھی پہنے عورتیں پھرتی نظر آتی ہیں۔ گلی محلوں میں رہنے والی لڑکیاں پردہ نشین بن جاتی ہیں۔

کیمی پوا لکھتی ہیں:

"آپ پنجاب کے جوانوں، سیاحوں اور پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگوں کو شلوار قمیض پہنے دیکھ سکتے ہیں۔"(85)

لاہور کا ماحول ثقافتی ہے اور پاکستان میں کوئی دوسرا ضلع ایسا نہیں ہے۔ منگلا ڈیم کی طرف چلیں یہاں عورتوں کو کشیدہ کاری سکھائی جاتی ہے اور مال بھی مہیا کیا جاتا ہے تاکہ وہ کشیدہ کاری کر کے بہترین لباس تیار کر سکیں۔ یہاں کشیدہ کاری کی ہوئی ساڑھیاں بچوں کے خوب صورت کپڑے اور ہاتھ کی بنی ہوئی خوب صورت چیزیں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے اگست 2003ء میں ترکی سے اپنی بیوی ثمینہ اور بیٹی کے ہمراہ پاکستان کا سفر اختیار کیا۔ دوماہ کے قیام میں اُنھوں نے لاہور، کراچی، کلر کہار، مری، ایبٹ آباد، شوگران، وادی کاغان اور ناران کی سیاحت کی اور یہاں کی ثقافت، تہذیب وتمدن، مذہب، سیاست، تاریخ اور جغرافیے کو دیکھا اور اپنے سفر نامے میں شامل کیا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے اہم شخصیات سے ملاقاتوں کو بھی اپنے سفر نامے "پیارا ملک ہے پاکستان" میں شامل کیا۔ انھیں لاہور کو دیکھ کر دلی وابستگی محسوس ہوئی۔ یہاں کی گلیاں، لباس، سڑکیں، لاہور کے باشندے، ان کا طرزِ زندگی انھیں ہر چیز اپنے شہر استنبول جیسی لگی۔ انھیں لاہور میں اپنے شہر استنبول کے ایک علاقے "زیتون بورنو" کی تصویر نظر آتی ہے۔ یہاں کا قمیض شلوار لباس انھیں بہت اچھا لگتا ہے۔ خلیل طوق اُر لکھتے ہیں:

"لاہور کی سڑکیں، چوک، گلیاں، ملے ہوئے گھر، رنگ برنگی شلوار قمیض پہنے ہوئے لاہور کے باشندے ایسا لگتا تھا کہ جیسے فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے پتہ نہیں کیوں میرے دل میں اس شہر سے ایک عجیب سارشتہ اور محبت ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ شہر مجھے استنبول کے ایک علاقے زیتون بورنو کی یاد دلاتا ہے۔"(86)

پنجاب کا شہر بھکر جہاں اب دریائے سندھ نہیں بہتا وہ دور چلا گیا ہے۔پہلے بھکر شہر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ آباد تھا۔ مگر اب دریا نے اپنے بہنے کا رخ بدل لیا ہے۔ یہاں کے لوگ سیدھے سادے ہیں۔لباس لمبے لمبے کپڑے پہنتے ہیں۔ سروں پر پگڑیاں باندھتے ہیں۔ پرانا معاشرہ ہے پرانے لوگ ہیں۔

سفر نامہ نگار رضا علی عابدی اپنے سفر نامے "شیر دریا" میں بھکر شہر کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " بالکل سیدھے سادے ہیں لمبے لمبے کپڑے پہنتے ہیں۔ پگڑیاں باندھتے ہیں۔ جیسے لوگ ہیں ویسی ہی گفتگو ہے۔ "(87)

بھیرہ پنجاب کا ایک قدیم علاقہ ہے۔ یہاں پہلے کچھ ہندو بھی آباد تھے۔جب تقسیم ہوئی اس وقت یہاں ہندو کافی تعداد میں آباد تھے۔کچھ ہندو ابھی بھی آباد ہیں۔باقی ہندوستان چلے گئے۔یہاں کے لوگ سادے اور سادگی پسند ہیں۔ یہاں کے لوگ کُھسہ ، دھوتی۔ تہہ بند ، کرتا اور پگڑی پہنتے ہیں۔اس کے علاوہ پتلون ، کوٹ ، شرٹیں بھی پہنی جاتی ہیں۔ٹیلی ویژن اور تعلیمی شعور نے ان علاقوں کی حالت زار کافی حد تک سدھار دی ہے۔

بلراج ساہنی جنھوں نے اپنا سفر نامہ "میر اپاکستانی سفر نامہ " کے عنوان سے تحریر کیا۔جس میں اُنھوں نے اپنے آبائی علاقے کا سفر کیا۔اس دوران اس پر کیا گزری اس یادداشت کو اس نے مفصل بیان کیا ہے۔بلراج ساہنی رقم طراز ہیں:

> " ڈاکٹر نذیر کے پاؤں میں دیہاتیوں والا کُھسہ ہے۔کورے سے رنگ کی پاپلین کی پتلون ، خاکی ٹویل کا کوٹ ،سادہ سی ٹائی ، مطلب یہ کہ لباس میں سادگی کا اور نہ ہی امارات کا کوئی خصوصی اظہار ہے۔ "(88)

یہاں کی عورتیں اپنے گورے رنگ کی وجہ سے ساڑھی پہن لیتی ہیں۔ یہاں لوگوں کے متناسب قد بھورے بھورے بالوں کی لمبی چٹیا میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ فن کشیدہ کاری میں ماہر ہیں۔لباس، چادریں اسی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

بلراج ساہنی سفر نامہ "میر اپاکستانی سفر نامہ "میں لکھتے ہیں:

> " مجھے جھنگ کے علاقہ میں کچھ ایسی عورتیں نظر آئیں جن کا لباس ہو بہو کاٹھیاواڑی عورتوں والا تھا۔ سرخ لال رنگ کی شیشے جڑی چولیاں ان

کے ساتھ میل کھاتی چنیاں اور گھکھرے یہاں ان لوگوں کو پست ذات سمجھا
جاتا تھا لیکن کاٹھیاواڑ میں یہ لوگوں میں ایسے گھل مل جاتے تھے کہ انھیں
پہچاننا مشکل تھا۔ تقسیم کے بعد کچھ تو یہاں ہی مسلمان ہو گئے اور کچھ دہلی
لکھنو کی طرف نکل گئے۔ یہاں کے لوگ ٹھیٹھ پنجابی تھے۔"(89)

دراصل ہند و اور مسلمان ہزار سال سے اکٹھے تھے ، ان کا رہن سہن تقریباً ایک جیسا تھا۔ وضع قطع بھی ایک جیسی تھی ،اس لیے ان کی شناخت مشکل ہوتی تھی۔

ٹھیٹھ لباس تو وہی تہہ بند کرتا ہے جو پورے پنجاب کا ہے۔ بلراج ساہنی اپنے سفر نامے "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں لکھتے ہیں:

"جس کا لباس بھی پینڈو (دیہاتی) اور بولی بھی ٹھیٹھ تھی۔"(90)

جھنگ کے لوگ اپنے پنجابی کلچر کے مطابق لباس زیب تن کرتے تھے۔ ان کا لباس پینڈو تھا ، ان کی بولی ٹھیٹھ پنجابی تھی۔ جھنگ کا کلچر ایسا تھا جس کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ٹھیٹھ پنجابی ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کالی تہہ بند دار ٹوپی ، سرمئی رنگ کی اچکن اور سفید شلوار ، کندھے پر
بندوق رکھے ، سائیکل پر سوار ہو کر بندوق ٹھیک کرانے جایا کرتے
تھے۔"(91)

پنجاب کا شہر چنیوٹ جہاں دریائے چناب گزرتا ہے۔ یہاں گرمی بھی شدت کی پڑتی ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ لباس زیب تن کرتے ہیں۔ پورے پنجاب کا کلچر ہے دھوتی اور کرتا۔ یہ لباس ہر دیہات میں عام ہے۔ چاہے وہ لاہور ہو یا بھیرہ گجرات ہو یا گوجرانوالہ سب گاؤں ایک جیسا سادہ اور عام لباس پہنتے ہیں۔

بقول محمد داؤد طاہر:

"منظور حسین نے شدید گرمی کے باعث قمیض اور بنیان اتار رکھی تھی اور
ڈھیلی ڈھالی دھوتی میں ملبوس تھے۔ معلوم ہوا کہ بہت دنوں سے صاحبِ
فراش ہیں۔ لیکن اس کے باجود اُنھوں نے چارپائی سے اُٹھ کر ہمارا استقبال
کیا۔"(92)

ٹیکسلا، گندھارا تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جس کے نشانات اس علاقے کے چپے چپے پر بکھرے پڑے ہیں۔ آریاؤں کی آمد کے راستے افغانستان اور پاکستان کے درمیان واقع پہاڑی درے تھے۔ آریا اپنے دور کے انتہائی ترقی یافتہ لوگ تھے۔ روئی سے کپڑے بننا، رنگ بھرے لباس پہننا ان کا وطیرہ تھا۔ سونے اور لوہے کا استعمال بھی انھیں آتا تھا۔

نقش بنا کر گاؤں تعمیر کرنا۔ قلعے تعمیر کرنا، لکھنا پڑھنا، بیماریوں کا علاج ان کے خاص فنون تھے۔ اسی تہذیب کا اثر آج بھی ٹیکسلا میں نظر آتا ہے۔ یہاں کے لوگ رنگ برنگے لباس اور خوب صورت زیوارت تیار کرنے کا ذوق اور شوق دونوں رکھتے ہیں۔ ٹیکسلا کے بازاروں میں بہترین لباس نظر آتے ہیں۔

ریاست بہاول پور پنجاب کا آخری شہر یہاں سے 100 میل کے فاصلے پر بہاول نگر واقع ہے۔ صادق آباد، رحیم یار خان پنجاب کی آخری سرحد ہے۔ بہاول پور سے ایک طرف چولستان، تھرپار کر ہے۔ یہاں ہندو بھی آباد ہیں۔ شہروں میں مسلمان سر پر خاسا یا ململ سے بنا ہوا ایک پٹکا پہنتے ہیں۔ اس کی لمبائی 15 سے 20 گز لمبی ہوتی ہے۔ پگڑیاں دو تھانوں یا 40 گز لمبے کپڑے کی ہوتی ہیں۔ پگڑی کو خوب بل دیئے جاتے ہیں۔ یہ فیشن ایبل سرپوش ہے۔ جس کا شملہ بہت اونچا ہوتا ہے۔ چاہے گرمی ہو سردی یہ پگڑی ایک خاص انداز میں باندھی جاتی ہے۔ خان پور اور صادق آباد کے علاقوں میں بہت سے مسلمان "چاچڑاں والی ٹوپی" پہنتے ہیں۔ دیہاتوں میں مسلمان ایک بل دی ہوئی پگڑی اور چاچڑانی جیسی سوتی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ دیہاتی لوگ انگرکھا پہنتے ہیں۔ شہروں میں مسلمان کرتا پہنتے ہیں اور عورتیں گھاگھرا، چولا، بوچھن یا دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔ بلوچ قبائل کی عورتیں شلوار پہنتی ہیں جب کہ ہندو عورتیں چولا، گھاگھرا اور بوچھن یا گھگرے کے ساتھ شلوار پہنتی ہیں۔ ان کا لباس مسلم عورتوں کی نسبت زیادہ قیمت کا ہوتا ہے۔ وہ زیوارات بھی کہیں زیادہ پہنتی ہیں۔

بقول ملک محمد الدین:

> "مسلمان عورتیں عموماً ایک گھاگھرا، ایک چولا اور بوچھن یا دوپٹہ لیتی ہیں۔ تاہم اُبھا میں مجھلا (کمر کے گرد باندھا ہوا کپڑا) اور چولی (چھوٹی سی انگیا جو چھاتی کو صرف سامنے ہی سے ڈھانپتی ہے) زیادہ عام ہیں۔ لما میں بلوچ قبائل کی عورتین سُتھن (شلوار) پہنتی ہیں۔"(93)

یہی لباس چولستان میں بھی پہنا جاتا ہے۔ صحرائے چولستان کے مرد سفید کرتا اور تہہ بند پہنتے ہیں۔ یہاں یہ لباس عام ہے۔ خواتین سفید سوتی بوچھن یا دوپٹہ پہنتی ہیں۔ خوش حال گھرانوں میں تنگ چولی

اور کم حیثیت گھرانوں کی کھلے چولے پہنتی ہیں۔ دونوں قسم کے چولوں کی آستیں تنگ ہوتی ہیں۔ تاکہ کام کرنے میں آسانی رہے۔ چولستان کی سب خواتین لٹھے یا چھینٹ کے گھاگھرے یا لہنگے پہنتی ہیں جو ایڑھیوں تک لمبے ہوتے ہیں۔

بقول احمد غزالی:

"پرانے زمانے میں کلیوں والا کڑتہ (کرتہ) پہننے کا رواج تھا۔ مگر اب سادہ سفید کرتا پہنا جاتا ہے۔ اسی طرح سفید "ڈیڑھا" یا تہہ بند پہننا عام ہے۔ خواتین سفید سوتی "بوچھن" یا دوپٹہ پہنتی ہیں۔ جو اس قدر لمبا ہوتا ہے کہ اس سے سر اور آدھا جسم بآسانی ڈھانپا جاسکتا ہے۔"(94)

چولستان کو مقامی طور پر روہی کا نام دیا گیا ہے۔ چولستان کی تہذیب کے ڈانڈے موہن جو داڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں کی خواتین محنتی جفاکش ہیں۔ دور دور سے گھڑوں کو سر پر رکھ کر پانی لاتی ہیں۔ لمبے لمبے گھاگھرے اور لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر پانی سروں پر رکھ کر تپتی دھوپ میں ان صحراؤں میں پانی بھرتی ہیں۔ مشکل ترین زندگی گزار رہی ہیں۔

سفر نامہ نگار ماجد فرید ساٹی نے اپنے سفر نامے "مناظر پاکستان" میں چولستان کے لوگوں کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے۔ ماجد فرید ساٹی لکھتے ہیں:

"اگر آپ کے پاس کیمرا ہے تو آپ ان خواتین کی تصویریں بھی اتار سکتے ہیں جو دور ٹیلوں کے پار رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ہاتھوں میں چوڑے پہنے لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر سروں پر مٹکے رکھے پانی بھرنے جاتی ہوئی نظر آئیں گی۔"(95)

یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ چولستان لفظ چولی سے نکلا ہے۔ جو عورتیں وہاں پر اپنے لہنگوں کے ساتھ پہنتی ہیں۔ یہ چولیاں مخصوص رنگوں میں بنائی جاتی ہیں۔ جس پر صحرائی ٹانکے سے کڑھائی کی جاتی ہے۔ انتہائی شوخ کے رنگ کے کپڑے زیب تن کرتی ہیں۔

"صحرا جتنا ویران اور مٹیالا نظر آتا ہے۔ یہاں کی خواتین اپنے لباس میں اتنے ہی تیز اور شوخ رنگ استعمال کرتی ہیں۔ تیز گلابی، بسنتی، اورنج اور طوطے

جیسا سبز رنگ چولستانی عورتوں کے پسندیدہ رنگ ہیں اور کم و بیش انہی رنگوں کے امتزاج سے کڑھائی کرتی ہیں۔" (96)

یہاں کی خواتین شوخ رنگوں میں ملبوس لمبے لمبے فراک یا لہنگے پہنتی ہیں۔ روزمرہ میں بھاری زیورات کا استعمال عام ہے۔ نتھ و نگاں (چوڑیاں) اور کٹ مالا (سات لڑیوں والا ہار) کا استعمال چولستانی روایت کا حصہ ہے۔

مری نتھیا گلی گرمیوں میں نہایت پُر فضا مقام ہے۔ یہاں کی آب و ہوا خوش گوار ہے۔ موسم سرما میں شدید سردی کی وجہ سے گرم کپڑوں، کوٹ اور گرم چادروں کا استعمال ہوتا ہے اور موسم گرما میں بھی بعض اوقات بارشوں کی وجہ سے گرم کپڑوں سویٹرز وغیرہ کا استعمال کرنا پڑ جاتا ہے۔ خصوصاً برسات کے موسم میں بارش سے ٹھنڈ کا احساس ہونے لگتا ہے اور گرم چادروں اور سویٹرز وغیرہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ یہاں ہر طبقے کے لوگ آتے ہیں جو مختلف لباسوں میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ شلوار، قمیض، پتلون، مغربی لباس زیبِ تن کیے لوگ نظر آتے ہیں۔

vii. پنجابیوں کا طرزِ زندگی / لوگوں کی خصوصیات:

پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ پنجاب آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے۔ رقبے کے لحاظ سے پنجاب تیسرے نمبر پر ہے۔ لوگوں کی زبان پنجابی ہے۔ پورے پنجاب میں مختلف لہجوں کے ساتھ پنجابی زبان بولی جاتی ہے۔ معمول کے رسم و رواج پورے پنجاب میں رائج ہیں۔ دیہاتوں میں اب بھی لوگ کام سے فارغ ہو کر اکھٹے مل بیٹھتے ہیں۔ کھیتی باڑی، شادی بیاہ اور دیگر قومی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ شادیاں بہت دھوم دھام سے کی جاتی ہیں۔ صوبہ میں مختلف شہروں میں کئی سالانہ میلے لگتے ہیں۔ جنھیں پنجاب کے لوگ بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ جگہ جگہ مویشی منڈیاں بھی لگتی ہیں۔

چولستان جسے چولستانی محبت و اپنائیت سے "روہی" کہتے ہیں۔ صحرا کی دھوپ سے ان کے چہروں پر سنولاہٹ کا سنہرا پن بکھرا ہوا ہے۔ سادہ لباس میں ملبوس یہ لوگ محنتی اور جفاکش ہیں۔

صوبہ پنجاب اپنی تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے ایک بہترین صوبہ ہے۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں۔ مذہبی تہوارات بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ شادی بیاہ کی رسوم سے لے کر موت تک کے واقعات کو مل جل کر نبھاتے ہیں۔ دیہاتوں کا ماحول بھی بدل رہا ہے اور

وہاں بھی شہروں کی طرح کے پکے مکانات بنتے جا رہے ہیں۔ دیہاتیوں کا لباس کرتا اور تہہ بند ہے۔ یہ پنجاب کا صوبائی لباس ہے۔ یہاں کے لوگ محنتی، جفاکش اور غیور ہیں۔

اُردو سفر نامہ نگاروں نے ہر خطے کی خصوصیات سے اَدب کو بہرہ ور ہونے کا شرف بخشا ہے۔ اُنھوں نے ہر خطے کا دورہ کیا۔ وہاں کے لوگوں کی معمولی سے معمولی عادات واطوار اور طرزِ رہائش کو اس طرح پیش کیا کہ وہ خزینہ اَدب کا حصہ بن گئے۔ ان ادبا نے اُردو سفر ناموں میں ایسے مسائل کو بھی بیان کیا جس سے لوگ نا آشنا تھے۔ اُنھوں نے ان خطوں کی بے مائیگی و بے حسی کی سچی تصاویر پیش کیں۔ ہمارے اُردو سفر نامہ نگار رضا علی عابدی، مستنصر حسین تارڑ، محمد داؤد طاہر، ماجد فرید ساٹی وغیرہ جیسے سفر نامہ نگاروں نے صوبہ پنجاب کی سیاحت کر کے اُردو اَدب کو پنجاب کی رنگا رنگ ثقافت سے روشناس کرانے میں اپنا مثبت کردار نبھایا ہے۔ بلراج ساہنی اور کیمی پوا جیسے غیر ملکی سیاحوں نے بھی اُردو سفر ناموں پر اپنے مثبت اثرات مرتب کیے۔ جیسے کیمی پوا نے پورے ملک کی سیاحت کی اور ہر صوبے ہر علاقے کی خصوصیات کو اُجاگر کیا۔

راولپنڈی شہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہاں کے لوگ اجنبیوں سے حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اجنبی ان سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہاں کا خوش گوار ماحول لوگوں کے حسن سلوک کی وجہ سے ہے۔

بقول کیمی پوا:

"اس شہر کے خوش گوار ماحول میں اجنبی جلد ہی مایوس ہو جاتے ہیں۔"

(97)

بلراج ساہنی ہندو ذات سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک اچھا انسان تھا۔ انسان دوست ہونے کے ساتھ ساتھ حساس طبیعت کا مالک تھا۔ تقسیم کے بعد اسے یہاں سے جانا پڑا۔ مگر اپنے علاقے سے دوری کا دُکھ، بچپن کی خوش گوار یادیں اسے بے چین کرتی تھیں اور پاکستان آنے پر اکساتی تھیں۔ اس کا گاؤں بھیرہ تھا۔ راولپنڈی میں رہائش پذیر تھا مگر پنجاب کے کونے کونے سے محبت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

بلراج ساہنی جھنگ جا کر ہیر کے مقبرے کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ جھنگ کا ماحول ہیر کی طرح خوب صورت تھا۔ یہاں کے لوگوں میں نین نقشہ کاٹھیاواڑ کے لوگوں جیسا تھا۔ یہاں کے لوگ ملنسار ہیں اور محبت سے پیش آتے ہیں۔

بلراج ساہنی سفر نامہ "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں رقم طراز ہیں:

"پروفیسر میرے نام سے بذریعہ فلمی رسائل واقف تھے۔ ایک دو نے میری فلم "ہم لوگ" دیکھ رکھی تھی۔ بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ کہنے لگے "ہیر کے مقبرے کی زیارت کرنے آپ ممبئ سے چل کر آئے ہیں۔ یہ جھنگ مگھیانے کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔"(98)

جھنگ، فیصل آباد سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ جھنگ مائی ہیر اور محنت کشوں کا شہر ہے۔ یہاں پنجاب کے پانچ پانیوں میں سے عشق کی سب سے زیادہ تاثیر رکھنے والا دریائے چناب اس کے اتنے قریب سے گزرتا ہے کہ اکثر چھلک جاتا ہے۔ دریائے چناب سے سوہنی کی لازوال داستان محبت بھی جڑی ہوئی ہے۔

محمد داؤد طاہر سفر نامہ "نئی منزلیں ہیں پکارتی" میں رقم طراز ہیں:

" محمود شام نے جھنگ کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں جو ماہ نامہ "رابطہ" کے مارچ 1986ء کے شمارہ میں شائع ہوا، لکھا ہے کہ مائی ہیر ا اور محنت کشوں کے شہر جھنگ کی اپنی ایک دُنیا ہے۔ جہاں دور دور تک اُونچے نیچے ٹیلے، شیشم کے بلند و بالا درخت پیپل اور برگد کے گھنے پیڑ، دریا کی چھوڑی ہوئی مٹی نہ جانے کتنی کہانیاں سناتی ہے۔"(99)

گاؤں، دیہاتوں میں مل جل کر رہنے کا رواج تھا۔ صوبہ پنجاب میں لوگوں کا رہن سہن بہت اچھا تھا۔ ہر گھر کے صحن میں ایک درخت ضرور ہوتا تھا۔ دوپہر کو لوگ ان کے نیچے چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ مرد دارے پر چلے جاتے تھے اور رات گئے گپ شپ لگاتے تھے۔ سردیوں میں آگ لگا کر الاؤ کے گرد سب جمع ہو جاتے تھے۔ حقے کا دور چلتا، سرکاری افسر بھی دارے پر بیٹھتے تھے۔ مہمان کی خدمت دارے کے مالک کے ذمے ہوتی تھی۔ برات بھی داررے کے زمے ہوتی تھی اور دارے پر ٹھہرائی جاتی تھی۔ سب مل جل کر رہنا پسند کرتے تھے۔ اب بھی دیہاتوں میں کافی جگہ ایسا ہی ماحول ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ تبدیلی آگئی ہے۔ مگر ضلع خوشاب، جہلم، بہاول پور وغیرہ میں اب بھی ایسا ماحول ہے۔ دیہات کی ایک لڑکی اگر دوسرے گاؤں میں بیاہی جائے تو اس کا شوہر سب کا داماد تصور ہوتا ہے۔ موت ہو جائے کسی گھر میں تو پورا گاؤں سوگ مناتا ہے۔ پنجاب کے یہ گاؤں احساس وضع داری کا نمونہ تھے۔

"دیہاتوں کی زندگی صاف ستھری اور پاکیزہ تھی۔ کھیتوں کی شادابی لوگوں کے شاداب چہروں کی عکاسی کرتی تھی۔"(100)

ڈیرہ غازی خان یہاں کے لوگ سادہ اور مذہبی ہیں۔ مذہبی ذہن کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ میڈیا، ٹی وی، وی سی آر نے ان لوگوں کو وقت کے ساتھ ساتھ قدرے ہوشیار بنا دیا ہے۔ مگر اب بھی ذہنیت مذہبی ہے۔ یہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ مل جل کر رہنا اس معاشرے کی فطرت ہے۔ صوبہ پنجاب کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ مہمان کی تواضع اچھی طرح کرتے ہیں۔

رضا علی عابدی سفر نامہ "شیر دریا" میں رقم طراز ہیں:

"تھوڑا سا وی سی آر کی وجہ سے لوگوں کے ذہن اس طرف چل نکلیں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں یہاں پر بہت ہی زیادہ اسلامی ذہن ہے۔"(101)

پنجاب کے لوگ پکے رنگ کے تنو مند جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ اخلاقی طور پر اچھے کردار کے مالک ہیں۔ مذہبی اعتبار سے سب مسلمان ہیں۔ البتہ ملتان، ڈیرہ غازی خان اور بہاول پور میں ہندو بھی رہتے ہیں۔ مگر اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ عیسائی بھی پاکستان کے ہر صوبے میں ہیں۔ جو مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ رہتے ہیں۔ لاہور میں سکھ بھی آباد ہیں جو اپنے مذہب کے مطابق آزادی سے عبادت کرتے ہیں۔ لوگ توہمات کا شکار ہیں۔ مزاروں کے چکر لگانا، منتیں وغیرہ ماننا، تعویز گنڈوں سے بیماریوں کا علاج کرانا یہ سب صوبہ پنجاب کے لوگوں کی عادات کا حصہ ہیں۔ مذہبی تہوار بہت دھوم دھام سے مناتے ہیں۔

بقول محمد اسلم مبتلا:

"عیدین کے موقع پر تکلف اور اہتمام کیے جاتے ہیں۔ عید میلاد النبی ﷺ جوش و خروش سے منائی جاتی ہے۔ محرم کے موقع پر سبیلیں لگائی جاتی ہیں۔ تعزیے نکالے جاتے ہیں۔ استاد اور شاگرد کے تعزیے ملک بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ بزرگانِ دین کے عرس جب منعقد ہوتے ہیں تو وہاں کھیل کود، خرید و فروخت، تفریحات بصورت تھیٹر وغیرہ سے لطف اندوزی عام ہے۔"(102)

ڈیرہ غازی خان، بھکر، میانوالی، چنیوٹ، سرگودھا، بہاول پور، سیالکوٹ، ملتان وغیرہ کے لوگ ایک جیسے طور طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ لاہور، گجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، جہلم، چکوال، ٹیکسلا وغیرہ میں یہاں

جاگیر داری سسٹم ہے یہاں کے دیہاتوں میں لوگ غلاموں کی سی زندگی جی رہے ہیں۔ محمود علی نے پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہی علاقوں کے بارے میں اپنے سفرنامے "دیکھا پاکستان" میں وہاں کے لوگوں کے طرزِ زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔ یوں تو اُنھوں نے اس سفرنامے میں ہر علاقے کی تاریخ و علمی و اَدبی داستانوں کو موضوع خاص بنایا۔ ساتھ ساتھ منظر کشی کو بھی فوقیت دی اور کہیں کہیں ثقافتی عوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ میانوالی کے لوگوں کی طرزِ زندگی کے متعلق لکھتے ہیں :

> "کاشت کار ، جاگیر دار کے مزارع ، دیہات کے مختلف دستکار ، موچی ، ترکھان ، لوہار سب ہی شامل تھے۔ کالی میٹالی جلدوں کو پھٹے پرانے کپڑوں سے ڈھکے ، بوڑھے ، بچے اور جوان کہیں کہیں کوئی عورت بھی یہ لوگ دسمبر کی سردی میں نیم عریاں بدنوں کے ساتھ آگے بڑھ کر آتے اور باری باری اپنے سردار کے گھٹنے چھو کر وفاداری کی رسم پوری کرتے۔"(103)

طرزِ زندگی / عمومی رہن سہن:

کسی بھی علاقے کے لوگوں کا عمومی رہن سہن ہی وہاں کی ثقافت کا پتا دیتا ہے۔ کیوں کہ رسوم و رواج ہی کسی قوم کی تہذیب، ثقافت اور معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں۔ رسوم و رواج ہی ایک خطے کو دوسرے خطے سے الگ شناخت کرانے میں، معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کسی بھی علاقے کی ثقافت کو جاننے کے لیے وہاں کے لوگوں کا عمومی رہن سہن کیا ہے ؟ جاننا بے حد ضروری ہے۔ لوگوں کا رویہ ، آپسی معاملات ، مہمان نوازی ، احساس و مروت یہ وہ اخلاقی خوبیاں ہیں جو کسی خطے کے باسیوں کی عادات اور رسوم و رواج کو اُجاگر کرتی ہیں۔ شادی بیاہ کی رسومات ، کھیل ، تفریحات واضح ہوتی ہیں۔ پیدائش ، مرگ کی رسومات کیا ہیں ؟ یہی وہ ثقافتی عناصر ہیں۔ جو ایک خطے کی ثقافت کو دوسرے خطے کی ثقافت سے جدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ یہ سہرا اُردو سفرنامہ نگاروں کے سر ہے۔ جن کی کاوشوں سے پاکستان کے تمام صوبے اپنی اپنی ممتاز ثقافت کے حوالے سے پہچانے گئے ہیں۔

viii. مہمان نوازی:

صوبہ پنجاب شیر دل لوگوں کا صوبہ ہے۔ مہمان نوازی ان کے خون میں رچی بسی ہے۔ مہمان کی خاطر مدارت میں کسی قسم کی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ دیہاتوں میں مہمان نوازی آج بھی اسی طرح سے کی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ نفسا نفسی کا دور ہے۔ مہمان اور میزان دونوں اکتاتے ہیں۔ شہروں میں زندگی مشینی ہے لوگ سارا دن کام کرتے ہیں۔ آدھی آدھی رات کام کرتے کرتے کمپیوٹر کے ساتھ گزر جاتی ہے۔ شہروں میں مہمان نوازی کا رجحان دیہاتوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

> "آج اس نفسا نفسی کے دور میں مہمان اور میزبان دونوں ایک دوسرے سے کتراتے ہیں۔ ہوٹلوں نے مشکل آسان کر دی ہے۔ مسافر یہ سمجھتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہیے کیوں کہ شہروں میں دیہاتوں کی طرح مہمان رکھنے کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔"(104)

دیہاتوں میں مہمان نوازی کا رُجحان بہت زیادہ ہے۔ دیہاتوں کے لوگ ملنسار محبت کرنے والے ہیں۔ دیہاتوں کی زندگی شہروں سے مختلف ہے۔ دیہات میں آدھی رات کو بھی مہمان آجائے تو وہ اسے خدا کی رحمت تصور کر کے اس کی خاطر داری کرتے ہیں۔ بلراج ساہنی نے اپنے سفر نامے "میرا پاکستانی سفر نامہ" میں بھیرہ کے لوگوں کی مہمان نوازی کو بیان کیا ہے۔ پنجاب کی اصل ثقافت یہی ہے مہمان کو پا کر اس کی دل و جان سے خدمت گزاری کرتے ہیں۔ بلراج ساہنی اپنے سفر نامے میں بھیرہ کے لوگوں کی مہمان نوازی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "آج صبح سے شروع ہو کر اگلے تیرہ دن۔۔۔ جو میں نے پاکستان میں گزارے۔۔۔ میں اوسطاً تین ناشتے، دو لنچ شام کی تین چار چائے اور تین ڈنر ہر روز کھاتا رہا۔ اسی سے وہاں کے باشندے کی مہمان نوازی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"(105)

آگے چلیں گجرانوالہ، شیخوپورہ، گجرات کی طرف تو یہاں بھی دیہات کے لوگ مہمان داری میں بے مثال ہیں۔ لسّی دودھ، دہی کھلانا، ان کی عادت ہے۔ لیکن شہروں کا ماحول اب بدل گیا ہے۔ یہاں چینی ریستوران کھانے کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جہاں ائیر کنڈیشنز کے ساتھ فرائیڈ رائس، چکن کارن سوپ اور

سویٹ اینڈ ساور کا دور دورہ چلتا ہے۔ گجرانوالہ پہلوانوں کا شہر ہے۔اس لیے اُمید تھی کہ مہمان داری دودھ سے ہوگی مگر شہروں میں ایسی مہمان نوازی کو کوئی رواج نہیں۔

رضا علی عابدی اپنے اُردو سفر نامے "جرنیلی سڑک" سے متعلق لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے یہ سفر سڑک کے کنارے بسے ہوئے لوگوں کے خدوخال اور ثقافت کو ذہن میں رکھ کر اپنے سفر کا آغاز کیا اور پاکستان سے لے کر ہندوستان تک اس کا احاطہ کیا اور وہاں کی ثقافت اور تہذیب کو اُجاگر کیا۔

رضا علی عابدی "جرنیلی سڑک" میں رقم طراز ہیں:

> "میں پہنچا تو خیال تھا کہ میرے میزبان گلاس بھر بھر کر دودھ اور لسی پلائیں گے صبح و شام دہی کھلایا جائے گا اور مرغ، چھولے اور پالک گوشت سے تواضع ہوگی لیکن وہ مجھے ایئر کنڈیشنز چینی ریستوران میں لے گئے اور دو دن تک مجھے چکن کارن سوپ اور سویٹ اینڈ ساور بیف مع ایگ فرائیڈ رائس قسم کی چیزیں ملیں۔"(106)

راولپنڈی کے لوگ پر خلوص اور مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کے ناشتے میں پینے کے لیے دودھ دیتے ہیں۔ یہاں لوگوں نے اپنے گھروں میں بھینسیں پال رکھی ہیں۔ جن کا خالص دودھ بے حد لذیذ اور مزے دار ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے مہمانوں کو خوش اور صحت مند رکھتے ہیں۔

کیمی پوا کا سفر نامہ "سفر نامہ پاکستان" مختلف عنوانات پر مشتمل ہے۔ جس میں سے ایک عنوان "رالپنڈی اور اسلام آباد" ہے۔اس حوالے سے کیمی پوا -رقم طراز ہیں:

> "ریلوے کے سابق ڈسٹرک سپر نٹنڈنٹ جناب ایف ایم خاں راولپنڈی میرے میزبانوں میں سے ایک تھے۔اس دوران میں روز صبح ناشتہ کے میز پر نہایت عمدہ دودھ موجود ہوتا تھا۔"(107)

لاہور بڑے دل والوں کا شہر ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت عزت و محبت سے پیش آتے ہیں۔ یہ لوگ فطرت کے نیک لوگ ہیں۔ فطرتاًصاف گو بھی ہیں اور کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرنے والے لوگ ہیں۔ یہاں کے لوگ بہترین مہمان نواز ہیں۔لاہور زندہ دل لوگوں کا زندگی سے بھرپور شہر ہے۔

بقول کیمی پوا:

”لاہور میں ہر طبقے کے لوگ آباد ہیں۔ باہر سے آنے والوں سے نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔ فطرتاً صاف گو ہیں اور ہر بات پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔“(108)

ٹیکسلا، حسن ابدال کی طرف نکل جائیں تو وہاں کے لوگ سادہ اور مہمان نواز لوگ نظر آتے ہیں۔ معاشی حالات اتنے خوش گوار نہ ہونے کے باوجود مہمان نواز ہیں۔ ہڑپہ ساہیوال سے 30 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہڑپہ اگرچہ قصبہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے؛ لیکن یہاں کے لوگ بے حد مہمان نواز ہیں۔ اپنے مہمان کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی اپنے سفر نامے ”مناظرِ پاکستان“ میں لکھتے ہیں:

”ساہیوال کے بازار میں ساہی قوم کے افراد مہمانوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں اور انھیں اپنی بہترین اشیا سے متعارف کراتے ہیں۔“ (109)

صحرائے چولستان کے لوگ مشکل زندگی جینے کے باوجود آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ملنسار اور پر خلوص ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگ نو روز کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور سیاحوں کے آگے پُر خلوص انداز میں کھانے پینے کی اشیا چن دیتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی لکھتے ہیں:

”سیاح جب ان راستوں سے گزرتا ہے تو حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور اسے ایک انجانی خوشی کا احساس ہوتا ہے وہ یہاں کے ملنسار اور پُر خلوص لوگوں کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔“(110)

یہاں کے لوگ شیریں کلام ہیں۔ چولستان، تھرپارکر اور رحیم یار خان کے علاقے یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی قابلِ رشک ہے۔ بہاول پور کے لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنا، ہمدردی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں:

”ان کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے۔ میسن نے ذکر کیا ہے کہ 1826ء میں جب ریاست سے گزرا تو لوگ کتنے اچھے طریقے سے پیش آئے۔ اس کی جیب میں رحمت خان کے دیئے ہوئے صرف 2 روپے تھے جن کی مدد سے اس نے 300 میل کا سفر بہ آسانی طے کیا۔“(111)

بھکر، ڈیرہ غازی خان یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ میانوالی کے بھی لوگ اچھے ہیں۔ حالاں کہ یہ علاقے گرم ترین ہیں۔ دیہاتوں میں سہولیات بھی اتنی نہیں ہیں۔ اگر چہ دیہات اب پہلے جیسے نہیں ہیں، کافی ترقی ہوگئی ہے۔ مگر پھر بھی مہمان داری آسان نہیں ہوتی۔ مگر یہ اللہ کے بندے خوش دلی سے مہمان داری کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو ان کے حسن سلوک سے ایسے متاثر ہوئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ لوگ ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ ان کے ہی دم سے ہماری ثقافت زندہ ہے۔ ان کی تہذیب محبت و الفت کی آئینہ دار ہے اور لوگ اتنے حلیم الطبع اور اتنے منکسر المزاج ہیں کہ ان کے اندر وہی شیرینی پائی جاتی ہے جو ایک قدیم تہذیب کی علامت ہوا کرتی ہے۔

رضا علی عابدی سفر نامہ "شیر دریا" میں رقم طراز ہیں:

> "ڈیرہ کے لوگ بہت ملنسار ہیں۔ بہت ہی مہمان نواز ہیں۔ ان کے لیے یہاں تک مشہور ہے کہ مہانوں کو آنے دیتے ہیں جانے نہیں دیتے۔ اس کی وجہ سے آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ باہر سے آئے ہوئے جو لوگ ایک دفعہ ان کے پاس ٹک گئے وہ مستقل طور پر یہاں کے سکونتی ہو گئے ہیں۔"(112)

دریائے سندھ نے جب اپنا رخ بدلا تو وہ کنارا جس پر بھکر آباد ہے، خشک ہو گیا۔ اس سے کسانوں کو شدید نقصان ہوا اور ان کے مالی حالات بری طرح متاثر ہوئے اب دریا تو ان کے پاس نہیں ہے مگر یہ دریا کی طرح بڑے دل رکھنے والے لوگ ہیں، مہمان نواز ہیں، اپنی حیثیت سے بڑھ کر مہمان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ غریبی کے باوجود مہمان داری میں بے مثال ہیں۔

بقول رضا علی عابدی:

> "دریا تو بہت دور چلا گیا لیکن لوگ یہاں کے دریا دل ہیں بڑے مہمان نواز ہیں اور غریبی کے باوجود مہمان نوازی پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ بڑے نرم رَو اور بڑے نرم خو ہیں۔"(113)

میانوالی پنجاب کا ایسا علاقہ ہے جہاں آج بھی زمانہ قدیم کا دستور قائم ہے۔ وڈیرا سسٹم ہے۔ سرداروں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ دیہاتوں کی زندگی بڑی صبر آزما ہے۔ اس سفر نامے میں ان لوگوں کے طور طریقے اور عادات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمود علی نے سفر نامہ "دیکھا پاکستان" میں یہاں کی ثقافت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ لوگ مہمان نواز ہیں مگر اتنے زیادہ نہیں کیوں کہ یہ فریضہ

سردار نبھاتے ہیں۔ سرداروں کی مہمان نوازی کا انداز ہٹ کر ہے جسے محمود علی نے سفرنامے میں بیان کیا ہے:

> ”غیر ملکی مہمانوں کی بڑی خاطر تواضع بھی ہوئی اور ان کے لیے خاص طور پر گھوڑوں کے رقص کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس کے علاوہ مہمانوں کو جاگیر دار نے اپنے زرعی مربعے ، پھل کے باغات ، مویشیوں کے ریوڑ اور سٹڈ فارم ، یعنی گھوڑوں کے تھان بھی دکھائے جہاں جہاں ہم لوگ گئے دیہاتی لوگ جوق در جوق وہاں پہنچ گئے۔ گورے مہمان جو سمندر پار اتنی دور سے پنجاب کے اس دور دراز علاقے میں جاگیر دار کے پالے ہوئے جانوروں کو دیکھ کر عش عش کر رہے تھے۔ ان کو یہ گنوار حیرت سے تکتے۔“(114)

اس سفرنامے سے میانوالی کی ثقافت کا پتہ چلتا ہے کہ وہاں لوگ کتنے پس ماندہ ہیں۔ اس کی زندگی کے رنگ ڈھنگ پتہ چلتے ہیں۔

پنجاب کا یہ کلچر ہے کہ لڑیں مریں کچھ بھی کریں مگر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ مہمان کی خاطر داری کرنا اولین فرض سمجھتے ہیں اور جو مہمانوں کی خاطر داری میں کمی کرے اسے بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ مہمان اللہ کی رحمت سمجھا جاتا ہے۔

ix. تفریحات / کھیل، موسیقی، تہوار:

پاکستان کے ہر صوبے میں کھیل، موسیقی، تہوارات ہوتے ہیں۔ تہوار دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ پنجاب کی ثقافت بہت دل آویز ہے۔ کرکٹ، ہاکی، پتنگ بازی، گلی ڈنڈا، کبڈی، پہلوانی پنجاب کی ثقافت کا حصہ ہیں۔ پہلوانوں کا شہر گوجرانوالہ ہے جہاں پہلوانوں کی کثرت ہے اور وہاں پہلوان اکھاڑوں میں پہلوانی کرتے ہیں۔

شیخوپورہ میں سالانہ میلے عموماً بزرگوں کے مزاروں پر لگتے ہیں۔ سالانہ عرس کے موقع پر ضلع کے علاوہ دور دور سے زائرین آتے ہیں۔ اس موقع پر مزاروں کو سجایا جاتا ہے۔ بازار بھی رنگارنگ سجائے جاتے ہیں۔ اس دن تھیٹر اور سرکس اپنے شو دکھاتے ہیں۔ بابا گرونانک کے جنم دن پر دنیا بھر سے سکھ یاتری یاترا کے لیے آتے ہیں۔ تین دن جشن بھی منایا جاتا ہے۔ ہر سال میلہ مویشیاں بھی منعقد ہوتا ہے۔ پیر وارث شاہ

کے عرس پر ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ کی طرف سے مقامی چھٹی ہوتی ہے۔صوبہ پنجاب کے مسلمان اپنے تہوار روایتی جوش و خروش اور احترام سے مناتے ہیں۔

بقول خالد پرویز ملک:

”ایک قابلِ ذکر مقامی تہوار ننکانہ صاحب میں سکھ مناتے ہیں۔جو بابا گرونانک کے جنم دن پر منایا جاتا ہے۔ہزاروں کی تعداد میں سکھ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دُنیا سے اس موقع پر ننکانہ صاحب آتے ہیں۔ تین دن متواتر رسومات ادا ہوتی ہیں۔“ (115)

حسن ابدال یوں تو اپنے ٹھنڈے میٹھے چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔مگر اس کی اس سے بھی کہیں زیادہ شہرت پنجہ صاحب کی مرہون منت ہے۔گوردوارہ پنجہ صاحب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل سردار ہر سنگھ نلوں نے تعمیر کرایا تھا۔مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہاں بیساکھی کا میلہ مذہبی تہوار کے طور پر شروع کرایا تھا جو پنجاب بھر میں گندم کی کٹائی شروع ہوتے ہی موسمی تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔جس میں سکھ اور ہندو شرکت کے لیے ہندوستان اور دُنیا بھر سے آتے ہیں۔یہ میلہ بیساکھی اپریل کے مہینے میں ہوتا ہے یہ تہوار 13 اور کبھی 14 –اپریل کو ہوتا ہے۔

بقول مسکین مغل:

”میلہ بیساکھی اس گوردوارے میں مہاراجہ رنجیت نے شروع کرایا تھا اور اسے ایک مذہبی تقریب قرار دیا۔یوں تو میلہ بیساکھی پنجاب بھر میں جہاں گندم کی کٹائی اپریل میں شروع ہو جاتی ہے ایک موسمی تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔“(116)

ٹیکسلا کا میوزیم ایک معلوماتی تفریح گاہ ہے۔جس باغ میں میوزیم ہے وہ باغ بھی گھومنے پھرنے کے لیے اچھی جگہ ہے۔ٹیکسلا سے آگے جائیں تو سری کپ کے کھنڈرات ہیں یہ معلوماتی سیر کہلائے گی۔یہ خطہ پاکستان کے لیے تاریخی و تہذیبی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے آگے خان پور ڈیم ہے۔جس کا اپنا مزہ ہے۔اس ڈیم میں کشتیاں ، اسٹیمر چلتی ہیں۔جن کی سیر سے اس تفریح کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔مغلوں نے پورے ملک میں بہت سے باغات اور یادگاریں تعمیر کرا کر اس کے حُسن کو دوبالا کیا۔ایسا ہی ایک خوب صورت باغ حسن ابدال کی وادی میں ”واہ گارڈن“ کے نام سے موجود ہے۔

بقول حمید قیصر:

”جوں جوں گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔اس باغ کی رونق میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔جدھر نظر جاتی ہے لوگ ہی لوگ نظر آتے ہیں۔بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔تو صبح سے شام تک یہاں میلے کا ساماں رہتا ہے۔“(117)

مری پہاڑی علاقہ ہے۔جہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔پتریاٹہ کی طرف نکل جائیں وہاں لفٹ کی سیر ایک منفرد تفریح ہے۔صوبہ پنجاب تفریحی مقامات میں خود کفیل ہے۔پہاڑ، دریا، ڈیم، پارک وغیرہ سبھی نعمتوں سے مالا مال ہے۔پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں بسنت کا تہوار منایا جاتا ہے۔لاہور گڑھ ہے بسنت منانے کا۔لاہور میں یہ تہوار نہایت جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔پکوان پکتے ہیں۔رقص ہوتا ہے۔سارا دن اور ساری رات پتنگیں اُڑتی ہیں۔ایسا خوب صورت منظر ہوتا ہے۔دن کو پتنگیں اُڑانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی سفر نامہ ”مناظر پاکستان“ میں بسنت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

”فروری کے مہینے میں بسنت کے باعث ہوٹلوں کے کرائے بڑھ جاتے ہیں اور پورے ملک کے لوگ ایک لشکر کی صورت لاہور پر یلغار کر دیتے ہیں۔پورا شہر روشنیوں سے جگمگا اُٹھتا ہے۔اندرونِ لاہور چھتوں پر حلیم، بریانی اور گوشت کی دیگیں پکتی ہیں۔پوری رات شور و غل اور ہنگامے میں گزر جاتی ہے۔دن کو پتنگیں اُڑانے کا مقابلہ ہوتا ہے اور پورا آسمان رنگین پتنگوں سے ڈھک جاتا ہے۔زیادہ تر سیاح پاکستانی سرحد واہگہ بارڈر کا دل چسپ نظارہ کرنے بھی پہنچ جاتے ہیں۔“(118)

فروری میں لاہور میں ہارس شو ہوتا ہے جو دُنیا بھر میں مشہور ہے۔اس موقع پر ہمیشہ بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔لاہور کا ماحول ثقافتی ہے۔

صوبہ پنجاب کا شہر میانوالی یہاں موسیقی میں بہت ورائٹی نظر آتی ہے۔پرانی طرزیں تھیں جن سے اُنھوں نے بہت کچھ سیکھا ان میں ہیمٹری ٹپہ جو عورتیں گھروں میں گاتی ہیں۔خصوصاً شادی بیاہ میں اس کے علاوہ وہ ٹپے گاتی ہیں۔ان کی ایک ہی دُھن ہوتی ہے۔اس علاقے میں دو راگ جوگ اور بھیروی بہت مشہور

ہیں۔اس کے علاوہ یہاں سرائیکی گانوں کے ساتھ ڈھونک، طبلہ اور ہارمونیم اور گھنگھرو ہوتے ہیں۔یہاں کے لوگ ثقافتی موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔یہاں لوک موسیقی کا بھی رواج ہے۔کبھی بارش ہوئی تو لوگ گانے لگے۔کبھی رات کا سناٹا دیکھا تو گانے لگے۔میانوالی میں لوک گیتوں کا بہت رواج ہے۔کبھی ہجر کے گیت، شادی بیاہ کے گیت، درد کے گیت، ماہیے، دوہڑے، موسموں، خوشیوں اور غموں کے گانے بھی گائے جاتے ہیں۔یہ میانوالی کا کلچر ہے۔ڈیرہ اسماعیل خان یہاں کی موسیقی کا ایک خاص گیت بگڑو یہ سرائیکی لفظ ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کے ہار، بگڑو میں اس رومانس کا ذکر ہوتا ہے جو عین عالم شباب میں ہوتا ہے۔اس علاقے کا خاص رقص جھومر ہے۔جھومر کی ایک خاص دھن ہے۔اس دھن میں نوجوان آدمی الگ اور عورتیں الگ رقص کرتی ہیں۔میانوالی اور ڈیرہ غازی خان میں بھی جھومر کا رواج ہے۔جھومر ناچی جاتی ہے۔

بقول رضا علی عابدی:

> ”اب رہ گیا رقص تو اس علاقے کا خاص رقص جھومر ہے۔جھومر گول دائرے میں ہوتا ہے۔ہمارے علاقے میں اب تک کچھ ایسے دیہات ہیں۔جہاں مرد و زن بلا تخصیص مل کے اکھٹے رقص کرتے ہیں اور اس کو معیوب تصور نہیں کیا جاتا کیوں کہ سارا گاؤں ایک ہی خاندان تصور کیا جاتا ہے۔البتہ جھومر کی ایک خاص دھن ہے۔اس دھن پر ہمارے نوجوان الگ رقص کرتے ہیں اور عورتیں الگ جھومر رقص کرتی ہیں۔“(119)

اس کے علاوہ یہاں گھڑ دوڑ، کُشتی اور تودے کی دوڑ ہوتی ہے۔ان کا ایک کھیل کبڈی جیسا ہوتا ہے جسے ”دو دایا بلارو“ کہتے ہیں۔ان علاقوں میں کھیل اور تفریح کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔اس کے علاوہ گیت، رقص بھی ان کی تفریح کے زُمرے میں آتے ہیں۔ڈیرہ غازی خان میں رواج تھا۔ہر گاؤں میں ایک جگہ بنی ہوتی ہے، جہاں لوگ اکھٹے ہو کر حقہ پیتے ہیں۔مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہیں، گیت گانے کی محفل ہوتی ہے اور لوگوں کی مالش کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔گیت بگڑو اور بڑھاؤ کا بھی دور چلتا ہے۔جہاں گاؤں کے لوگ مل کر بیٹھتے ہیں اسے ”وساق“ کہا جاتا ہے۔

رضا علی عابدی لکھتے ہیں:

> ”یوں کہیے کہ ایک کلچر سینٹر ہوتا ہے۔وہاں قصے سناتے ہیں۔مثالیں ہوتی ہیں۔مختلف قسم کی۔۔۔اور مالش بھی ہو رہی ہے۔گیت بھی گائے جا رہے

ہیں۔ بگڑو بھی سنائی جا رہی ہے۔ یہ سب ہمارے علاقے کے گیت ہیں۔ مثلاً
بگڑو اور لڑھاؤ۔ "(120)

گجرانوالہ پہلوانوں کا شہر ہے۔ یہاں کے لوگ پہلوانی کے جوہر دکھا کر محظوظ کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کھیلوں کا سامان بنانے میں نمبر 1 ہے۔ یہاں کرکٹ، ہاکی، بیٹ منٹن وغیرہ کھیلنے کا رواج ہے۔ بڑی نام ور ہستیاں سیالکوٹ سے تعلق رکھتی ہیں جیسے شعیب اختر۔ فیصل آباد صنعتی شہر ہے۔ خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ یہاں کھیلوں اور رقص و موسیقی پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

فرانس کے ناچوں کی طرح پانچ دریاؤں کے دیس کے ناچ بھی ہلکے پھلکے سبک اور چلبلے ہوتے ہیں اور اس سرزمین کے رہنے والوں کے رنگین مزاج کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ لوک گیتوں کی طرح ہمارے لوک ناچ بھی زیادہ تر دیہاتی زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہ دیس ایک وسیع دیس ہے۔ یہاں کی زبان کی طرح ناچ بھی دیس کے الگ الگ گوشوں میں الگ الگ روپ بھرتا ہے کہیں کہیں وہ ناچ زیادہ اور سبک اور کہیں زیادہ ٹھوس اور پُر زور ہے۔ اس دیس کے جنوب مغربی علاقے جسے ہم لہندا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ ناچ گیتوں کی طرح دھیما اور سریلا ہے اور اس میں لہندا زبان کے ساتھ ملتانی شاعری کی نئی لُوچ اور نزاکت بھی شامل ہے۔

بقول خالد پرویز ملک:

> "یہ ناچ گیتوں کی طرح بڑے دھیمے اور سُریلے ہوں گے۔ ان میں لہندا زبان اور ملتانی شاعری کی نئی لُوچ اور نزاکت ہو گی لیکن شمال کے علاقے میں جہاں کے لوگ زیادہ تر قومی ہیکل، زیادہ صحت مند اور زیادہ کرخت اور سخت ہیں یہ ناچ بھی ویسے ہی جوان اور پُر جوش ہیں اور وہاں کے لوگوں کی پُر جوش زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ "(121)

پنجاب کے اہم ناچ بھنگڑا، لڈی، لنگی، کلکی، جھومر، ایبک وغیرہ شعر کی طرح رقص بھی انسانی جذبات کے اظہار کی ایک موزوں صورت ہے۔ رقص بھی کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں نمایاں عنصر ہے۔ پنجاب کا رقص یہاں کی شاعری کی طرح جوان، پُر زور اور پُر شباب ہے۔

دھریس:

خوشاب کا یہ مقبول ناچ ہے۔ دھریس جھومر اور لڈی تینوں الگ الگ ناچ ہیں۔ دھریس ڈھول کی تھاپ اور گیت پر مزہ دیتی ہے۔ پہلے زمانے میں صرف دھریس ہی مشہور تھی۔ کھارا، گڑولی اور سہروں کے وقت اس فن کا مظاہرہ عورتیں پُر جوش طریقے سے کرتی تھیں۔ دھریس میں ڈھول کے علاوہ اور کسی ساز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لڈی، جھومر اور بھنگڑا ناچ ہیں۔ چپڑی، چمٹا، گھنگھرو اور ڈھول بھی استعمال ہوتا ہے۔

> ”خوشاب کا خاص ناچ صرف دھریس مشہور ہے۔ عام لوگ جھومر اور لڈی کو اس میں گڈ مڈ کر دیتے ہیں حالاں کہ تینوں بالکل مختلف ہیں۔ دھریس ڈھول کی تھاپ اور گیت پر مزہ دیتی ہے۔“(122)

بھنگڑا:

ولولہ انگیزی اور ہنگامہ آفرینی کے نام پر ایک ناچ پنجاب میں بھنگڑا ہے۔ جو بالعموم شمالی علاقوں میں مرغوب ہے۔ یہ ناچ صرف مرد کرتے ہیں۔ خاص لباس ململ کے سفید کھلے اور لمبے کرتے اور ان کرتوں کا کھلا گھیرا اور گھاگھرے کی طرح آستینیں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ رقص دائرے میں کیا جاتا ہے۔ ایسا مست ہو کر مرد ناچتے ہیں کہ دیکھنے والوں کے دلوں میں بھی جوش پیدا ہوتا ہے۔

خالد پرویز ملک لکھتے ہیں:

> ”ہمارے دیس کے لوک ناچوں میں بھنگڑا سب سے زیادہ پر جوش ناچ ہے۔ جو مکمل طور پر ہماری زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔“(123)

لڈی:

بھنگڑا ناچ سے ملتان جلتا ایک لُڈی ناچ ہے۔ بھنگڑے کی طرح سخت نہیں مگر پُر جوش اور ہیجان آور ہے۔ بھنگڑے کی طرح لُڈی میں بھی ایک والہانہ ترنگ ہوتی ہے۔

لُنگی:

عورتوں کے معروف ناچوں میں ابتدائی اور ایک سادہ ناچ لُنگی ہے۔ جس میں دو چھوٹی یا دو نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر پاؤں ایک جگہ ملائے اپنے پورے زور سے بدن پیچھے کو جھکائے ایک دوسرے کے بوجھ کے سہارے گھومتی ہیں اور ساتھ ساتھ گاتی بھی جاتی ہیں۔

"یہ گانا ناچ کی طرح بالکل سادہ ہوتا ہے اور بالعموم عورتوں کے لوک گیتوں سے انتخاب کیا جاتا ہے اور اس گیت کے بول ہلکے چھوٹے مگر رواں دواں ہوتے ہیں۔"(124)

کلکی:

کلکی کلیر تو ناچ کا نام ہے۔ کلکی کا ناچ دیہات میں گھر گھر ہوتا ہے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ یہ مختصر بھی ہوتا ہے۔

جھومر:

دائرہ بنا کر ناچا جاتا ہے۔ کبھی ڈھولک کے ساتھ اور کبھی تالیوں کے بل پر قدم اُٹھاتی اور جھومتی چلی جاتی ہیں۔ ایسے ناچ کو جھومر کہا جاتا ہے۔ یہ ناچ دراصل بلوچوں کے ہاں بہت مقبول تھا وہاں سے یہ پنجاب میں داخل ہوا ہے۔ جھومر چولستان کا بھی مشہور رقص ہے۔ سرائیکی زبان میں اسے جھومر یا "جُھمر مارڈان" کہا جاتا ہے۔

احمد غزالی رقم طراز ہیں:

"جھومر بلوچستان کا ایک معروف لوک رقص ہے۔ مرد پھیری والی اور ڈالیاں والی جھومر کر رقص کرتے ہیں اور عورتیں تالیوں والی جھومر کا ناچ کرتی ہیں۔"(125)

ایک اور رسمی ناچ:

یہ دونوں موسمی ناچ ہیں جو جھنگ اور ملتان کے ارد گرد کے علاقوں میں جب فصلیں پک کر کٹنے کا وقت آتا ہے تو نوجوان عورتیں راتوں کو چاند کی چاندنی میں دیکھنے نکلتی ہیں اور بے اختیار خوشی سے ناچنے لگتی ہیں۔

خالد پرویز ملک رقم طراز ہیں:

"موسمی ناچوں میں سے ایک اور ناچ سمی ہے جو جھنگ اور ملتان کے گردونواح میں دیکھنے میں آتا ہے۔ فصلوں کے پکنے اور کٹ جانے کے بعد جب کھلیان تیار ہو جاتے ہیں تو ان خرمنوں یا دولت کے ڈھیروں اور انباروں کو دیکھ کر کسانوں کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں اور ان کے گھروں سے

نوجوان عورتیں راتوں کو چاند کی روشنی میں ان دولت کے انباروں کو دیکھنے
کے لیے نکلتی ہیں اور پھر بے اختیار وجد میں جھومنے لگتی ہیں۔"(126)

X. لوک گیت:

لوک گیت کا اجرا صوفی شعرا نے کیا۔ ان لوک گیتوں کی زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے اور ہماری دیہاتی زندگی کا اٹوٹ انگ ہے۔

پنجاب کے لوک گیت ماضی کے عکاس:

پنجاب کے لوک گیت ہمارے پرانے وقتوں کے معاشرے کے لوک گیت ہیں۔ پنجاب کے لوگوں کے رنگ ڈھنگ، رسموں، رواجوں، سوچوں، خیالوں، اُمیدوں اور جذبوں کی تصویر دکھاتے ہیں۔ لوک گیتوں کے ذریعے ہم پرانے پنجاب کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔

بہن بھائی کی محبت کا ذکر:

پنجاب میں ایسے گیتوں کا بھی رواج ہے، جن میں بھائی بہن کی محبت کا اظہار ملتا ہے۔ بہن بھائیوں کی محبت فطری عمل ہے۔ اس کا اندازہ ان بولوں سے لگایا جا سکتا ہے:

سے ویرنوں مندا نہ بولیں
بھاویں میری جند کڈھ لے(127)

ان بولوں سے بھائی کے لیے ایک بہن کا جو پیار چھپا ہے، اس نے اس پاکیزہ جذبے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

زیورات کا ذکر:

پنجاب کے لوک گیتوں میں عورتوں کی زیور سے محبت اس کم زوری کا ذکر ان گیتوں میں موجود ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں تمہاری بہادری کے گیت گاؤں سہیلوں کو سناؤں لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے کانوں کا زیور لا کر دو۔ ان دو بولوں میں شوخی کا رنگ عروج پر نظر آتا ہے:

تیرے گدیاں وچ گاواں

دے ڈنڈیاں گھڑا دے مترا(128)

ساون کے گیت:

دیہاتوں میں ساون کے گیت گانے کا رواج ہے۔ بادلوں کی آمد ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے۔

پھولوں کے بادشاہ آم کا تذکرہ گیتوں میں:

گاؤں کی مٹیارئیں آموں کا ذکر اپنے گیتوں میں کرتی ہیں۔ گاؤں کی ثقافت بہت ہی دل کش ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی زندہ دلی، شوخی ان کے گیتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

xi. پیدائش کی رسومات:

پنجاب میں پیدائش اور موت سے متعلق رسومات یہاں کے کلچر کو اُبھارتی ہیں۔ رسمِ پیدائش، فوتگیوں، منگنی، شادی بیاہ ان میں بڑھ چڑھ کر خرچ کرنا باعثِ عزت سمجھا جاتا ہے۔ خواہ قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ان رسومات کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ رسومات کی عدم ادائیگی کا مطلب ناک کٹ جانا تصور کیا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ پنجاب کا کلچر بیان کرتے ہوئے اپنی پیدائش کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے سفر نامہ "جو کالیاں" میں رقم طراز ہیں:

> "جتنے بھی لوگ مبارکیں دینے کے لیے آئے تمہاری دادی نے ہر ایک کو دو ٹوپے کنک اور ایک ٹوپا گڑ دیا۔ عورتوں کے لیے چادروں اور مردوں کے لیے پگڑیوں کا وعدہ کیا۔ اگرچہ وہ زیادہ حیثیت والے نہ تھے۔ گاؤں کے جتنے کاشت کار تھے ان کی ملکیت بس اتنی تھی کہ دن رات کی مشقتوں سے بہ مشکل گزر اوقات ہوتی تھی۔ دوسروں کی نسبت تمہارے دادا کا رقبہ تھوڑا زیادہ تھا۔۔۔ اس کے باوجود تمہاری دادی نے جو کچھ گھر میں تھا، یہ سوچے بغیر کہ کل کیا ہو گا، سب کچھ مبارکیں دینے والوں میں بانٹ دیا کہ اس کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔"(129)

ترت مراد :

یہ پہلے بچے کی پیدائش پر رسم ہوتی ہے۔ دیہاتوں میں ان رسموں کی پاس داری ضروری سمجھی جاتی ہے۔ نومولود برادری میں چینی، گڑ تقسیم کی جاتی ہے اور دایہ کو انعامات دیے جاتے ہیں۔ لڑکے کی پیدائش پر گاؤں والے انعام و مبارک باد کے لیے آتے ہیں۔

بقول پرویز ملک :

> "یہ رسم پلوٹھی کے بچے کی پیدائش پر ادا کی جاتی ہے۔ نومولود کی دادی اس موقع پر برادری میں چینی یا گڑ تقسیم کرتی ہے اور دایہ کو انعامات حیثیت کے مطابق دیئے جاتے ہیں۔"(130)

نال کاٹنا:

دیہاتوں میں بچہ جب پیدا ہو جاتا ہے تو دایہ چھری یا درانتی سے اس کی نال کاٹ کے اس کو ایک برتن میں رکھ کر گاڑ دیتی ہے۔ شہروں میں ہسپتالوں میں ڈاکٹر نال کاٹنے کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ پھر بچے کو نہلا کر کپڑے پہنا دیئے جاتے ہیں۔ بچے کی پیدائش سے ایک مہینے تک زچہ و بچہ کی دیکھ بھال بھی دائی کرتی ہے۔ جس کا اسے معاوضہ اور انعام چھلے پر دیا جاتا ہے۔

اذان:

بچے کو نہلانے کے بعد خاندان کا کوئی بزرگ بچے کے کان میں اذان دیتا ہے۔ دیہات میں اذان دینے والے کو گڑ دیا جاتا ہے۔

گھٹی:

اذان کے بعد بچے کو گھٹی دی جاتی ہے۔ شہد کچھ گھرانوں میں چٹانے کا رواج ہے۔ خاندان کا کوئی نیک بزرگ یا خوش قسمت عورت بچے کو شہد یا گھٹی دیتی ہے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ گھٹی دینے والے کا سب سے زیادہ اثر بچے پر پڑتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے کا پیٹ صاف ہو جائے۔ اب تو سائنس کی ترقی کے مطابق شہروں میں ماں کے دودھ کو بچے کو بطورِ گھٹی دیا جاتا ہے:

> "ہر جگہ پہلی گھٹی دینے میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں ایسی چیز شامل ہو جس سے آلائش خارج ہو کر پیٹ صاف ہو جائے۔"(131)

چھٹی:

زچہ کو سوا مہینے میں 5 بار نہلاتے ہیں۔ ساتویں، گیارھویں، اکسویں اور چالیسویں دن، ساتویں دن کے غسل کو چھٹی کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس دن کو بہت دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ رشتہ داروں اور قریبی لوگوں کو بلا کر گھر میں دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ اس دن تحفے تحائف بھی دیتے ہیں۔

جھنڈ اُتروائی:

بچے کی پیدائش کے پانچویں، گیارھویں، اکیسویں یا اکتالیسویں دن بچے کا سر مونڈ کر نائی کو انعام و اکرام اور بالوں کے ہم وزن چاندی دی جاتی ہے اور بال ماں باپ سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔ اسے جھنڈ اُتروائی کی رسم کہا جاتا ہے۔

عقیقہ:

عموماً سات دن کے بچے کا عقیقہ کیا جاتا ہے۔ لڑکے کے نام کے دو بکرے اور لڑکی کا ایک بکرا قربان کر کے کچا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔ غربا اور مساکین میں گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصہ رشتہ داروں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگ عقیقہ پر دعوت کا انتظام کر کے اپنے رشتہ داروں اور برادری کو مَدعو کر کے کھانا کھلاتے ہیں اور رشتہ دار بچے کو تحفے اور پیسے دیتے ہیں۔

بچے کا نام رکھنا:

عقیقہ کے دن بچے کا نام رکھ کر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔

ختنہ:

ختنہ کی رسم کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور بعض لوگ تو اس کو چھوٹی سی شادی کی رسم کی طرح مناتے ہیں۔ برادری، دوست احباب مدعو کر کے دعوت کا اہتمام کر کے لڑکے کو گھوڑے پر بٹھا کر نئے کپڑے پہنا کر سہرا باندھ کر گھماتے ہیں اور پھر ختنہ کی رسم ادا ہوتی ہے جب کہ شہروں میں زیادہ تر مہینے کے اندر اندر ختنہ کی رسم ادا ہو جاتی ہے۔ سادگی کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔

جوڑے اور زیور:

پنجاب کا رواج ہے، دیہاتوں میں اس کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے اور شہری بھی اس کو نبھاتے ہیں۔ پہلا بچہ ننھیال میں ہوتا ہے۔ ماں باپ اپنی بیٹی کو زچگی کے لیے دو تین مہینے پہلے اپنے گھر بلا لیتے ہیں اور

تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ بچے کے لیے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی سونے کے کڑے، گیارہ یا اکیس جوڑے، بستر، جھولا اور دودھ بنانے اور پلانے کے برتن دیتے ہیں اور جب زچہ بچہ نہانے کے بعد سسرال جاتی ہے تو اس کو زیور اور جوڑے کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو بچے کے والدین کے ساتھ ساتھ دادا، دادی اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کو بھی جوڑے دیتے ہیں۔ دیہاتوں میں ان رسومات پر عمل لازماً کیا جاتا ہے۔ شہروں میں حالات پھر بھی مختلف ہیں۔

xii. توہم پرستی / وہمات:

زچہ کے پاس کسی ایسی عورت کو جانے نہیں دیتے جس کا بچہ پہلے مر چکا ہو یا ضائع ہو چکا ہو۔ بانجھ عورت سے بھی پرہیز کراتے ہیں۔

شاہد حسین زراقی رقم طراز ہیں:

> "بعض لوگ تو سوا مہینے تک ایسی عورت کی آواز تک زچہ کے کان میں جانے نہیں دیتے اور بچے کو تو کئی سال تک ایسی عورت کی گود میں نہیں دیتے۔"(132)

جن عورتوں کو اٹھرا اں کا مرض ہو ایسی عورت اگر نہا کر آئے اور کسی بچے پر اپنے بال ڈال دے تو وہ بچہ مر جاتا ہے اور اس عورت کا بچہ زندہ رہتا ہے۔ دیہاتی ایسی عورت سے بہت خوف زدہ رہتے ہیں اور اپنے بچوں کو ایسی عورت سے چھپاتے اور دور رکھتے ہیں۔

xiii. رسمِ فوتگی:

انسانی زندگی خوشی اور غم دونوں سے جڑی ہوئی ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ مسلمانوں میں مذہب اسلام کے مطابق کفن دفن کی رسم سرانجام پاتی ہے۔ رسم قل اور پھر چالیسواں یہ وہ رسوم ہیں جن کی ادائیگی سب ہی کرتے ہیں۔ البتہ دیہاتوں میں چوں کہ برادری سسٹم ہے اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لیے لوگ دسواں، بیسواں، تیسواں اور پھر چالیسواں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرنے کے بعد چالیسویں سے پہلے جمعراتیں کی جاتی ہیں۔ ایک مولوی مقرر کیا جاتا ہے جو چالیس دن تک گھر میں آکر قرآن پڑھتا ہے۔ چالیسویں کے دن اسے پیسے، جائے نماز، کپڑے، برتن، تسبیح، ٹوپی، قرآن مجید دیا جاتا ہے۔ چالیس دن تک مردے کے نام کا کھانا کسی غریب کو کھلانا لازم ہوتا ہے۔

دیہاتوں میں کسی کی موت پر بین ڈالنے کی رسم ہے۔شہر میں بھی اکثر گھروں میں یہ رسم ہے۔برادری کی خواتین ننگے پاؤں اپنے گھر سے موت والے گھر تک بین کرتی آتی ہیں۔جوں جوں موت کا گھر قریب آتا ہے، رونا پیٹنا بڑھتا جاتا ہے۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

> ”فوتگی کی صورت میں برادری کی خواتین اپنے گھر سے میت والے کے گھر تک ننگے پاؤں بین کرتی آتی ہیں۔گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے ان کی آہ زاری بلند بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ گھر کی دہلیز میں قدم رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی کہرام مچ جاتا ہے۔“(133)

تعزیت کے لیے آنے والے لوگ پہلے تعزیت کے کلمات کہتے ہیں پھر ایک ہی سوال مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے یہ گفتگو یہاں کے کلچر کا حصہ بن چکی ہے۔ہر آنے والا لواحقین سے یہی پوچھتا ہے اور وہ بے چارہ وقتاً فوقتاً رو رو کر اسٹوری سناتا ہے۔

کندھا دینا:

یہ بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔لاہور ایک قدیمی شہر ہے اور یہاں کے لوگ ایسے کام جن میں دکھاوا ہو ضرور کرتے ہیں۔

xiv. عورت کی حیثیت:

اسلام نے عورت کو بہت عزت دی ہے اور اس کی حیثیت متعین کی ہے۔صوبہ پنجاب میں عموماً دیہاتوں میں تو عورت کی شاید ہی کوئی حیثیت ہو۔اس کا کام صرف مرد کی غلامی ہے اور مرد کی بنائی ہوئی جاگیر میں ایک خادمہ کی طرح زندگی بسر کرنا ہے۔

پاؤں کی جوتی سمجھنا:

اکثر لوگ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔دیہات تو دیہات اکثر لوگ شہروں میں بھی اسی ذہنیت کے مالک ہیں۔

احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

"میں نے لاہور میں بیش تر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ پیسہ ہاتھ کی میل اور عورت پاؤں کی جوتی ہے۔"(134)

اصل میں اس طرح کے خیالات اَن پڑھ دیہاتوں میں بسنے والوں کے ہیں۔

گھر کی رانی:

تعلیم یافتہ طبقہ عورت کے معاملے میں بہت حساس ہے اور اسے پوری عزت اور اہمیت دیتے ہیں۔ شہروں کی عورتوں کا معیارِ زندگی تو بہت بلند ہے۔ انھیں گھر کی عزت گھر کی رانی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس رانی کے فرائض میں گھر کے سب کام اور سب کی غلامی فرض ہے۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

"تاہم اس رانی کے فرائض میں جھاڑو دینا، برتن صاف کرنا، کپڑے دھونا، کھانا پکانا، جھاڑ پونچھ کرنا اور شوہر نیز اس کے ماں باپ، بہن بھائی، رشتے دار اور دوستوں کے ناز نخرے اُٹھانا ہے۔" (135)

XV. شادی بیاہ کی رَسومات:

پنجاب کے دیہاتوں میں سب سے زیادہ رسمیں شادی کے موقع پر ہوتی ہیں۔ کسی علاقے کی ثقافت کو شادی کی رسمیں پوری طرح عیاں کرتی ہیں۔ پورا کلچر کسی بھی علاقے کا کھل کر واضح ہو جاتا ہے۔ یوں تو ہر صوبے کی رسومات اپنی اپنی جگہ منفرد ہیں۔ مگر پنجاب کی رَسمیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے دل چسپ اور انفرادیت کی حامل ہیں۔

برادری میں رشتہ کرنا:

پنجاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اپنی لڑکیاں غیر خاندانوں یا برادری سے باہر نہ جائیں۔ بعض اوقات مناسب رشتہ نہ ملنے کی صورت میں لڑکیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں اور بعض بڑھاپے اور موت کی نذر ہو جایا کرتی تھیں:

"ذات پات اور برادری میں شادی کرنے کی پابندی دیہاتوں میں شہروں سے بھی زیادہ ہے۔"(136)

وَٹہ سَٹہ:

دیہاتوں میں وَٹے سَٹے کا بہت رواج ہے۔خاندان در خاندان شادیاں ہوتی ہیں۔ ضلع خوشاب ، سرگودھا وغیرہ میں بھی وَٹے سَٹے کا بہت رواج ہے۔یوں تو سارا پنجاب وَٹے سَٹے کی رَسم پر قائم ہے:

> ”دیگر لوگوں میں وَٹے سَٹے کا سلسلہ جاری تھا یہاں تک کہ وہ اپنی لڑکی اس شرط پر بیاہتے تھے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکی کا رشتہ طلب کر لیا جاتا تھا۔“(137)

پیغام رساں:

ابتدا میں پیغام رسانی کے فرائض حجام (نائی) ادا کرتا تھا۔رشتہ کا پیغام لے کر لڑکی کے گھر آتا تھا۔

> ”حجام زمانہ قبل سے ہی منگنی کے رسم کی ادئیگی میں اہم کردار ادا کرتا چلا آ رہا ہے۔ابتدا اس میں اسے کلی اختیار ہوتا تھا کہ جہاں کہیں اسے اچھا اور موزوں رشتہ ملے طے کر آئے لیکن اب اس کا رواج بہت ہی کم ہو گیا ہے۔“(138)

نشانی:

بات پکی ہونے پر دولھا والے دُلھن کے گھر جا کر رشتہ کی ہاں کراتے ہیں۔اس ہاں کو مقامی زبان میں نشانی کہا جاتا ہے یعنی نشان زدہ۔

پہلی رسم:

دُلھن کے سر پر دوپٹہ اور کچھ نقدی ، بعض لوگ کھانے پینے کی چیزیں بھی دُلھن کی نذر کر دیتے ہیں۔دو چار دن بعد دُلہن کی والدہ بہنیں اور قریبی عورتیں دولھا کو دودھ پلاتی ہیں۔

دوسری رسم منگنی:

اس موقع پر دولھا والے اپنے بڑے چھوٹوں ، عورتوں اور عزیز و اقارب کے ہمراہ دُلھن کے گھر چند جوڑے کپڑے ، ایک آدھ زیور ، کچھ مٹھائی اور پھل لے کر جاتے ہیں۔ ضلع خوشاب میں منگنی کی نشانی کے طور پر ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں۔شیخوپورہ میں منگنی تریور کہتے ہیں۔ منگنی ایک سال تقریباً ہر علاقے میں رکھی جاتی ہے تا کہ دونوں فریقین کو تیاری کا موقع اچھی طرح میسر آ سکے۔

تیسری رسم:

یہ رسم "گڈھ" کہلاتی ہے یعنی شادی کی تاریخ طے کی جاتی ہے۔

چوتھی رسم:

تاریخ مقرر ہونے کے بعد چوتھی رسم "میڈھی" انجام دی جاتی ہے۔اس رسم کی ادائیگی کے لیے دولھاوالوں کی عورتیں دُلھن کے گھر جاکر اس کو ابٹن مل کر آتی ہیں۔اسی طرح دلھا کو بھی اُبٹن ملا جاتا ہے۔یہ رسم شادی سے چند دن قبل ادا کی جاتی ہے۔

میڈھی:

میڈھی کی رسم کو ہی مائیوں بٹھانا بھی کہا جاتا ہے۔سر میں تیل ڈالتے ہیں۔لڑکی کو سب سے الگ تھلگ بٹھا کر رکھتے ہیں۔

پرویز خالد ملک لکھتے ہیں:

> "شادی سے دس گیارہ یوم پہلے لڑکی کے سر میں تیل ڈالتے ہیں اور دھاگے میں لوہے کی انگوٹھی ایک کوڑی کو ڈال کر لڑکے اور لڑکی کی کلائی پر باندھتے ہیں۔"(139)

شادی کی رضامندی:

ہمارے ہاں والدین لڑکے اور خاص طور پر لڑکی کی شادی کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس کے لیے لڑکی یا لڑکے کا راضی ہونا ضروری نہیں حتمی فیصلہ والدین کا ہوتا ہے۔

"ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور" میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> "مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ پاکستان میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کا راضی ہونا کافی نہیں بلکہ ان کے والدین کا راضی ہونا ضروری ہے۔"(140)

رسم گالا:

جب بارات کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے تو دولھا اور دلھن دونوں کے گھروں میں گالا کی رسم ہوتی ہے اور اس رسم سے دونوں کے گاؤں میں شادی کی تقریب کا آغاز ہو جاتا ہے۔گالا بارات سے تین چار ہفتے پہلے

کرتے ہیں۔ گالا میں جو عورتیں مدعو ہوتی ہیں وہ اپنے ساتھ گہیوں لاتی ہیں۔ جس کو "ویل" کہتے ہیں۔ یہ "ویل" نائن اور دوسرے کام کرنے والوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

وڑ اور سنبھال:

بارات کی تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے دولھا اور دُلھن کے گھروں میں وڑ اور سنبھال کی رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ وڑ میں گوشت اور آٹا یا غلہ گاؤں میں بانٹا جاتا ہے اور سنبھال میں میٹھے چاول پکا کے تھال میں ڈالتے اور گاؤں میں بانٹتے ہیں۔

ویل:

جب کہیں شادی ہوتی ہے تو میراثی شادی میں گانے کی اجازت لیتے ہیں۔ میراثی مہمانوں کو خوش کرنے کے لیے گانے بجانے اور نقلیں کرتے ہیں۔ مہمان اپنے میزبان کی عزت کرتے ہوئے میراثیوں کو انعام دیتے ہیں۔ جسے "ویل" کہا جاتا ہے۔

رسمِ سہرا:

مقررہ تاریخ پر گھر کا بڑا دولہا کو سہرا باندھتا ہے اور اس کے اُوپر سرخ رنگ کی ریشمی یا سوتی کرن والا یا سادہ دوپٹہ ڈال کر گھوڑے پر سوار دُلھن کے گھر بارات کی صورت میں لے جاتے ہیں۔ جہاں دُلھن کا والد، ماموں یا بھائی دولہا کو گھوڑے سے اُتار کر اپنے گھر لے جاتے ہیں اور ایک چکر لگوا کر واپس باراتیوں میں بٹھا دیتے ہیں۔

لاگ لینا:

اس موقع پر دُلھن کی سہیلیاں ہر قسم کی شرارتیں کرتی ہیں۔ جیسے اصل دودھ کی بجائے آٹا گھول کر پلانے کی زبردستی کرنا۔ اینٹیں روڑے براتیوں پر پھینکنا ایک چادر پھیلا کر دولھے کے والدین سے انعام جسے مقامی زبان میں لاگ کہتے ہیں۔ دُلھن کی بہناں یا سہیلیاں وصول کرتی ہیں۔ اس رسم کا نام "جھمی" ہے۔

کھارے پر چڑھنا:

دیہاتیوں میں رواج تھا کہ سرکنڈوں سے تیار شدہ "تونگ" ایک قسم کے صندوق پر بٹھا کر نہلایا جاتا تھا اور دُلھن والوں کی طرف سے آئے لباس کو پہنایا جاتا تھا۔ نکاح سے پہلے دولھا کو نہلانے کی رسم کھارے چڑھنا کہتے ہیں۔ اس موقع پر تونگ، لانے والوں اور دیگر پیشہ وروں کو انعام (لاگ) بھی دینے کا رواج تھا۔

" نکاح سے پہلے دولھا کو نہلایا جاتا ہے۔اس رسم کا نام کھارے چڑھنا ہے۔"(141)

بعض دیہاتیوں میں برات کی روانگی کے دن صبح کے وقت لڑکی کو ٹوکری پر بٹھا کر نہلایا جاتا ہے۔ جس پر سے اسے اس کا ماموں اتارتا ہے اور اسے پیسے دیتا ہے۔ کچھ لوگ تو بھانجی کو بھینس بھی دیتے ہیں۔

رسم گھڑولی:

دُلھن کو رخصت کرنے سے قبل نہلانے کی رسم کا نام "گھڑولی" ہے۔ دولھا کی والدہ، بہنیں اور قریبی عورتیں مٹی کا ایک گھڑا اور ایک لوٹا کنویں سے بھر کے ڈھولک کی تھاپ پر گیت گاتی ناچتی پانی بھر کر دُلھن کو نہلاتی ہیں۔ اب دیہاتیوں میں بھی نلکوں سے پانی بھرنے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ نہلا کر عروسی لباس پہنا کر تیار کرتی ہیں۔ عروسی لباس عموماً سرخ ریشمی ہوتا ہے۔

میل:

بارات کی روانگی سے قبل جب سب مہمان جمع ہو جاتے ہیں تو میل کی رسم ہوتی ہے۔ دولھا کے گھر والے پلاؤ، قدرمہ، زردہ وغیرہ پکا کر اپنے گاؤں اور اپنے پڑوس کے گاؤں میں کھانا بھیجتے ہیں۔ اس تقریب میں مہمانوں کو سب سے پہلے کھانا کھلاتے ہیں پھر خاص عزیزوں اور دوستوں کو پھر اپنے گاؤں اور برادری کو اور آخر میں کامی کھانا کھاتے ہیں جو بچ جاتا ہے اسے غریبوں میں تقسیم کر دیتے ہیں:

"اس تقریب میں سب سے پہلے میل یعنی شادی کے مہمان کھانا کھاتے ہیں۔"(142)

دُلھن کے گھر میں مہمان بارات سے کم از کم دو دن پہلے پہنچ جاتے ہیں اور وہاں بھی میل کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ دولھا کے گھر والے بات کی روانگی سے ایک دن پہلے اپنے گاؤں میں لڈو بھی تقسیم کرتے ہیں:

"شادی سے ایک دو یوم قبل رشتہ دار اور دوست جنھیں قبل بلایا جا چکا ہوتا ہے۔ پہنچ جاتے ہیں۔ گاؤں والوں کو گنڈ نہیں بھیجی جاتی برات سے ایک رات قبل برادری اور میل کو کھانا دیا جاتا ہے۔"(143)

میل کی رسم میں شرکت کے لیے آنے والے مہمانوں میں دولھا کی شادی شدہ بہنوں اور پھوپھیوں کو خاس اہمیت دی جاتی ہے اور یہ گھر کی بیٹیاں کہلاتی ہیں۔ دولھا کی بہنیں اس کے لیے ایک سلا ہوا جوڑا لاتی ہیں اور دولھا یہ جوڑا پہن کر بارات کے ساتھ سسرال جاتا ہے۔

کھارا اور کھارا لہائی کی رسم:

بارات کی روانگی کے دن دولھا کی بہنیں اور گاؤں کی دوسری عورتیں مٹی کا ایک رنگین گھڑا لے کر خوشی کے گیت گاتی ہوئی گاؤں کے بڑے کنویں سے پانی لا کر دولھا جو لنگی باندھے نہانے کی چوکی پر کھڑا ہوتا ہے۔ عورتیں اس کے گرد حلقہ بنالیتی ہیں اور نائن اور کمہارن مٹی کے رنگین گھڑے میں بھرا ہوا پانی اس پر ڈالتی ہیں۔ غسل ختم ہونے سے پہلے ننھیال کی طرف سے دولھا کا ماموں یا ماموں زاد بھائی تحفہ دیتا ہے جسے کھارا لہائی کہتے ہیں۔ یہ تحفہ کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ماموں، چچا اور پھوپھو بھی تحفہ دیتے ہیں۔ دُلھن کے گھر میں یہ کھارا لہائی کی رسم رخصتی کے دن ہوتی ہے۔

بقول شاہد حسن رزاقی:

> "غسل ختم ہونے سے پہلے ننھیال کی غرض سے دولھا کا ماموں یا ماموں زاد بھائی تحفہ دیتا ہے۔ جو کھارا لہائی کہا جاتا ہے۔ تحفہ روپے بھینس یا گھوڑا ہوتا ہے۔ ماموں کے علاوہ چچا اور پھوپھا بھی روپے کی شکل میں کھارا لہائی دیتے ہیں۔ کھارا کی رسم دلھن کے گھر میں بھی رخصتی ے کے دن ہوتی ہے اور اس کو بھی کھارا لہائی کہتے ہیں۔" (144)

رسم سلامی:

دولھا کے تیار ہونے کے بعد برادری اور دیگر خاندان کی عورتیں لڑکے کو سلامی دیتی ہیں۔ لڑکے کی بڑی بہن دولھے کا جوڑا لے کر آتی ہے اور جب وہ واپس اپنے سسرال جاتی ہے تو اسے چپکے سے میکے تحفے کے طور پر بھینس اور کپڑے وغیرہ لے کر رخصت کرتے ہیں۔

بقول پرویز ملک:

> "دولھا کو آراستہ کرنے کے بعد برادری اور دیگر عورتیں لڑکے کو نقدی کی صورت میں سلامی دیتی ہیں۔" (145)

رسم ہتھ بھرا:

شادی سے پہلے لڑکے کے لیے ننھیال والے اس کی ماں کے لیے جوڑا لے کر آتے ہیں۔ جو وہ شادی کے دن پہنتی ہے۔

واگ پھڑائی:

برات کی روانگی کے وقت جب دولھا گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو اس کی بہنیں گھوڑے کی لگام پکڑ لیتی ہیں اور اس وقت تک نہیں چھوڑتیں جب تک کہ منہ مانگی چیز نہ لے لیں۔

بقول شاہد حسن رزاقی:

> "دولھا کی سب بہنیں گھوڑے کی لگام پکڑ لیتی ہیں۔ گیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور جب تک دولھا بہنوں کو نیگ نہیں دیتا یہ لگام نہیں چھوڑتیں اس رسم کو واگ پھڑائی کہتے ہیں۔"(146)

لاہور شہر کی سیر کرتے ہوئے ایک غیر ملکی سیاح کے فرضی نام سے احمد ندیم قاسمی نے اپنے تاثرات یہاں کے رسوم و رواج کے متعلق اپنے سفر نامے "ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور" میں درج کیے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> "یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا بارات میں بے شمار لوگ تھے جو پیدل چل رہے تھے اور دولھا گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ دولھے کو گھوڑے پر بٹھانے کی رسم میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔"(147)

بد:

بارات کے ساتھ دولھے کے ماں باپ کی طرف سے دلھن کے لیے زیور، کپڑے، مٹھائی، خشک میوہ جات، مہندی اور ناریل بھیجا جاتا ہے۔ جسے بد کہتے ہیں۔ نائی یہ سب سامان لے کر ساتھ چلتے ہیں جب کہ شہروں میں دولھا کی بہنیں یا بھائی لے کر جاتے ہیں۔

رسم ملنی یا رسم استقبال:

جب برات دُلھن کے گاؤں پہنچتی ہے تو دُلھن کی برادری استقبال کے لیے گاؤں کے باہر کھڑی ہوتی ہیں۔ پھولوں سے بارات کا استقبال ہوتا ہے۔ لڑکی اور لڑکے کے والد گلے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارکبادیں دیتے ہیں۔ صدقہ اُتارا جاتا ہے۔ نوٹ سر پر سے وارے جاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "لاہور آوارگی" ایک ایسی ہی رات کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہم واپس دلی دروازے آرہے تھے کہ سامنے سے ایک بارات آگئی۔ ایک بے چارہ سا دولہا تھا جو رزق برق سہرے سے پاؤں تک ڈھکا ہوا تھا۔۔۔اس کے پیچھے کوئی درجن بھر فلاکت زدہ سی عورتیں سر پر شادی کے صندق اُٹھائے آرہی تھیں۔۔۔ دولھے کے ہمراہ ایک ڈھول والا تھا اور اس کے برابر میں ایک لیپا پوتا ہوا غریب سا خواجہ سرا یعنی کُھسرا۔۔۔ڈھول بجنے لگا اور کھسرا ناچنے لگا باراتیوں نے اپنی معمولی حیثیت کے مطابق دس روپے کے دو تین نوٹ نچھاور کیے۔ سفید بٹ کو اس ناچتے ہوئے کھسرے پر بے حد ترس آیا اور موصوف نے آگے بڑھ کر سو کا ایک نوٹ دولھا کے سر پر گھما کر خواجہ سرا پر نچھاور کر دیا۔"(148)

پورے پنجاب کا یہی کلچر ہے۔ شادی کی رسومات دھوم دھام سے ادا ہوتی ہیں۔

نکاح:

بارات دُلھن کے گھر پہنچتی ہے تو گولے پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔ بارات کا شان دار استقبال ہوتا ہے۔ دودھ یا میٹھی لسی سے باراتیوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ پھر نکاح کی رسم ہوتی ہے اور نکاح کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

رسم دودھ پلائی:

دودھ پلائی کی رسم دُلھن کی بہنیں کرتی ہیں۔ دولھا کو دودھ پلاتی ہیں اور اس سے اچھے خاصے پیسوں کا مطالبہ کرتی ہیں۔ دولھا اور دُلھن کی بہنوں اور قریبی عورتوں میں بحث چلتی ہے اور پھر بزرگوں کے کہنے سے ایک مناسب رقم دولھا اپنی سالیوں کو دے کر جان چھڑاتا ہے۔

جوتا چھپائی رسم:

یہ رسم بھی پورے پنجاب میں ہے۔ یہ بھی دولھے کی سالیاں دولھے کا جوتا چھپا کر پیسے مانگتی ہیں اور دونوں خاندانوں میں ہنسی مذاق میں تکرار چلتی ہے اور بالآخر پیسے دے کر جان چھوٹتی ہے۔

کھٹ:

لڑکی کا جہیز جو اس کے والدین دیتے ہیں برادری کو دکھایا جاتا ہے۔ دولھا کو پلنگ پر بٹھا کر نوجوان لڑکیاں چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ اس کے بعد سلامی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

بقول پرویز خالد ملک:

> ”لڑکی کا جہیز جو والدین لڑکی کو دیتے ہیں اس کی نمائش کی جاتی ہے جسے برات اور برادری کے سب مرد اور عورتیں دیکھتی ہیں۔“(149)

سلامی:

اس کے بعد دولھے کی سلامی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے لڑکی کی ماں اور پھر برادری کے لوگ، رشتے دار لڑکے کو سلامی دیتے ہیں۔

رخصتی:

سلامی کے بعد دُلھن کے بھائی ڈولی اُٹھاتے ہیں۔ ڈولی میں لڑکی کو ماموں بٹھاتے ہیں۔ ماموں نہ ہو تو والد، بھائی یا چچا بٹھاتے ہیں۔ دولھا گھوڑے پر سوار ہو کر ڈولی کے ساتھ چلتا ہے اور دولھا کا باپ ڈولی پر روپے نچھاور کرتا ہے۔ دلھن کی رخصتی کے وقت اس کے ساتھ لڈو بھیجے جاتے ہیں جو دولھا کے گاؤں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ گاؤں والے اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں کہ دُلھن اپنے ساتھ کیسے لڈو لائی تھی۔ رخصتی کے بعد مہمان رخصت ہونے لگتے ہیں۔ ان کو لڈو اور کپڑے دیئے جاتے ہیں اور ساتھ آئی بد اور میوہ مہمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جسے وہ اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے جاتے ہیں۔

بقول شاہد حسن رزاقی:

> ”مہمان یہ سب چیزیں اپنے گاؤں لے جاتے ہیں اور اس میں سے تھوڑی تھوڑی مٹھائی اور میوہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور کامیوں کو دیتے ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ شادی میں شریک ہوئے تھے اور وہاں ان کی آؤ بھگت کی گئی تھی۔“(150)

رخصتی کے وقت دُلھن اپنے گھر سے نکلتے ہوئے چاول یا جو مٹھی بھر بھر کے اپنے پیچھے پھینکتی ہے تاکہ اس کے بعد اس کا میکہ ہرا بھرا رہے۔

رونمائی:

دُلھن جب دولھا کے گھر پہنچتی ہے تو گھر والے اور گاؤں کی عورتیں اس کا استقبال کرتی ہیں۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے چوکھٹ پر تیل گرایا جاتا ہے اور دلھن کے سر پر سے پیسے وار کر مراثیوں اور کام والوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ س کے بعد سلامی دی جاتی ہے۔ ساس سب سے پہلے سلامی دیتی ہے پھر دولھا کے ننھیال والے اس کی بہنیں اور پھر پھوپھیاں سلامی دیتی ہیں اور پھر دوسری عورتیں سلامی دیتی ہیں۔ اس روز دولہا کے گھر کھچڑی پکائی جاتی ہے جو گاؤں میں تقسیم کی جاتی ہے۔

ولیمہ:

اگلے دن ولیمے کی تقریب رونما ہوتی ہے جس میں لڑکی کے گھر والوں کی شرکت لازمی جُز ہے۔ اس میں لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں کی دعوت ہوتی ہے۔

مکلاوا:

مکلاوا شادی کی ایک اہم رسم ہے۔ دُلھن سسرال سے جب پہلی دفعہ میکے جاتی ہے تو دولھا بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔ دو دن بعد اس کے گھر والے مٹھائی لے کر دلھن کے گھر جاتے ہیں۔ اس کو واپس لینے تب دُلھن کے گھر والے کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ تب دُلھن کے گھر والے مٹھائی، لڈو اور کپڑے، تحفے دے کر دُلھن کو اس کے سسرال والوں کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ یہ مٹھائی اور لڈو دولھا کے گاؤں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دلھن کے گھر والے لڑکے کی ماں بہنوں کو بھی کپڑے دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس باب میں ان سفر ناموں کو اور ان سے متعلقہ کتب کو شامل کیا گیا ہے۔ جنھوں نے صوبہ پنجاب جیسے بڑے اور تاریخی صوبے کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ پنجاب کے 36 – اضلاع ہیں۔ جن کی ثقافت سے روشناس کرانے میں اُردو سفر نامہ نگاروں نے مثبت ترین کردار ادا کیا ہے۔ ان سفر نامہ نگاروں نے قاری کو گھر بیٹھے بیٹھے پنجاب جیسے عظیم تاریخی صوبے کی ثقافت، معاشرت سے بہرہ ور کیا ہے۔

سفر نامہ، "مناظرِ پاکستان"، "یہ میرا پاکستانی سفر نامہ"، "سفر نامہ پاکستان"، "لاہور آوارگی"، "ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور"، "ٹلہ جوگیاں"، "شیر دریا"، "جرنیلی سڑک"، "نئی منزلیں ہیں پکارتی" وغیرہ یہ ایسی کتب ہیں جن کے اُسلوب کی شگفتگی اور رعنائی سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان سفر ناموں نے پنجاب کے علاقوں کی ثقافت، تہذیب و تاریخ کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ پنجاب ایک عظیم تاریخ و تہذیب رکھتا

ہے۔ یہاں کے ثقافتی عوامل نے یہاں کے لوگوں کے طرزِ زندگی، طرزِ بود و باش، عادات، رہن سہن، رسوم و رواج سب سے اُردو اَدب کو وسیع معلومات سے روشناس کرایا ہے۔

حوالہ جات

1. سید محمد لطیف ، تاریخِ پنجاب ، تخلیقات ، علی پلازہ 3 –مزنگ روڈ ،لاہور ،ص: 61

2. Tylor F.B. Primition Culture, Londan, 1871, Vol:1, P.1

3. فتح محمد ملک ، دیباچہ ، نئی منزلیں ہیں پکارتی ، از محمد داؤد طاہر ،ص: 12

4. طارق عزیز ،ڈاکٹر محمد طفیل کی خاکہ نگاری ، مشمولہ : نئی اَدبی جہتیں ، مقبول اکیڈمی ،لاہور ، 2007ء،ص: 76

5. مستنصر حسین تارڑ ، سفر زندگی ہے -پر ایک ناقدانہ نظر ،مشمولہ: سفر زندگی ہے ،فیروز سنز ، لاہور ، 2004ء،ص: 17

6. محمود شام ، مناظرِ پاکستان ،از ماجد فرید ساٹی ،ص: 13 – 12

7. خوشاب ، شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)،ضلع خوشاب ،تاریخ کے آئینے میں ، علم و عرفان پبلشرز ،الحمد مارکیٹ ، 40 –اُردو بازار ،لاہور ، ص: 29

8. سید محمد لطیف ، تاریخ پنجاب ، تخلیقات ،علی پلازہ - 3 مزنگ روڈ ، لاہور ،ص: 63

9. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ،علم و عرفان پبلشرز ، 7C –لوئر مال روڈ ،لاہور ،2002ء، ص: 586

10. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص: 209

11. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار : فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص: 147

12. مستنصر حسین تارڑ ، لاہور آوارگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،2020ء ، ص: 13

13. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار : فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص:13

14. مستنصر حسین تاڑ ، جو کالیاں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،2020ء،ص: 24

15. کیمی پوا ، سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ، بک ہوم بک سٹریٹ 46 ، مزنگ روڑ ، لاہور ،
ص: 96
16. ایضاً، ص: 133
17. پروفیسر خالد بیگ ، نوائے وقت سنڈے میگزین ، 12 -اکتوبر 2003ء
18. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ، علم و عرفان پبلشرز ، 7C -لوئر مال روڑ ، لاہور ، ص:474
19. ایضاً، ص:480
20. کیمی پوا ، سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ، بک ہوم بک سٹریٹ 46 ، مزنگ روڑ ، لاہور ،
ص:109
21. محمد اسلم میتلا ، ملتان نامہ ، سرائیکی ریسرچ سنٹر ، بہاءالدین زکریایونی ورسٹی ، ملتان ، ص: 320
22. کیمی پوا ، سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ، بک ہوم بک سٹریٹ 46 ، مزنگ روڑ ، لاہور ،
ص:89
23. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار : فضلی بک سپر مارکیٹ ، نزد ریڈیو پاکستان ، اُردو بازار
، کراچی ، ص:140
24. عباس برمانی ، ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ، سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ، 2001ء، ص: 79
25. ایضاً، ص: 79
26. بلراج ساہنی ، میرا پاکستانی سفر نامہ ، مترجم : یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ، الاکو مینشن پٹیالہ
گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڑ ، لاہور ، ص: 41
27. ایضاً، ص: 59
28. رضا علی عابدی ، شیر دریا ، سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ، 2004ء، ص: 176
29. ملک محمد دین ، ریاست بہاول پور ، ترجمہ : یاسر جواد ، الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی
سٹریٹ ، اُردو بازار ، لاہور ، ص: 137
30. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ، علم و عرفان پبلشرز ، 7 C -لوئر مال روڑ ، لاہور ، ص:497
31. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)، ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں، علم و عرفان پبلشرز ، الحمد
مارکیٹ، 40- اُردو بازار ، لاہور ، ص: 57

32. ایضاً،ص: 64

33. بلراج ساہنی ، میر اپاکستانی سفر نامہ ،مترجم : یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ،الاکو مینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڈ ،لاہور ،ص:64

34. ایضاً،ص: 64

35. ایضاً،ص:68

36. محمد داؤد طاہر ،نئی منزلیں ہیں پکارتی ، فیروز سنز ،لاہور ، 2005ء،ص: 167

37. مستنصر حسین تارڑ ، لاہور آوارگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص: 35

38. ایضاً،ص:39

39. ایضاً،ص: 14

40. رضا علی عابدی ، جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1995ء،ص: 139

41. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار : فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص:143

42. ایضاً،ص: 122

43. ایضاً،ص: 121

44. رضا علی عابدی ، جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1995ء،ص: 112

45. ملک محمد دین ،ریاست بہاول پور ، ترجمہ : یاسر جواد ،الفیصل ناشران و تاجراان کتب ،غزنی سٹریٹ ،اُردو بازار ،لاہور ،ص:216

46. امام غزالی ،چولستان ،لوک ورثہ ،اسلام آباد ،ص: 344

47. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ،علم و عرفان پبلشرز ، C 7 –لوئر مال روڈ ،لاہور ، ص:480

48. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)،ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں،علم و عرفان پبلشرز ،الحمد مارکیٹ ، 40- اُردو بازار ، لاہور ،ص:61

49. رضا علی عابدی ، جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1995ء،ص:115

50. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:106

51. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص: 129
52. ایضاً،ص: 133
53. مستنصر حسین تارڑ ، جو کالیاں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص: 217
54. مستنصر حسین تارڑ ، لاہور آوارگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:33
55. ایضاً،ص: 43
56. خلیل طوق اُر،ڈاکٹر،پیارا ملک ہے پاکستان،بزمِ تخلیق اَدب،پاکستان ،2007ء،ص:32
57. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:137
58. بلراج ساہنی ، میرا پاکستانی سفر نامہ ،مترجم : یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ،الاکومینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڈ ،لاہور ،ص: 101
59. محمد داؤد طاہر ،نئی منزلیں ہیں پکارتی ، فیروز سنز ،لاہور ، 2005ء،ص: 248
60. ملک محمد دین ،ریاست بہاول پور ، ترجمہ : یاسر جواد ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ،غزنی سٹریٹ ،اُردو بازار ،لاہور ،ص:220
61. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار :فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص:148
62. ایم زمان کھوکھر ،سنڈے میگزین نوائے وقت ، 29 جنوری 2006ء
63. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص: 128
64. ایضاً،ص: 137
65. رضا علی عابدی ،جرنیلی سڑک،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص:111
66. ایضاً،ص: 121
67. محمد اسلم میتلا ، ملتان نامہ ،سرائیکی ریسرچ سنٹر ، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی ،ملتان ، ص: 323
68. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:78
69. بشیر محمود ،سنڈے میگزین جنگ ، 29 –اگست 1999ء

70. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار : فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص:144

71. ایضاً،ص: 158

72. بلراج ساہنی ، میرا پاکستانی سفر نامہ ،مترجم : یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ،الاکومینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڑ ،لاہور ،ص: 73

73. ایضاً،ص39

74. ایم زمان کھوکھر ،سنڈے میگزین نوائے وقت ، 29 جنوری 2006ء

75. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ،علم و عرفان پبلشرز ، 7 C –لوئر مال روڑ ،لاہور ، ص:497

76. ملک محمد دین ،ریاست بہاول پور ، ترجمہ : یاسر جواد ،الفیصل ناشران و تاجراان کتب ،غزنی سٹریٹ ،اُردو بازار ،لاہور ،ص:214

77. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڑ ،لاہور ، ص:100

78. ایضاً،ص:10

79. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)،ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں،علم و عرفان پبلشرز ،الحمد مارکیٹ ، 40- اُردو بازار ، لاہور ،ص: 55

80. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڑ ،لاہور ، ص:91

81. ایضاً،ص: 124

82. بشیر محمود ،سنڈے میگزین جنگ ، 29 –اگست 1999ء

83. مستنصر حسین تارڑ ، لاہور آوارگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ،ص:102

84. احمد ندیم قاسمی ، ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور ، نستعلیق مطبوعات ، F – 3 الفیروز سنٹر ،غزنی سٹریٹ ،اُردو بازار ،لاہور ،ص: 39

85. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڑ ،لاہور ، ص:95

86. خلیل طوق اُر ، ڈاکٹر ، پیارا ملک ہے پاکستان ،بزم تخلیق اَدب ،پاکستان ، 2007ء،ص:30
87. رضاعلی عابدی ، شیر دریا ، سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،2004ء،ص218
88. بلراج ساہنی ، میرا پاکستانی سفر نامہ ،مترجم :یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ،الاکو مینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڑ ،لاہور ،ص: 35
89. ایضاً،ص:74
90. ایضاً،ص: 65
91. ایضاً،ص:65
92. محمد داؤد طاہر ،نئی منزلیں ہیں پکارتی ، فیروز سنز ،لاہور ، 2005ء،ص: 167
93. ملک محمد دین ،ریاست بہاول پور ، ترجمہ : یاسر جواد ،الفیصل ناشران و تاجراان کتب ،غزنی سٹریٹ ،اُردو بازار ،لاہور ،ص:218
94. احمد غزالی ،چولستان ، لوک ورثہ ،اسلام آباد ،ص: 344
95. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار :فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص:150
96. سعدیہ قریشی ، جنگ سنڈے میگزین ، 8 جولائی 2007ء
97. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڑ ،لاہور ، ص:112
98. بلراج ساہنی ، میرا پاکستانی سفر نامہ ،مترجم :یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ،الاکو مینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڑ ،لاہور ،ص: 43
99. محمد داؤد طاہر ،نئی منزلیں ہیں پکارتی ، فیروز سنز ،لاہور ، 2005ء،ص: 93
100. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)،ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں،علم و عرفان پبلشرز ،الحمد مارکیٹ ، 40- اُردو بازار ، لاہور ،ص:32
101. رضاعلی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص:208
102. محمد اسلم میتلا ، ملتان نامہ ، سرائیکی ریسرچ سنٹر ، بہاء الدین زکریایونی ورسٹی ،ملتان ، ص: 321

103. محمود علی ،دیکھا پاکستان ،بک پرنٹرز،لاہور،1993ء،ص57

104. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)،ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں،علم و عرفان پبلشرز ،الحمد مارکیٹ ، 40- اُردو بازار ، لاہور ،ص:27

105. بلراج ساہنی ، میر اپاکستانی سفر نامہ ،مترجم : یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ،الاکومینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڈ ،لاہور ،ص:66

106. رضا علی عابدی ،جرنیلی سڑک،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص:115

107. کیمی پوا ،سفر نامہ پاکستان ، ترجمہ: محمد حسن ،بک ہوم بک سٹریٹ 46 ،مزنگ روڈ ،لاہور ، ص:104

108. ایضاً،ص: 94

109. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار :فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص: 124

110. ایضاً،ص: 148

111. ملک محمد دین ،ریاست بہاول پور ، ترجمہ : یاسر جواد ،الفیصل ناشران و تاجراان کتب ،غزنی سٹریٹ ،اُردو بازار ،لاہور ،ص:215

112. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص: 207

113. ایضاً،ص: 217

114. محمود علی،دیکھا پاکستان ، بک پرنٹرز، لاہور،1993ء،ص:55

115. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ،علم وعرفان پبلشرز ، 7 C –لوئر مال روڈ ،لاہور ، ص:481

116. مسکین مغل ، جنگ سنڈے میگزین ، 29 –اپریل 2007ء،ص:55

117. حمید قیصر (اسلام آباد) ،جنگ سنڈے میگزین ، 25 ستمبر 2011ء

118. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، تقسیم کار :فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردو بازار ،کراچی ،ص: 163

119. رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء،ص:98

120. ایضاً،ص: 44

121. خالد پرویز ملک، تاریخِ شیخوپورہ، علم و عرفان پبلشرز، C 7 –لوئر مال روڈ، لاہور، ص:490

122. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)، ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں، علم و عرفان پبلشرز ، الحمد مارکیٹ ، 40- اُردو بازار ، لاہور ، ص: 69

123. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ، علم و عرفان پبلشرز ، C 7 –لوئر مال روڈ ،لاہور ، ص:490

124. ایضاً، ص: 491

125. احمد غزالی ، چولستان ،لوک ورثہ ،اسلام آباد ، ص: 345

126. خالد پرویز ملک ، تاریخِ شیخوپورہ ، علم و عرفان پبلشرز ، C 7 –لوئر مال روڈ ،لاہور ، ص:493

127. ایضاً، ص: 475

128. ایضاً

129. مستنصر حسین تارڑ ، جو کالیاں ، سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، ص:216

130. خالد پرویز ملک، تاریخِ شیخوپورہ، علم و عرفان پبلشرز، C 7 –لوئر مال روڈ، لاہور، ص:475

131. شاہد حسین رزاقی ، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج ، ادارہ ثقافت اسلامیہ ، لاہور ، ص: 44

132. ایضاً، ص: 45

133. احمد ندیم قاسمی ، ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور ، نستعلق مطبوعات ، ایف 3 الفیروز سینٹر ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص: 21

134. ایضاً، ص:18

135. ایضاً، ص:19

136. شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:102

137. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)، ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں، علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ ، 40-اُردو بازار، لاہور، ص:70

138. خالد پرویز ملک، تاریخِ شیخوپورہ، علم و عرفان پبلشرز، C 7 –لوئر مال روڈ، لاہور، ص: 482

139. ایضاً، ص:476

140. احمد ندیم قاسمی، ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، نستعلق مطبوعات، ایف 3 الفیروز سینٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ص:3

141. شیخ محمد حیات (ریٹائرڈ پرنسپل)، ضلع خوشاب: تاریخ کے آئینے میں، علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ ،40-اُردو بازار، لاہور، ص:71

142. شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:108

143. خالد پرویز ملک، تاریخِ شیخوپورہ، علم و عرفان پبلشرز، C 7 -لوئر مال روڈ، لاہور، ص:477

144. شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:109

145. خالد پرویز ملک، تاریخِ شیخوپورہ، علم و عرفان پبلشرز، C 7 -لوئر مال روڈ، لاہور، ص:477

146. شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:111

147. احمد ندیم قاسمی، ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، نستعلق مطبوعات، ایف 3 الفیروز سینٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ص:3

148. مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص:27

149. خالد پرویز ملک، تاریخِ شیخوپورہ، علم و عرفان پبلشرز، 7C -لوئر مال روڈ، لاہور، ص:478

150. شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:115

باب پنجم:

اُردُو سفر ناموں میں صوبہ خیبر پختونخوا کی علاقائی ثقافت کی پیش کش

پشاور پاکستان کا ایک قدیم شہر اور خیبر پختونخوا کا صدرِ مقام ہے۔بڑی وادی میں بنا یہ شہر درہ خیبر کے مشرقی سرے پر واقع ہے۔پاکستان اور افغانستان کی سرحد کے پاس ہے۔وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا کی اہم گزر گاہوں پر واقع یہ شہر علاقے کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔وسطی ، جنوبی اور مغربی ایشیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہونے کی وجہ سے پشاور صدیوں سے افغانستان ،جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے درمیان ایک مرکز کی حیثیت سے قائم چلا آرہا ہے۔خیبر پختونخوا کی طرح درہ خیبر کے مشرقی سرے پر واقع پشاور سطح مرتفع ایران کا حصّہ ہے۔ہزاروں سال پہلے پشاور پر ایرانی حکومت کرتے تھے۔کیومرث ایران کا شہنشاہ تھا۔اس کی چوتھی پشت سے افروال حکمران بنااور اس علاقے کو آباد کر کے اس کا نام پور شاپور رکھ دیا۔چینی سیاح ہون سانگ نے سے پولو شا پولو کا نام دیا۔جب کہ البیرونی نے اسے پورشاپورا یا پرشاپور کا نام دیا۔

بقول قاری جاوید اقبال :

> " چینی سیاح ہون سانگ نے اسے پولو شاپو لو ،لکھا سنسکرت میں اسے سوپورہ بھی لکھا گیا۔جب کہ البیرونی نے اسے پورشا پورا یاپرشا پور لکھاعلاوہ ازیں جب پہلا اسلامی لشکر حضرت سنان بن سلمہ کی سر براہی میں گندھارا میں وارد ہوا تو اس پوری وادی کو اس وقت "روہ" بھی کہتے تھے جب کہ ایک روایت کے مطابق اس علاقے کو "بدھیہ" بھی کہاجاتا رہا۔"(1)

پشاور مہاراجہ کنشک کا دارالخلافہ تھا۔اس وقت اسے پرشاپور کہا گیا۔پھر اسے پیش آور کہا جانے لگا۔یہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "پہلا "------ سے آنے والے حملہ آوروں کا پہلا پڑاؤ یہاں ہوتا تھا اسی نسبت سے اسے پیش آور کہا گیا۔مختلف آنے ولے اقوام اپنے ساتھ ہنرو پیشے

بھی لے کر یہاں آئے جس کی وجہ سے اسے پیشہ آور بھی کہا جانے لگا۔ جو بعد میں تبدیل ہو کر پشاور بن گیا۔

پشاور پاکستان کا سب سے قدیم اور آباد شہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار سال کے دوران اس میں ایک روز بھی سناٹا نہیں ہوا۔ یونانی اور عربی مورخوں اور چینی سیاحوں نے اپنی کتابوں میں پشاور کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے اور اس شہر کے عجیب کئی نام لکھے ہیں: پسکا پور، پولو شا پولو اور پرشاور، پشاور کو پھولوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ چینی سیاح فاہیان 1600 سال پہلے پشاور آیا تھا۔

بقول رضا علی عابدی:

> "پاکستان کا یہ سب سے قدیم آباد شہر ہے۔ یونانی اور عربی مورخوں اور چینی سیاحوں نے اپنی کتابوں میں پشاور کا ذکر بڑے چاؤ سے کیا ہے اور اس شہر کے عجیب و غریب نام لکھے ہیں: پسکا پور، پولو شا پولو اور پرشاور۔"[2]

کشان کے زمانے میں جو کتبہ ملا تھا وہ دوسری صدی عیسوی کا تھا۔ جن میں سب سے پہلے پشاور شہر کا نام آتا ہے۔ جسے پوش پور کہا جاتا تھا۔ یہ پراکرت لفظ ہے جس کے معنی ہیں "پشپ پور" یعنی پھولوں کا شہر۔ کنشک کے زمانے سے یہ شہر پاکستان میں سب سے پرانا آباد شہر ہے۔

پشاور کو جنوبی ایشیا کا قدیم ترین شہر مانا جاتا ہے۔ یہ کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس شہر نے کئی تہذیبوں کو اپنے دامن میں جگہ دی اور کئی تہذیبوں کے پارکھ یہاں سے گزرے بدھ مت کے لیے یہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سیاحوں، عالموں، حملہ آوروں اور پیشہ وروں نے صدیوں سے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا ہے۔ سوات ہو یا مانسہرہ، شہباز گڑھی کے آثارِ قدیمہ ہوں یا مانسہرہ کے "تخت بھائی کے کھنڈرات" یا گور گٹھری کے، رحمٰن ڈھیری کی تاریخی قدامت ہو یا خیبر کا قدیم ترین تاریخی روٹ، سب کا سرا پشاور سے جا ملتا ہے۔

یہ سارا علاقہ جو کہ اب پشاور کہلاتا ہے، گندھارا کہلاتا تھا۔ بدھ عہد میں پشاور کو جو مرکزیت حاصل تھی اسی نسبت سے اس شہر کو گندھارا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعض محققین تو اسے گندھاریوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ گندھارا وسیع و عریض خطہ ہونے کی وجہ سے دارالخلافہ بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پشاور کو گندھارا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

بدھ کا قدیم مسکن ہونے کی وجہ سے وادی پشاور میں سیاح بڑی تعداد میں آتے رہے ہیں۔ان سیاحوں میں چینیوں کی اکثریت تھی۔ان چینی سیاحوں نے صرف مذہبی مقامات کی سیر ہی نہیں کی بلکہ اُنھوں نے یہاں کی تاریخ ،جغرافیہ ،تہذیب و تمدن پر کئی کتابیں لکھیں۔مشہور چینی سیاح فاھیان ،سنگ یور ،ہیون سانگ اور ہیو چونے نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیے ہیں۔ان کی کتابوں کے تراجم دُنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے یہ کتابیں مذہبی عقیدت کا مظہر ہیں۔وادی پشاور کی تہذیب کا پتہ یہاں دریافت ہونے والے آثار و تحاریر سے بھی ملتا ہے۔قدیم چینی سیاحوں کی زیادہ تر دلچسپی ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

بقول الحاج ایم زمان کھوکھر :

> ”یہ سیاح اس وقت یہاں آتے جب یہ شہر اپنی پوری آب و تاب اور رعنائیوں سمیت آباد تھا۔قدیم ایرانی کتب میں پشاور کو ”دوستان“ کا حصہ بھی کہا گیا ہے یعنی نہایت ہی سخت سنگلاخ اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی وادی۔“(3)

فاھیان نے جب چین میں بدھ مت کا مطالعہ مکمل کیا تو اس کے دل میں مزید علم حاصل کرنے کی جستجو ہوئی۔سو وہ اس غرض سے وادی پشاور کی طرف عازم سفر ہوا۔وادی پشاور گندھارا تہذیب کا مرکز تھا ، اس تہذیب میں وادی پشاور اور ٹیکسلا کی تہذیب اور ساتھ ہی ساتھ سواستو (سوات) کی تہذیب کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔یہ دُنیا کی مہذب ترین تہذیب ہے جس میں علم اور گیان پر توجہ دی گئی ہے۔اس لیے اس تہذیب کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔اسی علم و گیان کی تلاش میں پوری دُنیا سے متلاشی یہاں آتے رہے اور علم حاصل کر کے پوری دُنیا میں پھیلاتے رہے۔چینی سیاح بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

سید جمال الدین شاہ لکھتے ہیں:

> ”چینی سیاحوں نے اگرچہ پشاور کا سفر اپنی مذہبی عقیدت مندی میں کیا مگر وہ دیگر معلومات بھی جمع کر کے یہاں سے لے گئے جن کا مطالعہ کر کے یہاں کی قدیم تہذیب ،ثقافت ،تجارت پیشوں اور حالات کے بارے میں اپنی کتابوں میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔پشاور شہر اور وادی

> پشاور کی تاریخ اس سے کہیں پہلے کی ہے مگر تحریری صورت میں ہمیں سب سے پہلے چینی سیاح اور عالم ہی نظر آتے ہیں۔جنھوں نے اس کی تاریخ لکھی اور اس خطے کو متعارف کروایا۔"[4]

اگر ہم پشاور کے جغرافیے پر نظر ڈالیں توپٹھانوں کی پر منظر سرزمین نے ان کی تاریخ اور طرزِ حیات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ان کا علاقہ ہمالیہ کے مغربی سرے سے شروع ہوتا ہے۔جہاں یہ سلسلہ عظیم بڑی بڑی چوٹیوں اور گڈمڈ سلسلوں یعنی قراقرم ، پامیر اور ہندوکش جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ قدرے تین مختلف حصّوں میں تقسیم ہے :

1. دریائے ہزارہ واحد حصّہ جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے۔
2. دریائے سندھ اور پہاڑیوں کے درمیان نسبتاً تنگ پٹی جو اضلاع مردان ، پشاور ، کوہاٹ ، بنوں اورڈیرہ اسماعیل خان پر مشتمل ہے۔
3. ڈیور نڈ لائن کے ساتھ ساتھ شمال اور مغرب کے پہاڑی علاقے جو قبائلی ایجنسیوں پر محیط ہیں۔

پٹھان یاپختون اچانک سے دریافت ہونے والی مخلوق نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک قدیم قبائلی معاشرہ ہے۔پٹھان کثیر تعداد میں نہ صرف پاکستان بلکہ افغانستان میں بھی ہیں۔ان کی زبان اور ثقافت ایک جیسی ہے۔

بقول جیمس ڈبلیو سپین:

> "پٹھانوں یاپختونوں یاافغانوں (جیسا کہ وہ عموماً اپنے آپ کو کہتے ہیں)پر گہری نگاہ ڈالنے سے پہلے یہ کہہ دیناضروری ہے کہ وہ کوئی گم نام اولین باشندے نہیں ہیں جو حال ہی میں اندرون افریقہ یاآسٹریلیا کے کسی دور افتادہ کونے میں دریافت ہوئے ہیں۔ان کا قبائلی معاشرہ غالباً سب سے بڑا اور اہم ترین ہے۔جو موجودہ دُنیا میں اب بھی زندہ ہے۔قریباً گیارہ ملین پٹھان ہیں۔جن میں سے قریباً نصف پاکستان اور نصف افغانستان میں ہیں۔"[5]

پشاور کے تاریخی مقامات میں بالا حصار فورٹ خیبر ویلی (وادی خیبر) سرِفہرست اہمیت کے حامل ہیں۔پشاور کی تاریخ گندھارا کے بغیر نا مکمل تصور ہوگی۔کیوں کہ گندھارا ایک قدیم ریاست تھی۔جو شمالی پاکستان میں صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب کے علاقے پوٹھوہار کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھی۔جب کہ پشاور ، ٹیکسلا ، تخت بائی اور چار سدہ اس کے اہم ترین مرکز تھے۔یہ دریائے کابل سے شمال کی جانب تھی۔گندھارا بدھ مت کی تعلیمات کا مرکز بھی رہا اور یہی وجہ ہے کہ پشاور میں آج تک اس کے اَثرات باقی ہیں۔یہ علاقہ دوحصّوں میں تقسیم ہے :

1. قبائلی علاقہ : جس میں مالاکنڈ ، مہمند ، کرم ، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کی ایجنسیاں شامل ہیں۔
2. چھ زیر قانون اِضلاع یعنی ہزارہ ، مردان ، کوہاٹ ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان۔

پشاور کو صوبہ خیبر پختونخوا کے ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔اس کی ثقافت طویل عرصے تک گندھارا ثقافت ، پختون ثقافت اور ہند کو ثقافت سے متاثر ہوتی آئی ہے۔اس کی اکثریت آباد پختون ہیں جب کہ پشاور میں 1980ء کی دہائی کے اوائل تک آبادی کی اکثریت ہند کو تھی جو یہاں کے مقامی ہیں۔پختون اور ہند کو ثقافتوں میں کافی چیزیں مماثل ہیں اور جغرافیائی اعتبار سے کچھ اختلافات بھی ہیں۔ہند کو افراد زیادہ تر شہری جب کہ پختون افراد کی اکثریت دیہاتی پسِ منظر رکھتی ہیں۔اسی طرح شادی بیاہ اور رہن سہن میں بھی واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔انسانی معاشرے کے حوالے سے تہذیب و ثقافت کے الفاظ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔جس سے قوم کے معاشرتی مزاج اور ذہنی و فکری رُجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔یہ الفاظ تاریخ کے ہر دور میں مسلمہ اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ہزاروں سال پرانا یہ شہر اپنی انفرادیت میں یکتا ہے یہ کہ یہاں پر وارد ہونے والی اقوام و قبائل کی لائی ہوئی تہذیب سے اس شہر کے جو رابطے ہوئے ہیں یہ سارے تہذیبی رابطے اب تک جوں کے توں قائم ہیں۔پشاور صوبہ سرحد کا ہمیشہ سے دار الخلافہ رہا ہے۔پشاور شہر اپنے اندر اتنی وسعت کا حامل ہے کہ اس نے ہر آنے والی قوم و قبیلے اور خاندان کی تہذیبی روایات کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔صوبہ سرحد تاریخی اور ثقافتی حیثیت کا علم بردار رہا ہے۔قاری جاوید اقبال "ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے" میں لکھتے ہیں :

"پشاور کا سینہ اتنا وسیع اور کشادہ ہے کہ اس نے ہر آنے والی قوم و قبیلے اور خاندان کی تہذیبی روایات کو اپنے اندر با کشادگی و فراخی سمو لیا ہے اور فنون کو اسی خاک میں مرکزیت حاصل ہوئی۔پشاور صوبہ سرحد کا ہمیشہ سے دارالخلافہ رہا ہے۔سرزمین خیبر کا پہلا تمدنی شہر ہونے کے ناطے اس کے سینے پر کئی حملہ آوروں کے عروج اور مفتوحین کے زوال کی داستانیں رقم ہیں اور یہ قابلِ ذکر تہذیبوں اور ثقافتوں کا امین رہا ہے۔یہاں پر اب بھی قدیم گندھارا کے نشانات و کھنڈرات اور ؟ بدھ مت اور ہندو مت کے ادوار کی تبرک گاہیں و عبادت گاہیں خصوصاً اسلامی عہد کے مغلوں کی بے شمار عمارتیں ،مساجد ،سیر گاہیں ،باغات اور قلعے موجود ہیں۔"(6)

پشاور کی تاریخ وثقافت بہت قدیم ہے۔انسانی تاریخ میں تمدنوں اور تہذیبوں کے آغاز سے ہی جو شہر و قریے آباد ہوئے۔ان میں پشاور کا وسیع و عریض تمدنی خطہ سرِفہرست ہے۔جسے او شہنگ پیشداد نے آباد کیا۔جس کا عہد انسانی آفرینش کے قریب تر عہد سے ہے۔پشاور ایک تمدنی خطہ ہے اور مختلف زمانوں میں اس کے نام مختلف رہے۔اگرچہ اس کی ہیئت وصورت ، تبدیلیاں رو پذیر ہوتی رہیں لیکن اس کی بنیادی قدریں قائم رہیں اور یہی اس کی ثقافتی تابندگی کی واضح دلیل ہے۔اس لحاظ سے پشاور ایسا قدیم و بے نظیر خطہ ہے جہاں کے باشندوں نے قدر افروز تہذیبوں اور ثقافتوں کی توسیع وتوزیع میں بھرپور کر دار ادا کیا۔پشاور کی ثقافتی ہیئت جو قدیم اور جدید تہذیب کا سنگم ہے۔اپنی توانائی اور استحکام کے لحاظ سے بھرپور طرح سے زندہ ہے اور اس حیرت انگیز سائنسی ترقیوں کے مناظر میں بھی پشاور اپنی قومی روایات اور سماجی احوال کی اقدار میں اپنی قدامت کو پرانی عمارتوں ،ہنر مندیوں ،دستکاریوں ، قبیلوں اور خاندانوں کے رواجوں ، کھانے پینے کے طور طریقوں میں ملاپ کے انداز وسلیقوں اور شادی و غمی کی رسموں کے نمونوں میں زندہ رکھے ہوئے ہے اور ہزاروں سال قدیم یہ شہر اپنی انفرادیت میں یکتا ہے۔پشاور کی پرانی عمارتیں اور حویلیاں اس کی عظمت کی علامت ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> " پشاور کی پرانی عمارتیں اور حویلیاں اور بچی کچھی حصار شہر اور دو تین پرانے دراوزے اس کی عظمت ماضی اور شوکت گزشتہ کی علامات ہیں۔غرض یہ کہ پشاور ایک ایسی تہذیب کا گہوارہ ہے جو اپنی ثقافت کے غیر منقطع تسلسل کی وجہ سے تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔"(7)

خیبر پختونخوا کا کل رقبہ 205344 کلو میٹر ہے۔آبادی 3 کروڑ 55 لاکھ 25 ہزار 47 ہے۔ خیبر پختونخوا 7 ڈویژن اور 35 اِضلاع پر مشتمل صوبہ ہے۔پہلے صوبہ خیبر پختون خوا تین حصّوں میں منقسم تھا:

1. صوبہ خیبر پختونخوا
2. گلگت بلتستان
3. کشمیر

ڈویژن کے نام اور اضلاع :

1. بنوں ڈویژن کے اِضلاع : لکی مروت ،بنوں ، شمالی وزیرستان
2. ڈیرہ اسماعیل خان کے اِضلاع: ڈیرہ اسماعیل خان ، جنوبی وزیرستان ،ٹانک
3. ہزارہ ڈویژن کے اِضلاع : لوئر کوہستان ، ایبٹ آباد ، ہری پور ، بٹ گرام ، اپر کوہستان ،
   مانسہرہ ،کولائی پلاس ،تورغر
4. کوہاٹ ڈویژن کے اِضلاع : اورکزئی ،کوہاٹ ،ہنگو ،کرک ،کرم
5. مردان ڈویژن کے اضلاع : مردان ،صوابی
6. مالاکنڈ ڈویژن کے اضلاع : لوئر چترال ، مالاکنڈ ، باجوڑ ،لوئر چترال ، اپر چترل ، سانگلہ ،اپر
   دیر ،لوئردیر ،سوات
7. پشاور ڈویژن کے اِضلاع: مہمند ،پشاور ، چارسدہ ،خیبر ، نوشہرہ

صوبہ سرحد یعنی خیبر پختونخوا کی سب سے بری ڈویژن مالاکنڈ ہے۔اس کا رقبہ 29872مربع کلو میٹر ہے۔جب کہ سب سے چھوٹی ڈویژن کوہاٹ ڈویژن ہے۔جس کا رقبہ 7012 مربع کلو میٹر ہے۔

صوبہ سرحد آبادی کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتا ہے۔2017 ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 3 کروڑ 5لاکھ 23 ہزار ہے۔

اس باب کا مقصد اُردو سفر ناموں کے تناظر میں صوبہ سرحد کی علاقائی ثقافت کی پیش کش ہے۔یہاں کے ثقافتی پہلوؤں کی نشاندہی اُردو سفر نامہ نگاروں نے کی ہے۔جنھوں نے پاکستان کے قدیم ثقافتی عناصر کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔خیبر پختونخوا جیسا قدیم اور دشوار گزار خطہ ثقافتی عوامل سے مالا مال ہے۔اس ثقافتی ذخیرے کو سامنے لانے کا موجب اُردو سفر نامہ نگار ہیں۔جنھوں نے قدیم اور دور افتادہ خطوں سے اُردو اَدب کو روشناس کرایا ہے۔اس باب میں اُردو سفر ناموں میں خیبر پختونخوا کی ثقافت کا عمیق جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سفر نامے وہ قیمتی مآخذ ہیں جن کی بدولت تمام ثقافتی عوامل (آب وہوا ،خوراک ،رہن سہن ، طرزِ رہایش ،پیشے ،زبان ،رسم ورواج)منظرِ عام پر آئے۔اُردو سفر ناموں میں صوبہ خیبر پختونخوا کی ثقافت کا بھرپور احساس واظہار ملتا ہے۔

اس باب کا مقصد صوبہ سرحد کے تمام اضلاع کی ثقافت کی پیش کش ہے۔ ان اُردو سفر ناموں میں "مناظرِ پاکستان" ،"دھماکہ لیک سوات" ، "کافرستان" ،" سوات سیاحوں کی جنت "،" سفر شمال کے" ،"چترال داستان" ،" سندر چترال" ،" پشاور سے کوئٹہ تک" ،"کیلاش" ، "سفر نامہ پاکستان" ، " جوکالیاں" ،"جرنیلی سڑک "،"گڈبائی شہرنو" ،" دوسفر" ، "جھیل سیف الملوک" وغیرہ شامل ہیں۔

"سفر نامہ کیلاش کتھا" ڈاکٹر عباس برمانی کا ہلکے پھلکے انداز میں لکھا گیا سفر نامہ ہے۔یہ سفر نامہ ناول اور افسانے کے انداز سے بالکل مختلف ہے۔اُنھوں نے واقعات کو حقیقی رنگ وروپ میں پیش کیا ہے۔ہلکا پھلکا مزاح تحریر کو بوجھل نہیں ہونے دیتا بلکہ جاذبیت بخشتا ہے۔

"کیلاش کتھا " کے متعلق رضی الدین رضی لکھتے ہیں :

> "ڈاکٹر عباس برمانی ان چند قلم کاروں میں سے ایک ہیں۔جنھوں نے سفرنامے کو سفر نامہ ہی رہنے دیا بلکہ اپنے بعض ہم سفروں کی طرح

سفر نامہ نہیں بنا دیا۔"کیلاش کتھا" ایک روشن خیال قلم کی تحریر
ہے۔ایک ایسی تحریر جس کو قارئین نے بھر پور محبت کا اعزاز
بخشا۔"کیلاش کتھا" کی صورت میں ہمارے اُردو اَدب میں ایک ایسے
سفر نامے کا اضافہ ہوا ہے۔جو تا دیر تر و تازہ و زندہ رہے گا۔"(8)

"کیلاش کتھا" کو پڑھنے سے انسان ایک نئی دُنیا سے متعارف ہوتا ہے۔وہ اس حسین و جمیل وادی کے خوب صورت ترین لوگوں کے تہذیب و تمدن ، ثقافت ، زبان ، رہن سہن اور مذہب و معاشرت سے آگاہ ہوتا ہے۔ان وادیوں کے فطری حسن و جمال کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے مسائل کو بھی اس سفر نامے کا موضوع بناتے ہیں۔

بقول شاکر حسین شاکر:

"کیلاش کتھا" ایک دیو مالائی سر زمین کی کہانی ہے۔عباس برمانی نے
ہمیں ایک ایسے خطے اور اس کے باسیوں سے متعارف کرایا ہے۔جو
اس تہذیب و ثقافت اور رہن سہن کے حوالے سے انفرادیت رکھتے
ہیں۔وہ اس مقصد میں قاری کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور کسی بھی موقع
پر اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیتا۔یہ سفر نامہ یقیناً ان چند سفر ناموں
میں سے ایک ہے جن میں کیلاش کے باسیوں کی اصل مشکلات اور
مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے۔"(9)

خالد اختر کا سفر نامہ "دو سفر" کے عنوان سے ہے۔اس میں اُنھوں نے اپنے دو سفری مہموں کا احوال بیان کیا ہے۔ایک" سوات" کا سفر ہے اور دوسرا "خنجراب" کا۔پہلی مہم سوات کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے اور دوسری کاغانی مہم کی روداد پر مشتمل ہے۔چوں کہ خالد اختر سواتی مہم پر نکلے ہیں اور ان کی اصل منزل سید و شریف ہے۔وہ سوات کے مرغزاروں کی سیاحت کے شوقین ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید محمد خالد اختر کے بارے میں لکھتے ہیں :

"خالد اختر اُردو اَدب کے شاید واحد اَدیب ہیں۔جنھوں نے اپنے
منفرد اسلوب تحریر اور مشاہداتی نظر سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ
بنا رکھا ہے۔ان کی تحریروں کا اپنا ایک الگ ذائقہ ہے اور جسے بھی اس
ذائقے کی چاٹ لگ گئی۔وہ اس کے جادو سے نکل نہیں سکتا اور ان کے

سفر نامے جو "دوسفر" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔اسی اسلوب کے
آئینہ دار ہیں۔ "(10)

محمد خالد اختر کے ہاں مزاح کے سبھی رنگ موجود ہیں۔ان کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ کسی بھی خطے کے مسائل کا ذکر بھی موجود ہوتا ہے۔ان کی طبیعت کی شگفتگی معاشرے کے ناسوروں پر اشک بار بھی ہو جاتی ہے۔

بقول غفور قاسم شاہ :

" خالد کی تحریروں میں ایک اعلیٰ مزاح نگار کی اُداسی کا پرتو نظر آتا ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ اپنی تمام تر زندہ دلی کے باوجود محمد خالد اختر حزینہ اُسلوب نگارش سے نہیں بچ سکے۔"(11)

"مناظر پاکستان " اس سفر نامے کی ماجد فرید ساٹی نے سادہ اور سلیس زبان میں رُودادِ سفر بیان کر کے اپنی تحریر کو امر بنادیا ہے۔ان کا اسلوب نگارش قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔شمالی علاقہ جات اور پنجاب کی سیاحت سے لطف اندوز ہونے کے بعد مسافر سوات ،بلوچستان ،سندھ ، کشمیر اور کاغان کے خوب صورت علاقوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔سوات میں مٹلتان،وادی دیر ،وادی اشو اور مالم جبہ مسافر کی نظر انتخاب ہیں۔

کاغان ،ناران ،لالہ زار ،آنسو جھیل ، جھیل دودی ،پت سر اور بابو سرٹاپ تک ماجد فرید ساٹی کے قدم پہنچے۔سوات کے سیاحتی مقام ، مالم جبہ جیسے پرکشش اور پہاڑی سلسلے میں مسافر اپنے آپ کو جنتی تصور کرتا ہے۔

ماجد فرید ساٹی یہاں کے حُسن و جمال سے نہ صرف محظوظ ہوئے بلکہ اُنھوں نے یہاں کی سیاست کے ساتھ ساتھ ثقافت کو بھی مدِ نظر رکھا۔

بقول مستنصر حسین تارڑ :

" جیسے ایک شاعر کے لیے زبان و بیان سے بڑھ کر حسِ شعر ضروری ہے۔اسی طور ایک سفر نامہ نگار کے لیے حسِ آوارگی شرط ٹھہرتی ہے۔مجھے خوشی ہے کہ ماجد فرید ساٹی ایک نہایت عمدہ قسم کا آوارہ گرد ہے وہ ہر منظر چہرے اور عمارت کو اس بے یقینی سے دیکھتا ہے کہ جیسے

انھیں آخری بار دیکھ رہا ہو۔جیسے اس کی رُوح میں اُتر جائے اور وہیں قیام کر جائے۔ایک آورہ گرد ہمیشہ بے یقین شخص ہوتا ہے اگر اسے یقین آجائے تو وہ آوارہ گرد نہیں رہتا دُنیا دار شخص ہو جاتا ہے۔ساٹی کی حسِ مزاح بھی نہایت عمدہ ہے اور زبان کا برتا ؤ بھی قابلِ رشک ہے۔"(12)

"سفر شمال کے" یہ سفر نامہ مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کا سفر نامہ ہے۔جو کہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔جن میں وادی سوات اور خنجراب شامل ہیں۔پہلا حصّہ سوات کے سفر پر مشتمل ہے۔اس سفر نامے میں سوات میں پائے جانے والے قدیم نوادرات کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے دل کش مقامات راستے کے اندو پیش آنے والی مشکلات اور سفر کے دوران ہونے والے مکالموں کو مستنصر حسین تارڑ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ان کے سفر نامے اس بات کے غماز ہیں کہ وہ سفری زندگی کو ہمہ جہت انداز میں مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قاری تک منتقل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

بقول محمد افسر ساجد :

"تارڑ کا اَدبی اور فنی سفر کم و بیش 33 سالوں پر محیط ہے۔وہ لہجے اور اُسلوب کے اعتبار سے ایک منفرد انداز کے مالک ہیں۔آج کل سفر نامے لکھنا ایک فیشن بن گیا ہے۔جن کے ذریعے سفر سے زیادہ سفر نامہ نگار اپنی ذات کی تشہیر کرتے نظر آتے ہیں۔لیکن تارڑ نے سفر نامہ نگاری کو فن کا درجہ عطا کیا ہے۔اس کے سفر ناموں میں مشاہدہ ، تخلیق اور اسلوب بیان کی ایک خوب صورت Synthesis پائی جاتی ہے۔وہ دیکھنے ،سننے اور بیان کرنے کے عمل میں قاری کو اس کے طعام و تعین معطل کیے بغیر اپنے ساتھ مسلسل شریک رکھتا ہے۔"(13)

مستنصر حسین تارڑ ایک منجھے ہوئے سفر نامہ نگار ہیں۔سفر نامے کی دُنیا ان کے ذکر کے بغیر نا مکمل ہے۔ان کا سفر نامہ "داستان چترال" چترال کے حُسن و جمال اور ثقافت و تہذیب پر مشتمل سفر

نامہ ہے۔ان کا ایک سفر نامہ ''ٹلہ جوگیاں'' ہے۔اس میں سوات کے اسٹوپوں کا بکثرت ذکر موجود ہے۔سفر نامہ ''کیلاش'' کیلاش کے لوگوں کے رَسوم ورَواج اور ثقافت پر مبنی ہے۔

''سُندر چترال'' سلمیٰ اعوان کا تحریر کردہ سفر نامہ ہے۔وادی چترال کی تہذیب وثقافت اوررَسم ورَواج کو بیان کرنے اوروادی کی مذہبی اور غیر مذہبی رَسومات کو سمجھنے میں یہ سفر نامہ ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔

بقول غفور شاہ قاسم:

''سلمیٰ اعوان کے شمالی علاقہ جات کے سفر نامے ، مستنصر حسین تارڑ کے انہی علاقوں کے سفر ناموں کی طرح خاصے کی چیز ہیں۔''[14]

''کافرستان'' یہ سفر نامہ محمود دانش ور کا تحریر کردہ ہے۔یہ چوں کہ نثر اد کا سفر نامہ ہے اس لیے اُنھوں نے اسے فارسی زبان میں لکھا ہے اور اسے اُردو کے قالب میں ڈھالنے والے خلیل احمد ہیں۔محمود دانش ور نے ''کافرستان'' کے خوب صورت علاقے ان کی تہذیب ،ثقافت ،رَسوم ورواج کو خوب صورت لفظوں کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔جب ہم اس سفر نامہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو 1952ء کا چترال ، دیر ، سوات اور کافرستان کے خوب صورت علاقے ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔''کافرستان'' زندگی سے بھرپور سفر نامہ ہے۔وہ ایک آزاد منش اور آوارہ گرد سیاح کی طرح ان شمالی پہاڑی علاقہ جات کی سیر کرتے ہیں۔سفر اسی کا نام ہے۔

بقول سید محمد ابن الحسن :

''سفر ذات کے تنگنائے سے نکلنے اور پھیلے ہوئے ان دیکھے روابط سے جڑنے کا نام ہے۔''[15]

پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر لکھا گیا یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد سفر نامہ ہے۔جو ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ یہ سفر نامہ 1952ء کے دیر ،چترال ،سوات ، کافرستان اور پشاور کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

بقول مظہر فریدی :

''محمود دانش ور ایرانی نے تاریخ اور جغرافیائی ماحول نسل در نسل زندگی کا جزو بننے والی باتیں ،روایات اوررسوم ورواج کا رُوپ دھار چکی

ہیں۔ مصنف نے عقائد ،عادات ،رَسوم ورَواج ،لین دین ،طرزِزندگی ، مردوں اور عورتوں کا لباس ،شادی بیاہ ، کھاناپینا ، جرائم اور مسلم وکافر کلچر کے باقیات کا اس خوب صورتی سے تجزیہ کیاہے کہ یہ سفر نامہ سراپا انتخاب ہے اور ہر لفظ معلومات کی پرتیں کھولتا اور کافرستان کی ثقافت اور تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتا چلاجاتا ہے۔"(16)

کافرستان سے واپسی پر ایرانی سیاح نے کچھ دن وادی سوات میں قیام کیا اس قیام کے دوران سوات کے مذہبی ،سیاسی ،تہذیبی وتمدنی اور تعلیمی اوررفاہی امور کابغور مطالعہ کیا۔

"سوات سیاحوں کی جنت " کے عنوان سے یہ سفر نامہ فضل ربی راہی نے تحریر کیا ہے۔فضل ربی راہی کامیدان تحریر سیاحت ہے۔وادی سوات دُنیا کے حسین ترین خطوں میں شامل ہے۔سوات کو تین طبعی حصّوں میں تقسیم کیاجاسکتا ہے :

1. زیریں سوات
2. بالائی سوات
3. کوہستانی سوات

قدرت نے سوات کو بے حد حسین اور دل کش بنایا ہے۔یہ پاکستان کاسوئٹزلینڈ ہے۔فضل ربی راہی نے نہ صرف تاریخ ،جغرافیہ ، حسین مناظر قلم بند کیے ہیں۔یہاں کی تہذیب ، ثقافت اوررسم و رواج کو بھی جامہ تحریر میں لانے کا کام کیا ہے۔یہ سفر نامہ سوات کوعیاں کرنے میں اہم مقام رکھتا ہے۔

سید قاسم محمود "سوات سیاحوں کی جنت" کے متعلق لکھتے ہیں:

" سوات اور شمالی علاقہ جات کے بارے میں آپ کے مضامین میں نے پڑھے ہیں۔دل چسپ اور معلومات افروز ہیں۔کاش پاکستان کے ہر علاقے اورہرخطے کوایک فضل ربی راہی میسرآ جاتا۔"(17)

فضل ربی راہی نے اس سفر نامے میں کسی بھی نقطے کو تشنہ نہیں چھوڑا۔یہ سفر نامہ معلومات کا خزینہ ہے۔

بقول مستنصر حسین تارڑ :

"خوش حال خٹک نے کہا تھا کہ سوات وہ وادی ہے ،جو لوگوں کے دلوں کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔تو آج کے عہد میں خوشی کی جتنی کمی ہے وہ صرف سوات جانے سے ہی ہو سکتی ہے اور اگر سوات جانا ہے تو کیسے جانا ہے اور وہاں کہاں کہاں جانا ہے اور کیا دیکھنا ہے؟ بس یہی مشکل سوال تھے جنھیں راہی نے حل کر دیا ہے اور یہ مشکل آسان ہو گئی ہے۔

سفر نامے کسی وادی یا علاقے کے بارے میں دل میں اُمنگ تو پیدا کر سکتے ہیں کہ وہاں جانا چاہیے آپ کی انگلی پکڑ کر آپ کو سفر ی ہدایت نہیں دے سکتے اور یہ کام صرف ٹورسٹ گائیڈ ہی کر سکتے ہیں۔راہی صاحب اہلِ سوات ہیں اور وہی ایسی گائیڈ بک لکھنے کے اہل تھے۔اُمید ہے اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔"(18)

"کافرستان" یہ ثقافتی عناصر سے بھرپور سفر نامہ ہے اس کے مصنف پر ویش شاہین ہیں۔وہ پشتو میں کئی کتب کے مصنف ہیں۔اس کتاب کا موضوع کافرستان کی ثقافت ہے۔یہاں کے باشندوں پر ان کی تحقیق بہت کار آمد ہے۔سیاحوں کے لیے یہ ایک نادر کتاب ہے۔اس کا ہر ایک ورق معلومات کا بیش بہا خزینہ ہے۔

بقول ڈاکٹر صابر کلوروی :

"کافرستان کے مصنف پرویش شاہین صوبہ سرحد کے نام ور محقق ہیں۔وہ پشتو میں بھی کئی کتب کے مصنف ہیں۔ان کی یہ کتاب ان کی اُردو زبان پر بھی دسترس کو ظاہر کرتی ہے۔اس کتاب میں اُنھوں نے کافرستان کے کلچر اور زبان کو موضوع بنایا ہے۔یہاں کے باسیوں پر ان کی تحقیق اُچھوتی ہے۔اس میں اُنھوں نے بڑی محنت سے تحقیق کی کڑیاں ملائی ہیں۔خاص طور پر یہاں ان کی زبان کے بارے میں اُنھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔پاکستان کی مختلف زبانوں اور ان کی ابتدا اور باہمی رشتوں کے ضمن میں اب تک جو تحقیق ہوئی ہے۔اس کتاب کی روشنی میں اس پر نئے سرے سے غور و فکر کرنے کی

ضرورت ہے۔اُمید ہے یہاں کی زبانوں پر ان کی تحقیق لسانیات کے نئے دوازے وا کرے گی۔سیاحوں اور اس پر اسرار علاقے کے بارے میں دل چسپی لینے والوں کے لیے اس کتاب میں دل چسپی کا وافر مواد موجود ہے۔شاہین صاحب کی معلومات کتابی نہیں ہیں۔اُنھوں نے اس علاقے میں خود جا کر معلومات حاصل کی ہیں اور یوں یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے ،شاہین صاحب کی تصانیف میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔"(19)

پشاور شہر شمال مغربی سرحد کے ایک شہر کی حیثیت سے مشہور ہے۔صدیوں سے یہ شہر تاریخ میں ناقابل تسخیر پٹھانوں کا قلعہ لکھا جاتا رہا ہے۔قدیم زمانے میں کاروانوں کا راستہ رہا ہے اور اب بھی بے شمار صدیوں گزر جانے کے بعد بھی یہ شہر باعزت تجارتی مرکز ہے۔محبت ، قہقہے اور تشدد پشاور کے ماحول میں ہمیشہ اکھٹے رہے ہیں۔پشاور ایک ایسی جگہ ہے جو سیاحوں کے لیے ایک پیرائیہ آغاز ہے۔پشاور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افغان سرحد پر یہ سب سے بڑا فوجی مرکز ہے اور پاکستان ریلوے کا آخری اسٹیشن ہے۔یہاں پاکستان کی حد ختم ہو جاتی ہے۔

کیمی پوا اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان" میں پشاور کے بارے میں لکھتی ہیں:

" پشاور کا اپنا ایک وقار ہے۔قدرت نے اسے زندگی کی نعمتوں سے نوازا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ رُومان پرور درہ خیبر اور دل کش ریاست سوات کا دروازہ بھی ہے۔"(20)

پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔یوں تو پاکستان کے چار صوبے ہیں۔ہر صوبہ اپنی جگہ بے مثال ہے۔مگر خیبر پختونخوا اپنی مثال آپ ہے۔یہاں کا حُسن ،وادیاں ، حسین مناظر ،طرزِ زندگی ، رسم ورواج ،لوگوں کی عادات واطوار بھی منفرد اور قابلِ دید ہیں۔

بقول پرویش شاہین:

"یوں تو پاکستان کے چاروں صوبوں کا اپنا ایک منفرد حُسن ہے۔لیکن صوبہ سرحد اپنے چٹانی وجود میں قدرت کے انمول حُسن کو سموئے ہوئے ہے۔اس کے مختلف شہر اور وادیاں فطرت کے حسین نظاروں

سے مالا مال ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کے طرزِ زندگی اور رسم و رواج
میں ایک دل کش سادگی ہے۔"(21)

i. آب و ہوا :

اس باب کا مقصد اُردو سفر ناموں میں صوبہ خیبر پختون خوا کی ثقافت کو سامنے لانا ہے۔یوں تو اس صوبے کے تمام اضلاع اپنی قدامت پسندی کی داستان ہیں۔لیکن ہر علاقہ دوسرے علاقے سے قدرے مختلف ہونے کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔آب و ہوا کو ہی اگر دیکھا جائے تو یہ وہ ثقافتی عنصر ہے جو باقی تمام عناصر پر اثر انداز ہوتا ہے۔کیوں کہ جیسی آب و ہوا ہوگی ویسا ہی لباس زیب تن کرنا ہوگا ویسا ہی رہائش کا انتظام ہوگا ،ویسی ہی خوراک ہوگی۔اسی طرح کے پیشے اختیار کرنے ہوں گے جو وہاں کی آب و ہوا کے مطابق ہوں گے گویا آب و ہوا کسی بھی علاقے کی ثقافت کا بھرپور انداز میں احاطہ کرتی ہے۔اب ضلع کوہاٹ کو ہی لیجیے۔یہ صوبہ سرحد کے اُنیس ضلعوں میں سے ایک ضلع ہے۔اس کی دو تحصیلیں ہیں : تحصیل ہنگو اور تحصیل کوہاٹ۔

یہاں کی آب و ہوا اور موسم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔مئی سے لے کر اگست تک شدید گرمی پڑتی ہے۔جون کا مہینہ انتہائی گرم ہوتا ہے۔اس موسم میں دن لمبے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔خزاں کا موسم ستمبر سے لے کر اکتوبر کے آخر تک رہتا ہے۔ان مہینوں میں گرمی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔دن رات تقریباً برابر ہونے لگتے ہیں۔پتے جھڑنے لگتے ہیں اور عموماً اس کو پت جھڑ کا موسم کہا جاتا ہے۔پھر موسم بدلنے لگتا ہے اور بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔

احمد پراچہ "تاریخ کوہاٹ" میں لکھتے ہیں:

"ضلع کوہاٹ میں دسمبر ، جنوری اور فروری سردی کے مہینے ہوتے ہیں۔مغربی پہاڑ وں پر برف باری ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور سخت سردی پڑتی ہے۔" (22)

مارچ اور اپریل کے مہینے خوش گوار ہوتے ہیں۔موسم معتدل رہتا ہے۔یہ موسم بہار ہے۔ان مہینوں میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔درختوں پر نئے پتے نکل آتے ہیں۔دن رات اس

موسم میں پھر برابر ہونے لگتے ہیں۔ بہار اور خزاں دونوں موسم ایسے ہیں جس میں دن رات برابر ہو جاتے ہیں۔

اکتوبر سے اپریل تک موسم اچھا رہتا ہے۔ جاتی خزاں اور آتی بہار یہ دونوں موسم انتہائی خوش گوار اور درمیان میں 3 ماہ سخت سردی کے مہینے ہیں۔ دسمبر، جنوری، فروری سخت سردی کے مہینے ہیں۔ پشاور کے پہاڑی علاقے ان موسموں میں برف سے ڈھک جاتے ہیں اور سردی کی شدت چبھتی ہے۔ دیہاتوں میں پہاڑیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ موسم انتہائی دل فریب ہوتا ہے۔

کیمی پوا "سفر نامہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

> "اکتوبر سے اپریل تک آب وہوا خوش گوار اور عمدہ ہوتی ہے لیکن
> جنوری، فروری میں دیہات میں پہاڑیاں برف سے ڈھک جاتی ہیں اور
> ہوا میں سردی کی شدید چبھن بڑی مزے دار ہوتی ہے۔"[(23)]

پشاور کے گردو نواح میں ایک اور قابلِ دید مقام نوشہرہ ہے۔ یہ شہر دریائے کابل کے کنارے پر پھیلا ہوا ایک چھوٹا سا دیہاتی قصبہ ہے۔ چار میل کے فاصلے پر رسال پور ہے جو پاک فضائیہ کا اہم اسٹیشن ہے۔ یہ خوب صورت مقام دریائے کابل کے بائیں کنارے آباد ہے۔ یہ ایک خوب صورت بستی ہے۔ جہاں پشاور سے زیادہ خنکی ہے اور یہ جگہ سطحِ سمندر سے خاصی بلند ہے۔

وای پشاور چار موسموں کا خطہ ہے۔ فروری، مارچ اور اپریل کا موسم" سپر لے" کہلاتا ہے۔ پشتو میں بہار کو "سپر لے" کہتے ہیں۔ کبھی کبھی بارش ہوتی ہے، ہوا ٹھنڈی اور خوش گوار رہتی ہے، مئی جون اور جولائی کا موسم گرم ہے، جسے "اوڑھے" کہتے ہیں۔ بارش شاذو نادر ہی ہوتی ہے۔ یہ سال کا گرم ترین موسم ہے۔ اگست، ستمبر اور اکتوبر موسم خزاں کا موسم ہے جو "منے" کہلاتا ہے۔ یہ موسم گرما کی بارشوں (برشکال کہلاتا ہے) سے شروع ہوتا ہے۔ وادی میں بارشیں چند دن کے وقفوں سے ہوتی ہیں۔ یہ موسم برسات کا موسم ہے۔ فضا بوجھل اور جامد رہتی ہے۔ بارش پڑنے سے موسم بہتر ہو جاتا ہے۔ مگر بارش کے بعد شدید حبس ہو جاتا ہے۔ یہ موسم غیر صحت مندانہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ نومبر، دسمبر اور جنوری سردیوں کے مہینے ہیں۔ جنھیں "ژمے" کہا جاتا ہے۔ دسمبر، جنوری اور فروری میں پہاڑوں پر برف باری ہوتی ہے۔ پشاور اور پنجاب خاص کی آب و ہوا کے درمیان مرکزی فرق پشاور کے موسم سرما کی طوالت اور شدت کا ہے۔ گرمیوں کے موسم

میں جب پہاڑوں پر پڑی برف پگھلتی ہے تو دریائے سندھ میں اٹک کے مقام پر دریا کا راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے پانی باہر آجاتا ہے اور علاقے زیرِ آب آجاتے ہیں۔ دریاؤں کا پانی کم ہوتا ہے تو نم مٹی اور دھوپ کی تمازت سے فضا میں شدید حبس پیدا ہو جاتی ہے۔

بقول جی سی واکر ایسکوائر :

> " موسم گزر جانے اور دریاؤں کا پانی اُترنے پر (ستمبر کے آخر میں) نم مٹی دھوپ کی حرارت کی وجہ سے فضا میں شدید حبس پیدا کرتی ہے اور وادی پشاور میں ملیریا پھیل جاتا ہے۔ جو اصل میں دلدلی بخار ہے۔ اگر موسم خزاں کے مہینے اچھے اور خشک رہیں تو فضا بہت صحت بخش ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس اگر موسم بادلوں والا یا بارش کا ہو تو برعکس حالات ہوتے ہیں۔"[24]

پاکستان کے بلند و بالا شمال سے پہلے کئی ہل اسٹیشن اپنے سحر میں انسان کو مبتلا کر دینے کا حُسن رکھتے ہیں۔ ٹھنڈیانی پہاڑی سلسلوں میں بسی مشہور آبادیوں کے درمیان سب سے خوب صورت، پر سکون اور چھوٹی سی جگہ ہے۔ ایبٹ آباد پہنچ کر ٹھنڈیانی نہ دیکھنا تشنگی کا باعث ہے۔ ٹھنڈیانی اصل میں صوبہ سرحد میں بسنے والے انگریزوں کے لیے آباد کیا گیا تھا۔ ٹھنڈیانی کے ٹاپ پر جب گاڑی رُکتی ہے تو ٹھنڈی ہوائیں سیاحوں کا سواگت یعنی استقبال کرتی ہیں۔ ٹھنڈیانی کا موسم انتہائی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں بھی موسم خوش گوار رہتا ہے۔ پہاڑوں پر ہونے والی برف باری کی وجہ سے یہاں سردیوں میں شدت کے ساتھ سردی پڑتی ہے۔

ماجد فرید ساٹی نے اپنے پاکستان کے ٹور کو سفر نامے کی صورت میں سفر نامہ "مناظرِ پاکستان" میں قلم بند کیا ہے۔ ایبٹ آباد کے موسم کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> " ٹھنڈیانی میں دن کو خنکی چھائی رہتی ہے اور رات کو سخت سردی پڑتی ہے۔ اس لیے یہاں آنے والے سیاح اپنے سویٹر اور گرم چادر ضرور لاتے ہیں۔"[25]

سوات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی خوب صورتی، دریا، چشمے اپنی مثال آپ ہیں۔ سوات کے برف سے ڈھکے پہاڑ نہایت ہی خوب صورت منظر پیش کرتے ہیں۔ سوات کو پاکستان کا

سوئزر لینڈ کہا جاتا ہے۔سوات کا مٹلتان اپنی سفید مٹی کی وجہ سے مشہور ہے۔یہ سفید مٹی بطور چونا بھی استعمال ہوتا ہے۔یہاں سردیوں میں مسلسل آگ روشن رہتی ہے اور چمنیوں سے نکلتا دھواں چھتوں او ردیواروں کو کالا کر دیتا ہے اور موسم سرما کے ختم ہوتے ہی دیواروں اور چھتوں کو مٹل سے دوبارہ سفید کر لیا جاتا ہے۔یہاں برف پڑتی ہے اورجب اس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو برف پر نور کا ہالہ بن جاتا ہے۔یہاں کے گلیشیئر پر برف تہہ در تہہ بنتی رہتی ہے۔ گلیشیئر سے کچھ فاصلے پر مہوڈنڈ جھیل ہے جسے غیر ملکی سیاح برصغیر پاک وہند کی سب سے خوب صورت جھیل کہتے ہیں۔اس جھیل کے آس پاس بلند برف پوش چوٹیاں ہیں۔مٹلتان کی سیاحت کے لیے اپریل سے ستمبر تک کے مہینے مناسب ہیں کیوں کہ اکتوبر سے یہاں سردی شروع ہو جاتی ہے۔سردیوں میں برف پڑتی ہے اور گرمیوں میں گلیشیئر پگھلتے ہیں۔

بقول ماجد فرید ساتی :

> ”گرمیوں کے موسم میں اس گلیشیئر کی برفیلی دیواروں سے ٹھنڈی ہوائیں جھومتی ہوئی اُٹھتی ہیں۔جون ، جولائی میں بھی اس کے قُرب میں یوں لگتا ہے جیسے فل ایئر کنڈیشنز کمرے میں بیٹھے ہوں۔اس گلیشیئر پر تہہ در تہہ برف بنتی رہتی ہے اور یہاں سیر و تفریح کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔“(26)

وادی دیر صوبہ سرحد کا حسین علاقہ ہے۔یہاں گرمیوں میں رکنا بے وقوفی ہے۔یہاں کے پر ہجوم بازاروں میں گرم ہوائیں ہم سفر بن جاتی ہیں۔ستمبر کے مہینے میں آب و ہوا بدل جاتی ہے۔آب وہوا معتدل رہتی ہے۔موسم ہلکا ٹھنڈا رہتا ہے۔بوندا بوندی یہاں روز کا معمول ہے۔سیاح یہاں آکے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔لواری ٹاپ پر تیز بارش اور بجلی کی کڑک واپس بھاگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔بارش کی وجہ سے اُوپر پہاڑوں سے پتھروں اور مٹی کا سیلاب پوری سڑک کو بہا کر نیچے کھائی میں لے جاتا ہے۔لواری ٹاپ کے دس ہزار فٹ بلند مقام پر جب سیاح پہنچتا ہے تو سجدہ شکر ادا کرتا ہے۔سوات کا علاقہ وادی اشو یہاں گرمیوں میں تو خاصی گرمی ہوتی ہے۔البتہ دسمبر کے مہینے میں یہ وادی بھی شدید سردی کا منظر پیش کرتی ہے۔مینگورہ اور سیدو شریف ان جڑواں شہروں کا موسم بھی گرمیوں میں گرم ہوتا ہے۔

بقول ماجد فرید ساٹی :

> "گرمیوں میں تو یہاں بازاروں ، ہوٹلوں اور ہجوم کے باعث شدید گرمی ہوتی ہے۔مگر دسمبر کے موسم میں یہ شہر بھی ایک خواب ناک منظر پیش کرتے ہیں۔"(27)

سوات دُنیا کے حسین ترین خطوں میں شمار ہوتا ہے۔سردیوں کے موسم میں یہاں خوب برف باری ہوتی ہے۔گرمیوں میں جب برف پگھلتی ہے تو پوری وادی ایک الگ ہی مناظر پیش کرتی ہے۔اس خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے ملکی اور غیر ملکی سیاح سوات کا رُخ کرتے ہیں اور یہاں کے دل کش مناظر سے محظوظ ہوتے ہیں۔لگتا ہے جیسے ہر طرف سبزے کا بستر بچھا ہو یہ حسین منظر آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں۔

سوات کے شہر سیدو کی آب وہوا نہایت معتدل ہے۔وادی سوات اور بونیر کے درمیان ایلم پہاڑ کا طویل سلسلہ حائل ہے۔ٹاپ سے بونیر کے میدانوں اور برف پوش چوٹیوں کا نظارہ بہت حسین اور دل فریب ہے۔دنگرام سے آگے "جابسیل" اور کوکاری بلند پہاڑوں کے عین وسط میں ہونے کی وجہ سے یہاں گرمیوں کا موسم معتدل اور خوش گوار رہتا ہے۔سردی کے موسم میں بہت زیادہ یہاں برف پڑتی ہے۔فضا گٹ بھی ایک خوب صورت علاقہ ہے۔موسم معتدل ہونے کی وجہ سے سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز ہے۔گرمیوں میں متعدل موسم کی وجہ سے یہاں کئی خوب صورت ہوٹل تعمیر ہیں جو سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔مالم جبہ سوات کے سیاحتی مراکز میں منفرد خصوصیات کی حامل ایک جدید تفریح گاہ ہے۔مالم اور جبہ دو الگ الگ مگر آپس میں ملے ہوئے علاقے ہیں۔مالم جبہ کے قریب پہنچتے ہی ٹھنڈی ہوائیں سیاحوں کا استقبال کرتی ہیں۔مالم جبہ دسمبر سے مارچ تک برف میں ڈھکا رہتا ہے۔مالم جبہ سرسبز پہاڑوں اور دل کش مناظر کی وجہ سے خوب صورت اور پُر فضا مقام ہے۔گرمیوں میں یہاں موسم بہت خوش گوار اور قدرے سرد ہوتا ہے۔

فضل ربی راہی اپنے سفر نامے "سوات سیاحوں کی جنت" میں وادی سوات اور اس میں موجود علاقوں کی خوب صورتی اور ثقافت کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مالم جبہ دسمبر سے مارچ تک برف سے ڈھکا رہتا ہے۔اس عرصہ میں یہاں 12 سے 16 فٹ تک برف پڑتی ہے۔ہلکی برف باری اپریل کے

مہینے تک جاری رہتی ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت سردیوں میں منفی پانچ
سے 10 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے جب کہ موسم گرما میں درجہ
حرارت دس سے پچاس ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔"(28)

میاں دم سوات کی ایک سحر انگیز وادی ہے۔ یہ وادی خوش رنگ و گل اور دل کش مناظر اور معتدل آب و ہوا کی وجہ سے دل و دماغ کو فرحت اور آسودگی بخشتی ہے۔ سوات، کوہستان وسیع و عریض وادی سوات ایک خوب صورت اور پر کشش علاقہ ہے۔ سوات کوہستان ضلع سوات کے ساتویں سب ڈویژن پر مشتمل ہے۔ بحرین کو سوات کوہستان کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہاں سردیوں میں 10 سے 16 فٹ تک برف پڑتی ہے۔ پورا علاقہ برف کی سفید چادر اوڑھ لیتا ہے۔

بقول فضل ربی راہی:

" سردی کے موسم میں بعض اوقات یہاں بڑے بڑے گلیشیر پہاڑوں
کی بلندیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے کی طرف آتے ہیں۔ جن کی تند و تیز
ہوا سے بڑے بڑے مضبوط درخت بھی جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ سردی
کے موسم میں زیادہ برف باری کی وجہ سے اتروڑ، گبرال اور مٹلتان
وغیرہ کی وادیوں سے دیگر علاقوں کا زمینی راستہ کٹ جاتا ہے اور کئی
ہفتوں تک یہاں کے باشندے سوات کے مرکزی شہر منگورہ تک آنے
جانے سے قاصر رہتے ہیں۔"(29)

گل و لالہ کی وادی بحرین، سوات کے مرکزی شہر منگورہ سے 64 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وادی اپنے حسن و دل کشی اور خوب صورتی میں سوات کے دیگر علاقوں میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ یہاں کی صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے یہ جگہ بہترین تفریح گاہ تصور کی جاتی ہے۔

وادی کالام یہ علاقہ دریائے سوات کے کنارے کنارے کاغان سے بہت زیادہ خوب صورت ا ور میدانوں کی شادابی کی وجہ سے کشمیر ثانی ہے۔ گرمیوں میں یہاں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا موسم خشک اور معتدل رہتا ہے۔ کالام کی ایک انفرادیت ہے کہ دن کے وقت یہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں جو شام کو رک جاتی ہیں۔ اس لیے دن کو گرمی اور رات کو زیادہ سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ اتروڑ اور گبرال سرد علاقے ہیں۔ یہاں خوب برف پڑتی ہے اور اتنی زیادہ کہ سردیوں

میں عموماً اتروڑ اور گبرال کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔اکتوبر ،نومبر کے مہینوں میں یہاں برف باری کی شروعات ہوتی ہے جو مارچ ،اپریل تک جاری رہتی ہے۔یہاں سیر وسیاحت کے لیے موزو ں مہینے مئی ، جون ،جولائی ،اگست اور ستمبر ہیں۔اس کے بعد یہاں جانا خود کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

اوشو ، مٹلتان ،گلیشیر ، آبشار ،مہوڈنڈ ،سوات کے حسین گوشے ہیں۔یہاں سردیوں میں اس قدر برف پڑتی ہے کہ یہ تمام علاقے سوات کے مرکزی شہر مینگورہ سے کٹ جاتے ہیں۔یہ علاقے ''سوات کوہستان'' میں شامل ہیں۔

بقول فضل ربی راہی:

> ''اکتوبر ،نومبر کے مہینوں میں برف باری شروع ہو جاتی ہے اور تمام راستے دسمبر کے وسط سے فروری کے آخر تک بند ہو تے چلے جاتے ہیں۔یہاں سردیو ں میں اتنی زیادہ برف پڑتی ہے کہ اوشو ،مٹلتان اور مہوڈنڈ بشمول کالام اور اردگرد کے تمام علاقے سوات کے مرکزی شہر منگورہ سے کٹ جاتے ہیں۔''(30)

بش گرام جھیل یہ حسین و جمیل اور طلسماتی جھیل سوات کا مشہور تفریحی مقام ہے۔یہاں ستمبر کے مہینے میں برف باری شروع ہو جاتی ہے اور یہاں رہنے والے یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔شدید ترین سردی کی وجہ سے لوگوں کا رہنا دشوار ہو جاتا ہے جیسے ہی گرمیوں کا موسم شروع ہوتا ہے۔یہ لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجاتے ہیں۔چترال اس کی اُونچی اُونچی چوٹیاں جو گرمی کے موسم میں بھی برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔سردی اور برف کی شدت کی وجہ سے ان پہاڑوں پر نہ گھاس اُگتی ہیں نہ درخت پیدا ہوتے ہیں۔سردی کے موسم میں اتنی برف پڑتی ہے کہ دریاؤں کا پانی برف بن جاتا ہے۔خاص خاص مقامات پر گھڑ سوار اُنھیں عبور بھی کر جاتے ہیں۔

بقول منشی محمد عزیز الدین:

> ''سردی کے موسم میں یہ دریا عموماً پایاب ہو جاتے ہیں۔چناں چہ خاص خاص مقامات سے گھوڑے پر سوار ہو کر انسان انھیں عبور کر سکتا ہے۔مگر گرمی کے موسم میں سب سیلاب کے سبب نا قابلِ گزر ہو جاتے ہیں۔''(31)

کافرستان صوبہ سرحد کے ضلع چترال کی ایک حسین وادی ہے۔گرمیوں میں توکافرستان بآسانی پہنچا جاسکتا ہے مگر سردیوں میں ہوائی جہاز موسم کے رحم وکرم پر ہوتا ہے اور بذریعہ سڑک پہنچنا نا ممکن ہوتا ہے۔کیوں کہ یہ راستے برف باری کی وجہ سے چھ ماہ تک بند پڑے رہتے ہیں۔کافرستان کی تینوں وادیاں بمبوریت ،بریر اور رمبور تک سردیوں میں پہنچنا نا ممکن ہے۔درہ لواری ضلع دیر اور چترال کے وسط میں واقع ہے اور چھ ماہ برف سے بند رہتا ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں بھی برف کھانے کو مل سکتی ہے۔چترال سے کافرستان کا خطرناک سفر شروع ہوجاتا ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> ”ہم صبح چار بجے وہاں سے روانہ ہوئے ہوا بہت سرد تھی ہم نے بڑے بڑے کپڑے پہن لیے۔چاروں طرف ہوائیں سنسار ہی تھیں۔“(32)

سوات کا ایک خوب صورت مقام کالام بھی ہے۔جہاں اپریل کے مہینے میں بھی سردی ہوتی ہے کیوں کہ اپریل کے مہینے تک برف کے پگھلنے کا عمل شروع نہیں ہوتا گرمی ہوتے ہی برف پگھلنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔جو اکثر سیلاب کا باعث بن جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفرنامے ”سفر شمال کے“ میں لکھتے ہیں:

> ”ایک وسیع وادی جس کے گرد اور برف پوش پہاڑ کھڑے ہیں اور ان کی برفیں ان کے قدموں میں آکر سڑک تک آتی تھیں کیوں کہ ابھی ماہ اپریل تھااور برف کا پگھلاؤ شروع نہیں ہوا تھا۔چند مکان اور واد ی کی خاموشی میں ہموار سڑک جو پتہ نہیں کہاں جارہی تھی اور وہاں سردی کچھ زیادہ تھی۔“(33)

کالام کے گاؤں الائی کوٹ میں سردی کچھ زیادہ تھی۔اپریل کا مہینہ اچھا خاصا ٹھنڈا تھا۔کالا م خوب صورت علاقہ ہے۔یہاں قبائلی لوگ رہتے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں افغان بھی پھرتے نظر آتے ہیں۔وادی سوات کا علاقہ مرغ زار جہاں کی آب و ہوا اپریل کے مہینے میں بھی قدرے بہتر رہتی ہے۔سید و شریف کی نسبت موسم ٹھنڈا رہتا ہے۔البتہ سوات کا موسم قدرے تبدیل ہو گیا ہے۔درختوں کے کٹنے سے یہاں پہلے کی نسبت اب گرمی بڑھ گئی ہے۔البتہ وادی سوت کے کئی علاقے اپریل تک ٹھنڈے رہتے ہیں۔کالام اپنی برف باری کے حوالے سے کافی مشہور ہے۔2004ء میں وہاں

چار دن تک شدید برف باری ہوئی 36 سالہ برف باری کے ریکارڈ ٹوٹے اور وہاں موجود لوگوں کا سردی سے برا حال تھا۔سیاح چند منٹ بعد گرم چائے یا گرم پانی ہوٹل والوں سے مانگتے تھے۔کیوں کہ اگر وہ چند منٹ گرم پانی نہ پیتے تو ان کے جسم اکڑنے لگتے۔

آغا سلمان باقر اپنے سفر نامے "دھماکہ لیک سوات" میں رقم طراز ہیں:

" 2004ء میں سوات میں 36 سال بعد تباہ کن برف باری ہوئی تھی۔
سردیوں کے دن تھے۔۔۔شاید جنوری تھا۔۔۔اور جب سنا کہ کلام میں
پندرہ فٹ سے زیادہ برف چار دن میں آسمان سے گری۔۔۔"(34)

ان علاقوں کی سردی یوں تو جان لیوا ہوتی ہی ہے مگر 2004ء کی برف باری نے سردی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ایسی سردی کہ بس اللہ کی پناہ۔

ii. زبان:

یوں تو کہا جاتا ہے کہ اظہار کے کئی ذریعے ہیں۔بقول شاعر : " آنکھیں بولتی ہیں ہاتھ بولتے ہیں۔" مگر اظہار کا سب سے مؤثر اور طاقت ور ذریعہ زبان ہے۔زبان اللہ تعالیٰ کا ایک انمول تحفہ ہے۔اس کے ذریعے انسان اپنے احساسات ،جذبات اور کیفیات بیان کرنے کے قابل بنتا ہے۔زبان ثقافتی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے۔انسان جو سوچتا ہے ، محسوس کرتا ہے ،اپنے گردونواح میں دیکھتا ہے ،اس کا اظہا ر وہ زبان ہی سے کرتا ہے۔جیسی انسان کی سوچ ہوتی ہے۔ویسی ہی اس کی ثقافت ہوتی ہے۔ان تمام ثقافتی عناصر کو منظر عام پر لانے میں ہمارے اُردو سفر نامہ نگاروں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔زبان کسی علاقے کی تہذیب وثقافت کا واضح اظہار ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا ،خواہ وہ ذہنی
ہوں یا مادی ، خارجی ہوں یا داخلی ،احاطہ کرلیتا ہے۔"(35)

خیبر پختونخوا ایک قدیم صوبہ ہے۔پشاور کی تاریخ وثقافت پر اگر نظر ڈالی جائے تو انسانی تاریخ میں تہذیبوں کے آغاز سے ہی جو شہر آباد ہوئے ان میں پشاور کا وسیع و عریض خطہ سر فہرست ہے۔پشاور ایسا قدیم و بے نظیر خطہ ہے۔جہاں کے باشندوں نے قدر افزا تہذیبوں اور ثقافتوں کی توسیع

میں بھرپور کردار ادا کیا اور ان کے ثقافتی میعاروں میں اضافے کا باعث بنے۔یہاں کی مادری زبان پشتو ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال :

> " پشاور کی تاریخ و ثقافت سے متعلق اس بنیادی چیز کو مدِ نظر رکھنا ہو گا کہ انسانی تاریخ میں تمدنی اور تہذیبوں کے آغاز ہی سے جو شہر و قرینے آباد ہوئے ان میں پشاور کا وسیع و عریض خطہ سرِ فہرست ہے۔"(36)

پشاور کے اصلی باشندے گندھاری تھے ،ان کی زبان پشتو تھی۔پشتو زبان کا نام اصل میں پشتو ہے اور ان کے لیے اپنی زبان کی بڑی اہمیت ہے۔پشتون یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی پشتون بغیر پشتو کے پشتون کہلانے کا مستحق نہیں۔

"تاریخ افغانستان " کے مصنف حیات خان لفظ پشتو اور پشتون کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " ملک غور میں پشت کے مقام پر اس قوم کے مورث اعلیٰ قیس عبدالرشید کی سکونت تھی چناں چہ اس جگہ کی نسبت یہ قوم پشتون کے نام سے مشہور ہوئی۔اس باعث اس کی زبان پشتو کہلائی۔یا یہ کہ پشتون منسوب بہ پشتہ ، بہ معنی پہاڑی کے ہیں۔چوں کہ یہ لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں۔اسی لیے یہ قوم کسی قدر تصرف لفظی کے بعد پشتو ن کہلائی۔پس پشتون کے معنی کوہی یا کوہستانی ہوتے ہیں۔"(37)

پشتون اپنی زبان پشتو سے بہت محبت کرتے ہیں۔اس کا ان کی تہذیب میں اتنا عمل دخل ہے کہ خود پشتونوں کے ضابطہ اخلاق کو بھی پشتو یا پشتونولی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔پشتو زبان اپنی ایک تہذیبی روایت کی حامل ہے۔یہ زبان دُنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔پشتو بولنے والے جہاں بھی ہیں ایک قوم تصور ہوتے ہیں۔آخر وہ کون سا رشتہ ہے جس نے ان مختلف نسلوں کے مابین محبت ،اُخوت اور ہم دردی کا جذبہ پیدا کیا اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔جس کے تحت آج تمام پشتون نہ صرف ایک قوم بلکہ ایک ہی نسل کے لوگ شمار ہوتے ہیں۔یہ

رشتہ پشتو (زبان) اور پشتو نولی(پشتون کلچر) کا رشتہ تھا۔پشتون اپنی ثقافت کی قدامت پر بھی فخر کرتے ہیں۔اسی طرح اپنی زبان کی قدامت کا احساس بھی رکھتے ہیں۔پشتو زبان زبانوں کے آرین خاندان کی ایرانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔جس میں فارسی اور دری زبانیں بھی شامل ہیں۔

پشاور صوبہ سرحد کا وسطی شہر ہے۔پشاور دُنیا کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے۔یہ کئی مرتبہ اجڑا اور بسا مگر پھر بھی اس کا شمار زندہ شہروں میں ہی رہا ہے۔درہ خیبر کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے پشاور میں کئی تہذیبوں نے جنم لیا اور یہاں آکر ٹھہرتے جس کی وجہ سے یہاں کئی ایک قومیں آباد ہیں۔جو فارسی اور پشتو زبان بولتی ہیں۔لیکن یہاں کے قدیم باشندے ہند کو بولا کرتے تھے جو پنجابی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ماضی میں یہ شہر بارہ دروازوں پر مشتمل قلعہ بند شہر تھا۔لیکن اب آبادی ان قلعوں سے باہر کہیں زیادہ پھیل چکی ہے۔قدیم اور جدید پشاور میں بہت فرق ہے۔اس علاقے کی مادری زبان پشتو ہے جو کہ ہر پٹھان کی زبان ہے۔زبان ہی کی وجہ سے افغانی بھی پٹھان بن کر پاکستان میں رہتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔کیو ں کہ ان کی زبان بھی انہی کی پشتو سے ملتی جلتی ہے۔

بقول الحاج ایم زمان کھوکھر :

> ” یہاں کئی اقوام آباد ہو چکی ہیں۔ان کی زبان فارسی اور پشتو ہے۔لیکن یہاں کے قدیم باشندوں کی زبان ہند کو ہے جو پنجابی زبان سے ملتی جلتی ہے۔“(38)

وادی سوات یہاں پر لوگ زیادہ تر یوسف زئی پشتون ہیں۔اس کے علاوہ کوہستانی باشندے بھی کافی تعداد میں آباد ہیں اور پشتونوں کے ساتھ گھل مل کر اخوت اور بھائی چارے کے ساتھ رہتے ہیں۔پشتون کلچر میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ وہ خود کو پشتون کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں یہاں کے لوگ زیادہ تر پشتو زبان کے بولنے والے ہیں۔سوات کوہستان میں کئی ایک زبانیں بولی جاتی ہیں۔جیسے توروائی ، گوجری ، گاؤری اور قاش قاری وغیرہ۔اس کے علاوہ ہندکو اور پنجابی بھی بولی جاتی ہے مگر ان کے بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔اُردو چوں کہ پاکستان کی قومی زبان ہے ، جسے سب ہی بول اور سمجھ لیتے ہیں۔

فضل ربی راہی نے اپنے سفر نامے ”سوات سیاحوں کی جنت “ میں وادی سوات میں بسنے والوں کی ثقافت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔اُنھوں نے تمام ثقافتی عوامل کو نمایاں انداز میں بیان کر کے اُردو اَدب کو قیمتی خزانے سے نوازا ہے۔یہ سفر ثقافتی عوامل کا بھرپور عکاس ہے۔

فضل ربی راہی رقم طراز ہیں:

> ”یہاں زیادہ تر پشتو زبان بولی جاتی ہے۔تاہم سوات کوہستان کے علاقوں میں تو روالی ، گوجری ، گاؤری اور قاش قاری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔سوات میں پنجابی اور ہندکو بولنے والے بھی رہتے ہیں۔لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔اُردو یہاں کے قریباً تمام لوگ بول اور سمجھ سکتے ہیں۔“(39)

سوات کی ایک حسین وادی بحرین ہے جہاں پشتو کے علاوہ کوہستانی زبان سب سے زیادہ بولی جاتی ہے ،اسے ” توروالی“ کہتے ہیں۔جب کہ کالام اور اس کے قریبی علاقوں میں گاؤری نامی کوہستانی زبان بولی جاتی ہے۔تاہم پشتو زبان یہاں عام بولی جاتی ہے اور اُردو بولنے اور سمجھنے والے بیش تر افراد ہیں۔کوہستانی زبان میں ”لام“ گاؤں کہتے ہیں۔اسی وجہ سے اس علاقے کا نام ”کالام“ یعنی ”کال کا گاؤں“ رکھا گیا۔کال کی نسل کے لوگ آج بھی کالام میں آباد ہیں اور ”کالا خیل“ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔کالام میں کئی ایک بولیاں بولی جاتی ہیں۔اپنی اسی انفرادیت کی وجہ سے کالام زبانوں کا گڑھ کہلاتا ہے۔اس کے علاوہ یہاں غیر ملکی سیاح آکر اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں۔تو یوں لگتا ہے کہ یہاں مختلف زبانوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔یہاں آکر ایک نئی تہذیب اور ثقافت سے آگاہی ملتی ہے۔

بقول فضل ربی راہی :

> ”کالام میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور اس معاملے میں کالام کو مختلف علاقائی زبانوں کا گڑھ بھی کہا جاسکتا ہے۔یہاں داشوی ، گاؤری ، توروالی ، قاش قاری ،اُشوجی ، تانگیری ، گوجری اور پشتو زبانیں بولی جاتی ہیں۔قومی زبان اُردو بھی یہاں عام بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جب مختلف زبانیں بولنے والے ملکی اور غیر ملکی مہمان سیاح یہاں آکر اپنی زبانیں بولتے ہیں تو یہاں پر زبانوں کے بین الاقوامی میلہ لگنے کا

سماں ہوتا ہے۔اسی وجہ سے یہاں آ کر انسان ایک نئی تہذیب اور ثقافت سے آشنا ہو جاتا ہے۔"(40)

وادی سوات کی ایک حسین وادی "گبرال" ہے۔اتروڑ اور گبرال نہایت ہی خوب صورت اور سحر انگیز ہیں۔یہاں کی مقامی زبان کو ہستاتی اور گوجر ی ہے۔پشتو زبان عام بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ اُردو زبان تقریباً سبھی سمجھتے ہیں۔وادی سوات کی خوب صورت جھلیں ، سحر انگیز وادیاں بے مثال ہیں۔اُوشو ،مٹلتان اور مہوڈنڈ سوات کی وسیع وفراخ وادی کے حسین گوشے ہیں۔یہ علاقہ سوات کوہستان میں شمال ہے۔یہاں کے لوگوں کی زبان کوہستانی ہے لیکن پشتو عام بولی اور سمجھی جاتی ہے۔چوراٹ کوہستانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی اخروٹ کے ہیں۔ضلع چترال میں پانچ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔چترالی یا کھودار ،شناکی ،درشک ،نرصاتی وڈنگرک ،کلشوار یہ تمام زبانیں چترال کے مختلف علاقوں میں رائج ہیں۔

بقول منشی محمد عزیز الدین :

" دروش سے لے کر مقام دہیمل واقع غدر تک درش ، چترال ،لٹکوہ ،تریکھو ، ملیکھو ، مستوج ،یار خون، لاسپور اور غذر کی وادیوں میں بولی جاتی ہے۔فارسی ، سنسکرت ،ہندی ،اُردو اور پشتو کے ملاپ سے بنی ہے۔بہت شیریں اور آسان اور عمدہ زبان ہے اور ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی جاتی ہے۔"(41)

چترالی یا کھودار مختلف زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے۔یہ بہت شیریں ، آسان ہے اور چترال کے ایک بڑے حصے میں بولی جاتی ہے۔شناکی یہ زبان دہیمل سے تھمشک اور گلگت کے کچھ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔"درشک" یہ زبان وادی یاسین ، درکھوت ،توئی یا تھوئی میں بولتے ہیں۔یہ زبان ہنزہ اور نگر کی زبان سے ملتی ہے۔"نرصیاتی وڈنگرک" یہ زبان کوہستان باشقا اور گلگت میں بھی بولی جاتی ہے۔"گلش وار" کالشگوام میں بولی جانے والی زبان ہے۔یہ بالکل ایک الگ زبان ہے۔یہ کافرستان میں بھی بولی جاتی ہے۔

پشاور کے بعض علاقوں میں زمانہ قدیم میں پنجابی بھی بولی جاتی تھی۔ہندو بھی یہی زبان بولتے تھے۔اور ہند کی بولنے والے بھی پنجابی ہی بولتے تھے۔ڈوگری اور کشمیری کشمیر و جموں سے آئے

ہوئے لوگ بولتے ہیں۔جب کہ گوجر پہاڑوں کے گوجر گڈریوں کی زبان رہی ہے۔ضلع کے خٹک پشتو بولتے ہیں۔

کافرستان کی زبانیں بہت قدیم زبانوں کا مرکب ہیں۔ان پر کئی زبانوں کے اثرات ہیں۔چترال میں بھی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔یہ لوگ چترالی بھی بولتے ہیں ،فارسی بولتے ہیں ،پشتو بھی بولی جاتی ہے۔دیہات میں بولی جانے والی زبان صرف چترال ہے۔

مدراس میں بچوں کو اُردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فارسی زبان بھی سکھائی جاتی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

> ”چترال میں عام طور پر لوگ چترالی زبان بولتے ہیں لیکن فارسی بھی بول سکتے ہیں۔دیہات میں صرف چترالی بولی جاتی ہے۔پولیٹیکل ایجنٹ کے لیے بھی ضروری ہے کہ چترالی زبان میں مہارت رکھتا ہو۔سرکاری زبان تو فارسی ہے لیکن بازار میں چترالی بولی جاتی ہے۔“(42)

سوات کی زبان کے چند الفاظ ایسے ہیں جو بآسانی سمجھ آجاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے وہ الفاظ یا تو اُردو سے ملتے ہیں یا پھر سرائیکی سے۔حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سوات کی کوہستانی ،سرا ئیکی سے بہت ملتی جلتی زبان ہے۔حالاں کہ دونوں علاقوں میں بہت فاصلہ ہے ایک کسی پٹی میں دوسرا کسی اور پٹی میں۔

سوات کی مقامی زبان میں سرائیکی اور پشتو کی کچھ کچھ آمیزش ہے۔جس کی وجہ سے ان کی زبان میں سرائیکی کا ذائقہ ملتا ہے۔

سلمان آغا باقر رقم طراز ہیں:

> ”سوات کی کوہستانی ،سرائیکی سے بہت ملتی جلتی زبان ہے۔۔۔یہ سنگم عجیب سا ہے۔۔۔کہاں سرائیکی وطن جھنگ سے ملتان اور بہاول پور تک اور دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ کی پٹی میں اور کہاں ہندوکش کے بالائی حصے میں بولی جانے والی کوہستانی ! یوں سمجھ لیجیے کہ اگر

سرائیکی کے ساتھ نمک کے برابر پشتو کی آمیزش کر دی جائے اور اس میں مسالے اور زیرے کی جگہ کوہستانی کا ذائقہ ڈال کر بس ذرا اردو کا بگڑا ہوا لہجہ لے کر اس سواتی زبان کی روٹی کو چھوڑ دیا جائے تو سوات کی مقامی زبان تقریباً مکمل طور پر تیار ہو جاتی ہے۔"(43)

سوات کی کوہستانی زبان میٹھی ہے۔جس طرح سرائیکی بولنے والوں کی زبان میں ایک مٹھاس محسوس ہوتی ہے۔یہی تاثر زبان کا ہمیں یہاں بھی ملتا ہے۔لیکن کسی علاقے کی زبان کو سمجھنا اتنا آسان نہیں اسے سمجھنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پشاور شہر کے قصہ خوانی بازار میں رنگ برنگی بولیاں سننے کو ملتی ہیں۔پشتو ،پنجابی اور سب سے بڑھ کر ہندکو پشاور کا،کاروباری اور تجارتی شہر تھا اور یہ کام پٹھانوں کا نہیں۔زیادہ تر تاجر پنجاب اور دوسرے علاقوں کے تھے اس لیے یہاں پشتو کے علاوہ دوسری زبانیں سننے کا موقع ملتا ہے۔اصل پٹھان گاؤں میں رہتے ہیں۔

بقول رضا علی عابدی :

" پشاور کی آبادی کے بارے میں ملک کے بڑے مورخ ڈاکٹر احمد حسن دانی نے دل چسپ بات بتائی کہنے لگے یہ شہر پٹھانوں نے نہیں بنایا بلکہ وہ تو شہر کے باشندوں کو حقارت سے اپنی زبان میں "خاری" کہتے ہیں۔پشاور کاروباری اور تجارتی شہر تھا۔اور یہ کام پٹھانوں کا نہیں زیادہ تاجر پنجاب اور دوسرے علاقوں کے تھے۔ان کے کاروبار کی زبان ہندکو بنی اور اب بھی اسی زبان کا غلبہ ہے۔اصل پٹھان گاؤں میں رہتا ہے۔"(44)

رضا علی عابدی نے دریائے سندھ کے ساتھ چلتے ہوئے تقریباً پورے ملک کی سیاحت کی اور وہاں کے لوگوں کی ثقافت کو نہایت قریب سے دیکھا اور اپنے سفر نامے میں محفوظ کر لیا۔

iii. خوراک:

دُنیا کا ہر خطہ اپنی ثقافت ،تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے انفرادیت رکھتا ہے۔پاکستان کے تمام صوبے ثقافت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ان کی یہی انفرادیت انھیں ایک

دوسرے سے منفرد بناتی ہے خوراک کسی بھی علاقے کی ثقافت کو اُبھارنے میں اہم ہے۔خوراک وہاں لوگوں کی طبیعت ،میلانات اور رُجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔صوبہ سرحد ایک قدیم خطہ ہونے کی وجہ سے ثقافت کا منبع ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے پاکستان کے ہر صوبے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

عام لوگ سادہ غذا استعمال کرتے ہیں۔یہ لوگ گندم اور جَو کی روٹی ،ترکاری ،بوٹیاں اور جنگلی پھل ،دودھ کی بنی اشیا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔گوشت توشاذو نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔دن میں دو کھانے کھانے کارواج ہے۔ایک صبح 10 بجے (ڈوڈئی وقت) ؛ اگر کھانا بچ جائے تو دوپہر کے وقت کھایا جاتا ہے ،جسے "ماس پغین" کہتے ہیں۔شام کے کھانے کو "ماخان ڈوڈئی " کہتے ہیں۔شام کا کھانا 8 بجے کھایا جاتا ہے۔خوش حال طبقہ بھی انہی اوقات میں کھانا کھاتا ہے اور اکثر پُر تکلف کھانے کھاتے ہیں۔جیسے گوشت ،مرغی ، چاول ، جیسی اشیا کھاتے ہیں۔

بقول جی سی واکر :

"عام لوگوں کی غذا نہایت ساد ہ نوعیت کی ہے۔موسم گرما کے دوران گندم اور جَو کو ملا کر بنائی گئی روٹیاں ،ترکاری ،بوٹیاں اور جنگلی پھل ،دودھ کی مختلف پروڈکٹس ،لیکن شاذو نادر گوشت۔موسم سرما میں مکئی غذا کے طور پر استعمال ہوتی ہے کیوں کہ اسے حرارت بخش بتایا جاتا ہے۔د ن میں دو کھانے کھائے جاتے ہیں۔"(45)

غریب لوگ عموماً سادہ غذا کھاتے ہیں کیوں کہ وہ پر تکلف کھانا کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔پٹھان روٹیاں بہت زیادہ کھاتے ہیں ۔ گندم اور جو کو ملا کر روٹیاں بناتے ہیں۔سبزیاں جڑی بوٹیاں اور جنگلی پھل بکثرت کھاتے ہیں۔دودھ کا استعمال بھی کثرت سے کرتے ہیں ۔گھروں میں جانور پلے ہوئے ہیں جن کا دودھ انھیں میسر ہے ۔گوشت کے بہت شوقین ہیں مگر کھانے کو شاذو نادر ہی ملتا ہے ۔دن میں غریب طبقہ دو مرتبہ کھانا کھاتا ہے جب کہ خوش حال طبقہ دن میں تین مرتبہ کھانا تناول کرتا ہے۔

بقول جیمس:

"وہ سوچتا ہے کہ پٹھان کسی قدر گندم نما اور جَو نما فروش ہیں۔"(46)

پٹھانوں کی خوراک بہت زیادہ ہے ۔ کھانا بہت زیادہ کھاتے ہیں ۔ گندم اور جو کی روٹیاں پٹھان قوم میں بکثرت کھائی جاتی ہیں ۔

ہر علاقے کے کچھ نہ کچھ روایتی پکوان ہوتے ہیں۔ جو اس علاقے کی پہچان کہلاتے ہیں۔ جیسے پشاور کا کابلی پلاؤ ، افغانستان کا کابلی پلاؤ ، چپلی کباب ، چرسی تکہ ، کڑھائی وغیرہ۔ یہ تمام ثقافتی عوامل کسی علاقے کے کلچر کو اُبھارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اُردو سفر نامہ نگاروں نے ملک کے چپے چپے کو اپنے سفر ناموں کی بدولت متعارف کرایا ہے۔

امتیاز اے قریشی کا تعلق صحافت سے ہے۔ وہ ہر وقت اسی کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ نئی خبر ، نیا خطہ ، نئے لوگ ، نئی معاشرت کو سامنے لا سکیں۔ "گڈبائی شہر نو" ان کا یہ سفر نامہ افغانستان سے متعلق ہے لیکن افغانستان کے بارڈر تک پہنچتے پہنچتے جن جن پاکستانی علاقوں سے ان کا گزر ہوا او جس باریک بینی سے امتیاز اے قریشی نے انھیں اپنی نظروں کے فریم میں اُتار کر محفوظ کیا ہے اور پھر اسے قاری تک پہنچایا ہے۔ اس میں ان کی محنت و شوق نمایاں ہے۔ بقول امتیاز اے قریشی :

> " ان علاقوں میں کابلی پلاؤ وہ ڈش ہے جو کھانے سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا میں نے اس کی فرمائش کی۔ تھوڑی دیر میں وہ تمام لوازمات کے ساتھ حاضر ہوا۔"(47)

پشاور کے مشہور روایتی اور ثقافتی پکوانوں میں چپلی کباب کو جو مقام حاصل ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ پکوان بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے تو غلط نہ ہو گا۔ چپلی کباب یہاں کا ایسا مخصوص پکوان ہے ، جسے اہم نوعیت کی محفلوں اور عوامی حیثیت سے بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ چپلی کباب کی دکانیں زمانہ قدیم سے شہر کے ہر چوراہے ، علاقے اور تقریباً ہر محلے میں قائم ہیں۔ گائے کے گوشت کے قیمے ، مکئی کے آٹے ، پیاز اور ٹماٹر اور کئی قسموں کے مصالحہ جات کے امتزاج سے ایک خاص انداز میں گائے کی چربی کے رُوغن میں یہ چپلی کباب پکایا جاتا ہے۔ چپلی کباب کی تیاری میں اوّل سے لے کر آخر تک ہاتھ کی مہارت سے کام لیا جاتا ہے، اسی لیے اسے چپلی کباب کہا جاتا ہے۔ جب کہ سیخ کباب سیخ پر بنایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا لذیذ اور سستا پکوان ہے، جسے امیر و غریب دونوں کھا سکتے ہیں۔ یہ صوبہ سرحد کا ایک مشہور اور اہم روایتی پکوان ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

"اس پکوان کو ایک خاص تیاری ہی نہیں بلکہ خوراک میں چپلی کباب کی جو لذت اور زود ہضمی کی جو صفت ہے ، اس صفت کی وجہ سے پشاور کے اس خاص پکوان نے شہرت دوام حاصل کی ہے۔ یہ پکوان پشاور کے علاوہ صوبہ سرحد کے ہر شہر ، دیہات اور قصبے کی پہچان ہو گئی ہے اور چپلی کباب کی دُکانیں شہروں ، دیہاتوں اور قصبوں میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔"(48)

چپلی کباب کا مخصوص پکوان گائے اور بھینس کے گوشت سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ اس پکوان کی موجودہ شکل کی تیاری کو باقاعدہ رواج انگریزں کے دور میں ملا ہے اور پشاور کے دیگر پکوانوں میں مہارت رکھنے والوں نے اس کے تیار کرنے میں زیادہ سے زیادہ اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔

چپلی کباب کی خوشبو انسان کو مسحور کر دیتی ہے۔ سلمیٰ اعوان اپنے سفر نامے "سندر چترال" میں چپلی کبابوں کی خوشبو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"قصہ خوانی بازار میں چپلی کبابوں کی پاگل کر دینے والو خوشبو کو ذرا رُک کر میں نے سونگھا پر خریدا نہیں یوں یہ اور بات ہے کہ میں نے چاہا کہ آدھا کباب خرید لوں پر شرم آڑے آگئی۔ خدا یاد وکان دار کیا سوچے گا کہ کیسی شوم عورت ہے۔"(49)

سردیوں کے موسم کا ایک مخصوس مقوی پکوان میٹھی حلیم ہے۔ پشاور کے بازار میں یہ پکوان بڑے جوش وخروش سے لوگ خریدتے ہیں۔ یہ پکوان بڑے گوشت کے ساتھ مٹی کے مٹکے میں تیار کیا جاتا ہے۔ گوشت کو کاٹ کر اور گندم کو بھگو کر ایک بڑے مٹکے میں پانی ڈال کر یہ اجناس ڈال کر ساری رات اسے آگ پر پکا کر ریزہ ریزہ کیا جاتا ہے۔ صبح سویرے اس پکوان میں گھی ، چینی ، انڈے ملا کر ناشتے میں اسے کھایا جاتا ہے۔ یہ پشاور کا مقبول پکوان ہے۔ اس ثقافتی پکوان کو بڑے شوق سے لوگ روٹی کے ساتھ تناول کرتے ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال :

"ناشتے کے ساتھ دسترخوان پر یہ حلیم کھائی جاتی ہے۔ یہ پکوان زمانہ قدیم سے پشاور کا ایک ثقافتی پکوان ہے اور اسے روٹی کے ساتھ

پشاوری لوگ کھاتے ہیں۔یہ پکوان لذیر ہونے کے ساتھ ساتھ مقوی بھی ہے اور گرم بھی ہے۔اس لیے صرف سردیوں کے موسم میں یہ پکوان یہاں بنتا اور کھایا جاتا ہے۔اب بھی قصّہ خوانی کے عقب میں علی الصبح یہ میٹھی حلیم بنتی ہے اور لوگ یہیں سے خریدتے ہیں۔"(50)

سری پائے اگرچہ پنجاب کے لوگوں کا مرغوب پکوان ہے؛لیکن پشاوری سری پائے پنجاب کے سری پائے سے مختلف روایتی پکوان ہے۔ یہاں کے بڑے پائے گائے اور بھینس کے پائے بیچنے والوں کی قدیم ترین دُکانیں ہیں۔صبح اذانوں سے یہ دکانیں کھل جاتی ہیں اور ایک بہت بڑے مٹی کے مٹکے میں پکا ہوا یہ پکوان بکنا شروع ہو جاتا ہے۔لوگ چٹائیوں پر بیٹھ کر یہ مقوی غذا کھاتے ہیں۔اہلِ پشاور کا یہ غذائیت سے بھرپور روایتی اور ثقافتی پکوان ہے۔اس کے علاوہ بازاروں میں اوجڑی بھی بکتی ہے ،جو زیادہ تر دوپہر کے بعد لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال:

"اندرون کوہاٹی گیٹ میں پختہ پائے فروشوں کی دُکانیں قائم ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ پائے فروش پائے کے ساتھ ساتھ اُوجڑی بھی پکاتے ہیں۔جو زیادہ تر دوپہر کے بعد لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ان دونوں پکوانوں نے بہت فروغ پالیا۔"(51)

وادی سوات یہاں کا ناشتہ بھی بہت لذیذ ہے۔سیاح یہاں کے روایتی پکوانوں سے بھی بہت محظوظ ہوتا ہے۔ہر علاقے کے مخصوص پکوان ہیں۔کسی بھی صوبے کے ہر علاقے کی ثقافت دیکھی جا ئے تو مختلف ہے۔مگر پراٹھے ہر صوبے کا روایتی ناشتہ ہیں۔پراٹھوں کے بغیر صبح کا ناشتہ مکمل نہیں سمجھا جاتا۔پھر وہ پنجاب ہو یا سندھ ہو یا سرحد ،پراٹھے ہر دل عزیز ناشتہ ہیں۔سوات میں بل دار پراٹھے جو مکھن میں تلے جاتے ہیں ،سواتی ہوٹلوں میں سیاحوں کی بھوک بڑھا دیتے ہیں۔

بقول آغا سلمان باقر:

"خالص سواتی ناشتہ دسترخوان پر ،ہمارا شدت سے منتظر تھا۔سواتی بل دار ، خالص مکھن میں تلے ہوئے ، پراٹھے جن کی اشتہا انگیز خوشبو بھوک کو چمکا رہی تھی ،ساتھ میں کھیرے کا سالن جو میں زندگی

میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور کھانے والا تھا پراٹھوں کے ساتھ اور اس کا شوربا۔"(52)

مٹلتان سوات کے آخری کنارے پر بسا ہوا ایک سحر انگیز قصبہ ہے۔ یہاں کی سوغات خالص سواتی شہد ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے شہد کی بوتلیں سیاحوں کو فروخت کرتے ہیں۔ مٹلتان سے چند ہی قدم کے فاصلے پر گلیشیئر ہے۔ جس کی جون جولائی میں بھی برف دکھائی دیتی ہے اور ایسی ٹھنڈی ہوائیں کہ گرمیاں سردیوں کا منظر پیش کرتی ہیں۔ گلیشیئر سے کچھ فاصلے پر میوڈنڈ جھیل ہے جو برصغیر کی سب سے خوب صورت جھیل کہلاتی ہے۔ یہاں کی ٹراوٹ مچھلی دُنیا بھر میں ذائقے، لذت اور غذائیت کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اس مچھلی میں کانٹے بہت کم ہوتے ہیں اور یہ انتہائی سرد موسم میں زندہ رہ سکتی ہے۔

وادی دیر یہاں کے کھانے اپنی مثال آپ ہیں۔ یہاں کے کھانو ں کی مسحور کن خوشبوئیں سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ قصہ خوانی بازار میں دُنبے کے گوشت کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دُنبے کا گوشت انتہائی لذیذ ہوتا ہے، جو کہ یہاں کی اسپیشل سوغات ہے۔

ماجد فرید ساٹی لکھتے ہیں:

"قصّہ خوانی بازار میں دُنبے کے بُھنے گوشت کی خوشبو سیاحوں کے قدم رُوک لیتی ہے اور وہ ڈنر کے لیے جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔"(53)

دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے چائے کے کھوکھے نظر آتے ہیں۔ جہاں سارا دن چائے بکتی رہتی ہے۔ چائے کی خوشبو چائے کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے۔ ان چائے کے کھوکھوں کے پاس سیخ کباب اور بوٹیاں لگا کر فروخت کرنے والے نظر آتے ہیں۔ یہاں لوگ کباب بہت شوق سے خریدتے ہیں۔ سیاحوں کو ان مسالے دار بوٹیوں کا ذائقہ انھیں مزید لینے پر اُکستاتا ہے۔ ان کا ایسا منفرد ذائقہ ہے جو سیاحوں کو مدتوں یاد رہتا ہے۔

بحرین کی خوب صورت وادی کی بھی مرغوب ڈش میں سے ایک کباب ہیں۔ آغا سلمان باقر "سفر نامہ سوات دھاکہ لیک" میں لکھتے ہیں:

"ہم نے جی بھر کر یہ تازہ ایک سیر تغبئی "کباب" کا آرڈر دیا اور ایسے کھانا کھایا جیسے پہلی دفعہ کھا رہے ہوں۔"(54)

وادی دیر کے بازاروں میں کھانے پینے کی اشیا بکثرت نظر آتی ہیں۔بازاروں میں بڑی گہما گہمی نظر آتی ہے۔کہیں گوشت بھنتا نظر آتا ہے تو کہیں سڑک پر مرغ چھولے کی دُکان سجی نظر آتی ہے۔اسی طرح فضاگٹ میں چپلی کباب اور بالٹی مرغ کے جگہ جگہ ہوٹل نظر آتے ہیں۔یہاں کا بالٹی گوشت اور چپلی کباب انتہائی لذیزاور منفرد ہیں اور رات گئے تک یہ ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی لکھتے ہیں:

> ”رات کے وقت مینگورہ کے بازار روشنیوں سے جگمگا اُٹھتے ہیں۔فضا گٹ پارک کے راستے میں چپلی کباب اور بالٹی مرغی کے ریستوران بھرے پڑے رہتے ہیں۔“(55)

چپلی کباب پشاور کا مشہور و معروف پکوان ہے۔یہاں تک کہ آپ پورے خیبرپختونخوا میں کسی بھی علاقے میں چلے جائیں تو آپ کو چپلی کباب کی جابجا دُکانیں نظر آئیں گی۔فٹ پاتھ پر بھی کباب لگاکرلوگ بیٹھنے پر مجبور ہیں۔مینگورہ کے بازار میں رات گئے تک رونق لگی رہتی ہے۔یہاں فٹ پاتھ پر چپلی کباب کی مہک سیاحوں کواپنی طرف کھینچتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اور ان کے بیوی بچوں نے بھی چپلی کباب خریدے۔اس کی خوشبو نے انھیں ناچاہتے ہوئے بھی خریدنے پر مجبور کیا اوراُنھوں نےبڑے انہاک سے چپلی کباب کھائے۔

بقول مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے ”سفر شمال کے“ میں سوات کی سیر کرتے ہوئے اہم نکات سامنے رکھے۔وہ لکھتے ہیں:

> ”چپلی کباب نوش کرتے ہوئے جب ہم نے ہوٹل کے باتونی مالک سے کلام کی خوف ناکی کا ذکر کیا۔“(56)

ضلع کوہاٹ یہاں قبائلی نظام ہے۔یہاں کے مقامی قبائلی سردار گائے کا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔یہاں کارواج ہے کہ اگر کوئی مہمان آجائے تو یہ فوراً گائے ذبح کر کے اس کا گوشت استعمال کرتے ہیں۔یہاں کے لوگ دل لگا کر کھانا پکاتے ہیں۔اگرچہ ان کی خوراک کچھ زیادہ نہیں ہے۔گائے کے تازہ گوشت کو تنور میں پکاتے ہیں۔جس سے اس کاذائقہ مزید نکل آتا ہے۔

کیمی پوا ”سفر نامہ پاکستان“میں لکھتی ہیں :

"مقامی قبائلی سردار کے ساتھ بیٹھ کر ایک گائے کا تازہ اور سرخ رنگ گوشت کھایا۔ گائے کو ابھی ابھی ذبح کر کے باہر تنور میں پکایا گیا تھا۔ کچے پیاز کے ساتھ اس کا ذائقہ بڑا عمدہ لگا۔ درہ کوہاٹ میں لوگ بڑے دل لگا کر کھانا کھاتے ہیں۔ اگرچہ خوراک زیادہ نہیں ہوتی۔"(57)

چک درہ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ جہاں سے ریاست دیر کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں صفائی ستھرائی کا بالکل انتظام نہیں ہے۔ لوگوں کی اقتصادی حالت بڑی ابتر تھی۔ یہاں پٹھانوں میں بہت زیادہ جاہلیت ہے۔ یہاں کے لوگ پنجاب اور پشاور کی طرح مرچ نہیں کھاتے کھانا بے حد لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد یہاں نسوار کھانا اور کھلانا لازمی رکن ہے۔

یوں تو ہر علاقے کی اپنی کچھ خاص اور مشہور خوراکیں ہیں۔ جنھیں مقامی لوگ مزے لے لے کر کھاتے ہیں اور باہر سے بھی جو لوگ ان علاقوں کا رُخ کرتے ہیں تو وہ ان خاص خوراکوں سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔ کالاش یعنی کافرستان کے لوگوں کی کوئی خاص خوراک نہیں ہے۔ یہ لوگ نہایت غریب ہیں۔ یہ روز مرہ کی معمولی اور سادہ خوراک پر گزر بسر کرتے ہیں۔ انھیں صرف جشن کے موقع پر ہی کچھ بہتر خوراک مل جاتی ہے۔ بوڈ الک جشن کے بعد ان لڑکوں کے ہاتھوں میں ذبح کی ہوئی بھیڑ بکریوں کا گوشت تبرک کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ تبرک صرف مردوں کے لیے ہے عورتوں کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔ گوشت کو مقامی زبان میں "موس" کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں پیتل کے بڑے سے برتن میں پانی، گھی اور نمک ڈال کر گوشت کو آگ پر چڑھا دیتے تھے۔ اس اُبلے ہوئے گوشت کو "جشن" کہا جاتا ہے۔ جشن کو روٹی پر رکھ کر بانٹ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی خاص شخصیت ہو تو یہ جشن کسی برتن میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پنیر کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ سردیوں اور خصوصاً تقریبات میں پنیر زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

یہ سفر نامہ "کافرستان" پرویش شاہین کی اچھی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس سفر نامے میں اُنھوں نے کالاش کی ثقافت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ وہ ان کی خوراک سے متعلق لکھتے ہیں:

"بوڈ الک جشن کے بعد ان لڑکوں کے ہاتھوں ذبح کی ہوئی بکریوں کا گوشت تبرک کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے لیکن یہ تبرک کھانا عورتوں کو کھلایا نہیں جاتا گوشت جسے مقامی زبان میں "موس" کہتے

ہیں۔بوٹی کا بٹہ اور بوٹیوں کو بٹے کہتے ہیں۔پانی اور گھی کے ساتھ ایک بڑے برتن میں نمک ڈال کر آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔پرانے زمانے میں بڑا برتن پیتل کا ہو اکرتا تھا۔اب سلور کا بھی استعمال کیا جاتا ہے ، جسے "جشن" کہتے ہیں۔"(58)

چپلی کباب تو خیبر پختونخوا کا روایتی پکوان ہے جو ہر جگہ مقبول اور ہر دل عزیز پکوان مانا جاتا ہے۔مینگورہ بلند پہاڑوں میں گھرا ہوا خوب صورت اور صاف ستھرا شہر ہے۔یہ شہر دریائے سوات کے کنارے آباد ہے۔یہاں کی تکہ کڑاہی اور مرغ کڑاہی مشہور پکوان ہیں۔مینگورہ کے ہوٹل اور ریستوران ان کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہکتے ہیں اور یہ مہک سیاحوں کے دل اپنی طرف کھینچتے ہیں۔سیخ کباب ، کڑاہی تکے یہاں کے مرغوب پکوان ہیں۔مینگورہ وادی سوات کا خوب صورت اور بارونق شہر ہے۔یہاں کے کھانے خوش ذائقہ اور لذیذ ہیں۔

فضل ربی راہی سفر نامے "سوات سیاحوں کی جنت" میں رقم طراز ہیں:

"یہاں کے سیخ کباب ، کڑاہی تکے ، مرغ کڑاہی ، چکن اور رُوسٹ چکن ذائقہ اور لذت کے لیے خاص شہرت رکھتے ہیں۔"(59)

پشاور کا خاص چنا میوہ پلاؤ بھی بڑا مرغوب پکوان ہے۔جسے مردوزن اور بچے ،بڑے بوڑھے سب شوق سے کھاتے ہیں۔شادی اور غمی کے موقع پر بڑی بڑی دیگوں میں پشاور کے گھروں میں اہم تقریبات میں خاص مہارت سے یہ پلاؤ بنتا ہے۔چاولوں میں موٹا چنا اور موٹا میوہ ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ختم قران ، کسی فوتگی کے موقع پر نذرونیاز کے لیے یہ پکوان بنایا جاتا ہے۔محرم ،ربیع الاوّل اور دوسرے تہواروں پر یہ پلاؤ بنتا ہے۔یہ پلاؤ گوشت میں بھی پکایا جاتا ہے۔گوشت ہو یا گوشت کے بغیر دونوں صورتوں میں یہ ایک لذیذ پکوان ہے۔اس پلاؤ کو چلا پلاؤ کہا جاتا ہے :

"اہلیان پشاور اسی پلاؤ کو چلا پلاؤ بھی کہتے ہیں یعنی یہ اتنا لذیذ پکوان ہوتا ہے کہ لوگ جو مختلف امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان پر چاول کھانے کی ممانعت ہوتی ہے وہ مریض بھی یہ پلاؤ دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں اور اپنی صحت کا خیال رکھے بغیر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔"(60)

موٹے اور ڈکرہ چالوں سے پشاوری یہ پکوان تیار کرتے ہیں۔یہ کچھڑی سے زیادہ نَرم اور زود ہضم ہوتا ہے۔یہ پکوان چاولوں کے ساتھ مونگ میں ملا کر شوربہ بنایا جاتا ہے ،جس میں مختلف مرچ مسالے ڈالے جاتے ہیں۔پشاوری اس پکوان کو بہت شوق سے کھاتے ہیں ،اسے "شوربہ" کہا جاتا ہے۔یہ شوربہ اکثر بڑے گوشت کے شوربے میں پکتا ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> "پشاور کے گھروں میں موٹے اور ڈکرہ چاولو ں سے یہ پکوان خاص مہارت کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے جو اکثر پشاوری خواتین گھروں میں پکاتی ہیں۔یہ کچھڑی سے زیادہ نَرم ہوتا ہے۔"[(61)]

پشاور کے روایتی مشروبات:

قہوہ:

قہوہ پشاور کا ایک مرغوب اور مقبول مشروب ہے۔گھروں کے علاوہ پشاور کے ہر بازار ،ہر علاقے اور ہر محلّے میں قہوہ چائے کی دُکانیں ہیں، جنھیں قہوہ خانہ کہتے ہیں۔ہر پشاوری دن میں تین مرتبہ ضروری قہوہ پیتا ہے۔پشاور کا یہ مشروب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔جہاں پشاور کا ذکر ہو گا۔وہاں قہوے کا ذکر بھی ہو گا۔سبز چائے کی پتی سے تیار کیا جانے والا یہ مشروب خاص پشاور کا روایتی اور ثقافتی مشروب ہے۔مہمان کی خاطر تواضع میں بھی قہوہ ایک اہم عنصر ہے۔پشاور میں آباد ہونے والا ہر گھرانہ قہوہ نوشی کا عادی ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> "جب بھی کوئی مہمان آجائے تو مہمان کی تواضع کے لیے اس پانی کو خاص چینک میں ڈال دیا جاتا ہے۔پھر اس اُبلے ہوئے پانی میں سبز چائے کی پتی ملا کر اور الائچی کوٹ کرڈال دی جاتی ہے اور پھر اسے میٹھا کرنے کے لیے چینی ڈال دی جاتی ہے اور پھر قہوہ کی پیالیوں میں ڈال کر مہمان کو پیش کیا جاتا ہے۔"[(62)]

گاجر کا پانی :

یہ بھی پشاور کا ایک مشروب ہے۔جو پشاوریوں کے قدیم گھرانوں میں بڑے یا چھوٹے مرتبان میں ہوتا ہے۔یہ جگر اور معدے کی گرمی کو دور کرنے اور ہاضمے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔یہ مشروب ترش ہوتا ہے۔گھروں میں اکثر یہ خواتین خود ہی تیار کرتی ہیں۔اس کے علاوہ اچار بیچنے والے یہ مشروب تیار کر کے بیچتے ہیں۔گاجر کو پانی میں اُبال کر اس میں رائی ،نمک ، مرچ اور کالا نمک ڈال کر اس کو تیار کیا جاتا ہے اور اس کے پانی کو ٹھنڈا کر کے مرتبان میں رکھ لیا جاتا ہے۔گاجریں بھی اس میں موجود ہوتی ہیں۔پانی کو پیا جاتا ہے اور گاجریں چبالی جاتی ہیں۔پنجاب میں اس مشروب کو کانجی کہتے ہیں۔یہ جگر کی بیماریوں اور یرقان کے لیے بہت مفید ہے۔

اچھوانی:

یہ میٹھا اور مفید مشروب دورانِ زچگی زچہ کو پلایا جاتا ہے۔یہ لذیذ اور مقوی مشروب ہے۔سردیوں میں یہ مشروب نزلے ،زُکام اور بُخار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔یہ مشروب آٹے میں گھی ڈال کر بنایا جاتا ہے۔آٹے کو گھی میں سُرخ کر کے اس میں پانی ڈال کر اُبال لگایا جاتا ہے اور پھر اس میں چینی یا گُڑ ملا کر پیا جاتا ہے۔زچہ کو تین دن تک یہی مشروب پلایا جاتا ہے۔

گُڑ کا شربت:

پشاور کے بازاروں میں گرمیوں میں گُڑ کا شربت ملتا ہے۔گڑ کا شیرہ بنا کر اس میں اسپغول اور تخم ملنگی اور برفانی پانی ملا کر یہ شربت تیار ہوتا ہے جو کہ انتہائی مفید اور ٹھنڈا مشروب ہے۔دل اور جگر کی گرمی کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

گاچی:

یہ ہندکو لفظ ہے جو بادام، دودھ اور چار مغز کے مشروب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔لنگری میں بادام اور چار مغز کوٹ کر دودھ میں ملا کر گرمیوں میں برف ڈال کر ٹھنڈا کر کے پیتے ہیں اور سردیوں میں دودھ میں اُبال کر گرم گرم پیا جاتا ہے۔یہ مشروب قدیم زمانے سے رائج ہیں۔

گنے کا شیرا:

دیہاتوں میں گھانیوں پر گنے سے جو گُڑ بنتا ہے اور جو شیرا نکلتا ہے ،اسے جمع کر کے گھڑوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔دیہاتی اِسے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بطور تحفہ شہروں میں بھیجتے

ہیں۔پشاور کے لوگ اس میں پانی ملاکر شربت پیتے ہیں۔اسے روٹی کے ساتھ بھی لوگ استعمال کرتے ہیں۔یہ ہاضمے کے لیے بہترین ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> "دیہاتوں میں گھانیوں پر گنے سے جو گڑ بنتا ہے ،اس وقت اس سے جو شیرا نکلتا ہے ،اسے جمع کر لیا جاتا ہے۔چھوٹے بڑے گھڑے میں ڈال دیا جاتا ہے۔پشاور کے لوگ اسے "نکیوں" کہتے ہیں۔دیہات کے لوگ اسی مشروب کو بطور تحفہ شہریوں کے گھروں میں دوستوں اور رشتہ داروں کو بھیجتے ہیں۔"(63)

فالودہ:

پشاور کا فالودہ بہت مشہور ہے۔قصّہ خوانی بازار میں قدیم اور مشہور دُکانیں اب تک موجود ہیں۔یہ برف اور چینی سے تیار کیا ہوا مشروب ہے۔فالودہ میں کوٹی ہوئی برف چینی کا شیرا سویاں دودھ پیالوں میں ڈال کر بیچتے ہیں جو گاہک چمچ کے ساتھ پیتے ہیں۔

توتیا موتیا:

یہ پشاوری بچوں کا مشروب ہے ،فالودے کی ہی ایک شکل ہے۔رندے پر برف کو رگڑ کر اور ایک برتن یا گلاس رکھ کر برف کو اس میں جمع کر کے اسٹک لگا کر گلاس سے باہر نکال لیتے ہیں ، برف اسی شکل کی بن جاتی ہے۔اس پر گڑ یا چینی کا شیرا ڈال دیتے ہیں۔اس پر پھیکی کھیر بھی ڈال دیتے ہیں۔بچے بڑے شوق سے یہ پیتے ہیں۔یہ ایک سستا مشروب ہے۔پنجاب میں اسے گولا گنڈا کہتے ہیں۔

قلفی:

کھویا ملاکر دودھ تیار کیا جاتا ہے او راسے ٹین کے سانچے میں ڈال کر برف کے ڈبوں میں ہلایا جاتا ہے۔جس سے دودھ جم کر قلفی بن جاتے ہیں اور اس میں لکڑی کی اسٹک لگا دی جاتی ہے۔بڑی ، چھوٹی ، ہر طرح کی قلفیاں اس طرح تیار کر کے فروخت کی جاتی ہیں ، یہ گرمیوں کے موسم میں بکتی ہیں۔

بھنگ:

یہ ایک خاص قسم کی جڑی بوٹی ہوتی ہے۔جسے مٹی کی سنگری میں اچھی طرح رگڑ دیا جاتا ہے۔پھر اس میں دودھ ملا کر پیالے میں پیا جاتا ہے۔یہ نشہ آور مشروب ہے۔جسے پشاور کی خانقاہوں اور تکیوں میں ملنگ لوگ پیتے ہیں۔عام لوگ بھی اسے پیتے ہیں لیکن اب عام طو ر اس کا استعمال متروک ہو گیا ہے۔

''سفر گزشت''عبدالحفیظ مرزا کے سفر ناموں پر مشتمل کتاب ہے۔یہ سفر نامہ مختلف ملکوں اور شہروں کے سفر کی روداد سناتا ہے۔اس میں پاکستان ،افغانستا ن ،ایران ، ترکی اور پیرس کے مختلف شہرو ں کی سیاحت کے احوال کو قلم بند کیا گیا ہے۔مقالے میں چوں کہ صرف پاکستان کے سفر نامے شامل کیے گئے ہیں۔اس لیے ''سفر سرگزشت '' میں پاکستان کے خطوں کی سیاحت کا جائزہ لیا گیا ہے۔پاکستان کے جن شہروں یا جن علاقوں کے سفر کی روداد عبدالحفیظ نے اپنے سفر نامے میں لکھی ہے۔ان میں سوات ، پشاور ، درہ آدم خیل اور راول پنڈی سے ایرانی باڈر تک کے احوال شامل کیے گئے ہیں۔خصوصاً وہ احوال و واقعات جن کا سامنا مسافر کو دورانِ سفر کرنا پڑا۔اپنے سفر کا آغاز شمالی علاقہ جات سے کیا۔وادی سوات جنت نشاں خطہ زمین سے سب سے پہلے متعارف ہوئے۔مینگورہ ، سیدو شریف ،بحرین ، مدین کی سیر کی۔مینگورہ میں رات کو قیام کیا اور ایک سستے سے ہوٹل میں رات بسر کی۔یہاں کا ناشتہ بہت ہی لذیذ تھا۔لذیذ گھی میں بنے پراٹھے اور چائے کا ناشتہ کرنے کا بہت ہی لطف آیا۔یہاں کے پراٹھے انتہائی خستہ اور خالص دودھ کی بنی چائے بہت ہی مزے دار تھی پھر کھانے کے وقت بہترین قسم کے تکے جو کہ سیخ پر بھوننے کے بعد گھی میں تلے جاتے ہیں۔ان کا ذائقہ بہت ہی لذیذ ہوتا ہے اور کھانے کے بعد قہوہ کا سلسلہ چلتا ہے۔یہاں کی ثقافت بہت ہی دل نشین ہے۔قدیم اور جدید کا سنگم بھی بہت دل کش ہے۔بحرین کا کھانا اپنی جگہ ہے۔اس کی لذت کا اپنا مقام ہے۔بحرین جہاں دو دریاؤں کا سنگم ہوتا ہے۔دریائے سوات اور دریائے درال یک جان ہو جاتے ہیں اور اس لیے اس جگہ کو بحرین کہتے ہیں۔یہاں کی خمیری روٹی جو نَرم اور ذائقے دار ہوتی ہے۔ویسے تو چپلی کباب یہاں کا بھی روایتی پکوان ہے۔مگر یہاں چکن کے پکوان بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں اور قہوہ تو کھانے کے بعد کا بہترین مشروب ہے۔

بقول عبدالحفیظ:

"کئی پیالیاں چائے اور قہوہ پیا اور دوپہر تک پھر واپس حجرے میں پہنچ گئے کھانا تیار تھا۔ بہترین قسم کے تکے جو کہ سیخ پر بھوننے کے بعد گھی میں تلے گئے تھے، مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔"(64)

بحرین کی سیر کرنے کے بعد وہاں دو دریاؤں کے سنگم کا حسین نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہاں کے کھانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بحرین پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ چوزہ سالم اور خمیری روٹی صرف تین روپے میں خوب سیر ہو کر کھائی۔"(65)

سوات کی ٹراوٹ مچھلی بھی ایک لاجواب پکوان ہے۔ یہاں کی ٹراوٹ مچھلی کا ذائقہ ایسا ہے کہ اس کو کھانے کے بعد انسان مچھلی کے ذائقے کو بھول جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو سوات کی سیر کے دوران مچھلی کھانے کا اتفاق ہوا۔ وہ اپنے سفر نامے "ٹلہ جوگیاں" میں لکھتے ہیں کہ ہوٹل کے باورچی نے ایسی لذیذ ٹراوٹ مچھلی بنائی کہ دس پندرہ کلو کھا لینے کے بعد بھی ہاتھ رُکتا ہی نہیں تھا۔ بحرین کی مٹن کڑاہی ایسی شاندار کہ لگتا تھا کہ ایسی کڑھائی نہیں کھائی۔ دُنیا کی بہترین مٹن کڑھائی کھانے کا یہاں اتفاق ہوا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہاں کے پانی میں کچھ ایسی خاص بات ہے کہ یہاں کے گوشت کی لذت ہی الگ ہے۔ سیخ کباب ہوں یا کڑھائی، چپلی کباب ہوں یا روسٹ چکن ہر کھانے کی مہک اور ذائقہ ایسا دل فریب و لذیذ ہے کہ دل چاہتا ہے کہ انسان کھاتا ہی رہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "جو کالیاں" میں سوات شہر کے پکوانوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"راستے میں متعدد اُوپن ائیر ریستوران پُر ہجوم ہوتے تھے اور کوئلوں پر پہلو بدلتے سیخ کبابوں کی دھواں آلود مہک نے ہمارے بھوکے بدنوں کو اَسیر کر کے ہمیں بھی رکنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ان خطوں کے پانیوں کا کرشمہ ہے کہ یہاں کے گوشت کے ذائقے بہت کمال کے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر تندور کی روٹی اتنی خستہ اور خمار گندم میں گندھی ہوتی ہے کہ انسان اسے کچا کھانے پر مائل ہو جاتا ہے۔"(66)

سوات کے خصوصی پکوان کے ساتھ ساتھ یہاں کے نان بھی بے حد لذیذ ہیں۔کھانے کے بعد قہوے کی روایت بھی یہاں کی ایک مخصوص ثقافت ہے۔ خیبر پختونخوا کی یہ ثقافت زمانہ قدیم سے اپنے مخصوص رنگ کے ساتھ قائم و دائم ہے۔ کلونجی اور تل کے نان یہاں کے بہت ہی لذیذ ہوتے ہیں۔ یہاں جیسے نان پورے ملک میں اور کہیں نہیں ملیں گے۔ یہاں کا نمک گوشت ایک منفرد پکوان ہے۔اس کا ذائقہ بھی انتہائی لذیذ اور منفرد ہے۔نان ، قہوہ سب خیبر پختونخوا کی مُنفرد ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

بقول مستنصر حسین تارڑ:

> ”اور پھر سیاحوں کو طعام کے بعد اور یہ طعام بھی ان خطوں کی خوراک پر مشتمل ہو ، روسٹ گوشت ، نمک گوشت ، چپلی کباب اور تندروں سے نکلتے سلگتے خستہ نان ، بعد ازاں قہوہ کی پیالیاں ، چناں چہ کھانے کے بعد سیاحوں کو ڈرامائی انداز میں ٹھوکر درہ یونی ورسٹی کی قدیم تاریخ سے آگاہ کیا جائے۔“(67)

پشاور کی سیر کو نکلیں تو راستے میں آنے والی بہت سی وادیاں اپنی ثقافت کے ساتھ سجی نظر آئیں گی۔سوات جاتے ہوئے راستے میں کوہاٹ ،کالام ، دیر ،نوشہرہ ، وغیرہ آتے ہیں اور اپنی دل کش ثقافت سے سیاح کا دل موہ لیتے ہیں اور یہاں کے روایتی پکوان ایسے ہیں کہ ان کی خوشبو ہی پاگل کر دیتی ہے۔پیٹ بھر جاتا ہے ، دل نہیں بھرتا۔سوات ایسا خطہ زمین ہے جو ہمیشہ سے سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سوات پر کافی سفرنامے لکھے گئے ہیں۔کڑاہی گوشت ، کباب سوات کے روایتی پکوان ہیں۔جوں جوں سوات سے آگے بڑھتے جائیں یہ خوشبو بھی کم ہونے لگتی ہے۔

بقول آغا سلمان باقر:

> ”کڑاہی گوشت کے بُھننے کی خوشبو ، کبابوں کی خالص سواتی خوشبو اور اصل سوات کی خوشبو کالام شہر میں داخل ہوتے ہی آہستگی سے معدوم ہونے لگی۔۔۔“(68)

دودی پت سر وادی کاغان کے آخر میں بلاشبہ دُنیا کی خوب صورت ترین جھیل ہے۔یہ خیبر پختونخوا کے جنتِ نظیر علاقوں میں سے ایک ہے۔یہاں کا موسم یہاں کے روایتی پکوان سب کچھ

بہترین ہے۔ یہاں زیادہ تر لوگ اپنے اپنے خیمے لے کر آتے ہیں۔ یہاں کا مکھن اتنا لذیذ ہے کہ روٹی کے بغیر تینوں وقت صرف مکھن ہی کھایا جا سکتا ہے۔ یہاں کی ٹراؤٹ مچھلی بے مثال ہے۔ مچھلیوں کو آنکھوں اور دم سمیت تل کر کھایا جاتا ہے۔ چھوٹی مچھلیوں کا سوپ بنایا جاتا ہے۔ یہاں انڈے اور مکھن زیادہ کھایا جاتا ہے۔

بقول حافظ عمار وحید سلیمانی:

> "یہاں آپ کو بستی سے کھانا، انڈے انتہائی لذیذ اور تازہ مکھن مل سکتا ہے۔ مکھن اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ روٹی کے بغیر تینوں ٹائم صرف مکھن ہی کھانے کو دل چاہتا ہے۔ ہاں اگر جال یا کانٹا ساتھ ہو تو چند مخصوص اوقات میں دریا سے نہایت عمدہ اور لذیذ ٹراؤٹ مل سکتی ہے۔ یوں تو ناران کے راستے میں فارمی ٹراؤٹ دستیاب ہے لیکن فارمی اور دریائی ٹراؤٹ کا فرق برائیلر اور دیسی مرغی والا ہے۔ دریائی ٹراؤٹ کھانے کے بعد تمام مچھلیاں بے مزہ لگنے لگیں گی۔"(69)

کالام کی تمام وادیوں میں یہاں کا قدرتی پیدا شدہ سچل کا ساگ ہر گھر میں دونوں اوقات میں مکئی کی روٹی کے ساتھ بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے مکھن، دیسی گھی پیش کیا جاتا ہے۔ سچل کا ساگ ان کا ثقافتی پکوان ہے، جس میں دیسی گھی ڈال کر مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

کوہستان کے تمام علاقوں میں مشترکہ اور اجتماعی خوراک شہد، دیسی گھی، مکھن، مکئی کی روٹی اور سچل کا ساگ ہے۔ جب کہ خشک پھل عام وخاص میں اخروٹ، انجیر، شہتوت، چلغوزہ ہیں۔ ان کے بعض پھل قدرتی اور خود رو ہوتے ہیں۔ کوہستانی لوگ بالخصوص گوجر بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ان خود رو پھلوں میں کیش اور منگراس نامی پھل ہیں۔ ضلع دیر کے لوگ گوشت بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ چاول زیادہ کھاتے ہیں۔ کچھ سالوں پہلے ان لوگوں کی روایتی خوراک یہ تھی کہ صبح چائے پینے کے فوراً بعد چاول پکا کر کھاتے جو ان کا ناشتہ ہوتا تھا۔ تالاش جس کا اصل نام تہ لاش تھا جو کہ بعد میں تالاش بن گیا، یہ نام ان لوگوں کی امن پسندی کی وجہ سے پڑا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی خوراک سادہ ہے۔ مکھن، ساگ اور مکئی کی روٹی، مرغوب غذا ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> ”یہاں کے لوگوں کی روایتی خوراک لسّی ، مکھن ، ساگ اور مکئی کی روٹی ہے۔دودھ اور چائے کا استعمال بھی عام ہے۔“[70]

یہاں ہر گھر میں تنور ہے جس پر عورتیں روٹیاں بناتی ہیں۔

باجوڑ ، چترال یہاں کے لوگوں کا خاص موسمی پکوان ہے ، جو سردیوں کے موسم میں بنتا ہے۔اخروٹ اور گندم کے بوٹے خشک کر کے ایک ساتھ پیس لیتے ہیں۔آگ جلا کر بڑی سی دیگ رکھ دیتے ہیں ، جس میں حسب مقدار پانی ڈال کر میدہ شدہ چیزیں ڈال کر پانچ چھ آدمی اس دیگ کے گرد کھڑے ہو کر کف گیر کو اس میں گھماتے ہیں اور یہ عمل دس گھنٹے جاری رہتا ہے۔پھر اخروٹ کو میدہ کر کے دھپ میں رکھ لیا جاتا ہے۔پھر اس میدہ شدہ اخروٹ کو بھی اس میں ڈال کر خوب پکاتے ہیں۔یہ ایک خاص قسم کا حلوہ تیار ہو جاتا ہے اور پھر سردیوں میں یہاں کے لوگ یہ حلوہ استعمال کرتے ہیں اور یہ اس علاقے کا خاص ثقافتی پکوان ہے۔ایبٹ آباد ، ہزارہ یہاں کی میٹھی روٹی بہت مقبول ہے۔جب دلھن میکے آتی ہے تو اس کے میکے والے اس طرح کی روٹی بناتے ہیں۔پھول دار چوکی پر پیڑہ ڈال کر اسے ہاتھ کے زور سے پھیلا دیتی ہیں تو اس پر گل کاری ہو جاتی ہے۔پھر اسے تنور پر پکاتی ہیں۔یہ روٹی قریبی رشتہ داروں میں بانٹ دی جاتی ہے۔مانسہرہ میں ”گرڑا“ کا پکوان بہت مشہور ہے یہ پالک اور مقامی چاول کا بنتا ہے۔چاول کا پراٹھا بنا کر بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔کوہاٹ میں کچھڑی ، گوشت اور کڑی بہت شوق سے کھائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ پلاؤ ، زردہ کھانے کے بھی یہ لوگ بہت شوقین ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال :

> ”کوہاٹ کے مقامی پکوان میں کچھڑی ، کوئلوں پر بھنا ہوا گوشت اور کڑی معروف پکوان ہیں۔اس کے علاوہ پلاؤ ، زردہ بھی مرغوب پکوان ہیں۔“[71]

ڈیرہ اسماعیل کے مشہور پکوانوں میں پیاز پورخ ، صحبت اور سوہن حلوہ خاص روایتی پکوان ہیں۔

پیاز بوخ:

یہ ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک روایتی پکوان ہے۔یہ ایک خاص طریقے سے باروچی پیاز پکاتا ہے۔اس میں مختلف اجزا ملائے جاتے ہیں۔یہ ایک مقوی غذا ہے۔مقوی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ہاضمینہ بھی ہے

صحبت:

یہ ایک ایساروایتی پکوان ہے جوڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے علاقوں میں مشترکہ طور پر استعمال ہوتا ہے۔ایک بڑے سے لگن میں شوربا تیار کر کے اس میں روٹیاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں۔پھر اس لگن کے گرد لوگ خاص ترکیب سے بیٹھ کر ہاتھ کی انگلیوں سے کھاتے ہیں۔یہ اس علاقے کا خاص اور روایتی پکوان ہے۔

سوہن حلوہ :

یہ خاص روایتی اور ثقافتی لذیز ترین حلوہ ہے۔جو یہاں کا مشہور حلوہ ہے لوگ اسے سوغات کے طور پر بھی لے کر جاتے ہیں۔ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقوں اور شہر میں مختلف مقامات پر یہ سوہن حلوہ تیار ہوتا ہے۔

قاری جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

> "ڈیرہ اسماعیل خان کے اس روایتی اور ثقافتی پکوان حلوے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوچکی ہے اور بطور سوغات لوگ اس حلوے کو دور دراز علاقوں میں لے جاتے ہیں۔یہ سوہن حلوہ لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ مقوی بھی سمجھا جاتا ہے۔"(72)

خیبر پختون خوا کی ثقافت بہت جان دار ہے۔یہاں کے روایتی کھانے زمانہ قدیم سے آج تک اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔صوبہ خیبر پختونخوا کی یہی ثقافت انھیں مُنفرد مقام عطا کرتی ہے۔

iv. مذہب:

خیبر پخون خوا مسلمانوں کا صوبہ ہے۔ہمارا ملک اسلامی ملک ہے اور یہاں رہنے والوں کی اکثریت مسلمان ہے۔چترال میں اسماعیلیہ فرقہ موجود ہے گو کہ ان کے مذہبی امور خالص مسلمانوں والے نہیں ہیں۔اس کے علاوہ کافرستان ہے۔جس کو دوحصّوں سیاہ اور سرخ کافرستان میں

منقسم کیا گیا ہے۔جن میں سرخ کافر مسلمان ہو چکے ہیں۔مگر ان کی کچھ رسومات اور طور طریقے اب بھی کافرستان جیسے ہیں۔مگر مذہبی طور پر وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔یہ مسلمان نماز ،روزے کے پابند ہیں۔زکوٰۃ کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں۔

بقول منشی محمد عزیز الدین:

> ” اس ملک میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں۔ہاں علاقہ کالشگوم میں جو کافرستان کا ایک حصّہ مہتر چترال کے زیرِ فرمان ہے۔کوئی اڑھائی ہزار کافر رہتے ہیں جنھیں کالاش بھی کہتے ہیں۔یہ بت پرست ہیں۔حلال و حرام کی ان میں تمیز نہیں۔بلکہ یوں سمجھو کہ ان کا کوئی مذہب ہی نہیں۔“(73)

پشتون ایک راسخ العقیدہ مسلمان قوم ہے۔ان میں اپنے مذہب کے ساتھ والہانہ لگاؤ موجود ہے۔اس کی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ پشتون قوم میں قدیم زمانے سے بعض روایات ایسی موجود تھیں کہ ان کو اسلام میں اپنا فلسفہ حیات نظر آیا ۔یہ وہ روایات تھیں جن میں غیریت و حمیت ، مہمان نوازی وخودداری ، حریت وشجاعت ، مردانگی ودلیری ،فیاضی وسخاوت ، کم زور کی حمایت اور انتقام وغیرہ جیسے تصورات شامل ہیں۔اسی وجہ سے جب پشتونوں نے اسلام میں یہ خاصیتیں دیکھیں تو وہ من حیثیت القوم مسلمان ہوگئے اور مذہب پر سختی سے کاربند رہنا ان کی گھٹی میں تھا جو اسلام کی تعلیمات سے نکھر کر اور گہرا ہوتا گیا۔رفتہ رفتہ دینِ اسلام پشتون کلچر کا مرکزی اور اہم ترین ستون بن گیا۔پشتون قوم میں اسلا م کے بغیر کسی اور مذہب کا تصور ہی نہیں۔کبھی کوئی ہندو پشتون یا عیسائی پشتون یا سکھ پشتون نظر نہیں آسکتا۔پشتو زبان بولنے والا مذہب کا پیروکار ہو گا۔اگرچہ پشتون قوم نے اپنے اندر بہت ساری قومیں جذب کر لی ہیں۔جنھوں نے اپنا تشخص کھو کر پشتون شناخت بنا لی ہے۔لیکن کسی بھی غیر مسلم کو پشتون اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔اس لیے کہ پشتون کہلانے کے لیے کٹر مسلمان ہونا پشتون کی فطرت ہے۔

صوبے کے تمام لوگ سنی العقیدہ ہیں۔تمام ظاہری معاملات مثلاً صوم وصلوٰۃ کے وہ سختی سے پابند ہیں۔مذہبی آدمی کی شناخت آسان ہے وہ حرام کاموں اور چیزوں سے بچتا ہے۔دن بھر میں پانچ نمازیں ،فجر ،ظہر ، عصر ، مغرب اور عشا پڑھی جاتی ہیں۔یہاں زیادہ تر یوسف زئی پٹھان ہیں۔

بقول جی سی واکر ایسکوئر:

"مذہبی آدمی کی شناخت آرام سے ہو جاتی ہے کیوں کہ وہ ناپاک چیزوں سے ہر وقت بچتے رہنے کی کوشش کرتا ہے ، بالخصوص کتوں سے اجتناب کرتا ہے۔دن میں پانچ نمازیں پڑھی جاتی ہیں : سہر یعنی فجر ، منر پشین یعنی ظہر ، منرڈیگر یعنی عصر ،مزخم یعنی مغرب اور مزخوتان یعنی عشا۔"(74)

عورتیں مردوں سے بھی زیادہ توہم پرست ہیں۔وہ زیارتوں اور محرم رشتہ داروں کی قبروں پر جانے کی شوقین ہیں۔جمعے کے دن اکثر گاؤں کے قبرستان اور زیارتوں کے احاطے جوان اور بوڑھی عورتوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔یہ غم میں ڈوبی اپنے پیاروں کا دُکھ مناتی ہیں۔

صوبہ خیبر پختون خوا کی سرزمین جو باغات ،حویلیوں ،شاہراؤں ،چشمہ درس گاہوں ،مزارات ، خانقاہوں اور قدیم مذاہب کی عبادت گاہوں اور سٹوپوں کا مرکز ہے۔

پورے صوبے میں کیلاش کا علاقہ ہے جو مذہبی امور میں مختلف ہیں۔کیوں کہ یہ بت پرست ہیں۔جنوں ، بھوتوں ، پریوں اور روحوں پر یقین رکھتے ہیں۔ان کے سارے طور طریقے غیر مسلم ہیں۔باقی اللہ کے کرم سے پورا صوبہ خیبر پختونخوا مسلمان ہیں او ر ایک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمودات کے پیروکار ہیں۔

ماجد فرید ساٹی کیلاشی لوگوں کے مذہب کو بیان کرتے ہوئے سفرنامہ "مناظرِ پاکستان " میں لکھتے ہیں:

"کیلاشی بت پرست بھی ہیں اور روحوں ، جنوں اور بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ان کی خوشی کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔ان لوگوں نے بے شمار خدا بنا رکھے ہیں ، ان بتوں کو خطرات سے نجات دینے والے سمجھتے ہیں۔ان کے سب سے بڑے مذہبی بت کو بیٹان کہا جاتا ہے۔"(75)

کہلاش کے لوگ بت پرست ہیں ،اسی طرح کافرستان میں بھی سرخ کافر اور سیاہ کافر بھی مسلمان نہیں تھے ، ان کے عقائد ،رسم و رواج ،تہذیب و تمدن ،ثقافت سب جدا ہے ۔بدلتے

رجحانات نے ان کے مذہبی عقائد پر بھی اثر ڈالا ہے ۔سرخ کافر جنھون نے اگرچہ اسلام قبول کرلیا مگر ان کے کچھ طور طریقے اور رسوم بھی سیاہ کافروں جیسے ہیں ۔

چترال میں زیادہ تر اہلِ تشیع آباد ہیں ۔اسماعیلی فرقے کے لوگ عام شعیہ کافر سے بالکل الگ ہیں۔چترال میں اسماعیلیوں کے علاوہ سنی العقیدہ مسلمان اور کافر کیلاشی آباد ہیں ۔

بقول الحاج زمان کھوکھر :

"چترال میں سنی العقیدہ مسلمان ،اسماعیلی اور کافر کیلاشی آباد ہیں اور تینوں قسم کے لوگ اپنے اپنے عقیدے اور نظریے پر سختی سے قائم ہیں البتہ کیلاشی کافروں سے دین اسلام کی تبلیغی صماعی کی وجہ سے بہت سے لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوچکے ہیں ۔"(76)

چترال میں سنی المذہب لوگوں کے علاوہ اسماعیلی فرقے کے لوگ بھی بستے ہیں ۔یہ لوگ مذہب ،تمدن ،تہذیب وثقافت کی روایات کے پاس دار ہیں ۔یہاں کے باشندے سخت مذہبی قسم کے لوگ ہیں۔چترال میں سنی ،اسماعیلی اور کیلاشی کافر آباد ہیں اور سب اپنے اپنے دائرے میں پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

برصغیر میں جب لوائے اسلام لہرانے لگا تو اسلامی عبادت گاہیں یعنی مساجد کی تعمیر بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ہونے لگی۔پشاور کی حدود میں مختلف مقامات پر عالی شان مساجد کی تعمیر میں عوام وخواص نے بھرپور مذہبی جذبات وعقائد کا مظاہرہ کیا پشاور کی چند قدیم مساجد یہاں کا ثقافتی ورثہ ہیں اور یہ مساجد یہاں کے لوگوں کے دین اسلام کی گواہ ہیں۔

مسجد خواجہ معروف :

وہ گٹھڑی (تحصیل) کے جنوب کی طرف علاقہ گنج میں واقع ہے۔جو آج سے تقریباً 600 سال قبل جلیل القدر ولی اللہ حضرت خواجہ معروف رحمۃ اللہ علیہ نے تعمیر کرائی۔بری امام والے شاہ عبدالطیف اور حضرت جنید نے یہاں پر چلہ کاٹا۔یہ مسجد اسلامی علوم کا مرکز اور طریقت اسلامی کا مرجع رہی ہے۔

جامع مسجد مہابت علی خان :

مہابت علی خان مغلیہ دو ر کا معروف نام ور پشاور کا گورنر تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں جب وہ پشاور کا حاکم بنا تو اس دوران پشاور آسامی دروازے عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ مغل دور کا تعمیراتی شاہکار یہ مسجد 1658ء سے 1662ء کے دوران تعمیر ہوئی۔ یہ پشاور کی سب سے بڑی جامع مسجد کہلاتی ہے۔

مسجد قاسم علی خان:

جامع مسجد قاسم علی خان جو بازار مسگراں اور بازار داالگراں کے عین وسط میں ہے۔ یہ بھی مغلیہ سلطنت کے اندازِ تعمیر کا نمونہ ہے۔1842ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے برصغیر کے بڑے حصّے پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ اس دو ر کی تعمیر ہے۔

جامع مسجد گنج علی خان:

یہ مسجد پشاور کے ایک بارونق بازار گھنٹہ گھر کے مشرق کی جانب بازار کلاں اور گھنٹہ گھر کے سنگم پر واقع ہے۔ مغل فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ اورنگ زیب کے دور میں 1665ء میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔

جامع مسجد دلاور خان:

یہ مسجد پشاور کے قدیم بازار کلاں کے ایک محلے میں واقع ہے۔ یہ بھی مغل فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ 1802ء میں تعمیر ہوئی۔

مسجد سلطان پورہ :

قدیم پشاور کی آبادی چار حصوں میں تقسیم تھی۔ پشاور شہر کے جنوبی طرف میں موجود بھاناں ماڑی اور کوٹلا محسن خان کے جنوب مشرق کی سمت کو سلطان پورہ کہتے ہیں۔ مسجد سلطان پورہ 1697ء میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ یہ چھوٹی سی مسجد پیر سید حسن شاہ گیلانی کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد کے شمالی طرف مسجد سے متصل ان کا مزار ہے اور مسجد کے چاروں اطراف سادات بزرگوں کی قبریں ہیں۔

مسجد شیخ حبیب:

اس قدیم اسلام پورہ کے مقام پر مزار سید حسن کے جنوب مشرق کی جانب حضرت شیخ حبیب پشاوری کا مزار ہے۔ حضرت شیخ حبیب پشاور کا زمانہ 1650ء کے نزدیک کا ہے۔ ان کے مزار کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہ پرانی طرز کی چھوٹی سی مسجد ہے اور پشاور کے قدیم اسلامی ورثہ کی ا مین ہے۔

مسجد میاں غلام جیلانی:

یہ مسجد تقریباً دو سو سوال پرانی ہے۔ وقت کے جلیل القدر عالمِ دین میاں غلام جیلانی کے دادا ملا فصیح نے ایک مسجد بنوائی تھی جو اندرونِ بازکاں گیت میں واقع ہے۔ اس مسجد کو تالاب والی مسجد بھی کہتے ہیں۔ میاں جیلانی کا یہاں گراں قدر کتب خانہ ہے۔ جواب دیگر کتب خانوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ ان کے کتب خانے کی بہت سی نایاب کتب پشاور یونی ورسٹی کی لائبریری میں رکھی گئی ہیں۔

مسجد چوک شادی پیر:

اس مسجد کا قدیم نام مسجد اسماعیل تھا جب سکھوں کے خلاف سید احمد اور اسماعیل احمد کی تحریک کا آغاز ہوا، تب یہ مسجد تعمیر ہوئی اور جب سید اسماعیل شہید ہوئے تو اسی مناسبت سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ 35-1834ء کی بات ہے۔ بعد میں بدل کر علاقے کے نام پر مسجد کا نام چوک شادی پیر ہو گیا۔

اس تفصیل کا مقصد پشاور کے باشندوں کی مذہب سے محبت ہے۔ یہاں اسلام کا دور دورہ زمانہ قدیم سے رہا ہے۔ مگر پاکستان کے بعد پختون یا پشتون اسلام کے کٹر ماننے والے ہیں اور اسلام کے اُصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ یہاں کے لوگ مزارعات کو بھی بہت مانتے ہیں اور توہمات پرستی ان میں بہت زیادہ ہے۔

V. توہم پرستی یا ضعیف الاعتقادی:

پشتون قوم نے ہزاروں سال سے اپنی تہذیب کو سینے سے لگا کر اس کی حفاظت کی ہے۔ کتنے زمانے بیت گئے اور پشتون کتنے ہی انقلابات سے گزر گئے مگر ان کے کلچر میں تبدیلی کا عمل بہت ہی کم ہے۔ پشتون معاشرے میں جو توہم پرستی کا رُجحان زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ ان میں سے بعض توہمات آج بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔ اگرچہ پشتونوں کو ان توہمات کا احساس بھی ہے اور بظاہر ان توہمات کو غلط بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود توہم پرستی کے حصار سے باہر نکلنے میں کام یاب نہ ہو سکے۔

یہ کلچر ہمارے پورے پاکستان میں رائج ہے۔لوگ پیروں ، فقیروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔پشتون معاشرہ بھی پیروں ، فقیروں سے بہت متاثر ہے۔ان پیروں فقیروں سے اکثر من گھڑت باتیں منسوب کی جاتی ہیں اور اکثر انھیں مصیبت کے وقت پکارا بھی جاتا ہے۔

اسی طرح اکثر بچے کسی مزار پر جا کر ان پر پڑے ہوئے پتھر اُٹھا کر اپنی زبان کو ان سے رگڑتے ہیں تا کہ پڑھائی میں تیز ہو سکیں۔کان کا درد رفع کرنے کے لیے الگ مزار اور بابا ہیں۔

دیوانوں اور پاگلوں کو بھی مخصوص مزاروں پر لے جایا جاتا ہے اور وہاں ان کو درخت سے باندھ لیا جاتا ہے۔اس عمل کے دوران مزار کے قریب کھڑے مخصوص درختوں پر کیل بھی ٹھونکے جاتے ہیں۔اسی طرح بعض مزاروں پر بانجھ یا بے اولاد یا نرینہ اولاد سے محروم عورتیں نرینہ اولاد کے حصول کے لیے بھی جاتی ہیں۔

بعض مزاروں پر خالی جھولا لٹکا ہوتا ہے جسے عورتیں جھلاتی ہیں اور جھولا جھلاتے وقت پیر سے گود ہری ہونے کی فریاد کرتی ہیں۔اسی طرح مختلف قسم کے مزاروں پر مختلف قسم کی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور مختلف قسم کی منتیں مانی جاتی ہیں۔

سیدو کی سیاحت کرتے ہوئے محمد خالد اختر سفر نامہ ”دوسفر“ میں پشتونوں کی مزاروں سے عقیدت اور ضعیف الاعتقادی کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ”ہم ایک جھرو کے دار اُونچے ایوان میں گئے۔جہاں مزار ایک قیمتی غلاف میں منڈھا ہوا تھا ایک سیاہ چوکھٹی داڑھی والا آدمی دوزانو بیٹھا گڑ گڑاتے لہجے میں پیر سے کوئی منت مانگ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں عیاری تھی کسی قدر لومڑ کی جھلک اور اس کا چہرہ ایک ایمان دار چہرہ نہ تھا۔۔۔
>
> تم ان لوگوں کو جانتے ہو گے جن کے دل مذہب کی سچی روح سے بے گانہ ہوتے ہیں۔جو اپنے ہمسائے کی کھال ادھیڑنے سے نہیں چوکیں گے۔اگر اس سے ان کا کچھ فائدہ ہوتا ہو۔ایسے لوگ اکثر پیروں سے فیض حاصل کرنے میں سر گرداں رہتے ہیں۔“(77)

توہم پرستی :

صوبہ خیبر پختونخوا کے باشندوں نے مختلف مزاروں سے مختلف کرامات منسوب کر رکھی ہیں اور وہ ان پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرتے ہیں۔پشتون معاشرے کی عورتوں میں مزاروں کے علاوہ مختلف قسم کے وہمات بھی پائے جاتے ہیں۔

پشتون معاشرے کی عورتوں میں ایک توہم یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو لڑکیاں یا لڑکے کھانے کے بعد ہنڈیاں چاٹتے ہیں۔ان کی شادی پر بارش ہو جاتی ہے۔

ایک چپل کا دوسری چپل پر آنا سفر ی علامت سمجھا جاتا ہے۔جب کوا کائیں کائیں کرتا ہے تو اسے خوش خبری یا مہما ن تصو ر کیا جاتا ہے۔جب کسی کی دائیں آنکھ پھڑ کتی ہے تو اسے مہمان کی آمد کی علامت سمجھا جاتا ہے یا کوئی نیک خیال تصور کیا جاتا ہے۔اگر بائیں آنکھ جھپکے تو اسے برا شگون خیال کیا جاتا ہے۔

پشتونوں کے بعض علاقوں میں یہ تصور بھی موجود ہے کہ جب کوئی کسی کو یاد کرتا ہو تو اس کی آنکھ پھڑ کتی ہے۔دائیں آنکھ کے پھڑ کنے سے ذکرِ خیر اور بائیں سے ذکر بد مراد لیا جاتا ہے۔

> ”ان کی توہمات پرستی بے مثال اور لا متناہی ہے۔معجزات ، کرشمات اور شگونوں پر یقین کیا جاتا ہے۔اولیا اور مذہبی طبقات کے لیے زبردست احترام ہمہ گیر ہے۔اور ان کے فرامین پر من و عن عمل کیا جاتا ہے۔تمام طبقات کے مرد وخواتین زیارت پر جانے کے عادی ہیں۔ان مقدس جگہوں پر وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور عفو طلب کرتے ، اپنے دلوں کو ہر قسم کی خفیہ خواہشات کے بوجھ سے آزاد کرتے اور رحم مانگتے ہیں۔انھیں پورا یقین ہوتا ہے کہ یہ دُعائیں سُنی جائیں گی۔“(78)

رات کے وقت جب کتا لمبی تان سے بھونکتا ہے تو اسے اسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔اکثر اسے کسی کی موت کا پیغام یا پیشِ خیمہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔

کبوتر کو گھر میں پالنا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔الّو کو منحوس پرندہ خیال کیا جاتا ہے۔ابابیل کو بزرگ پرندہ سمجھتے ہوئے گھر میں اس کے گھونسلے کی حفاظت کی جاتی ہے۔مکڑے اور چھپکلی کو مارنا گناہ سمجھا جاتا ہے جب کہ گرگٹ کو مارنا ثواب کے زُمرے میں شمار کرتے ہیں۔

بطخ ، گھریلو خرگوش ، طوطا اور مینا کا گوشت نہیں کھایا جاتا۔جب کہ کوّے کا گوشت بھی کھانے کے زُمرے سے باہر ہے اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگرچہ کوّا حلال ہے لیکن اس کا رنگ مردار ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سارے جانور ایسے ہیں جنھیں یا تو متروک سمجھا جاتا ہے یا منحوس خیال کیا جاتا ہے اور ان سے مختلف قسم کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں۔

اگر بارشیں زیادہ دنون تک جاری رہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ کسی نے ناجائز اولاد جنی ہے یا کسی کو ناحق قتل کیا گیا ہے۔ماہِ سفر کو منحوس خیال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس مہینے میں جنات کا سایہ پڑتا ہے۔یہ اور اسی قسم کے دوسرے توہمات پشتونوں میں صدیوں سے موجود رہے ہیں اور آج کے جدید دور میں بھی موجود ہیں۔

بقول جی سی واکر ایسکوائر:

> ”کچھ ایک زیارتیں نہایت مقدس ہیں اور تمام سوار ان کے قریب سے گزرتے وقت نیچے اُتر جاتے ہیں یہ معاملہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ زیارت کے پاس سے گزرتے وقت وہ بائیں ہاتھ کی طرف ہونی چاہیے۔حتیٰ کہ کافروں کی جانب سے بھی اس میں کوتاہی کے نتائج بہت برے سمجھے جاتے ہیں۔مثلاً ششتو میں مقبرے کے قریب ایک یورپی افسر اپنے گھوڑے سے نیچے نہ اترا اور جلد ہی بری طرح نیچے گر پڑا۔“(79)

کیلاشی چوں کہ کافر ہیں ان کے بہت سارے دیوتا ہیں۔ملوش ان کا ایک بڑا دیوتا ہے اور اس کے پاس سے عورتوں کو گزرنا منع ہے۔کیوں کہ اگر ایسا ہو جائے تو ان کا عقیدہ ہے کہ ملوش پلید ہو جاتا ہے۔یہ لوگ حد درجہ ضیف الاعتقاد ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> ”میں ملوش کو دیکھ کر واپس آیا تو استانلی نے بتایا کہ یہ بڑی مقدس جگہ ہے اور ہم اس کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ہم اس کی اس قدر زیادہ عزت کرتے ہیں کہ عورتیں اس کے

نزدیک نہیں جا سکتیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ عورت اس کے نزدیک جائے تو ملوش پلید ہو جاتا ہے۔"(80)

سوات کے لوگ اس حد تک توہم پرست ہیں کہ اگر وہاں بچے بیمار ہو جائیں اور دوائی بھی اثر نہ کرے تو وہ انھیں دریا کے پانی میں غوطہ دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ دریائے سوات کے پانی میں جادو کاٹنے کی زبردست طاقت ہے۔ ویسے بھی یہاں کے لوگ دریا کے صاف پانی کو بہت معتبر خیال کرتے ہیں۔

بقول سلمان آغا باقر:

"باجی۔۔۔ جادو سے اللہ ہمیں پاک رکھے۔۔۔ بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔۔۔ اچھے ڈاکٹر صاحب کی دوائی بھی اَثر نہیں کرتی۔۔۔ آپ بھی نہاؤ اور بچوں کو بھی اس دریا کے پانی سے غوطہ دو۔ ہمارے دریائے سوات کے پانی میں جادو کاٹنے کی زبردست تاثیر ہے۔"(81)

خیبر پختونخوا کے لوگ اس حد تک توہم پرست ہیں کہ وہ عقائد جو زمانہ قدیم سے لوگوں میں موجود تھے۔ نسل در نسل مُنتقل ہوتے رہے اور آج بھی توہم پرستی حد درجہ پائی جاتی ہے۔

vi. لباس:

لباس بھی کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ہوتا ہے۔ ہر علاقے کا اپنا ایک مخصوص روایتی لباس ہوتا ہے۔ جو ان کی پہچان بنتا ہے۔ ان کی یہی انفرادیت انھیں دوسرے علاقوں کے باشندوں سے ممیز کرتی ہے۔ خیبر پختونخوا کی آب و ہوا مجموعی طور پر سرد ہے۔ یہاں کے بلند و بالا پہاڑ، جھیلیں، دریا یہاں کی آب و ہوا کو خوش گوار رکھتے ہیں، زیادہ تر علاقوں میں موسم خوش گوار ہی رہتا ہے۔ کچھ علاقے ہیں جو گرم ہیں جہاں گرمی بھی سردی کے ساتھ ساتھ شدت کی ہوتی ہے۔ یہی عوامل کسی بھی علاقے کے لباس کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کی تاریخ و تہذیب اور اَدب و ثقافت اپنے علاقے کی منہ بولتی تصویر ہوتی ہے۔

کسان کا لباس بہت ہی سادہ ہوتا ہے جو سفید کپڑے کی ایک پگڑی ایک ڈھیلی ڈھالی قمیض اور کھلے پائنچوں کے پاجامے پر مشتمل ہوتا ہے۔ سارا لباس دیسی سوتی کپڑے سے بنتا ہے۔ سردار اور

کھاتے پیتے لوگ بھی اسی طرز کا لباس زیب تن کرتے ہیں اور سردیوں میں ململ اور خاسہ پگڑیوں کی جگہ لنگیاں لے لیتی ہیں۔ گول ٹوپی پگڑی کے نیچے پہنی جاتی ہیں۔ غریب لوگ سردی کے موسم میں بھیڑ کی کھال کے کوٹ (پوستین) پہنتے ہیں۔ موسم سرما میں صرف خوش حال طبقے کے لوگ ہی جرابیں پہنتے ہیں۔ بہتر طبقے کے لوگ عموماً چوغا پہنتے ہیں۔ خوش حال طبقے کے لوگ بہتر قسم کے جوتے پہنتے ہیں جس کے ساتھ تلوار اور پستول لٹکی ہوتی ہے۔ ہمیشہ وہ لوگ پہنتے ہیں جو ہتھیار اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ کچھ پگڑیاں بہت اُونچی ہوتی ہیں بالخصوص ملاؤں اور اثرو رسوخ والوں کی۔ عورتوں اور مردوں کا لباس ایک ہی کپڑے سے بنتا تھا۔

بقول جی سی واکر ایسکوائر:

"کچھ پگڑیاں بہت وسیع و عریض ہوتی ہیں بالخصوص ملاؤں اور اربابِ اختیار کی اور کبھی کبھی انھیں مزید پُر شکوہ بنانے کے لیے کپڑے کی کترنیں اندر بھری جاتی ہیں۔ سر ہمیشہ مونڈا جاتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے لباس میں صرف پٹکا کی جگہ خانوں والی چادر اوڑھنے کا ہی فرق ہے۔ یہ چادر پورے قبیلے کے لیے ایک ہی میٹریل اور طرز کی ہوتی ہے اور صرف ایک سے دوسرے قبیلے میں ہی بدلتی ہے۔"(82)

ضلع چترال، صوبہ سرحد کا ایک اہم ضلع ہے۔ یہاں کے لوگوں کا لباس کوہستانی ہے۔ سر پر پٹی کی گول سیاہ ٹوپی رکھتے ہیں۔ جو اصل میں بہت لمبی ہوتی ہے۔ مگر سر سے لپیٹ کر چھوٹی سی کر لیتے ہیں۔ یہ سر کے ساتھ ملی رہتی ہے اور کناروں سے موٹی ہوتی ہے، اسے "پھکول" کہتے ہیں۔ یہ اس کا چترالی نام ہے۔ بعض لوگ پٹھانوں کی طرح چھوٹی سی گول پگڑی بھی باندھتے ہیں اور اس کے اندر چترالی کلاوہ بھی رکھتے ہیں۔ سفید کپڑے یالٹھے کا ایک لمبا کرتا اور اس کے اُوپر لمبا چوغہ یا چمڑے کی پیٹی باندھی جاتی ہے۔ پاؤں میں لمبی جرابیں پہن کر پُبو یعنی چمڑے کی جوتی پہنتے ہیں۔ سفر کے وقت اکثر پاؤں پر چمڑا لپیٹ کر رسی سے باندھ دیتے ہیں۔ اس سے پہاڑوں پر چلنے میں مدد ملتی ہے شقہ بطور رواج پہنا جاتا ہے۔ اسے پہننا لازمی ہے۔

بقول منشی محمد عزیز الدین:

"بعض لوگ پٹھانوں کی طرح چھوٹی سی گول پگڑی بھی باندھتے ہیں اور اس کے اندر چترالی ریشمی کلاوہ رکھتے ہیں۔بدن پر سفید کپڑے یعنی لٹھے وغیرہ کا ایک لمبا کرتا اور اس کے اُوپر لمبا چوغا جسے ان کی زبان میں شقہ کہتے ہیں ، پہنتے ہیں۔"(83)

شقہ یہاں پہننے کا عام رواج ہے۔کوئی بھی آدمی ایسا نہیں جو اس نے نہ پہنا ہو۔عورتیں پٹھانوں کی طرح کھلے پاجامے پہنتی ہیں۔جسم پر ایک لمبا کُرتا جو ٹخنوں تک آتا ہے اور اس کے اُوپر شقہ۔سر پر چھوٹی سی گول ریشمی ٹوپی پہنتی ہیں جو اُنھوں نے خود ہی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوتی ہے۔سر کے لیے ایک رومال استعمال کرتی ہیں جسے "پٹک" کہتے ہیں۔اور سردیوں میں اکثر وہ بھی کمر سے باندھ لیتی ہیں۔

بقول منشی محمد عزیزالدین:

" عورتیں پٹھانوں کی طرح کھلے پاجامے پہنتی ہیں۔بدن پر ٹخنو ں تک ایک لمبا کرتا او راس کے اُوپر شقہ۔سر پر چھوٹی سی گول ریشمی ٹوپی رکھتی ہیں۔جو انہی کے ہاتھوں کی بنی ہوتی ہے۔سر کے واسطے ایک رُومال بھی رکھتی ہیں ، جسے "پٹک" کہتے ہیں اور اکثر وہ بھی کمر سے باندھے رہتی ہیں۔"(84)

وادی سوات کے لوگ بھی اپنے خوب صورت علاقے کی طرح خوب صورت کردار کے مالک ہیں۔یہاں کے لوگوں کا لباس قمیض شلوار ہے۔مرد اور عورتیں دونوں قمیض شلوار پہنتے ہیں۔صاحبِ حیثیت لوگ قمیض شلوار کے ساتھ واسکٹ بھی پہنتے ہیں۔عورتیں سونے چاندی کے زیورات بھی پہنتی ہیں۔مرد پشاوری چپل پہنتے ہیں۔سوات کی پرانی ثقافت ہے کہ یہاں کی عورتیں لباس کے ساتھ زیورات کا بھی استعمال کرتی ہیں۔عورتیں اور بچیاں کشیدہ کاری کی ہوئی فراکیں بھی پہنتی ہیں۔

فضل ربی راہی وادی سوت کے لباس کے متعلق لکھتے ہیں:

" یہاں کا عمومی لباس شلوار قمیض ہے۔خواتین بھی یہی لباس زیب تن کرتی ہیں۔کوہستانی علاقوں کی خواتین ہاتھ سے کڑے ہوئے روایتی لباس بڑے شوق سے پہنتی ہیں اور سوات کے روایتی چاندی اور

سونے کے زیورات بھی استعمال کرتی ہیں۔جو سوات کی پرانی تہذیب و
ثقافت اوراس دور کی مخصوص معاشرتی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔"(85)

منگورہ دریائے سوات کے کنارے آباد ایک خوب صورت اور صاف ستھرا شہر ہے۔یہاں کے مقامی لوگوں کا لباس شلوار قمیض ہے جو مقامی اور قومی لباس ہونے کی وجہ سے ان کا طرہ امتیاز ہے۔میاں دم وادی سوات کی ایک سحر انگیز وادی ہے۔یہ وادی دل کش اور معتدل آب وہوا کی وجہ سے سیاحوں کی مرکز نگاہ ہے۔یہاں کی دست کاری کی ہوئی قدیم وجدید طرز کی مثالیں انتہائی دل کش اور خوب صورت ہیں۔یہاں کے مخصوص لباس اپنی مثال آپ ہیں۔ان کپڑوں پر روایتی کشیدہ کاری کے سواتی رنگ بہت بھلے لگتے ہیں۔چاندی کے زیورات ان کپڑوں کو مزید جاذب نظر بناتے ہیں۔میاندم یہاں کی سواتی کڑھائی ملبوسات کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

بقول فضل ربی راہی:

"دست کاری کی دکانوں میں قدیم وجدید طرز کی خوب صورت شالیں ،روایتی سواتی کشیدہ کاری سے مزین ملبوسات ،علاقے کے مخصوص چاندی کے زیورات ، منقش لکڑی کا قدیم سامان اور دیگر مقامی مصنوعات سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز بنی رہتی ہیں۔"(86)

کالام کے چاروں طرف بلند وبالا پہاڑوں کے لا متناہی سلسلے ہیں جن کے بیچ میں وادی کالام دُلھن کے ماتھے پر سجے خوب صورت جھومر کا منظر پیش کرتی ہے۔یہاں کے لوگ ڈھیلے ڈھالے روایتی لباس زیب تن کرتے ہیں۔جن میں خوب صورت اور مخصوص قسم کی گل کاری سے سجے لباس اور چاندی کے زیورات میں ملبوس خواتین نظر آتی ہیں۔ان کا یہ پہناوا انسان کو زمانہ قدیم کی یاد دلاتے ہیں۔

منگورا کے نواح سے نکل کر ذرا آگے بڑھیں تو خانہ بدوش عورتیں نظر آتی ہیں۔یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی یہ عورتیں سیاہ کپڑے پہنے ہوئے اور زیورات میں لدی پھندی نظر آتی ہیں۔ان خانہ بدوش عورتوں کے سروں پر گول ٹوکریاں رکھی ہوتی ہیں۔جب کہ ان کے مرد کاہل اجڈا اپنے گدھوں اور خچروں پر سوار نظر آتے ہیں۔

محمد خالد اختر اپنے سفرنامے "دوسفر" میں لکھتے ہیں :

"خانہ بدوش پہاڑی عورتیں سڑک پر سے گزرتیں۔۔۔یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی عورتیں۔۔۔اور قدرے جھکی ہوئی۔۔۔سیاہ کپڑوں میں ملبوس اور وحشیانہ زیورات میں لدی پھندی۔ان کے سروں پر گول ٹوکریاں ہوتیں۔"(87)

وادی دیر ایک خوب صورت علاقہ ہے۔جہاں کی ثقافت بھی خوب صورت ہے۔یہاں کے لوگوں کا لباس شلوار قمیض ہے۔شلوار قمیض میں ملبوس سوات اور کوہستان کے خوش اخلاق لوگ بکثرت نظر آتے ہیں۔

خیبر پاس یہاں کے لوگ سادہ کپڑے زین تن کرتے ہیں۔لوگ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے ہیں۔پگڑی باندھتے ہیں۔گھاس کے جوتے پہنتے ہیں۔یہاں کے پٹھان اپنی مردانگی پر بہت نازاں ہیں۔لمبے تڑنگے پٹھان سادہ لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔

کیمی پوا "سفرنامہ پاکستان" میں لکھتی ہیں:

"گھاس کے جوتے اورڈھیلا ڈھالا لباس پہنے اور پگڑی باندھے ایک لمبا تڑنگا پٹھان چلتے ہوئے ماضی کی جھلک معلوم ہوتا تھا۔"(88)

کاغان خیبرپختونخوا کا جنتِ نظیر علاقہ ہے۔یہاں کی خوب صورتی بے مثال ہے۔یہاں سیاحوں کا تانا بانا بندھا رہتاہے۔یہاں کی عورتیں رنگ برنگے بھڑ کیلے کپڑے پہنتی ہیں اور بھاری زیورات کا استعمال کرتی ہیں اور مرد چُغے پہنتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اپنا روایتی لباس پہنتے ہیں۔یہاں کے لوگ طبعتاً سادہ ہیں اوران کی طبیعت کا اَثر ان کے لباس میں بھی جھلکتا ہے۔

کیمی پوا "سفرنامہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

"عورتیں رنگ برنگے بھڑ ک دار کپڑوں کے اُوپر بھاری زیورات پہنتی ہیں۔مرد چغے پہنتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ،کوئی نہ کوئی زیور ضرور پہنتے ہیں۔"(89)

کالاش میں زمانہ قدیم میں لوگ بھیڑ بکریوں کی کھالوں کا بناہوا لباس پہنتے تھے اور اکثر کالے رنگ کی کھالیں استعمال کیاکرتے تھے۔جن کی وجہ سے ان کا نام "سیاہ پوش" پڑگیا تھا۔بعد میں یہ لوگ کالے رنگ کی اُون کے کپڑے پہننے لگے۔جو خواتین خود تیار کرتی ہیں ،مردوں کے کپڑوں پر عام پٹھانی

کپڑوں کا اَثر ہے۔یہاں کے مرد پٹھانوں کی طرح ہی شلوار قمیض پہنتے ہیں۔البتہ خواتین کا اپنا ایک مخصوص لباس ہے۔یہ عورتیں کالے اونی یا سوتی کپڑے کی لمبی قمیض پہنتی ہیں اور سر پر ٹوپی پہنتی ہیں جو کمر تک لٹکتی ہے۔اس پر موتی اور سیپوں کا خوب صورت کام ہوتا ہے۔ان کے لباس پر یونانی ملبوسات کی چھاپ نظر آتی ہے۔مرد ٹوپی پر مصنوعی پھول ضرور لگاتا ہے۔یہ خواتین صرف سیاہ رنگ کا لباس پہنتی ہیں اور کوئی رنگ استعمال نہیں کرتیں۔اس لباس کی لمبائی عورت کے قد کے برابر ہوتی ہے۔جوتے بکرے کی کھال یا پلاسٹک کے پہنتی ہیں۔عام پلاسٹک کے جوتے اب زیادہ استعمال ہونے لگے ہیں۔

سفر نامہ ''کافرستان'' میں پرویش شاہین کالاش کے لوگوں کے لباس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''کالاش عورتیں کالے اُونی یا سُوتی کپڑے کی لمبی قمیض پہنتی ہیں۔جسے ''سینگچ'' کہا جاتا ہے۔ان کے لباس میں سب سے دل چسپ پہناوا ٹوپی ہے جو کمر تک لٹکتی ہوتی ہے۔اس پر مونگے اور سیپوں کا خوب صورت کام ہوتا ہے۔اس کو ''کوپھس'' کہتے ہیں۔''(90)

ان کے لباس میں سب سے منفرد اور دل کش چیز ان کی پھن نما ٹوپی ہے۔جسے ''کوپھس'' کہتے ہیں۔یہ اپنی ''کوپھس'' کو مختلف خوب صورت دھات کی چمک دار اشیا سے بھی مزین کرتی ہیں۔مثلاً گھنگھرو ،چمک دار سکے ،گھنٹیاں ،بلیڈ ،پلاسٹک کی رنگ دار چیزیں ، غرض جو چیز ان کے دل کو بھا جائے وہ فوراً اس کو اپنی کوپیسی میں ٹانک لیتی ہیں۔مختلف چیزوں کے ٹانکنے کی وجہ سے یہ کوپیسی زیادہ خوش نما اور دیدہ زیب ہو جاتی ہے۔یہ کوپھس کالاشی خواتین کی دست کاری کا اعلیٰ اور نادر نمونہ ہوتا ہے۔سب سے پہلے وہ بکرے کے بالوں سے سادہ کوپیسی کو کھڈی پر کات کر اسی کی ہیئت تیار کرتی ہیں۔پھر اس پر خوب صورت نقش و نگار کی کڑھائی کرتی ہیں۔سب سے زیادہ اہم کام سمندری کوڑیوں کو ایک سائز کا کر کے اتنی خوب صورتی اور ترتیب سے ٹانکتی ہیں کہ ان کی مہارت کی داد دینی پڑتی ہے۔

بقول پرویش شاہین:

"غرض وہ ہر اس چیز کو ٹوپی میں سجاتی ہیں جو خوش نما لگے اور ان کے لیے دل کش اور اجنبی ہو چاہے وہ کسی ٹورسٹ کا پھینکا ہوا بلیڈ ہی کیوں نہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کو پیسی بڑی وزنی ہوتی ہے اور یہ پونڈوں کے حساب سے وزنی ٹوپی وہاں کی خواتین کی ایک پہچان ہے۔کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی کالاشی عورت ٹوپی کے بغیر رہے کیوں کہ یہ ان کے مذہب کا ایک لازمی جز ہے۔"(91)

کالاش خواتین اپنی زیبائش اور میک اپ کا بھرپور خیال رکھتی ہیں۔میک اپ کے لیے بکریوں کے پاؤں جلا کر اس کا پاؤڈر حاصل کرتی ہیں۔اس میں کچھ اور چیزیں ملا کر آنکھوں کے ارد گرد لگاتی ہیں۔جس سے ایک طرف زیبائش کا کام لیا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ اسے اپنی آنکھوں کی حفاظت کے لیے استعمال کرتی ہیں۔کالاش خواتین کے زیورات بھی قابلِ دید ہوتے ہیں۔اگرچہ غریب لوگ ہیں اور جدیدیت سے ناآشنا ہیں اور سونے چاندی سے لاتعلق ہیں۔پتھروں کی مالائیں ، ہڈی کے خوش نما ٹکڑوں کی مالائیں انتہائی دل کش ہیں۔انھیں جو چیز پسند آ جائے اُٹھا کر کپڑوں میں ٹانک لیتی ہیں۔

بقول پروین شاہین:

"کالاش عورتوں کے زیورات پہننے کا ذوق بھی جداگانہ ہے۔پتھروں کی مالائیں ،ہڈی کے خوش نما ٹکڑوں کو بھی مالا میں پرو کر گلے میں پہن لیتی ہیں۔"(92)

ان کے اس قدیم اور مخصوص لباس نے ان کو ایک منفرد اور جداگانہ مقام دیا ہے۔جو پوری دُنیا میں ایک مُنفرد حیثیت کا حامل ہے۔اگر کسی نے کسی شکل میں کچھ مشابہت کسی اور قوم کے ساتھ کھائی ہے۔تو وہ لداخ اور تبت کے لوگوں کے ساتھ ہے۔کیوں کہ ان کے زیورات ،زیبائش اور خصوصاً ٹوپیوں کی بناوٹ اور سجاوٹ ان کے قریب قریب ہے۔

ضلع دیر یہاں بہت سردی پڑتی ہے۔نہانے کے لیے گرم پانی نہیں ملتا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں لوگ سردیوں میں بہت کم نہاتے ہیں۔عورتیں کالا لباس پہنے نظر آتی ہیں۔پہاڑی علاقوں کی عورتیں

کالالباس اس لیے پہنتی ہیں تاکہ یہ جلد میلانہ ہو۔سر پر کپڑا باندھ کر رکھتی ہیں تاکہ سرد ہوا سے بچا جاسکے۔

محمود دانش ور ایرانی ''سفر نامہ کافرستان'' میں رقم طراز ہیں:

''کبھی کبھی راستے میں پہاڑی عورتیں بھی ملتی تھیں۔ان سب نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ یہاں کی عورتیں اس لیے سیاہ لباس پہنتی ہیں تاکہ جلد میلا نہ ہو۔''(93)

دیر کی ایک گاؤں جس کانام ''گجر'' تھا۔اس گاؤں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس گاؤں کی لڑکیاں بہت خوب صورت ہیں اور یہ لڑکیاں عام طور پر یہاں سے دودھ لے کر شہر جاتی ہیں۔گجریوں کالباس بھی سیاہ ہے۔چوں کہ ان کی لڑکیاں بے حد حسین ہیں اور کالے لباس میں ان کا حسن مزید نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔کالے لباس میں وہ اور بھی حسین نظر آتی ہیں۔

بقول محمود دانش ورایرانی:

''گجریوں کا لباس بھی سیاہ تھا اور وہ اس لباس میں اور بھی حسین معلوم ہوتی تھیں۔''(94)

کافرستان کے لوگ سادہ لباس زیب تَن کرتے ہیں۔مردوں نے اُونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں اور بعض کافروں نے چُغے پہن رکھے تھے جو کہ بہت لمبے تھے۔تمام کافرستان میں ایک ہی لباس نظر آتا ہے۔لڑکوں کو شلوار پہنائی جاتی ہے جب کہ لڑکیوں کوشلوار اس لیے نہیں پہنائی جاتی کیوں کہ ان کے چغے لمبے ہیں اس لیے انھیں شلوار کی ضرورت نہیں۔ان کا یہ لباس ان کا قومی لباس ہے۔کافروں کے ہاں ایک جیسا ہے۔تمام عورتیں ایک ہی لباس میں نظر آئیں گی۔سب کا یونیفارم ایک جیسا ہے۔یہ کالام یونیفارم بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔کافرستان کے لوگوں کا تو ایک ہی لباس ہے۔البتہ افغانستان کے نورستان میں لباس میں ہم آہنگی نہیں رہی۔کیوں کہ یہ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔مگر سیاہ پوش کافروں کے علاقے میں ابھی بھی ہم آہنگی ہے اور سب کالباس سیاہ ہے۔

محمود دانش ور ایرانی لکھتے ہیں:

''مجھے ایک کافر نے بتایا کہ اب ''نورستان'' کے لباس میں ہم آہنگی نہیں رہی کیوں کہ وہاں کے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔افغانستان کے

زیرِ اَثر رہنے سے اب وہاں کوئی شلوار پہنتا ہے ، کوئی چُغہ ، کوئی پاجامہ۔۔۔وہاں رنگارنگ لباس نظر آتا ہے۔سیاہ پوش کافروں کے علاقے میں اب تک لباس کی ہم آہنگی ہے۔"(95)

vii. پیشے/ذریعہ معاش :

کسی بھی خطے کی ثقافت کو سامنے لانے میں پیشے بھی مؤثر اور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اُردو سفر نامہ نگار ان ثقافتی عوامل کو سامنے لانے کا ذریعہ بنے ہیں۔اُردو سفر نامہ گاروں نے پاکستان کے ہر گوشے کو اپنی انتھک کوششوں سے جس طرح اُبھارا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ خیبر پختونخوا آبادی کے لحاظ سے تیسرا بڑا صوبہ ہے۔اگر صوبہ سرحد کے تین حصے نہ کیے جاتے ، کشمیر اور بلتستان کو اسی صوبے میں رکھا جاتا تو یہ آج یقیناً سب سے بڑا صوبہ ہوتا۔ہر صوبے میں لوگ مختلف کاموں سے جڑے ہوئے ہیں۔زندگی گزارنے کے لیے ہر انسان کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے اور اس طرح وہ کسی نہ کسی پیشے سے منسلک ہو جاتا ہے۔سوات خیبر پختونخوا کی ایک قدیم اور حسین وادی ہے۔یہ علاقے گندھارا آرٹ کا مرکز تھے۔یہاں پر گندھارا تہذیب اسٹوپے آج بھی موجود ہیں اور لوگ بطور پیشہ ان اسٹوپوں کو فروخت کرتے ہیں۔ٹوٹے پھوٹے اسٹوپے بھی وہ منہ مانگے پیسے لے کر فروخت کرتے ہیں۔سری بہلول کی پوری بستی گندھارا کے نودرات سے بھری پڑی ہے۔لوگ ان علاقوں میں غربت سے تنگ آکر مجسموں کی ٹوٹ پھوٹ سیاحوں کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں۔بے شک یہ کسی گاؤں کے ان پڑھ کسان یا مزدور ہوں گندھارا تہذیب اور مجسموں کے فن کے ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔وہ خوب جانتے ہیں کہ کس شکستہ بدھ کی کیا اہمیت ہے۔چناں چہ اگر وہ گندھارا کا کوئی ٹکڑا دکھاتے ہیں اور آپ اسے فضول سمجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں صاحب اسٹوری مکمل ہے غور سے تو دیکھو۔اس طرح یہ لوگ ان اسٹوپوں کو بیچ کر اپنی گزر اوقات کرتے ہیں۔یہاں آنے والے غیر ملکی عقیدت میں مہاتما گوتم بدھ کے مجسمے کو کوئی بھی حصّہ منہ مانگے دام دے کر ان سے خرید لیتے ہیں۔سوات میں اب بھی بہت سے اسٹوپے موجود ہیں۔سوات کے علاوہ ٹیکسلا ایسی نوادرات کا گڑھ ہے۔یہاں لوگ کثرت سے آتے ہیں۔غیر ملکی بھی آتے ہیں ، جیسے جاپان ، چائنا ، پولینڈ ، ہالینڈ وغیرہ سے اسٹوپوں کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ بھی اسٹوپوں سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے اور اسی لگن نے انھیں تلاش میں سرگرداں رکھا اور یوں انھیں اس پیشے سے جڑے لوگوں کا پتہ چلا۔ مستنصر حسین تارڑ نے سوات کی سیر کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان علاقوں کی ثقافت کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے سفر نامے "جو کالیاں" میں لکھتے ہیں:

> "مجھے یاد ہے ایک اجڈ سے شخص نے مجھے بُدھ کا ایک ہیڈ دکھایا۔ جس کا ناک نقشہ غائب تھا اور وہ ایک معمولی پتھر لگتا تھا۔۔۔ جب میں نے محض اس کا دل رکھنے کی خاطر دو سو روپے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا کہ خان صاحب۔۔۔ یہ تو ٹوٹا ہوا ہے، بیکار ہے۔ تو وہ کہنے لگا: "صاحب یہ بیکار نہیں یہ تو سوکھا ہے" اور واقعہ ذرا غور سے پرکھا تو انکشاف ہوا کہ یہ تو کسی مختصر سے "فاسٹنگ بدھا" کا ہیڈ ہے۔۔۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور رخسار پچکے ہوئے تھے۔۔۔ وہ سُوکھا یعنی فاسٹنگ بُدھا کا سَر تھا۔۔۔"(96)

ضلع کوہاٹ میں کئی مقامات پر معدنیات کے ذخائر موجود ہیں۔ جپسم سفید رنگ کا ایک چمک دار پتھر ہے۔ اس میں گندھک کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں لوگ اس روزگار سے منسلک ہیں۔ اسے پاؤڈر بنا کر (امونیا کھاد) بنا کر سیم و تھور کے خاتمے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کاغذ، ربڑ، رنگ، روغن اور پالش بنانے کی صنعتوں میں بھی کام آتا ہے۔ کوہاٹ میں وافر مقدار میں جپسم پایا جاتا ہے۔ سوڈیم بھی کوہاٹ میں ملتا ہے اس سے صابن اور پاؤڈر بنتا ہے۔ نمک ہماری خوراک کا ایک اہم عنصر ہے۔ ضلع کوہاٹ میں مالگین اور جٹہ کے علاقوں میں نمک کے پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ جپسم پاکستان میں سندھ اور پنجاب میں پایا جاتا ہے۔

بقول احمد پراچہ:

> "جپسم کے ذخائر سندھ، سرحد اور پنجاب سب جگہ اس قدر موجود ہیں کہ ہم اپنی کیمیائی ضرورت پوری کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کر سکتے ہیں۔ ایک محقق کا کہنا ہے کہ پاکستان میں اعلیٰ قسم کے

جپسم کی مقدار اس قدر وافر ہے کہ اس سے سیمنٹ کے کم و بیش ایک سو کارخانے کئی سو ہزار سال تک چلائے جاسکتے ہیں۔"(97)

وادی دیر صوبہ سرحد کا ایک حسین گوشہ ہے۔یہ ایک پس ماندہ علاقہ ہے۔ترقیاتی کام نہ ہونے کے برابر ہیں۔یہاں بے روزگاری بہت زیادہ ہے۔نوجوان سارا سارا دن پھلوں کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکتے پھرتے ہیں۔جن کے پاس ہوٹل ہیں وہ پھر بھی سب سے بہتر ہیں۔دریاؤں میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور مایوس ہو کر شام کو گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔پیاز کی پیداوار کی وجہ سے کئی لوگوں کو روزگار مل جاتا ہے۔مقامی لوگ پیاز لڑکوں میں بھرتے ہیں۔دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے چائے خانوں کے باہر کوہستانی سیخ کباب اور مسالہ بوٹی کوئلوں پر سینک کر بیچتے ہیں۔

ماجد فرید ساٹی وادی کی پس ماندگی پر افسوس کرتے ہیں اور لوگوں کے روزگار سے متعلق لکھتے ہیں :

"دریائے پنج کوڑہ کے کناروں پر گھاس کے وسیع و عریض قطعوں میں مقامی باشندے پیاز کے ذخیروں کو بوروں میں لاد کر لڑکوں میں بھرتے ہیں۔پیاز کی پیداوار کے باعث یہاں کئی لوگوں کو روزگار مل جاتا ہے۔راستے میں دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے چائے خانوں کے باہر بیٹھے ہوئے لکڑی کے کھوکھوں پر کوہستانی سیخوں پر کباب اور بوٹیاں سینک رہے ہوتے ہیں۔"(98)

چترال میں لوگ تجارت کے پیشے سے منسلک ہیں۔سوداگر یہاں سے دیودار کی لکڑی اور ہڑتال جو ترچ میر سے نکلتی ہے۔پشاور میں لے جا فروخت کرتے تھے اور وہاں سے کپڑا ، نمک ، صابن ، مصری چائے کے برتن اور بہت سی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں خرید لاتے ہیں۔کچھ بیچ دیتے ہیں اور کچھ بدخشاں لے جا کر بیچتے ہیں اور وہاں سے نمک ،زیرہ ،ریشمی ،کپڑے ،روسی اور چینی کپڑے ،سونا وغیرہ چیزیں خرید کر چترال کے راستے جا کر بیچتے ہیں۔

بقول منشی محمد عزیز الدین :

"بدخشاں اور بخارا کے تاجر بھی چترال میں آتے ہیں جو اپنے ساتھ نمک ، گھوڑوں کے ساز و سامان ، نمد ، کپڑے اور سونا وغیرہ لاتے ہیں۔"(99)

چترال کی تجارت نہایت ترقی پر ہے۔درہ کوہاٹ پشاور سے 25 میل جنوب میں قبائلی علاقے میں واقع ہے۔یہاں کے لوگ بہت ہُنر مند ہیں۔ریوالور اور رائفلیں یہاں آفریدی قبیلے کے لوگ ہاتھ سے بناتے ہیں اور یہ آلات مشینوں سے بنے آلات سے زیادہ بہترین اور عُمدہ ہیں۔سیاح انھیں بہت پسند کرتے ہیں اور بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔پختون محنتی اور جفاکش ہیں۔یہاں کے لوگ ہُنر مند ہیں۔اور جو بھی کام کرتے ہیں اس میں مکمل مہارت رکھتے ہیں۔یہاں معمولی قیمت کے سنہری جوتے آنکھوں کے سامنے بن رہے ہیں۔کہیں پیدائشی فن کاروں کی مصنوعات چمک رہی ہیں۔زیورات آپ کے سامنے بن رہے ہیں۔چمڑے کو کوٹ کر بکسوں کی شکل میں ڈھالنے کا ہُنر جانتے ہیں۔پٹھانوں کی دل کش ٹوپیاں اور پگڑیاں چمک دار ریشمی دھاگوں سے اور موتی جڑ کر بنانے کا رواج ہے۔ایرانی بھیڑوں اور بکریوں کی کھالوں پر یہاں کے درزی مشینیں چلانے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔پشاور کے تانبے اور کانسی کے برتنوں کی چمک شمال مغربی سرحدی علاقے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔چمک دار دھات کی بنی ہوئی گول ٹرے ،کافی سیٹ ، کافی دل کش میز ، شمع دان اور مختلف شکل کی پلیٹیں سیاح کو خریداری پر مجبور کر دیتی ہیں۔اس نفیس دست کاری کا راز موروثی اور روایتی ہے۔پختون محنت ،مشقت کرنے والی قوم ہے۔یہ لوگ بہترین ہُنر مند ہیں۔اپنے کام میں مکمل مہارت رکھتے ہیں۔سوات کے آس پاس کا علاقہ اسلام پور ہے جہاں لوگ کھڈیوں پر کپڑے اور پردے بناتے ہیں۔سوات میں سینکڑوں پنجابی جو کہ سوات کے رہائشی ہیں۔سیدو شریف میں منگورہ ٹیکسٹائل انڈسٹریز میں کام کرتے ہیں۔سوات میں بڑے بڑے کارخانے کام کر رہے ہیں۔منگورہ مل میں پانچ سو سے اُوپر لوگ ملازمت کرتے ہیں۔یہاں جاپانی طرز کی مشینیں بھی لگی ہوئی ہیں ، جن میں ریشمی کپڑے بنتے ہیں۔

کیمی میر پوا نے پاکستان کی سیاحت کے دوران ملک کے ہر حصّے کو اچھی طرح سے دیکھا یہاں کی تاریخ ، ثقافت کو دیکھا سمجھا اور اپنے سفر نامے "سفر نامہ پاکستان" میں اس کا مفصل ذکر کیا۔کیمی پوا خیبر پختونخوا کے لوگوں کے روز گار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

”اِرد گرد کے علاقہ میں اسلام پور بھی آتا ہے جہاں گاؤں کے لوگ کھڈیوں پر رنگ برنگ کپڑے اور پردے بنتے ہیں۔سوات میں سینکڑوں پنجابی رہتے ہیں۔جو سید و شریف میں منگورہ ٹیکسٹائل انڈسٹریز میں کام کرتے ہیں۔معقول آمدنی کی وجہ سے سواتی اور پنجابی باہم مل جل کر رہتے ہیں۔سوات میں بڑے بڑے کارخانے دیکھ کر پاکستانی اور غیر ملکی دنگ رہ جاتے ہیں۔منگورہ مل میں پانچ سو سے اُوپر ملازم ہیں۔شیشہ چڑھی کھڑکیوں کے ساتھ بجلی کے کرگھے چلتے ہیں۔جاپانی طرز کی مشینوں سے ریشمی کپڑے کے تھان نکلتے ہیں۔شفٹیں دن رات کام کرتی ہیں اور یہاں پر اس شخص کے لیے کام موجود ہے جو کام کی تلاش میں ہے۔“(100)

خیبر پاس اور پشاور کے گردو نواح میں لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ یہاں کچھ کاری گر مٹی اور تانبے کے برتن بنانے کا کام کرتے ہیں۔

وادی کاغان میں چائے کا کاروبار بھی بہت نفع آور ہے۔اچھے چائے خانے آمدنی کا بہترین روز گار ہیں۔گھریلو صنعتوں میں بڑی عمدگی سے فرنیچر بنتا ہے۔یہاں کے لوگوں کے روز گار میں بھیڑ کی اُون سے کپڑے بنانا ، گائے کے چمڑے سے جوتے بنانے کا کام کیا جاتا ہے۔یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر مہاندری ہے۔جہاں ایک صاف ستھرا ریسٹ ہاؤس ہے۔یہاں سایہ دار ٹھنڈی ہوا ہے۔یہاں کے لوگ چمڑے کے خوب صورت جوتے بنانے کا کام کرتے ہیں۔سنار زیورات بناتے ہیں اور چمک دار دھاتوں سے بٹن ڈھالتے ہیں۔چاندی کی خوب صورت بالیاں مناسب دام میں مل جاتی ہیں۔یہاں کے لوگ کسی نہ کسی کاروبار سے مُنسلک ہیں اور ہُنر مند محنت کش طبقہ ہیں۔

بقول کیمی پوا:

”مہاندری کے لوگ چمڑے کے خوب صورت جوتے بناتے ہیں جن پر طلے کا کام ہوتا ہے۔“(101)

سوات کے لوگوں کی آمدنی کا دارومدار چوں کہ سیاحت پر ہے۔وہ اسی وجہ سے سیزن طویل ہونے کی دُعا کرتے ہیں۔کیوں کہ سوات کے لوگ سیاحوں کی بدولت بہت کماتے تھے۔ان کے ہوٹل ،ریستوران انہی کے دم سے چلتے ہیں۔ٹرانسپورٹ کے مالکان ان سیاحوں کی بدولت بہت کماتے ہیں۔یہ سیاح سوات والوں کے لیے اللہ کی ایک نعمت ہیں اور نعمتوں کا شکر انسان پر ہر حال میں فرض ہے۔یہ بھی سوات کے لوگوں کا ایک روزگار ہے اور جو لوگ اس روزگار سے وابستہ ہیں ان کے مالی حالات بہت اچھے ہیں۔

آغا سلمان باقر اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> "سوات کے لوگوں کی آمدنی کا دارومدار چوں کہ سیاحت پر ہے۔غالباً
> اسی لیے وہ سیزن کی طوالت کی دُعا کرتے ہیں۔اس میں برکت کی دُعا
> ان کے شعور سے بلند محسوس ہوتی ہے۔
> اگر سیاح نہ ہوں تو سوات کے لوگ بھو کے مر جائیں۔۔۔"(102)

"سفر گزشت" عبدالحفیظ مرزا کا تحریر کردہ سفر نامہ ہے۔جس میں اُنھوں نے پاکستان کے ساتھ ساتھ آدھی دُنیا کی سیر کی ہے۔عبدالحفیظ مرزا کا یہ سفر نامہ اگرچہ پاکستانی علاقوں میں صرف سوات ، پشاور اور درہ آدم خیل کی سیاحتی روداد ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔قبائلیوں کی مہمان نوازی تو پوری دُنیا میں مشہور ہے۔یہاں پہنچ کر عبدالحفیظ مرزا نے فیکٹریاں دیکھیں اور ان میں کام کرتے لوگ دیکھے۔لوگوں کے حالات زندگی پتہ چلے کہ لوگ کس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں عبدالحفیظ مرزا رقم طراز ہیں :

> "پیٹ بھر کر کھانا کھایا اس کے بعد طیفور مجھے فیکٹریاں دکھانے لے
> گیا۔وہاں بھی مہمان نوازی کا وہی عالم تھا۔کاری گر وں کو کام کرتے
> دیکھا۔کوئی نالی بنا رہا تھا تو کوئی دستہ کسی کے ذمے ٹریگر سازی تھی تو
> کوئی گولیاں ڈالنے والا چیمبر بنانے میں مصروف تھا۔غرض یہ کہ ہر
> کاری گر کے ذمے ایک کام تھا جسے وہ بہت خوبی سے انجام دے رہا
> تھا۔"(103)

پختون معاشرے کی سب سے بڑی برائی وہاں ہیروئن جیسے زہر کا کاروبار ہے۔ جو لوگ ہیروئن کا کاروبار کرتے ہیں۔ دنوں میں امیر لوگوں میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ اس زہر نے لوگوں کو راتوں رات مال دار بنا دیا ہے۔

بقول رضا علی عابدی:

> "پشاور میں ہیروئن کا بڑا چرچا ہے۔ جیسے جیسے مغرب والوں کی جیبیں خالی ہو رہی ہیں۔ ادھر والوں کی تجوریاں بھر رہی ہیں۔ لوگ راتوں رات مال دار ہو گئے ہیں۔ میں ایک بزرگ سے باتیں کر رہا تھا کہنے لگے کہ یہ جو پڑوس کا بڈھا ہے۔ اپنے گدھے کرائے پر چلایا کرتا تھا اب ہیروئن کا دھندا چلا کر کروڑ پتی بن گیا ہے۔ جیسے چرس نے اس کے دن پھیرے بہت سے لوگوں کے دن بھی پھیرے۔" (104)

سوات میں خصوصی اہمیت کا حامل کوئی بڑا کارخانہ موجود نہیں ہے۔ تاہم سوات میں 462 چھوٹے بڑے پبلک ساز کام کر رہے ہیں۔ ان کارخانوں کی اکثریت منگورہ اور اس کے مضافات میں واقع ہے۔ ان میں مصنوعی ریشم سے کپڑا بنانے 425 کارخانے، آٹے کی چار ملیں، ادویات کی کئی فیکٹریاں، پلاسٹک کی اشیا، ہاٹ پاٹس، واٹر کولر بنانے کے تین کارخانے اور فرنیچر کی کئی فیکٹریاں شامل ہیں۔ چند کارخانوں میں اُونی کپڑا بھی بنتا ہے۔ ان کارخانوں میں ہزاروں لوگ مقید ہیں۔ ان کارخانوں کی بدولت ڈھیروں لوگ یہاں آباد ہیں اور عزت کی زندگی جی رہے ہیں۔ چینی کے برتن، ٹائلیں اور سینٹری کا سامان یہاں تیار ہوتا ہے۔ سوات اور پورا مالاکنڈ ڈویژن ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہے۔ یہاں بہت سی صنعتیں ہیں۔ جن میں ریشمی کپڑے کی صنعت کے علاوہ سامان آرائشِ حسن (کاسمیٹکس) اور برقیات (الیکٹرونکس) کی مصنوعات شامل ہیں۔ ایلفی کی پیکنگ بھی منگورہ میں کی جاتی ہے۔ ان کارخانوں میں تقریباً 20 ہزار مقامی اور غیر مقامی افراد برسرِ روزگار ہیں۔ سوات میں دست کاری اور گل کاری کی گھریلو صنعتیں ہیں۔ جو پورے ملک میں اپنی فنی نزاکت کی وجہ سے مقبول ہیں۔ سوات میں کھڈیوں کی صنعت بہت پرانی ہے۔ قدیم زمانے ہی سے سیدو شریف اور اسلام پور میں کھڈیوں کے ذریعے نرم ملائم اُونی کپڑا اور گرم کمبل بنائے جاتے تھے۔ پہلے یہ مصنوعات ہاتھ سے

چلنے والی کھڈیوں کے ذریعے تیار ہوتے تھے۔لیکن اب کپڑے کی تیاری کاکام کھڈی مشین کے ذریعے ہوتا ہے۔ سینکڑوں افراد ان فیکٹریوں میں ملازم ہیں۔یہ فیکٹریاں ان کی روزی روٹی کاذریعہ ہیں۔

فصل ربی راہی سوات کے باشندوں کے روزگار پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے سفر نامے "سوات ، سیاحوں کی جنت" میں لکھتے ہیں:

> "سوات میں کھڈیوں کی یہ صنعت صدیوں پرانی ہے۔قدیم زمانے میں سیدو شریف اور اسلام پور میں چرخوں اور کھڈیوں کے ذریعے نرم و ملائم اُونی کپڑے اور گرم کمبلوں کی تیاری کاکام کیاجاتا تھا۔جنھیں اس وقت کے امرا ، بادشاہوں اور راجاؤں کو خصوصی نذرانوں کی صورت میں پیش کیاکرتے تھے۔آج سے پندرہ سال قبل یہ مصنوعات ہاتھ سے چلنے والی کھڈیوں کے ذریعے تیار کی جاتی تھیں۔جن کا طریقہ بہت دقت طلب ہوتا تھا۔جس سے زیادہ وقت میں کم کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔لیکن بعد میں کھڈیوں کی اس صنعت نے ترقی کی اور اب کپڑے کی تیاری کاکام کھڈی مشین کے ذریعے ہوتا ہے۔جس کا طریقہ نہ صرف سہل ہے بلکہ اس طریقے سے کم وقت میں زیادہ کپڑا تیار ہو جاتا ہے۔"(105)

قصّہ خوانی بازار کے مشرقی سرے سے متصل شمالی طرف بازار مسگراں ہے۔جہاں تابنے کے برتنوں کا ہُنر اور پیشہ اب تک زمانہ قدیم سے قدیم ثقافت کے ساتھ زندہ و پائندہ ہے۔مسگری کے پیشے میں تانبے سے بنے ہوئے ظروف اور دیگر نمونے یہاں دستیاب ہیں۔یہاں کے کاری گر بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔تابنے کو پگھلاکر مختلف اشیا بڑی مہارت سے بنائی جاتی ہیں۔گھریلو استعمال کے برتنوں پر صرف ٹھپہ جب کہ فینسی برتنوں پر بڑی ہُنر مندی و مہارت کے ساتھ دست کاری اور چیستر کاری کرتے ہیں۔یہ مغلیہ دور کامقبول ترین ثقافتی فن ہے۔

چھاپہ گری:

پشاور کا یہ ثقافتی پیشہ بڑی شہرت کا حامل ہے۔اس کام کے دست کار کو چھاپہ گر کہتے ہیں۔بازار گھنٹہ گھر ، مینا بازار اور کری پورہ بازار میں چھاپہ گروں کی دُکانیں بکثرت تھیں۔موجودہ

زمانے میں یہ دست کاری کا کام کم ہو گیا ہے ، مگر موجود ہے۔سفید کپڑے پر مختلف قسم کے رَنگوں کے ٹھپے لگاتے ہیں۔

چپلی سازی :

قدیم ثقافتی پیشوں اور جدید حالات میں اس پیشے کو یکساں مقبولیت حاصل ہے۔یہ چمڑے سے بنائی جاتی ہے اور مختلف رنگوں اور نمونوں سے تیار کی جانے والی چپلی کو شہرت حاصل ہے۔ا ن دست کاروں کو عام طور پر "موچی" کہتے ہیں۔یہ ایسی صنعت ہے جس کا کام ہاتھ سے ہوتا ہے۔

نسوار سازی:

صوبہ سرحد کی روایتی ثقافتی زندگی میں نسوار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔صوبہ سرحد کے دارالخلافہ پشاور میں نسوار سازی کا پیشہ بھی دوسرے پیشوں کی طرح مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

قاری جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

> " پشاور میں جگہ جگہ نسوار کی سجی دُکانیں اکثر موجود تھیں اور کارخانوں میں تیار کی ہوئی نسوار کو ایک خاص ترکیب سے اور چند محلول ڈال کر از سرِ نو تیار کیا جاتا ہے۔"(106)

چوڑی گری:

شیشے سے چوڑی بنانے کو چوڑی گری کہتے ہیں۔چوڑیوں کا رواج ہر دور میں رہا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اب شیشے کی جگہ پلاسٹک نے لے لی ہے لیکن اچھی اور عُمدہ چوڑی شیشے ہی کی سمجھی جاتی ہے۔

ازار بندی:

پشاور کے لوگ اپنی ہندکو زبان میں "ازار" کو "ناڑا" کہتے ہیں۔اس ازار بنانے کے پیشے کو "ازار بندی" کہتے ہیں۔پشاور اور گردو نواح کی دیہاتی عورتیں یہ بنا کر دُکانوں پر فروخت کرتی ہیں۔

قاری جاوید اقبال اس ضمن میں لکھتے ہیں :

> " یہ کام پشاور اور گردونواح کی دیہاتی عورتیں اپنے گھروں میں کرتی ہیں۔یہ ازار بند سوت اور ریشم سے بنائے جاتے ہیں۔اس کا رواج اب

تک ہے اور دیہاتی عورتیں بنا کر دُکان داروں کو فروخت کرتی
ہیں۔"[107]

ظروف سازی:

مٹی کے برتن پشاور میں کمہار لوگ بناتے ہیں اور پھر انھیں رَنگ کر کے ان کی سجاوٹ کرتے ہیں۔ان میں گھڑے ،پیالے ،دیگچے ،دیگچیاں ،مٹکے ،گملے اور کئی اشیا شامل ہیں۔گل دان اور دیگر سجاوٹ کی چیزیں بھی شامل ہیں۔

قاری جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"پشاور میں اب بھی کمہار لوگ یہ اشیا بناتے ہیں اور بازار قصہ خوانی
میں ظروف سازی کا ایک کارخانہ ابھی تک موجود ہے۔"[108]

تنور سازی:

پشاور کے بڑے بڑے دیو نما تنور بہت مقبول ہیں۔جگہ جگہ تنور موجود ہیں۔ایک تنور کئی کئی دنوں میں تیار ہوتا ہے اور بڑی مہارت کے ساتھ یہ تنور بنتے تھے۔

لنگی بانی :

پشاور کے باوقار لوگ لنگی بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں۔یہ خاندانی وقار کا حصّہ ہے۔اگرچہ اس کا استعمال اب کم ہو چکا ہے۔خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی بنا پر یہ اہم پیشہ ہے۔

مہر کنی:

یعنی مہر کو کندہ کرنا اس پیشے کی مناسبت سے محلہ مہر کندہ اب تک معروف محلّہ ہے۔لوگ بڑے شوق سے اپنی انگوٹھی کے نگ پر اپنا نام یاد دستخط کندہ کراتے تھے۔یہ کام کرنے والے "مہر کندان" کہلاتے ہیں۔

چڑ دے کوباں:

پشاور کے لوگ چاولوں کی ایک خاص قسم کو چڑوا کہتے تھے۔اسے اچھی طرح کوٹ کر چاولوں کو چھلکے سے الگ کر کے بھون کر اس کی پھلیاں بنائی جاتی ہیں۔اس پیشے کی مناسبت سے یہ چڑ دے

کوہاں مشہور ہوا۔یہ پھلیاں پشاور کے لوگ خوشی اور ختم قران کے موقع پر بانٹتے ہیں۔یہ پھلیاں میٹھی اور پھیکی دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال :

"اس پیشے کی مناسب سے ایک علاقہ چڑ دے کوہاں بہت مشہور ہے اور اس پیشے سے منسلک یہ لوگ یہاں کے باسی تھے۔اس پیشے میں حاجی رمضان اور حاجی فدا بہت مشہور گزرے ہیں۔جنھیں پھلیاں والے کہتے تھے۔اس علاقے میں شب وروز یہ کام کیاجاتا ہے۔"(109)

زرگری:

پشاور کے زرگرد بہت مشہور ہیں چوک یادگار کے پاس اندر شہر بازار میں زرگروں کی دُکانیں ہیں۔سونے اور چاندی کے مختلف قسموں کے زیور تیار کرتے ہیں۔

چڑی مار:

چڑی مار ،بٹیر ،چکور ،چڑی ، تیتر کو زندہ پکڑ کر فروخت کرتے ہیں۔ان کے پیشے سے منسوب ایک محلّہ چڑی ماراں اب تک موجود ہے۔کوہاٹی گیٹ میں پرندوں کی بکثرت دُکانیں ہیں۔

کشیدہ کاری:

شالوں ،چادروں اور کپڑے کے جوڑوں پر مختلف نمونے بنا کر ان پر مختلف ریشمی دھاگوں سے کام کو کشیدہ کاری کہتے ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال:

" پشاور میں زیادہ تر گھر کی خواتین اور لڑکیاں گھروں میں یہ کام کرتی ہیں اور پھر ان کی دست کاریوں کو دُکان دار خرید کر دُکانوں پر بیچتے ہیں۔بیاہ شادی کے موقع پر اس صنعت کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔"(110)

قریشیہ :

کشیدہ کاری کی طرح یہ ہُنر بھی گھروں میں خواتین اور بچیاں اپنائے ہوئے ہیں۔اگرچہ اب اس کا رواج کم ہو گیا ہے۔لیکن پھر بھی بعض گھرانوں میں خواتین و بچیاں یہ کام کرتی ہیں۔لوہے کی

ایک عمدہ سلائی جس کے سر پر مڑا ہوا کنڈہ ہوتا ہے۔اس کنڈے میں دھاگہ پھنسا کر مختلف نمونے بنائے جاتے ہیں۔ان میں پلنگ کی چادریں ،میز پوش اور دیگر سجاوٹی سامان کے لیے یہ کام بہت مشہور ہے۔شادی بیاہ کے موقعوں پر یہ کام صدیوں سے ہوتا چلا آرہاہے۔

کافرستان ، خیبر پختونخوا کا جنت کا ٹکڑا جنگلات میں خود کفیل ہے۔کافرستان میں جنگلات کافی مقدار میں ہیں۔یہ پہاڑی علاقہ ہے اور پہاڑوں سے ڈھکا ہوا ہے۔یہاں تین وادیاں بمبوریت ،رمبور اور بریر پہاڑوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔یہاں کے تمام پہاڑ نہایت سرسبز اور گھاس پھوس سے بھرے ہوئے ہیں جن میں بہترین زرخیز چراگاہیں ہیں۔لوگ ٹھیکہ داری کا کام کرتے ہیں۔یہاں کے لوگ اس کے ساتھ ضروری سامان مزدوری کر کے کچھ پیسہ کما لیتے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں بہترین زرخیز چراگاہیں ہیں۔جس کی وجہ سے لوگ جانور چرانے کا کام کرتے ہیں۔زرخیز زمین ہے۔کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔یہاں بکثرت مشروم پیدا ہوتا ہے۔جیسے یہ دیوتاؤں کی خوراک سمجھتے ہیں۔

سفر نامہ ”کافرستان“ پرویش شاہین کا بہترین سفر نامہ ہے۔جس میں اُنھوں نے کافرستان کی ثقافت کو بڑے مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔اس سفر نامے میں اُنھوں نے کافرستان کی ثقافت اور زبان کو موضوع بنایا ہے اور گھر بیٹھے کافرستان کی سیر کرائی ہے۔وہ یہاں بسنے والوں کے روزگار یا پیشے کو سامنے لاتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”جنگلات کافرستان میں کافی مقدار میں ہیں۔جہاں یہ لوگ ٹھیکہ دار وں کے ساتھ مزدوری کر کے کچھ پیسے کما لیتے ہیں۔اگرچہ جنگلات تینوں وادیوں میں ہیں مگر سب سے بڑا جنگل وادی رمبور ہے۔ان کے جنگلوں میں بہترین لکڑ کے درختوں کے علاوہ قیمتی جڑی بوٹی پائی جاتی ہے۔“(111)

یہاں کے لوگوں کا ایک پیشہ یہ بھی ہے کہ وہ سیاحوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرا لیتے ہیں اور وہ جاتے ہوئے اپنی خوشی سے کچھ رقم دے جاتے ہیں اور یہی یہاں کے لوگوں کے لیے آمدنی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔اس کے علاوہ یہاں کے لوگ جانور پالتے ہیں اور ان کے گوشت اور دُودھ کی فروخت سے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔یہ یہاں کے لوگوں کے پیشے ہیں۔یہاں آمدنی کا بڑا ذریعہ باغات ہیں۔لوگ اپنے باغوں کے پھل بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔یہاں غربت بہت ہے ،اسی وجہ سے لوگ اپنے باغوں

کے پھل کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس روٹی کھانے کے لیے رقم نہیں ہوتی وہ اسی طرح گزر بسر کرتے ہیں۔

بقول پرویش شاہین:

"کوئی کچی پکی سڑک موجود نہیں ہے۔اس کے باوجود بھی سیاح وہاں آتے ہیں۔لیکن ان کے ٹھہرنے کے لیے کوئی خاطر خواہ جگہ کا انتظام نہیں ایک دو ہوٹل ہیں جن کے کرائے آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور باقی سیاح مقامی لوگوں کے گھروں میں ٹھہر جاتے ہیں اور جاتے ہوئے اپنی خوشی سے کچھ رقم دے جاتے ہیں اور یہی ان لوگوں کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔"(112)

چترال میں معدنیات بہت زیادہ ہیں۔یہاں سونے کے پہاڑ ہیں۔کہیں کہیں دریا کے کناروں پر لوگ بطور پیشہ سونا جمع کرنے کا کام کرتے ہیں۔یہی ان کا روزگار ہے۔کناروں پر سونا کانوں سے بہہ کر آ جاتا ہے۔کیوں کہ یہاں اصل کھدائی کا کام نہیں ہوتا۔جو لوگ دریا کے کناروں سے سونا اکٹھا کرتے ہیں۔وہ ریاست کو ٹیکس بھی دیتے ہیں۔اگر حکومتی سطح پر اس سونے کو حاصل کیا جائے تو ان علاقوں کی تقدیر بدل جائے۔ان علاقوں میں سونا ،چاندی ،لوہا ،کوئلہ ،ابرک ،گندھک وغیرہ بکثرت پایا جاتا ہے۔

محمود دانش ور ایران سے پاکستان آئے تھے۔اُنھوں نے اس سفر نامے "کافرستان" کو فارسی زبان میں لکھا۔جسے خلیل احمد نے ترجمہ کیا۔اُنھوں نے یہاں کی ثقافت کا بھرپور جائزہ اس سفر نامے میں پیش کیا:

"کہیں کہیں دریا کے کنارے لوگ سونا جمع کرتے ہیں جو کانوں سے بہہ کر دریا میں آ جاتا ہے۔لیکن اصلی کانوں کی کھدائی کا کام نہیں ہوتا۔جو لوگ دریا کے کنارے سے سونا جمع کرتے ہیں وہ ریاست کو محصول ادا کرتے ہیں۔"(113)

کافرستان چوں کہ زرخیز وادی ہے۔جنگلات ہیں۔سبزہ ہے ، چراگاہیں ہیں ، پہاڑ ہیں۔قدرت نے اس خطے کو حُسن سے مالا مال کیا ہے۔یہاں کے لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ

ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔یہاں کے لوگ ہُنر مند ہیں۔کپڑوں پر ڈیزائنگ اور گل کاری کا کام انتہائی اعلیٰ کرتے ہیں۔بس ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں کسی کام کا راستہ دکھایا جائے۔یہاں صنعتیں نہیں ہیں پھر بھی یہ لوگ اپنی ضرورت کی کافی چیزیں بنا لیتے ہیں ، دیسی قالین بھی بنائے جاتے ہیں۔کپڑے تیار کرتے ہیں۔جن پر کشیدہ کاری بھی کرتے ہیں۔یہاں کے لوگ باقی دُنیا سے الگ ہیں۔اور کھیتی باڑی ، قالین بانی ،چرواہی وغیرہ کے کام کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں۔سیاحوں کو اپنے گھروں میں دیکھ کر ان کی خدمت کرتے ہیں اور معاوضہ وصول کرتے ہیں۔یہ بھی ایک پیشہ ہے یہاں کے لوگوں کا۔دودھ ، گوشت اور پھل فروخت کرنا بھی یہاں کے لوگوں کے پیشے ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

> ”یہاں کے لوگ عام طور پر زراعت کا کام کرتے ہیں۔مصیبت یہ ہے کہ وہاں کاشت کرنے والوں کے لیے زمین زیادہ نہیں ہے اور پانی بہت زیادہ ہے۔کچھ لوگ دیسی قسم کے قالین بھی بناتے ہیں اور کپڑوں پر گل کاری کا کام بہت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔“(114)

viii. طرزِ رہائش:

خیبر پختونخوا اپنے حُسن اور اپنی قدیم ثقافت ، تہذیب اور تاریخ کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔اُونچے اُونچے پہاڑ ، سر سبز وادیاں ، گنگناتے جھرنے ،خوب صورت جھیلیں اس صوبے کی اصل پہچان ہیں۔جس طرح سے آب و ہوا ، لباس ، خوراک ، ثقافتی عناصر ہیں ،ایسے ہی رہائش گاہیں بھی ثقافتی عناصر ہی میں شامل ہیں۔رہائش گاہیں عموماً آب و ہوا کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔کیوں کہ جیسی آب وہوا ہوگی ،اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے طرزِ رہائش اختیار کرنی پڑتی ہے۔

پشاور شہر کے عام شہریوں کے قدیم طرز کے مکانات کے نمونے آج تک بعض علاقوں اور محلوں میں پائے جاتے ہیں۔ان مکانات میں بعض امیر لوگوں کے بڑے بڑے لکڑی کے دروازوں والے اور کھلی ڈیوڑھی پر مشتمل دو دو تین تین منزلوں والے مکانات ہیں۔جنھیں حویلی کہا جاتا تھا۔اس قسم کے مکانات گنج کے علاقے کے اندر اب تک موجود ہیں۔جو زیادہ تر قزلباشوں کے مکانات

ہیں اور اکثریت کے کچے مکانات جو عام اور متوسط طبقوں کے مکانات ہیں۔اگرچہ گردش ایام کے ساتھ ساتھ مکانات کی تعمیر کا انداز بدل چکا ہے۔لیکن اب بھی رہائشی ثقافت کا نمونہ پیش کرنے کے لیے قدیم مکانات موجود ہیں۔عام لوگوں کے مکانات بھی معمولی ہوتے تھے۔البتہ غریب لوگوں کے مکانات چھوٹے اور کیچڑ کے بنے ہوئے دیواروں میں لکڑیوں کے سہارے لگا دیئے جاتے تھے جو دیوار کو مضبوط رکھتے۔بالائی خانے یعنی چھت پر لیٹرین بنائی جاتی تھی۔ساتھ ہی غسل خانہ بھی بنایا جاتا تھا۔اکثر ان گھروں کے اُوپر کے حصّے میں پڑوس میں رابطے کے لیے ایک چھوٹی سی کھڑکی بنائی جاتی تھی ،جسے "باری" کہتے ہیں۔ان کھڑکیو ں سے کھانے پینے کے تبادلے بھی ہوتے تھے۔پشاور کے قدیم گھروں میں آج بھی یہ کھڑکیاں موجود ہیں۔

بقول جاوید اقبال:

"پشاور کے لوگوں کی رہائشی ضرورت کے ماتحت ثقافتی تعمیرات جو اپنے اندر ایک خاص قدرتی حُسن اور سادگی کا عکس پیش کرتیں ایک اور قابلِ ذکر بات ان مکانات میں یہ تھی کہ اکثر ان رہائش گاہوں کے اُوپر کے حصّے میں ہمسائے کے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم رکھنے کی خاطر ایک چھوٹی سی کھڑکی بنائی جاتی تھی۔جسے پشاوری "باری" کہتے تھے۔ان کھڑکیوں کے ذریعے اکثر کھانے پینے کی اشیا کے تبادلے کرتے اور ایک دوسرے کی غمی وخوشی کے موقعے پر آمدورفت رکھتے جس سے پیارو محبت اور آپس میں اخوت وبھائی چارہ کی خو بڑھتی رہتی تھی۔"(115)

دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں تو کوہستان کا علاقہ جیسے ہی ختم ہوتا ہے۔دریا اور سڑک نیچے اُترنے لگتے ہیں۔یہ تھا کوٹ کا علاقہ ہے۔تھاکوٹ یہاں کے لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں۔نیچے وادیوں میں جہاں گاؤں اور گھاس پھونس کے مکان نظر آتے تھے ،اب وہاں لوگ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کر چکے ہیں۔اب پتھروں کی نئی صاف ستھری عمدہ قسم کی عمارتیں نظر آنے لگیں ، جن پر ٹین کی کچھ چھتیں نئی نئی تھیں کہ دھوپ پڑنے سے چمک رہی تھیں۔

رضا علی عابدی سفر نامہ "شیر دریا" میں رقم طراز ہیں:

> ”نیچے وادیوں میں جہاں گاؤں اور گھاس پھونس کے مکان دکھائی دیا
> کرتے تھے۔اب پتھروں کی نئی صاف ستھری عمدہ عمارتیں نظر آنے
> لگیں۔جن پر ٹین کی چھتیں اتنی نئی تھیں کہ دھوپ میں جھلملا رہی
> تھیں اور جن گہری وادیوں میں دھوپ کی رسائی نہیں تھی وہاں
> ٹھنڈے سائے میں پہاڑی نالے ہلکا ہلکا شور مچارہے تھے۔“(116)

تھاکوٹ انتہائی پس ماندہ علاقہ تھا۔وہاں کی زندگی بہت مشکل تھی۔لیکن شاہراہ قراقرم سے جڑنے کے بعد ان لوگوں کا معیارِ زندگی بڑھ گیاہے۔ان کی زندگی میں سہولتیں آگئی ہیں۔ان سہولتوں نے ان کے اندازِ رہائش کو بھی بدل دیا ہے۔

وادی کاغان حسن کا مرقع ہے ،چوں کہ یہ ایک بہترین سیاحتی مقام ہے۔یہاں آنے والو ں کا تقریباً پورا سال ہی تانتا بندھا رہتا ہے۔یہاں جن کے حالات اچھے ہیں۔اُنھوں نے پہاڑوں پر بنگلہ نما مکان تعمیر کررکھے ہیں۔رات کو ان میں جلتی لائیٹیں بہت خوب صورت لگتی ہیں ،لگتا ہے کہ پہاڑوں پر قمقمے روشن ہیں۔کاغان وادی کا سب سے بڑا قصبہ ہے۔اس کو جانے والا راستہ نوکیلے بڑے بڑے پتھروں کے ایک میدان میں سے گزرتا ہے۔کہیں کہیں چٹانوں پر لکڑی کی ڈھلانی چھتوں اور کھلے برآمدوں والے مکان موجود ہیں۔واقعی انسان کی عقل بے مثال ہے۔اس نے پہاڑوں پر بھی خوب صورت دودو تین منزلہ مکان تعمیر کررکھے ہیں۔

بقول خالد اختر:

> ” اکا دکا چٹانوں پر لکڑی کی ڈھلانی چھتوں اور کھلے برآمدوں والے
> رنگین مکان ہیں۔ہزاروی نے کاسہ یسوں کی مثالی خوشی سے ہمیں
> بتایا کہ یہ سیدوں کے بنگلے ہیں۔“(117)

ناران کے بازار اور گاؤں میں تین چھوٹی دوکانیں ،پتھر کے چند کوٹھے اور پتھر کی چنی ہوئی باڑیں جن کے پیچھے مکئی کے کھیت تھے جو دریا تک جاتے تھے۔یہی کل ناران کا گاؤں ہے۔جہاں پتھر کے مکانات ہیں۔

سوات کی ایک وادی بحرین ہے جہاں دریائے سوات اور دریائے گبرال کا سنگم ہوتا ہے۔اس لیے اسے بحرین کہتے ہیں۔بحرین نہایت ہی خوب صورت اور دل کش وادی ہے۔بحرین یہاں

پتھر کے مکانات ہیں۔جو دو دو منزلہ بوسیدہ گھر ہیں۔گھروں کے نیچے لکڑی کے ستونوں کے برآمدے تھے۔گھر پرانے انداز کے ہیں۔

بقول محمد خالد اختر :

"ہم بحرین میں تھے ہوٹل کے آگے ایک چٹان کے نیچے کے دو دو منزلہ بوسیدہ گھر تھے جن کے نیچے لکڑی کے ستونو ں کے برآمدے تھے۔"(118)

گو ترائی بظاہر آدمی اور حیوان کے لیے روزی اور پرورش کے ذرائع مہیا نہ کرتی تھی مگر انسان آکر آباد ہوگئے تھے۔حالاں کہ یہاں اچھے گاؤں اور قصبے بھی موجود تھے۔برساتی نالوں کے ریتلے کناروں پر پتھر اور گارے کے بڑے گڈمڈ سے دل فریب گاؤں وہ اپنی پیچ دار گلیوں اور اُونچے مکانوں کے ساتھ بھڑوں کے چھتے لگتے تھے۔ان ٹیڑھی ناہموار گلیوں میں چلتے تھے۔پتھریلی حویلیوں میں رہتے تھے۔ترائی ایک اُونچی گھاس اور سبزے کی چراگاہ تھی۔

کوہستان کے دو حصے ہیں۔ایک سوات میں دوسرا دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ہے۔یہاں لکڑی کے مکانات ہیں۔پہاڑوں کے دامن میں لکڑی کے مکانات ہیں اور جن کے ساتھ ساتھ ندی بہہ رہی ہے۔یہاں پہاڑوں پر لکڑی کے گھر موسمی اَثرات سے محفوظ رہنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر عباس برمانی :

"ہمارے بائیں طرف پہاڑ کے دامن میں لکڑی سے بنے مکانات تھے۔جن کے آگے گویا آنگن میں ندی بہہ رہی تھی اور اس میں خواتین کپڑے دھورہی تھیں۔"(119)

کالام کا گاؤں الائی کوٹ اتناخوب صورت کہ اسے دیکھنے والا فیصلہ نہیں کرپاتا کہ یہ حسین وادی پاکستان میں ہے یا سوئٹزلینڈ میں۔جس کے گرد اور برف پوش پہاڑ کھڑے تھے۔یہ اپریل کا مہینہ تھا اور برف ابھی تک جمی ہوئی تھی۔اس موسم میں بھی یہاں بہت سردی ہوتی ہے۔یہاں چند مکانات تھے۔وادی کی خاموشی سردی کی وجہ سے اور زیادہ محسوس ہوتی تھی۔سرخ چھتوں والے جھونپڑے اور ہوٹل کی جدید عمارت تھی۔ہوٹل ابھی تک نہیں کھلا تھا۔اُمید تھی کہ اپریل کے آخر

میں کھلے گا۔ برف کی وجہ سے یہاں زندگی معمول کے مطابق نہیں تھی۔ یہاں کے ہوٹل رہائش کے قابل ہیں۔ نیچے کے ہوٹل توڑنے کے قابل نہیں ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے "سفر شمال کے" میں کالام کے حُسن کو سوئٹزر لینڈ کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں کے مقامات کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> "وادی کے ایک بلند مقام پر پی ٹی ڈی سی کا موٹل کا مپلیکس تھا۔ سرخ چھتوں والے جھونپڑے اور ہوٹل کی جدید عمارت جسے دیکھ کر جان میں جان آئی کیوں کہ ہم وہیں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔"(120)

وادی پشمال جس کے دائیں طرف شمال دریائے سوات ٹھاٹھیں مارتا ہوا۔ جنوب کی طرف بہہ رہا ہے۔ یہ سر سبز وادی اپنے حُسن میں بے مثال ہے۔ دریائے سوات ، جن پہاڑوں کی جڑ میں بہہ رہا ہے۔ ان پر راستے میں گھر ہیں ، آبادیاں ہیں ، پگڈنڈیاں ہیں۔ سوات میں پہاڑوں پر لکڑی کے گھر بنانے کا رواج ہے۔ اب تو جگہ جگہ پتھر اور سیمنٹ کے بنے گھر بھی نظر آتے ہیں۔ لکڑی کے گھر موسم کی شدت کی وجہ سے بنائے جاتے تھے۔ پہاڑوں پر برف پڑنا ، اس کی اصل وجہ تھی۔

وادی پشمال میں جگہ جگہ قدیم سواتی لکڑی کے گھر موجود ہیں۔ ان گھروں ، کھیتوں اور جھرنوں کے پسِ منظر میں برف پوش چوٹیاں اور پہاڑ ہیں۔ جن پر دیودار کے درخت ٹھنڈی ہوا سے ہولے ہولے جھومتے ہیں۔ یہاں کے بے سواتی لکڑی کے مکانات کشادہ صحنوں پر مشتمل پُر رونق مکانات ہیں۔

آغا سلمان باقر نے اپنے سفر نامے "دھماکہ لیک - سوات" میں اپنے اندرونِ سوات کی ان حسین اور لازوال وادیوں کے سفر کی داستان بیان کی ہے اور یہاں کے لوگوں کے طرزِ رہائش پر روشنی ڈالی ہے :

> "جگہ جگہ قدیم سواتی لکڑی کے گھر ہیں۔۔۔ جن کے آنگنوں میں بچے کھیل رہے ہیں اور بڑی بوڑھیاں صبح کے گھریلو کاموں میں مصروف ہیں۔"(121)

خیبر پاس خیبر پختونخوا کا وہ مقام ہے۔ جسے اس سرزمین پر آنے والے تمام سیاح دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس عظیم الشان خیبر جس کے گیت گائے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ اس کی خوب صورتی کے

بارے میں جانتے ہیں۔ یہاں لوگ پہاڑوں میں جھونپڑیوں میں اور غاروں میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ غیر مفتوح لوگ ہیں۔ یہ لوگ اپنی بدنامی کے ساتھ جینے کی بجائے عزت کی موت مرنا پسند کرتے ہیں۔

کیمی پوا اپنے سفر نامے ''سفر نامہ پاکستان'' میں رقم طراز ہیں:

''بہت کم لوگ اس کے باشندوں ،پٹھان قوم کے بارے میں جانتے ہیں۔۔۔ غیر مفتوح لوگ جو آج بھی پوشیدہ جھونپڑیوں اور غاروں میں رہتے ہیں ،اپنے اسلاف کی قائم کی ہوئی روایات پر چلتے ہیں۔''(122)

اگرچہ اب یہاں کے لوگ بھی کافی پہلے سے بہتر حالات میں رہ رہے ہیں۔ لیکن غاروں میں رہنے والے لوگ بکثرت ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ مٹی کے مکانوں میں بھی رہائش پذیر ہیں۔ خیبر پاس کے کچھ گاؤں ایسے ہیں جہاں صرف مسجد ہی ایک خوب صورت عمارت ہے ،باقی بستی کے گھر تو مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔

بقول کیمی پوا:

''غاروں میں رہنے والوں کی طرح یہ لوگ بھی مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ چھپے ہوئے میدانو ں اور ڈھلوان سڑکوں پر پہاڑ یوں کے اندر ہر گاؤں ایک سا ہے۔ جہاں مسجد محا فظ کی طرح کھڑی ہے۔ اس سارے منظر میں ہی مسجد ہی ایک خوب صورت عمارت ہے۔''(123)

چترال کی سیاحت کرتے ہوئے اور سفر نامہ نگاروں نے وہاں کے طرزِ رہائش کا بھی اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے۔ یہاں لوگ غاروں میں بھی رہائش پذیر ہیں مگر یہ غار بھی بہترین زندگی کی سہولیات سے آراستہ ہیں۔ یہ غار اندر سے بے حد نفاست سے سجے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ چترال میں خوب صورت عمارتیں بھی موجود ہیں۔ وادی میں رہائشی گھر بھی اچھے بنے ہوئے ہیں۔

سلمیٰ اعوان نے چترال کی سیاحت کے دوران وہاں کی ثقافت کا بھی جائزہ لیا ہے اور اسے اپنے سفر نامے ''سُندر چترال'' میں بیان کیا ہے۔ سلمیٰ اعوان ان کے طرزِ رہائش کے بارے میں لکھتی ہیں:

"تنگ و تاریک ستونوں والا کمرہ جس کے دروازے نیلے تھے اور کونے میں دو ٹیچی کیس پڑے تھے اگلا کمرہ اس سے بھی تاریک تھا۔ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔دہل کر باہر بھاگی باہر کیا تھا نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔خدایا یہاں انسان رہتے ہیں۔پہاڑ جیسا جگرا کیا اور پھر اس غار میں داخل ہوئی دونوں کمروں کا پل صراطِ جیسے تیسے پار کیا۔میرے خدایا آگے پھر ایک اور تاریک کمرہ تھا۔یقیناً مجھے اس وقت لوئیس کیرول کی ایلس یاد آئی تھی۔بلاشبہ میں ایلس نہیں تھی ساری ہمت ،حوصلہ اور میری اڑنچھو ہونے لگی۔"(124)

ان غاروں سے نکل کر قدیم اور جدید عمارتوں کی دل کشی تھی۔چترالی کمرے اور برآمدے تھے۔باہر کی ویرانی اور سناٹے کے برعکس یہ کشادہ کمرے زندگی کی حرارت سے لباب تھے۔غار کے اندر داخل ہوتے وقت جو اندھیرا جو منظر تھا وہ وہیں تک محدود تھا۔اس سے آگے کشادہ کمرے تمام سہولتوں سے آراستہ تھے۔یہ لوگ مہمان نواز ہیں۔ان غاروں میں زندگی کی رونقیں ہیں۔

بقول سلمیٰ اعوان:

"اندھیرے کے اس غار میں مجھے آخری سرے سے روشنی کی ایک کرن دکھائی دی میں دیوانہ وار اس کی طرف بھاگی۔میرے سامنے ایک دل کش منظر تھا۔رنگا رنگ پھولوں کی رعنائی مخملیں گھاس سے سجے لان کی دلربائی اور قدیم و جدید کی زیبائی داہنے ہاتھ چترالی کمرے اور برآمدے تھے۔برآمدے چترالی تخت قالین اور تکیوں سے آراستہ تھے سامنے شیشے کی کھڑکیوں اور جالی دار دروازوں والی جدید عمارت تھی ،جس کے برآمدے مارخور کے سینگوں اور پھولوں سے سجے تھے جس کمرے کی دہلیز میں جا کر کھڑی ہوئی وہ چترالیوں کی زبان میں بائیٹتس (نشت گاہ) کہلاتا ہے۔"(125)

گرم چشمہ کشادہ اور ترقی یافتہ وادی ہے۔یہاں عام لوگوں کے گھروں میں چولہا لپاپتا اور زمین سے دوفٹ اُونچی دیوار میں بنی لکڑی کی پڑچھتیوں پر قطار در قطار سجے ایلومینیم اور ستے سلور کے برتن تھے جنھیں نہایت لگن اور محنت سے مانجھا گیا تھا۔دیواریں کمرے میں کھانا پکنے کے باوجود

میلی نہیں تھیں۔کمرہ پُر رونق تھا۔یوں تو خیبر پختونخوا پورا ایک صوبہ ہے۔مگر ہر علاقے کے رہن سہن میں واضح فرق ہے۔

کاغان سے بارہ میل آگے مہاندری ہے۔جہاں ایک صاف ستھرا ریسٹ ہاؤس ہے۔گاؤں کے آس پاس کا علاقہ پرانی طرز کا ہے۔یہاں کے لوگ سیاحوں کی تعریفیں کر کے ان کو خوش کرتے ہیں اور ان کے آنے کو اہم واقعہ سمجھ کر اپنا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔اس گاؤں کے تمام مکانات پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔یہاں پر زیادہ تر مکان پہاڑوں کے دامن میں پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔

بقول کیمی پوا:

"گاؤں کے آس پاس کا علاقہ پرانی طرز کا ہے اور مکان پہاڑیوں کے دامن میں پتھروں کے بنے ہیں۔"(126)

پاکستان کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔چاہے کسی بھی صوبے کو دیکھیں۔آبادی کی اکثریت دیہاتوں میں رہائش پذیر ہے۔زیادہ دیہات کافی آرام دہ ماحول رکھتے ہیں۔صحن بہت بڑے اور زیادہ تر ہر گھر کے صحن میں درخت اور سبزے کی کیاریاں موجود ہیں۔دیہاتوں کی زیادہ تر رہائش گاہیں گارے سے بنائی گئی ایک منزلہ اور دس فٹ سے کم اُونچی ہیں۔زیادہ تر قدیم مکانات (کور) ایک فصیل بند احاطے میں ہیں۔جنھیں "گولائی" کہا جاتا ہے۔جس کے اندر کے حصے کو رہائشی مکان سمجھا جاتا ہے۔مکان کے اندر عموماً مٹی سے بنا ہوا ایک کنڈو، کچھ چارپائیاں، سٹول، لکڑی سے بنی ایک کپڑوں کی الماری کچھ چرخے اور مختلف طرح کی طشتریاں ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ حجرہ یا مہمان خانہ (جو اصولی طور پر گاؤں کے ہر ایک سیکشن سے ملحق ہوتا ہے) متعدد چارپائیاں اور بری چلم کی وجہ سے بہ آسانی شناخت ہو جاتا ہے۔یہاں کے مکانات بڑے بڑے کمروں اور صحن والے ہوتے ہیں۔دیہاتوں کی اپنی روایات و ثقافت ہیں۔

جی سی واکر ایسکو ائر کا تحریر کردہ "گزیٹر پشاور" ہے۔جس میں اُنھوں نے مردان، چارسدہ، نوشہرہ، پشاور شہر اور نواحی علاقوں کی ثقافت پیش کی ہے۔یہاں کے زیادہ تر رہائشی مکانات (کور) ایک فصیل بند احاطے میں ہیں۔باشندوں کی رہائش سے متعلق رقم طراز ہیں:

"زیادہ تر رہائشی مکانات (کور) ایک فصیل بند احاطے میں ہیں۔جنھیں "گولائی" کہا جاتا ہے۔جس کے اندرون کو رہائشی مکان

سمجھا جاتا ہے۔مکان کے اند عموماً مٹی سے بنا ہوا ایک کنڈو (اناج دان) ملے گا۔اس میں فوری استعمال کے لیے اناج رکھتے ہیں۔کچھ چارپائیاں (کٹ) ،سٹول (کٹکے) ،بچوں کی تعداد کے مطابق ایک جا دو جھولتے (زانگر) لکڑی سے بنی ہوئی ایک کپڑوں کی الماری (تونڑئی) کچھ چرخے (چرختی) اور مختلف سائز کی طشتریاں موجود ہوتی ہیں۔"[127]

منگورہ وادی سوات کا خوب صورت اور با رونق شہر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شہر قدیم اور جدید تہذیب کا حسین امتزاج ہے۔یہاں کی بعض قدیم آبادیوں کے دروازوں اور چوبی ستونوں پر گندھارا تہذیب کے نمائندہ خوب صورت روایتی نقش و نگار اگر سوات کے صدیوں قدیم طرز بودوباش کی یاد دلاتے ہیں۔سیدو سوات کا جدید ترین چھوٹا سا شہر ہے۔مرغزار بھی سوات کی حسین و جمیل وادی ہے۔فضا گٹ کے مقام پر ایک پارک واقع ہے۔راستے میں دریائے سوات سے نکلی ہوئی ندی کے ساتھ ساتھ حیات آباد میں جدید آبادی کے خوب صورت بنگلے یہاں کے طرز رہائش کو ظاہر کرتے ہیں۔اور ان بنگلوں سے متصل سرسبز و شاداب کھیت بڑی دل آویزی اور رعنائی کا باعث ہیں۔وادی مدین میں سیاحوں کے رہنے کے لیے بہت سی جدید سہولتیں موجود ہیں۔جدید ہوٹل ہیں۔موسم گرما میں فیملی کے لیے ہوٹلوں کے علاوہ پورے سیزن کے لیے فلیٹ نما مکانات بھی کرائے پر ملتے ہیں۔بہت سے پہاڑی علاقوں میں یہ بھی ایک کاروبار ہے۔سال کا کرایہ اکٹھا لے لیتے ہیں اور گھر کرائے پر چڑھا دیتے ہیں۔مری کا بھی یہی حال ہے وہاں بھی لوگ رہائش کے لیے گھر کرائے پر دیتے ہیں۔

اتروڑ اور گبرال نہایت خوب صورت اور سحر انگیز وادیاں ہیں۔یہاں کا حُسن فطری اور بے حجاب ہے۔یہاں پر پہاڑوں کے اُوپر اور ان کے دامن میں جو مکانات موجود ہیں۔وہ سب لکڑی کے ہیں اور مقامی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔اُتروڑ میں ایک تاریخی دو منزلہ مسجد ہے۔جس کی دوسری منزل کی تعمیر میں دیودار اور اخروٹ کی لکڑی استعمال کی گئی ہے۔یہ مسجد جدید طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔

بقول فضل ربی راہی :

" پہاڑوں کے اُوپر اور ان کے دامن میں واقع مکانات لکڑی کے
بنے ہوئے ہیں اور مقامی طرزِ تعمیر کا خوب صورت نمونہ ہیں۔"(128)

اُوشو مٹلتان اور مہوڈنڈ سوات کی وسیع و فراخ وادی کے حسین گوشے ہیں۔یہاں دریائے اُوشو کے کنارے پر ایک ہوٹل بھی موجود ہے۔جس کا نام اُوشو ہے۔یہاں کے بیش تر مکانات لکڑی کے ہیں۔یہ وادی چاروں جانب سے بلند بالا اور سرسبز پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔یہ پہاڑ اتنے اُونچے ہیں کہ آسمان سے سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

یہاں کے بیش تر مکانات دیار کی قیمتی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں جو اس خوب صورت وادی کے طلسماتی مناظر میں کسی پرستان کی وادی کا عکس پیش کرتے ہیں۔اُوشو سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر مٹلتان کی حسین ، دل کش مہکتی ہوئی وادی سیاحوں کے لیے اپنے دامن کو واکیے ہوئے ہے۔اُوشو ، مٹلتان اور مہوڈنڈ کی کل آبادی ملا کر قریباً پچیس ہزار ہے۔یہ علاقہ "سوات کوہستان" میں شامل ہے۔یہاں کے زیادہ تر مکانات پہاڑوں پر ہیں۔مکانات بھی بہت اچھے اور دو منزلہ ہیں۔جو لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔یہاں کے لوگوں کی زبان کوہستانی ہے۔لیکن پشتو عام بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

بقول فضل ربی راہی :

"زیادہ تر مکان پہاڑوں میں واقع ہیں۔جو تسبیح کے بکھرے دانوں کی
مانند نظر آتے ہیں۔مکانات عام طور پر دو منزلہ ہیں۔جن میں پتھر
اور لکڑی کا استعمال زیادہ ہے۔"(129)

ٹھنڈیانی ایبٹ آباد میں پایا جانے والا خوب صورت ، پُرفضا پہاڑی مقام ہے۔ٹھنڈیانی اصل میں صوبہ سرحد میں بسنے والے انگریزوں کے لیے آباد کیا گیا تھا۔اس وقت کی نشانیوں میں پتھروں کے بنے ہوئے چند خوب صورت بنگلے اور ایک چرچ موجود ہے ، جو آج کل بند رہتا ہے مگر ٹھنڈیانی پہنچانے والا رستہ خود آنے والی خوب صورتی کا پتہ دیتا ہے۔ٹاپ پر جانے سے پہلے سیاح کالا پانی کے مقام تک پہنچتا ہے۔یہاں چائے خانے ہیں۔چھوٹا سا بازار ہے اور یہاں پتھروں کی بنی ہوئی عمارات ہیں جو بطور ریسٹ ہاؤس استعمال ہوتی ہیں۔

ماجد فرید ساٹی نے پورے پاکستان کی سیاحت کی اور ان اسفار کو اُنھوں نے سفر نامے " مناظرِ پاکستان" میں شائع کیا ہے۔وہ یہاں بھی عمارات کی تعمیر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

" کالا پانی کے بازار کے بائیں طرف نگاہ ڈالیں تو پتھروں کی بنی عمارات نظر آتی ہیں۔"(130)

کاغان میں پہاڑوں پر بنگلہ نما مکانات بنے ہوئے ہیں۔

بحرین کی وادی سوات کی ایک حسین و جمیل وادی ہے۔بحرین میں پتھر کے مکانات ہیں اور دو دو منزلہ بوسیدہ مکانات ہیں۔جن کے نیچے لکڑی کے ستونوں کے بر آمدے تھے۔سردیوں میں بحرین کافی ویران اور اداس ہوتا ہے۔ساری وادی برف میں گھری ہوتی ہے۔

محمد خالد اختر رقم طراز ہیں:

"ہم بحرین میں تھے ہوٹل کے آگے ایک چٹان کے نیچے پتھر کے دو دو منزلہ بوسیدہ گھر تھے جن کے نیچے لکڑی کے ستونوں کے بر آمدے تھے۔"(131)

کافرستان کے مکان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ہر مکان تین منزلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔یہ تمام مکان لکڑیاں جلانے کی وجہ سے سیاہ ہو جاتے ہیں۔عموماً لکڑی کے مکانات ہوتے ہیں۔کہیں کہیں ان میں پتھر بھی استعمال ہوا ہے۔دروازے بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ان پر"بُنت کاری" ہوئی ہوتی ہے۔لکڑی کے بڑے بڑے دستے کھولنے اور بند کرنے کے لیے لگے ہوتے ہیں۔

بقول دانش ور ایرانی:

" میں جس مکان میں ٹھہرا ہوتھا وہ گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا۔یہ لوگ چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں۔ہر مکان کی کم از کم تین منزلیں ہوتی ہیں۔ایک کمرے پر دوسرا اور دوسرے پر تیسرا آپ اسے تین منزلہ مکان کہہ لیجیے۔یہ تمام مکان اندر سے بالکل سیاہ ہوتے ہیں۔کیوں کہ یہ لوگ آگ کمرے کے وسط میں جلاتے ہیں۔"(132)

ix. پختونوں کی خصوصیات / عادات واطوار :

پٹھان خون کے گرم اور نڈر ہوتے ہیں ،خواہ وہ آفریدی ہوں ،آفندی ، تلاگواری ، مہمند یا ملک قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔ہزاروں پٹھان پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔لیکن ان کا خاص علاقہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے جو کہ خیبر پختونخوا کہلاتا ہے۔جو خیبر پاس ،پشاور کو ہاٹ پاس اور سوات کا علاقہ ہے۔سب کے طور طریقے اور رسم و رواج ایک ہیں۔سب پشتو بولتے ہیں اور اپنے ساتھ بندوقیں رکھتے ہیں۔لوگ صاف گو اور کھلے مزاج کے ہیں۔خوش حال طبقے کے لوگ نہایت خوش اخلاق اور خوش آداب ہیں۔دیہاتوں کے لوگ بہت سادہ ہیں۔بزرگوں کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔اپنی زبان میں ایک دوسرے کی خیریت پوچھتے ہیں۔جیسے سلام علیکم ،وعلیکم السلام جواب میں بولا جاتا ہے۔پھر پوچھتے ہیں جوڑااے (کیا تم ٹھیک ہو) ،خہ جوڑ اے (کیا تم بالکل ٹھیک ہو)، خوشالہ اے (کیا تم خوش ہو)، تکڑا اے (کیا تم صحت مند ہو)، خہ تکڑا اے (کیا تمہاری صحت بالکل ٹھیک ہے)، زامن دی جوڑ دی (تمہارے بیٹے ٹھیک ہیں ؟) وغیرہ وغیرہ۔تمام پختونوں کی یہ عادات پکی ہیں اور سب پختونوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

قدیم زمانے میں وادی سوات مختلف تہذیبوں ،ثقافتوں اور مذہبوں کی آماجگاہ رہی۔یہاں کئی تہذیبیں پھلی پھولیں اور عروج کی منزلیں طے کر کے زوال پذیر ہوئیں۔کئی مذاہب نے اپنے اثرات یہاں چھوڑے اور کئی اقوام کی بودوباش اور ان کی طرزِ زندگی کے نقوش یہاں اُبھر کر ماند پڑ گئے۔سوات میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بدھ مت ظاہر نہ ہوئے ہوں۔گندھارا نہ صرف فن کا نام ہے بلکہ یہ ایک وسیع علاقے اور مکمل تہذیب کا آئینہ دار ہے۔گندھارا کا سند رمقام ٹیکسلا تھا۔سوات کے لوگوں نے اس فن میں مہارت حاصل کر کے اسے پتھر اور لکڑی کے دروازوں ،لوہے اور پیتل کے دروازوں پر کُندہ کاری ، گل کاری ، کپڑوں پر کشیدہ کاری کی صورت میں نام پیدا کرلیا ہے۔

منگورہ بلندوبالا پہاڑوں سے گھرا ہوا خوب صورت اور صاف ستھرا شہر ہے۔یہ دریائے سوات کے کنارے آباد ہے۔سید و شریف اس کے گردو نواح میں موجود تفریح پروگرام ہے۔یہاں کی زیادہ تر آبادی یوسف زئی پشتونوں پر مشتمل ہے جو بے حد محنتی ، جفاکش اور حبِ وطن کے جذبے سے سرشار ہیں۔یہاں کے بیش تر لوگ تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔یہاں کے رہنے والے عام طور پر

شلوار قمیض پہنتے ہیں۔یہ ان کا مقامی لباس ہے۔منگورہ وادی سوات کا خوب صورت اور بارونق شہر ہے۔یہ چھوٹا سا گنجان آباد شہر قدیم و جدید تہذیب کا حسین امتزاج ہے۔گندھارا تہذیب کے خوب صورت اور روایتی نقش و نگار سوات کے صدیوں قدیم طرز بودوباش کی یاد دلاتے ہیں۔

فضل ربی راہی سفر نامہ "سوات ،سیاحوں کی جنت"میں رقم طراز ہیں :

"منگورہ کی زیادہ تر آبادی یوسف زئی پشتونوں پر مشتمل ہے۔جو بے حد محنتی ،جفاکش اورحب وطن کے جذبے سے سرشار ہیں یہاں کے بیش تر لوگ تعلیم یافتہ مہذب ، باشعور اور بہت مہمان نواز ہیں۔مقامی باشندے عام طور پر شلوار اور قمیض زیب تن کرتے ہیں جو مقامی اور قومی لباس ہونے کے ناطے ان کا طرہ امتیاز بھی ہے۔"(133)

بحرین وادی سوات کی ایک وادی ہے۔اپنی دل کش اور خوب صورتی کی وجہ سے یہ وادی سوات کے دیگر علاقوں سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔یہاں کے لوگ بہت وضع دار اور انسان دوست ہیں۔مہمانوں کی عزت کو مقدم سمجھتے ہیں۔مذہب کے معاملے میں بہت سخت مسلمان ہیں۔مخصوص علاقائی تہذیب و ثقافت پر عمل پیرا یہ لوگ بہت سادہ اور خوش حال زندگی جی رہے ہیں۔

پشاور ایک ایسی جگہ ہے جس کی تاریخ اور ثقافت بڑی جان دار ہے۔صدیو ں سے تاریخ میں اسے ناقابلِ تسخیر پٹھانوں کا قلعہ لکھا جارہا ہے۔پشاور کا اپنا ایک وقار ہے۔اسی طرح یہاں کے لوگوں کا طرز زندگی منفرد حیثیت کا حامل ہے۔خیبر پاس کو درہ خیبر او ردل کش ریاست کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔یہاں کے لوگ سادہ ، محنت کش اور بہادر ہیں۔خوش حال خان خٹک کی طبیعت کی سادگی اور رنگ بھی بے مثال تھا۔

بقول کیمی پوا سفر نامہ "مناظرِ پاکستان "میں اسی حوالے سے رقم طراز ہیں :

"خوش حال خان خٹک کی سادگی پشاور کے لوگوں کی سادہ طبیعتوں سے ہی مشابہ تھی۔"(134)

پشتو اگرچہ پشتونوں کی زبان ہی کا نام ہے لیکن یہ لفظ پشتونوں کے زندگی گزارنے کے تمام طور طریقوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پشتو ، پشتون اور پشتو ولی کو لازم اور

ملزوم سمجھا جاتا ہے۔عام طور پر وہ شخص پشتون کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔جو ان قوانین کی پاس داری کرتا ہو یا ان قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔

اس ضمن میں مولانا عبدالقادر اپنے مقالہ "فلسفہ پشتو" میں لکھتے ہیں :

> " پشتو ایک زبان ہے جو لوگ یہ زبان بولتے ہیں۔اسی لفظ سے اسم صفت کے طور پر اس زبان بولنے والوں کو پشتون کہتے ہیں۔اسی پشتون کے عقیدے اور روایت کے مطابق پشتو صرف زبان ہی نہیں ہے زبان پشتو کا صرف ایک پہلو ہے۔پشتون جو یہ زبان بولتے ہیں اس لفظ پشتو کو زندگی کے بہت سے حقائق پر حاوی کرتے ہیں۔پشتو بولنے والے ہر اس خصلت کو پشتو کہتے ہیں۔جس کی تعبیر اسلام اخلاق کے نام سے کرتا ہے۔اخلاق سے مدعا وہی اخلاق ہیں ، جنھیں اچھا کہا جا سکتا ہے اور اچھا اس معنی میں کہ وہ بنی نوع انسان کی زندگی کے راستے اس طرح ہموار کرے کہ انسان کو انسانیت ، علم ، فضل ، صلح اور ترقی کی راہ پر گامزن کرے۔گویا پشتو اگر ایک طرف زبان ہے۔تو دوسری طرف یہ چند اخلاقی صفات کا مجموعہ ہے اور یہ وہی اخلاقی صفات ہیں جس کی ہر مذہب خصوصاً اسلام نے تعلیم دی ہے۔روزمرہ زندگی کو سنوارنے کے اصول عام انسانی اخلاق ہیں۔پشتو اسلام کا دوسرا نام ہے اور پشتو زبان میں "پشتو" ہر اس صفت کے لیے اصطلاحاً مروج لفظ ہے جس کی وجہ سے فرد یا ملت اپنا وجود برتری کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔"(135)

پشتون بنیادی طور پر ایک نسل کے لوگ نہیں بلکہ مخلوط النسل قوم ہے۔ان میں عرب اور سامی عناصر بھی ہیں۔ترک بھی، ایرانی اور یونانی بھی ، مغل بھی ہیں ، تاتاری بھی اور سپارٹا اور پارتھیوں کے عناصر بھی۔اس کے علاوہ یہ سرزمین جارجیا ، چیچینیا، تاجکستان اور وسطی ایشیا کے دوسرے خطوں سے آنے والی دوسری اقوام کا منبع بھی رہی ہے۔پشتون قوم ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتی آخر وہ کونسا رشتہ ہے جس نے ان مختلف نسلوں کے مابین محبت ، اخوت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرویا۔جس کی وجہ سے آج تمام پشتون نہ صرف ایک قوم بلکہ

ایک نسل شمار ہوتے ہیں۔یہ رشتہ پشتو (زبان) اور پشتون ولی (پشتوں کلچر)کا رشتہ تھا۔تمام پشتون اپنی روایات کے سخت پابند ہیں۔عزت نفس کا احساس اتنا شدید ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ زندگی کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔پشتو نوں کا مزاج ،لباس ، رسوم و رواج ،اخلاقی نظام ، قوانین اور زندگی کے دوسرے امور دوسرے علاقوں کے لوگوں سے مختلف ہیں اور اسی جغرافیائی ماحول کی ان کی زندگی کے ہر شعبے پر گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ان کی یہی خصوصیات انھیں انفرادیت بخشتی ہیں اور ان کی ثقافت کو دوسرے صوبوں سے ممیز کرتی ہیں۔وفا ،بہادری ،شجاعت ، وعدہ کا پابند ،سچائی ، غیرت مندی ، بدلہ لینا یعنی انتقامی کارروائی ، یہ پختون کی خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں:

> "پشتو (پشتون) ایک مخصوص طرز معاشرت و تمدن کا نام ہے۔یہ اخلاقیات ،اقدار اور روایات کا ایسا ضابطہ ہے جس کو کسی بھی صورت میں توڑا نہیں جاسکتا۔کسی بھی قانون سے رُوگردانی کو بغاوت سمجھا جاتا ہے۔"(136)

وادی سوات جنت کا نمونہ ہے۔جس بھی علاقے میں چلے جائیں وہاں کا حسن اور ثقافت آپ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔یہاں کے لوگ سادہ ، مہمان نواز ،محنت کش ہیں۔یہاں کے لوگوں کی محبت میں ریاکاری ، فریب اور جھوٹ کی آمیزش نہیں ملے گی بلکہ سچا پیار ،سادگی اور خلوص کی خوشبو ملے گی۔

بقول آغا سلمان باقر :

> "تمھیں سوات کے عام لوگوں کی محبت میں ریاکاری نہیں ملے گی بلکہ سادگی ،محبت کی بے لوث خوشبو رچی بسی ملے گی۔۔۔جھرنے کے پانی سے لے کر ہوا تک شفاف ملے گی۔۔۔"(137)

سوات کی بیش تر آبادی چوں کہ تعلیم سے بے بہرہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ صفائی اور حفظانِ صحت کے اُصولوں پر عمل پیرا نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ ،بچے گندے مندے پھرتے ہیں۔پاؤں میں چپل نہیں ہے لیکن یہ خلوص اور محبت میں خود کفیل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ سفرنامہ "جو کالیاں" سٹوپوں کے شہر سوات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مقامی بچے گندے مندے لیکن سوہنے سفید ہاتھوں میں جنگلی نرگس
کے پھول لیے نیلی کار کے ساتھ ساتھ دوڑ تے جاتے تھے اور ہم نے
ان کے سارے گل دستے خرید لیے اور ہماری چھوٹی سی کار نرگس کی
زرد اور دھیمی مہلک سے بھر گئی۔"(138)

یہاں کی عورتیں بھی اپنے مردوں کی طرح کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔وادی پشمال انتہائی خوب صورت اور کشادہ وادی ہے۔بے شمار جھرنے اور چشمے ،کھیت اور ان میں موجود فصلیں ہیں۔جہاں عورتیں اپنے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی نظر آتی ہیں۔سوات کی زرخیر وادی بے مثال ہے۔یہاں کے لوگ خوش حال او ر پُرامن ہیں۔اپنی دُنیا میں مگن ،خوش اخلاق اور شگفتہ ہیں۔اپنی روایات کے پابند بہترین ثقافت کے امین ہیں۔

محمد خالد اختر سفر نامہ "دوسفر"میں لکھتے ہیں :

"سوات بڑا اچھا ملک ہے۔اس کی وادی بڑی زرخیز ہے اور لوگ
خوش حال اور پُرامن اور شگفتہ ہیں۔"(139)

قبائلی علاقہ جات کے باشندوں کو عرف عام میں پٹھان کہاجاتا ہے۔پٹھان لفظ پختون کی بگڑ ی ہوئی شکل ہے جس کے معنی وفاداری ، میزبانی ،غیرت اور شجاعت کے ہیں۔یہاں کے لوگ جاہل ، اجڈ اور اکھڑ ہیں۔غیر ت کے نام پر قتل کرنا ان کی بہادری کی دَلیل ہے۔یہاں بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر کسی کے پاس اپنااپنا اسلحہ ہوتا ہے۔قبائلی علاقہ جات میں اسلحہ زیور سمجھا جاتا ہے۔

بقول الحاج ایم زمان کھوکھر:

"ان کے متعلق مشہور ہے کہ یہ اجڈ ،گنوار اور اکھڑ ہوتے ہیں۔ان
کے ایک کندھے پر بندوق ،دوسرے کندھے پر چادر اور سر پر مخصوص
کلاہ ہوتا ہے۔غیرت ان کی طرہ امتیاز اور ضابطہ اخلاق ہے۔یہاں
غیرت کے نام پر قتل کرنا اور بدلہ لینا شان سمجھا جاتا ہے۔"(140)

اگرچہ ڈیرہ اسماعیل خان جیسے پنجاب والے پنجاب میں اور سرحدوالے سرحد کا علاقہ نہیں مانتے تھے۔لیکن اب یہ سرحد میں ہی شامل ہے۔یہاں کے لوگ اسلامی ذہن کے ہیں۔یہ لوگ حلیم اور منکسر المزاج ہیں۔ان کے اندر اپنی ایک قدیم تہذیب کو سامنے لانے میں لطافت اور شرینی

موجود ہے۔یہاں کے لوگوں کی خصوصیات ہیں کہ پورا کا پورا گاؤں اپنے آپ کو ایک کُنبہ سمجھتا ہے۔ایک دوسرے کے غم وخوشی میں اس طرح شریک ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو غیر نہیں سمجھتے۔
بقول رضا علی عابدی:

> "لوگ اتنے حلیم اور منکسر المزاج ہیں کہ اس کے اندر وہی شرینی پائی جاتی ہے جو ایک قدیم تہذیب کی علامت ہوا کرتی ہے۔اس میں ایک بات یہ ہے کہ پورا کا پورا گاؤں اپنے آپ کو ایک کُنبہ سمجھتا ہے۔غم میں اتنی شراکت ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر نہیں سمجھتے ان کے غم میں بھی اور خوشیوں میں بھی وہ لطافت اور شیرینی پائیں گے کہ جو اب بڑے شہروں میں ناپید ہوتی جارہی ہے۔"(141)

چترالی لوگ عموماً بے وفا اور ہرجائی کہلاتے ہیں۔بے تکلفی سے ہر طرح کی بات دوسرے کو کہہ جاتے ہیں۔انھیں عموماً زبان دراز کہا جاتا ہے۔ہنسی مزاق ، مسخرہ پن ان کی عادت ہوتا ہے۔یہ لوگ ہمہ وقت خوش رہنا چاہتے ہیں۔ایک بڑی تعداد ،سادہ ،لوح اور قناعت پسند ہے۔وہ اپنے گھروں کو اور اپنے باطن کو بڑی حد تک صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں بہت چالاک ،بدزبان اور لڑاکا ہوتی ہیں مگر خاوند اور باپ کی نہایت وفادار ہوتی ہیں ۔ان کی عزت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہیں ۔نہایت ادب سے ان کے ساتھ پیش آتی ہیں ۔جب تک خاوند یا باپ بیٹھ نہ جائے وہ بھی نہیں بیٹھتی اور تعظیم میں کھڑی رہتی ہیں۔یہ عورتیں اپنے کنبے کے ساتھ وفاداری رہتی ہیں۔ باقی باہر کی دنیا کے لیے یہ بہت تیز وچالاک مانی جاتی ہیں۔ گانے اور ستار بجانے کا بھی شوق رکھتی ہیں۔ آج کل پردے وغیرہ کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔
اس ضمن میں منشی محمد عزیز الدین لکھتے ہیں :

> "اس طرح لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہمہ صفت موصوف ہے۔اس میں ہر ایک قسم کی نیکی پائی جاتی ہے۔ایسے لوگ عموماً سادہ اور قناعت پسندی کی زندگی پسند کرتے ہیں۔وہ اپنے باطن اور گھروں کو بڑی حد تک صاف ستھرا اور مصفا راستہ چلتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ان

> کا اخلاق اور مزاج انتہائی خوش گوار ہوتا ہے۔خوش اخلاق اور ملنسار
> چترالی بہ راہ ہوتے ہیں۔"(142)

چترال کے باسی سیدھے سادھے اور مہمان نواز ہیں۔وادی کیلاش یہاں کے لوگ کافر کہلاتے ہیں۔ان کے طور طریقے ، طرزِ بودوباش الگ ہیں۔یہ اپنی جداگانہ ثقافت اور معاشرت کے ساتھ کافر قوم کی حیثیت سے صدیوں سے موجود ہیں۔کیلاشی انتہائی گندے لوگ ہیں اور مہینوں نہاتے نہیں ہیں۔ان کے گھر انتہائی گندے ہوتے ہیں اور ان کی عورتیں اپنے لیے بھیڑ کی اُون کے لباس بناتی ہیں۔بھیڑ کے لمبے بالوں سے اپنے لیے پراندے بناتی ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال :

> "ان کے گھر انتہائی گندے اور متعفن ہوتے ہیں۔چارپائیوں پر بھیڑ اور بکری کے بالوں کی اُون سے بنا ہوا نمدہ بچھا ہوتا ہے ، جو انتہائی بوسیدہ ہوتا ہے۔"(143)

ان کے رسم ورواج بالکل مختلف ہیں۔ان کی ثقافت مختلف اور منفرد ہے۔سرخ کافرستان کے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور ان کے طور طریقے چترالیوں کے جیسے ہیں۔آگے "نورستان" آجاتا ہے اور باقی سرخ کافر وہاں آباد ہیں جو کہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ان کے رَسوم ورواج مُنفرد ہیں۔

قاری جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> "یہ لوگ زندگی کے جملہ طور طریقوں اور مرنے وقتیا مرنے کے بعد کی رَسوم ورواج میں یہ بالکل مختلف ہیں۔ان کی بعض رَسوم ورواج دوسرے لوگوں کے لیے وجہ حیرت واستعجاب بھی ہیں اور ان کی یہ منفرد مختلف ثقافت دیکھنے کے لیے دور دراز کے ملکوں کے سیاح یہاں پہنچتے ہیں۔"(144)

یہاں کی عورتیں بہت حسین ہیں۔بہت کام کرتی ہیں۔مردوں کے ساتھ کھیتوں میں بھی مدد کراتی ہیں۔دست کاری میں بھی ماہر ہیں۔کھانا بہت ہی اعلیٰ پکاتی ہیں۔پردے سے رہتی ہیں بعض مزاروں کی عورتیں جو بے پردہ پھرتی ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنی خوب صورت ہیں۔یہاں کے لوگ باہمت اور خوش اخلاق ہیں۔کافرستان کے لوگ بے ضرر ہیں۔محنتی ،جفاکش ، بے غرض اور

اپنے حال میں مَست رہنے والے لوگ ہیں۔سیاہ پوش کافر اور سرخ کافر اگرچہ ایک دوسرے سے اب قدرے مختلف ہیں اوران کے درمیان یہ فرق مذہب کا مرہونِ منت ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"کافرستان کی آبادی ان لوگوں پر مشتمل ہے جو بالکل بے ضرر ہیں اور جو ہر وقت اپنی مسرتوں میں کھوئے رہتے ہیں۔نہ تو یہ لوگ تاجر ہیں اور نہ ہی کوئی بڑے سرمایہ دار ، محنتی ، جفاکش ، بے غرض اور حال مست لوگ ہیں۔لیکن یہ بڑی حیرت انگریز بات ہے کہ چترال کی طرف سے اب تک ان سے جزیہ وصول کیاجاتا ہے۔"(145)

پاڑہ چنار کاعلاقہ اگرچہ سرحد کے ساتھ ہے۔اتنے دور دراز علاقے میں تعلیمی مواقع اور دیگر بنیادی سہولیات کا مہیا ہونا نا ممکن ہے۔لیکن پاڑہ چنار دوسرے پہاڑی علاقوں سے قدرے بہتر ہے۔یہاں کے باشندے تہذیب یافتہ ہیں۔انسانیت کے قدرداں ہیں اور محبت سے اَمن سے رہنا پسند کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہاں کے لوگ اچھی عادات واطوار کے مالک ہیں۔

امتیاز اے قریشی چوں کہ ایک صحافی تھے ،اس لیے کھوج لگانا ان کی طبیعت کا خاصا تھا ۔ انھیں نئے لوگوں، نئے خطوں اورنئے معاشرے کی کھوج ہر لمحہ سرگرمِ عمل رکھتی ہے ۔ نئی نئی خبریں اکھٹی کرنا ان کا شوق ہے۔"گڈبائی شہرنو" ان کا "سفرنامہ افغانستان" ہے ۔افغانستان کی سرحد تک جانے کے لیے انھیں پاکستان کے مختلف علاقوں سے گزرنا پڑا ۔ان کی تجسس آمیز فطرت نے انھیں ان علاقوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ یوں امتیاز اے قریشی نے باریک بینی سے اپنی نظروں کے فریم میں ان معلومات کو قید کرلیااور اپنے سفرنامے کی زینت بناکر پیش کیا۔

یہاں کے لوگوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے امتیاز اے قریشی لکھتے ہیں :

"پاڑہ چنار کے لوگ دوسرے قبائل کی نسبت تہذیب یافتہ ہیں۔شرح خواندگی کا تناسب بھی نسبتاً زیادہ ہے اور یہاں کے لوگ آرمی میں ہیں۔امن پسند لوگ ہیں۔اگرچہ یہاں پر سال میں متعدد بار شیعہ سنی فسادات ہوتے رہتے ہیں لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فسادات

انتظامیہ کی نا اہلی اور مخصوص انتہا پسند گروہ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔"(146)

سوات اور یہاں کی تمام وادیاں پشتون تہذیب وثقافت کی امین نظر آتی ہیں۔سوات میاں دم یہاں لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔مخصوص پشتون تہذیب پر عمل پیرا یہ لوگ بہت سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں۔بشی گرام ایک وسیع وفراخ وادی ہے۔یہاں کے لوگ بھی کشادہ دل اور اپنے مخصوص رَسم ورواج پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔

فضل ربی راہی سفر نامہ "سوات سیاحوں کی جنت" میں رقم طراز ہیں:

"یہاں کے لوگ بہت سادہ زندگی گزارتے ہیں اور اپنی روایتی معاشرتی اقدار کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔سیاحوں کی عزت واحترام یہاں کی روایات میں شامل ہے۔"(147)

کافرستان کے لوگ اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔یہاں کے لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔اسماعیلیہ فرقے کے لوگ بہت زیادہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔یہاں کا رہن سہن کچھ ایسا ہے کہ اسماعیلی فرقے کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں اور باہمی امداد کے سلسلے میں بھی ان کی عورتیں بہت زیادہ کام کرتی ہیں۔اسماعیلیہ فرقے کا ایک سردار سید نادر شاہ آغا خان کا نائب مانا جاتا ہے اور اس کی بہت تکریم کی جاتی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"یہ لوگ بڑے خوش خلق اور ترقی یافتہ ہیں۔اسماعیلیہ فرقے کے بچے بہت زیادہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔سید نادر شاہ جب بھی باہر نکلے گا اسماعیلیہ فرقے کا ہر شخص جھک کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دے گا۔یہ لوگ بڑے مہمان نواز اور فراخ دل ہوتے ہیں۔"(148)

خوش اخلاق اور ملنسار کیلاشی سیاحوں کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ان کے خوب صورت چہروں کے ساتھ سادگی ، معصومیت ان کی خصوصیات ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس صوبے میں باقی صوبوں کی نسبت جرائم کا تناسب بھی بہت زیادہ ہے۔غیرت کے نام پر جان دینا اور لینا ان کے نزدیک سب سے اہم ہے۔

X. پشتون کا کردار و مزاج:

پشتون حد درجہ خود پسند واقع ہوئے ہیں۔اسی لیے وہ عام طور پر اتفاق و اتحاد کے عمل سے محروم ہیں۔وہ ایک دوسرے پر اپنی برتری ظاہر کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔یہ ان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی برتری کو بمشکل تسلیم کرتے ہیں۔اس حوالے سے ان میں غرور نسبتاً زیادہ ہے۔

پٹھان اگرچہ زندہ دل ہیں لیکن وہ انتہا کے توہم پرست اور مغرور ہیں۔ان کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ ان کی بہادری اور مہمان نوازی ہے،جو ان کی بہت سے برائیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

جی سی واکر ،ایسکوائر لکھتے ہیں:

> ”پٹھان زندہ دل لوگ ہیں ، ناقابلِ یقین حد تک توہم پرست اور کچھ مغرور بھی۔لیکن بہادر اور مہمان نواز۔آخری دو اَوصاف ان کی بہت سی خرابیوں کا ازالہ کر دیتی ہیں۔مثلاً ناقابلِ اعتبار ہونا ،حاسد ،انتقام پرور اور ناراض طبع ہونا۔“(149)

پٹھان فطرتاً بہت حریص ،غاصب ،خود غرض اور بے رحم ہیں۔وہ شفقت سے نابلد اور مہر بانی کے جذبے سے عاری ہیں۔ان میں یہ سب نقائص موجود ہیں۔لیکن یہ الزام دہی بہت شدید اور عمومی طرز کی ہے۔پٹھان آپس میں اور اجنبیوں کے ساتھ ظاہری رویے میں ایسی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں جس کی توقع آپ ان جیسی گڑبڑ زدہ اور پر تشدد زندگی گزارنے والے لوگوں سے نہیں کرتے۔سلام کا جواب نہ دینا ہمیشہ غلط خیال کیا جاتا ہے اور اکثر اسے ذاتی بے عزتی سمجھ کر موزوں ا نتقام لیا جاتا ہے۔

پختونوں کا غرور ان کے قومی کردار کا ایک نمایاں وصف ہے۔یہ یوسف زئی میں بھی کافی عیاں ہے۔وہ ہمیشہ اپنے حسب نسب ،قوت بازو اور خود مختاری کے متعلق شیخیاں بگھارتے رہتے ہیں اور ہر بات کے آخر میں کہتے ہیں ”کیا میں پختون نہیں ہوں ؟ “۔

ذاتی مجر کا یہ مبالغہ آمیز تصور معاشرے کی خرابی کا سبب بنتا ہے۔ذرا ذرا سی بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور یہ انا و خود سری لڑائیوں کا موجب بنتی ہے۔قتل و غارت تک صورتِ حال پہنچ جاتی

ہے اور یہی نہیں یہ لڑائیاں نسلوں چلتی رہتی ہیں۔کئی ایک نسلیں ان لڑائیوں کا خمیازہ بھگتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس صوبے میں باقی صوبوں کی نسبت جرائم کا تناسب بھی زیادہ ہے۔غیرت کے نام پر جان دینا او رلینا ان کے نزدیک سب سے اہم ہے۔

xi. پشتون معاشرے کے مختلف رسوم ورواج:

تڑون اور ملاتڑ (مددوحمایت):

پشتون معاشرے میں "تڑون" اور "ملاتڑ" کے نام سے دو اصطلاحات مروج ہیں۔کسی کے ساتھ عہدو پیمان کوتڑون کہاجاتا ہے۔اس معاہدے میں دونوں فریق ایک دوسرے کی جان و مال ، عزت و آبرو کی حفاظت اپنی جان و مال عزت آبرو کی طرح کرتے ہیں اور ہر طرح کے مسائل میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔"ملاتڑ" بھی ایک رسم ہے۔جس میں دونوں قبیلے تیسرے قبیلے کے خلاف دوران جنگ متحد ہو جاتے ہیں یہ صرف ہنگامی معاملہ ہے۔مستقل بنیادوں پر نہیں ایک دوسرے کی مختلف مواقع پر مدد کرنا "ملاتڑ" کہلاتا ہے۔

بدرگہ:

پشتو میں "بدرگہ"رسم مشایعت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔نیر کسی مہمان کواس کے تحفظ کی ضمانت کی خاطر مہیا کیاگیا۔حفاظتی دستہ "بدرگہ" کہلاتا ہے۔بدرگہ کو پشتون اپناسماجی فریضہ سمجھتے ہیں۔

ٹیکر لے لینا:

ٹیکرلے لینا زبان میں "چادر" کوکہتے ہیں۔یہ حق اس مجرم سے لیا جاتا ہے جو کسی بیوہ یاغیر شادی شدہ عورت کی چادر کھینچ لیتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔چوں کہ یہ رسمی طریقہ نہیں بلکہ جر م ہے۔لڑکی کے والدین مجرم پر تاوان عائد کرتے ہیں۔تاوان کے علاوہ اسے عورت کے والدین کو ڈگنا ولور (شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی کے سسرال والوں سے پیسے لینے کی رسم) بھی دینا پڑتا ہےاوراس کے علاوہ بھاری مہر بھی رکھا جاتا ہے۔

پیغور (طعنہ):

پیغور ایک ایسے جذباتی اُبھار کا نام ہے جو غیر پشتون رویے سے جنم لیتا ہے۔جب کوئی شخص بزدلی دکھاتا ہے اور اپنا بدلہ نہ لے سکے تو اس کو پیغور کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔پشتون معاشرے میں بہت سے قتل ، مقاتلے ، جنگ جھگڑے کا سبب یہی پیغور ہے۔پشتون سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر پیغور نہیں۔پیغور کے خوف سے پشتون اکثر ایسا کام کرنے سے گریز کرتے ہیں جو ناشائستہ یا غیر اخلاقی ہو اور ذلت کا باعث بنے۔پشتون پیغور کے رویے کو بہت برا سمجھتے ہیں۔پشتو اَدب میں اس رویے کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے۔پیغور کے زخم کے مندمل نہ ہونے کے متعلق پشتو کے ایک ٹپے کا ترجمہ ہے:

> ”گولی کا زخم جلد بھر جاتا ہے لیکن پیغور کا زخم تا حیات رہتا ہے۔“(150)

اشر:

اشر پشتون معاشرے کی وہ رسم ہے جس کے تحت معاشرے کے افراد ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کے لیے مشترکہ طور پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ،ہاتھ بٹاتے ہیں۔اشر کا زیادہ تعلق کھیتی باڑی اور اس سے وابستہ کاموں سے ہے۔اس طرح معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم دردی ، ایثار ،قربانی اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ قائم رہتا ہے۔

غیرت مندی:

پشتونوں کے ہاں غیرت کا اپنا ایک منفرد تصور ہے ،جو دوسری اقوام میں اس صورت میں اور اس شدت سے نہیں پایا جاتا۔غیرت کا یہ تصور کبھی مہمان نوازی کی صورت میں نظر آتا ہے ، کبھی بہادری کے جوہر دکھانے میں ، کبھی عدل وانصاف کرنے میں ، کبھی بے انصافی ، کبھی ہمدردی اور شفقت ، کبھی بے رحمی اور سفاکی کا مظاہرہ کرنے کی صورت میں ، کبھی یہ تصورِ انسانیت کے اعلیٰ مدارج کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے تو کبھی غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویوں کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔یہ تصور ایک طرف تو دشمن کو پناہ دینے کا سبب بھی بن جاتا ہے اور دوسری طرف اپنے سگے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتارنے سے گریز نہیں کرتا۔ایک ایسا تصور ان کے ہاں غیرت مندی کا نظر آتا ہے کہ ایک بے سہارا عورت کو پناہ بھی دی اور اس کی عزت و آبرو کی لاج بھی رکھی ہے۔ایک عورت کو عزت و

وقار بھی بخشتا ہے اور دوسری طرف عورت کو جہنم کی آگ میں بھی جھونک دیا ہے۔اسی تصور نے ایک معصوم بچی کو ایک بوڑھے مرد کے نکاح میں باندھ دیا ہے اور ایک عورت کے تقدس کو پامال بھی کیا ہے۔اسی تصور نے کسی کے گھر کی تعمیر کے لیے پسینہ نہیں خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔

پشتون معاشرے میں غیرت کے بہت سے تصورات ہیں۔جن پر عمل پیرا ہو کر کہیں وہ معاشرے کے لیے مفید ہستی کہلاتے ہیں اور کہیں معاشرے کے لیے وبال اور شرمندگی کا باعث بنتے ہیں۔

کیمی پوا پٹھانوں کی غیرت مندی کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

> "پٹھان فخر کے ساتھ بخوشی پھانسی چڑھ جائے گا اور خاندان کے لوگ اس کی تعریف کریں گے اور "ہیرو" کے نعرے لگائیں گے جب کہ منصف نے اسے قاتل قرار دیا ہے۔ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کون راستی پر ہے؟ "(151)

پشتون معاشرہ اپنی روایات کی پاس داری کا پابند ہے اور اس معاملے میں وہ اپنے اُصولوں میں رتی برابر بھی تبدیلی نہیں کرتے۔

عزتِ نفس:

پشتونوں میں عزت نفس کا احساس اتنا شدید ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ زندگی کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔بقول کیمی پوا:

> "کیوں کہ اس کا عقیدہ ہے کہ اپنے ناموس کی خاطر لڑنے والا جنت میں جاتا ہے۔"(152)

بدل(انتقام):

لفظ "بدل" پشتو میں "بدلہ لینے" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔پشتون معاشرے میں نقصان اور نتائج سے بے پرواہ انتقام کا نام "بدل" یا "بدلہ" ہے۔بدل پشتو کے ابتدائی قوانین میں سے ایک ہے اور اسے پشتو کا بنیادی اُصول مانا جاتا ہے۔پشتون معاشرے میں اگر کسی شخص کو قتل کیا جاتا ہے یا اس کا کوئی نقصان کیا جاتا ہے تو متاثرہ شخص اپنا بدلہ ضرور لیتا ہے۔کہنے کو تو بدل کا یہ تصور اسلام کے عین

مطابق ہے یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ ،کان کے بدلے کان اور اسی طرح قتل کے بدلے قتل۔ایک پشتون کی غیرت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ قتل کے بدلے قاتل کے خاندان کے زیادہ سے زیادہ افراد کو قتل کیا جائے۔ایسے شخص کو پشتون معاشرے میں مرد میدان اور بہادر تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے ”غیرتی“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں پشتون معاشرے میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ :
”جو کوئی تھپڑ کے بدلے مُکا رسید نہ کرے وہ پشتون نہیں ہے۔“

بقول جی سی واکر ایسکوائر:

> ”کوئی بھی رواج نظر انداز کرنے سے پختون ساتھیوں کی جانب سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنتا ہے۔بالخصوص بدل اور قصاص کے معاملے میں انھیں کبھی نہیں بھولا جاتا اور یہ لوگوں کے انتقامی جذبے کی تصویر کشی کرنے کے علاوہ اپنے قائم رکھنے کے ذرائع بھی دکھاتا ہے۔ایک پشت میں پہنچنے والے نقصانات کا انتقام ، اگلی پشت میں لے جانے کے واقعات عام ہیں۔بلکہ دو یا تین پشتوں بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے۔چھوٹے بچوں کے ذہن پر ہی ان کی زندگیوں کے مقصد کو نقش کر دیا جاتا ہے۔“(153)

xii. عورت کا مقام :

پختون معاشرے میں عورت کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہے۔پختون ایک غیور قوم ہے۔مردوں کی سماجی محفلوں اور تفریحات میں عورتیں کبھی شامل نہیں ہوتیں۔تہواروں کے سوا عورتوں کے تفریحی اجتماعات معدودے چند ہیں۔خواتین کا زیادہ تر وقت گھریلو کام کاج میں گزرتا ہے۔

لیکن ایک دوسرے سے ملنے جلنے گھر گھر جاتی ہیں۔گپ شپ کرتی ہیں ،لڑتی جھگڑتی ہیں ، ایک دوسرے کے ساتھ۔لڑاکا عورتیں ہیں۔مرد انھیں پردے میں رکھتے ہیں۔یہ عورتیں عسکری جذبے کی حامل ہیں اور مردوں کو لڑائی جھگڑے پر اکساتی ہیں۔کئی ایک خواتین لڑائیوں کا مرتکب ثابت ہوئی ہیں۔ان کے گھریلو کام کاج جیسے پانی بھر کر لانا ، مکھن نکالنا ،اناج پیسنا ، کھانا پکانا ، سوت بٹنا وغیرہ ان کے دن بھر کے کام ہیں۔امیر طبقات میں عورتیں کم ذمہ داریوں کی حامل ہیں۔یہاں کی

عورتیں ہُنرمند ہیں ،سب کام خود کرتی ہیں۔لباس ،زیور اور ذاتی آرائش میں لگی رہتی ہیں۔یہاں کے لوگ زیادہ تر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے ہیں۔لیکن امیروں کی ایک سے زائد بیویاں ہوتی ہیں۔لوگوں کی آٹھ آٹھ شادیاں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔جن سب کو قانونی مانا جاتا ہے۔ پٹھان اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت سخت ہیں ۔ان کے ہاں عورت کسی قسم کی آزادی میسر نہیں ہے۔ اگر کوئی پٹھان مرد اپنی بیوی کو غیر مرد سے بات کرتے دیکھ لے تو اس کی غیرت پر بات آجاتی ہے اور غیرت میں آکر کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔عورت کی وفاداری پر شک کرکے اُسے مارتے پیٹتے ہیں عورتوں کو غیر مردوں سے بات کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔پختون معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں عورت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔اسے کوئی حیثیت نہیں دی جاتی۔

بقول جی سی واکر ایسکوائر:

> ”پشاور کے مہمند شرع پر عمل نہیں کرتے بلکہ استعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔سات، آٹھ بیویوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سب کو قانونی مانا جاتا ہے۔پٹھان اپنی عورتوں کے حوالے سے نہایت متشکک اور حاسد واقع ہوئے ہیں۔اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لینا جذبے کو برانگیختہ کرنے کے لیے کافی ہے۔“(154)

کسی مرد کی رشتہ دار خواتین سے بدسلوکی یا بہتان کا داغ صرف ملزم کے خون سے ہی دھلتا ہے اور بہتان کا نشانہ بننے والی عورت کو بھی مار دیا جاتا ہے۔اسے قتل کرنا ان کی غیرت کا سوال ہے۔پٹھان اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت حساس اور غیرت مند ہیں اور وہ عورت جس پر بہتان کا نشانہ باندھا جاتا ہے۔عورت کو وہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں۔جو ان کی عزت و غیرت کی امین ہے۔تنازعات کی زیادہ تر وجہ عاشق کے ساتھ بھاگنا ہے۔

عورتوں کی حفاظت سے متعلق کیمی پوا اپنے سفر نامے ”سفر نامہ پاکستان“ میں رقم طراز ہیں:

> ”پٹھان عورتوں کی عزت ایک عظیم خزانے کی طرح ہوتی ہے۔ماں بننے والی عورتیں خاندان کے مردوں کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتیں اور کسی غیر عورت کو مسکرا کر دیکھنا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔اس

معاملے میں مصالحتی کونسل کوئی مدد نہیں کرے گی۔ایک بھائی کو ایسی
آشنائی کا ذرا بھی شبہ ہو جائے تو وہ اپنی بہن یا عزیز ترین دوست کو گولی مار
دے گا۔اس کے غصے کے سامنے کوئی پیش نہیں جاتی۔وہ اپنی محبوبہ کو
مجبوراً مار دے گا اور والدین حقارت سے مسکرائیں گے۔"(155)

پشتونوں میں عورت کے تقدس کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ پشتون معاشرے میں عورت کو عزت اور وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔پشتون معاشرے میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہوتی ہیں۔پشتون معاشرے میں عورت پر ہاتھ اُٹھانا بڑا معیوب تصور کیا جاتا ہے۔عورت کو پشتو میں "تورسرے" کہا جاتا ہے۔اگر دو قبیلے آپس میں لڑ رہے ہوں اور عورت پانی لے کر جا رہی ہو تو اس وقت ڈز بندی (فائر بندی) کی جاتی ہے تاکہ عورت کو گولی نہ لگ جائے۔

"جنگ میں عورتوں کا خیال اس لیے بھی رکھا جاتا ہے کہ ضروری تو
نہیں کہ عورت مد مقابل خاندان یا قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔بلکہ اکثر
باہر کے قبیلوں سے بھی عورتیں بیاہی جاتی ہیں۔اس لیے اگر کسی
عورت کو گولی لگ جاتی ہے تو اس کے اپنے خاندان یا قبیلے کے لوگ بھی
اس لڑائی میں کود پڑتے ہیں۔"(156)

صوبہ خیبر پختونخوا میں تمام علاقے عورت کے معاملے میں ایک جیسے ہیں۔غیرت کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت کے قائل نہیں۔ضلع چترال کی عورتیں اگرچہ زبان کی بہت تیز ہیں۔مگر باپ کی عزت و تعظیم میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتیں۔جب تک باپ یا خاوند کھڑا رہے وہ بھی اس کی تعظیم میں کھڑی رہتی ہیں۔

بقول منشی محمد عزیز الدین:

"یہاں کی عورتیں زبان دراز اور نہایت چالاک سُنی جاتی ہیں۔مگر خاوند
اور والدین کی بڑی عزت و تعظیم کرتی ہیں نہایت ادب سے ان کے
ساتھ پیش آتی ہیں۔جب تک خاوند یا باپ کھڑا رہے وہ بھی تعظیماً
کھڑی رہتی ہیں اور جب تک وہ نہ بیٹھے نہیں بیٹھتی۔گانے اور ستار
بجانے کا ان کو بہت شوق ہے۔آج کل پردہ وغیرہ بھی کم کرتی
ہیں۔"(157)

کالاش معاشرے میں عورت کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔انھیں کم تر سمجھا جاتا ہے۔حالاں کہ کالاش خواتین انتہائی جفاکش ،وفادار اور حسین ہیں۔لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کا درجہ اور مقام اپنی سوسائٹی میں نہایت گراہوا ہے۔یوں سمجھیے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی مشین ہیں اور سیاست ، مذہب اور قانون سے باہر ہیں۔ان کو مقدس مقامات پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔جس جگہ گھریلو سامان رکھا ہو وہاں ان کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ہر مکان میں عورتوں کے مُنہ دھونے کی ایک خاص جگہ مقرر ہے۔اس کے علاوہ وہ کہیں منہ نہیں دھوسکتیں۔مگر مرد جہاں چاہے ہاتھ منہ دھوسکتا ہے۔

جس برتن میں مرد کھانا کھاتا یا پانی پیتا ہے۔عورت اسے استعمال نہیں کر سکتی۔نوجوان لڑکیاں گھروں میں نہانہیں سکتیں ان کے لیے باہر ندی یادریا پر ایک خاص جگہ ہوتی ہے ،جہاں وہ سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد نہاتی ہیں۔عورت بارات کے ساتھ ،جنازے کے ساتھ نہیں جاسکتی۔عورت کی میت پر رقص نہیں کیا جاتا۔عورت کی تدفین میں مرد حصہ نہیں لے سکتا۔عورت کسی تہوار میں حصّہ نہیں لے سکتی۔کوئی عورت اپنادودھ کسی اور بچے کو نہیں پلاسکتی۔عورت نہ قربانی کے جانور کو ہاتھ لگا سکتی ہے ،نہ کھاسکتی ہے۔بشالینی میں بیمار ہو کر مرنے والی عورت کی لاش گھر نہیں لائی جاتی اور نہ ہی مرد اس کی لاش قبرستان لے جاتے ہیں اور وہ مخصوص شخص جس کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ بشالینی میں مرنے والی عورتوں کی لاش وہ قبرستان لے جاکر ایک جگہ رکھ دیتا ہے۔ان کی نظروں میں یہ ناپاک عورت ہے اس لیے اس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے بلکہ قبرستان میں الگ جگہ میں رکھتے ہیں۔اگرچہ کالاش معاشرے میں عورتوں کو احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن انھیں پھر بھی دوسرے معاشروں کی نسبت کچھ آزادی بھی حاصل ہے۔

بقول پرویش شاہین:

> " اگرچہ کالاش لوگوں کے معاشرے میں عورتوں کو احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے بلکہ انھیں گندہ اور کم تر خیال کیا جاتا ہے۔لیکن ان کو بہت سے دوسرے معاشروں کی نسبت زیادہ آزادی حاصل ہے۔خاوند اپنی بیوی کو کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتا اور جب تک عورتیں حاملہ نہ ہوں تو ناچ اور دوسری رسومات میں شریک ہوتی

ہیں۔نوجوان لڑکیاں اپنے شوہر اپنی پسند کے مطابق منتخب کر سکتی ہیں۔"(158)

وادی کانڈیا کوہستان کی خوب صورت وادی ہے۔یہاں شدید سردی پڑتی ہے۔یہاں عورتیں اس حد تک پردہ کرتی ہیں کہ پورے علاقے میں شاید کوئی عورت دکھائی دی جائے۔نہ ہاتھ نظر آتا ہے نہ ہی کلائی اس حد تک باپردہ ہیں کہ پتہ نہیں لگ سکتا کہ کس عمر کی ہیں۔نہ ہی کسی کا رُوپ رنگ سامنے آسکتا ہے۔یہاں کی عورتیں بہت مظلوم ہیں ،انھیں کوئی حقوق نہیں دیئے جاتے۔عورتیں دن رات کام کرتی ہیں۔صبح تڑکے اُٹھ کر جانوروں کو چارا دینا ان کا دودھ دوہنا ،دودھ سے مکھن بنانا ، دہی بنانا ،لسّی بنانا غرض کون سا کام جو وہ نہیں کرتیں۔سارا دن سب کی خدمت میں گزار دیتی ہیں ، پھر بھی کوئی حقوق نہیں۔اس صنف نازک سے نازکی کا کوئی سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔

ماجد فرید ساٹی اپنے سفر نامے "مناظرِ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

"یہاں کے لوگ عموماً تین تین ،چار چار شادیاں کرتے ہیں۔عورتوں کو کوئی خاص حقوق نہیں دیئے جاتے۔عورتیں دن رات مشقت کرتی ہیں۔صبح تڑکے اُٹھ کر جانوروں کو چارا ڈالتی ہیں۔ان کا دودھ دوہتی ہیں ، دودھ نکالنے کے بعد اس سے مکھن نکالتی ہیں ،دہی بناتی ہیں ،لسّی بناتی ہیں۔ایک بڑی روٹی بناتی ہیں اور پورا کُنبہ وہی روٹی کھاتا ہے۔"(159)

مجموعی طور پر پس ماندہ علاقوں میں اور ایسے علاقے جہاں تعلیم بالکل نہیں ہے ،عورت بہت بے مائیگی اور کم تری کی زندگی گزار رہی ہے۔ہمارے ملک میں عورتوں کی اکثریت اسی طرح کی زندگی گزار رہی ہے ،جہاں اسے بنیادی حقوق تک حاصل نہیں ہیں۔صوبہ خیبر پختونخوا کا ماحول تو پھر قبائلی ہے۔جہاں بات بات پر قتل کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ غیرت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے اور ان کی شان سمجھا جاتا ہے۔

عورتوں کو جائیداد سے محروم رکھنا:

عورت کو ان پس ماندہ قبائل میں جائیداد سے محروم رکھا جاتا ہے۔حالاں کہ انھیں اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔یہ حق عورت کو اسلام نے دیا ہے۔مگر یہ لوگ زمانہ قدیم سے جس چلن

پر چل رہے ہیں ، اسی پر آج بھی کار بند ہیں۔کافرستان میں رواشت کے سلسلے میں اُنھوں نے تقسیم کر رکھی ہے کہ بیٹوں کو اراضی یعنی زمین دی جاتی ہے اور لڑکیوں کو صرف گائے یا بکریاں دی جاتی ہیں۔بس اس طرح ان کی وراثت کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

محمود دانش ور ایرانی لکھتے ہیں:

"وراثت کے سلسلے میں ان کا دستور یہ ہے کہ جس قدر اراضی ہو گی ، وہ بیٹوں کے حصّوں میں جائے گی اور لڑکیوں کو صرف گائے یا بکریاں دی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ ان کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا۔"(160)

پشتون قبائلی عورت کو وراثت میں کوئی حصّہ نہیں دیتے۔یہاں تک کہ مہر بھی معاف کرا لیتے ہیں۔

زناکاری کی سزا:

پٹھان اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت شکی مزاج ہیں۔اگر کوئی پٹھان اپنی بیو ی کو کسی غیر مرد سے بات کرتا دیکھ لے تو فوراً اس کی وفاداری پر شک کرنے لگتا ہے اور اسے مار تا پیٹتا ہے اور قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔عورتو ں کو کھلے عام مردوں سے بات چیت یا تعلقات بنانے کی اجازت نہیں ہے۔اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی لڑکی کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے تو پھر دونوں کی سزا صرف موت ہے اور انھیں کوئی نہیں بچا سکتا۔

جی سی واکر ایسکوائر لکھتے ہیں:

"پٹھان اپنی عورتوں کے بارے میں بہت حاسد ہیں ، لیکن انھیں کوئی احترام یا اعتماد نہیں دیتے۔بلکہ ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں۔جو ان کی عزت و غیرت کی امین ہے۔لہٰذا انھیں اسی کے مطابق دیکھا اور سزا کا مستوجب بنایا جاتا ہے۔"(161)

جب کسی عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھا جاتا ہے تو اس وقت یہ لفظ بولا جاتا ہے۔پشتون معاشرے میں عورت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی نامحرم کے قریب بھی جائے۔اگر کسی عورت پر "تور" کا الزام لگ جائے تو ایسی عورت داغ دار ہو جاتی ہے۔"تور" کے معنی "کالا"۔عام طور پر لڑکے اور لڑکی میں اگر محبت کے تعلقات حد سے بڑھتے ہوئے دیکھے جائیں تو قبائلی رواج کے مطابق

دونوں کو سنگھار کیا جاتا ہے۔"بدنام" محبت کی کسی بھی صورت میں مرد وزن دونوں پر "تور" لگتا ہے اور پشتون غیرت کے تقاضے کے تحت واجب القتل گردانے جاتے ہیں۔

پشتون معاشرے میں عورت شدو مد کے ساتھ پردے کا اہتمام کرتی ہیں۔کافرستان میں بھی زنا کی سزا کوڑے مارنا ہے۔مگر چوں کہ ان کے طور طریقے الگ ہیں۔جس عورت نے زنا کیا ہو ،اس کی تطہیر کے لیے رسم ادا کی جاتی ہے۔یہ ملوش دیوتا کے حضور میں جاکر ایک بکرا ذبح کرتے ہیں اور دیودار کے سرسبز پتے جلائے جاتے ہیں۔وہ عورت دھوئیں میں کھڑی ہو جاتی ہے۔اس کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ پاک ہو گئی ہے۔عورت کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> "یہ کافر سب سے پہلے اس عورت کو بیس کوڑے لگاتے ہیں کہ اس نے اپنی امانت دوسرے کے حوالے کیوں کی۔اس کے بعد اس شخص کو لایا جاتا ہے جس نے زنا کیا ہو۔اس کو سرعام کوڑے لگائے جاتے ہیں اور پھر اس سے تاوان حاصل کیا جاتا ہے۔اس تاوان میں ایک چُغہ ،ایک بکرا ، کچھ نقد روپے لیے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس مرد کو رہا کر دیا جاتا ہے۔"(162)

ہر مذہب میں زَنا کو فعل بد سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا مقرر ہوتی ہے۔کافرستان میں نہ ہی وکیل ہے نہ عدالتیں۔ان کا پروہت جسے "بودک" کہتے ہیں ،ان رسوم میں موجود ہوتا ہے اور فیصلے کرتا ہے۔

xiii. طرزِ زندگی:

لوگوں کی طرزِ زندگی ہی کسی علاقے کی ثقافت کو سامنے لاتے ہیں۔ان کے رہنے سہنے کے طریقے ،رسوم و رواج جو انھیں دوسرے علاقے سے مُنفرد بناتے ہیں۔اس لیے کسی بھی خطے کی ثقافت کو سمجھنے کے لیے وہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے۔لوگوں کا میل ملاپ ،اُٹھنا بیٹھنا ، مہمان نوازی ، عادات تب ہی سامنے آتے ہیں جب ہم وہاں کے رسوم و رواج سے واقف ہو ں۔شادی بیاہ کی رَسومات ، کھیل تفریحات ، پیدائش ، مرگ کی رسومات اور دیگر رسومات

جو وہاں کے لوگ اپنائے ہوئے ہیں۔سب کے بارے میں جان کاری ہی کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔یہی وہ ثقافتی عناصر ہیں جن کی وجہ سے ہم ایک خطے کی ثقافت کو دوسرے سے الگ کرسکتے ہیں۔

xiv. مہمان نوازی(میلمستیا):

خیبرپختونخوا میں روایات کی پاس داری عبادت کی طرح کی جاتی ہے۔مہمان نوازی کی روایت پشتونوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ میلمستیا کو پشتون خاص اہمیت دیتے ہیں۔وہ مسافر اور مہمان کی خاطر داری کرنا اپناروایتی فرض سمجھتے ہیں۔بخل کوپشتون روایات میں بہت برا سمجھا جاتا ہے۔جب کہ مہمان نوازی کوعزت اور وقار کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔اس روایت نے پشتونوں میں بلند حوصلگی ، خلوص ومحبت ،رواداری اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔پشتونوں میں مہمان نوازی صرف کھانا کھلانے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں مہمان کی جان و مال کا تحفظ بھی شامل ہے۔پشتونوں کے ہاں بدلے کے خوف سے کوئی دشمن بھی مہمان کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مہمان نوازی کی یہ صورتِ حال زمانہ قدیم سے جاری ہے۔مہمان کی حفاظت کے لیے اپنی زندگی اپناگھر بار سب کچھ تباہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن اسے اس کے دشمن کے حوالے کر دینے پر کسی صورت بھی راضی نہیں ہوتے۔دوسرے تو پھر دوسرے اپنا دشمن بھی مہمان بن کر آجائے تواس کی حفاظت بھی خود پرواجب سمجھتے ہیں۔پشتون معاشرے میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ اپنے بیٹے کے قاتل کا بھی اپنے گھر میں تحفظ کیاگیا ہے اور عزت واحترام کے ساتھ اسے اس کے ٹھکانے تک پہنچایا گیا ہے۔

اس حوالے سے جیمز ڈبلیو سپین لکھتے ہیں:

> ”انگریز ارباب بست کشاد عام طور پر پختون ولی کا احترام کرتے تھے اور آزاد قبائل کو اس کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتے تھے۔لیکن میلمستیا (مہمان نوازی) کی پابندی اکثر مشکلات پیدا کرتی تھی کہ قبایلی زیرِ انتظام ضلعوں میں سنگین جرائم کے مرتکب افراد کو تحفظ نہ دیں اور انھیں حکومت کی تحویل میں دے دیں جو پہاڑوں

> میں پناہ لے چکے تھے ، انفرادی میزبان اور اکثر پورے کے پورے طائفے یہ بات نہ مانتے تھے اور کوئی بھی طرف اپنا اصول چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ وظائف بند کر دیئے جاتے ، مہمات ، بھیجی جاتیں ، پُل اڑا دیئے جاتے اور دستوں کو نرغے میں لے لیا جاتا اور سرحد میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو جاتا۔"(163)

مہمان نوازی کو پٹھان یا افغان اپنی عزت و غیرت کا معاملہ سمجھتے ہیں۔ بڑھ چڑھ کر مہمان کی عزت و تکریم اور مہمان نوازی کرتے ہیں ۔ پٹھان مہمان نوازی کے حوالے سے مشہور ہیں کہ ان کی مہمان نوازی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے ۔ مہمان نوازی کرنا پٹھانوں کی شان مانی جاتی ہے اور جو شخص مہمان نوازی میں کنجوسی دکھاتا ہے، اس کی کوئی عزت نہیں کرتا ۔ بے شک وہ کردار کے لحاظ سے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو ۔ مہمان کی عزت و خاطر داری پختون معاشرے میں بہت اہم ہے۔

بقول جی سی واکر ایسکوائر:

> " جو شخص اپنے گھر کے معاملات میں بخیلی سے کام لے اس کی زیادہ عزت نہیں ہوتی چاہے وہ دیگر حوالوں سے کتنے ہی اچھے کردار کا مالک ہو ؛ اسی طرح جو ملک دو قسم کا کھانا رکھتا ہو (اچھی قسم کا اپنے اور گھٹیا قسم کا مہمانوں کے لیے) وہ بھی باعزت نہیں سمجھا جاتا۔"(164)

پاکستان کا ہر صوبہ مہمان نوازی کے معاملے میں کافی حساس ہے مگر پختونوں کے لیے یہ غیرت کا معاملہ ہے۔ وہ مہمان نوازی میں بہت آگے ہیں۔ پورے صوبے میں مہمان کی آؤ بھگت اور خاطر داری بہت اچھے طریقے سے کی جاتی ہے۔ چترال کے لوگ بھی مہمان نوازی میں مثالی سمجھے جاتے ہیں۔ مہمان کی خاطر داری بہت زیادہ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے آپس میں بھی اور غیر ملک کے لوگوں کے ساتھ بھی ان کا اخلاق بے مثال ہے۔ سب سے ادب و آداب اور تعظیم سے پیش آتے ہیں۔

اس ضمن میں منشی محمد عزیز الدین رقم طراز ہیں:

> "چترالی لوگ مہمان نوازی اور آؤ بھگت میں مثالی کردار کے مالک ہیں۔ مہمان کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔"(165)

خیبر پختونخوا میں لوگ آج بھی روایات کے پاس دار ہیں۔پختون معاشرے میں لوگ آج بھی مہمان داری میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔حتیٰ کہ ہوٹلوں والے بھی مہمانوں کا احترام کرتے ہیں اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔اکثر غیر ملکی سیاح جب پاکستان کی سیاحت کے لیے آتے ہیں تو وہ پشتونوں کے اخلاق و کردار سے بے حد متاثر ہوتے ہیں اور اپنے سفر نامہ میں ان کا تذکرہ بہت ہی اچھے انداز میں کرتے ہیں۔اسی طرح ایک سفر نامہ نگار رکیمی پوا پاکستان کی سیاحت کے واقعات سے جب صفحات کو رنگین کرتی ہیں تو "پشاور" کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "ہوٹل کا عملہ نہایت مہمان نواز ہے اور ایک غیر متوقع مہمان کے لیے کسی نہ کسی طرح جگہ بنالی جاتی ہے خواہ ہوٹل کے کمرے بالکل پُر ہوں۔"(166)

وادی سوات تہذیب و ثقافت کا ایک حسین مرقع ہے۔منگورا کی لسّی بہت لذیذ ہوتی ہے۔اگرچہ پنجاب کی لسّی اپنی جگہ ہے مگر یہاں کی لسّی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ایسا ذائقہ کہ پینے والا مینگورہ کو کبھی بھول نہ سکے۔سوات کے لوگ اتنے مہمان نواز ہیں کہ اگر کوئی کھیتوں میں سے گزر رہا ہے اور ان سے سلام دُعا کر لے اور بتا دے کہ میں مہمان ہوں تو سوات کے یہی لوگ ان کی مہمان نوازی کرنے لگتے ہیں اور فوراً چائے کا انتظام کر لیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ "سفر شمال کے" میں اسی مہمان نوازی کی صفت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک کھیت میں چند کسان پتھر چن رہے تھے۔ہم قریب سے گزرے تو اُنھوں نے تقریباً زبردستی ہمیں گڑ کی چائے پلائی جس نے اس مقام پر مہمان نوازی کے ذائقے کی وجہ سے بہت لطف اُٹھایا۔"(167)

برف باری کے شوق نے اور ثقافتی عوامل کی لگن نے مستنصر حسین تارڑ کو یہ مقام عطا کیا ہے کہ وہ مالم جبہ جیسے بلند مقام کی سیاحت سے لطف اندوز ہو سکیں۔یہاں مہمان نوازی کا انوکھا انداز ہے۔تارڑ لکھتے ہیں کہ ہم ایسے مقام سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔جہاں برف قدرے کم تھی۔ایک لڑکا پلاؤ لے کر آیا اور پھر چائے بھی جس نے ہمیں بہت سرور دیا۔

تارڑ لکھتے ہیں:

"میں نے دیگچے کا ڈھکن اُٹھایا تو بھاپ کے ساتھ پلاؤ کی خوشبو میرے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔ گرم گرم پلاؤ میں آلو اور پیاز بھی ڈالے گئے تھے۔۔۔ اسے ہم سب نے ہاتھوں سے کھایا اور اس پلاؤ کی وجہ سے ہماری نظروں میں مالم جبہ کی وقعت بڑھ گئی۔

پلاؤ ختم کیا تو وہی لڑکا گرم چائے لے آیا جس نے زبردست ذائقہ دیا۔۔۔"(168)

اس خطے کی مہمان نوازی کی صفت ایسی شان دار ہے کہ واقعی ان جیسا مہمان نواز شاید ہی اس روئے زمین میں پر کوئی اور ہو۔

یہا ں کے لوگ مسافر نواز ہیں۔مسافروں کی خاطر داری بھی یہ لوگ بخوشی کرتے ہیں۔کاغان جاتے ہوئے راستے میں جو پہاڑ آتے ہیں۔ان پر حسین چراگاہیں موجود ہیں۔سیاح ان پہاڑوں پر جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ایسی ہی مہمان نوازی کا ذکر محمد خالد اختر اپنے سفر نامے "دو سفر" میں کرتے ہیں۔جہاں ان کی ملاقات ایک ننھے چرواہے سے ہوئی اور وہ اس کی معصومیت اور خوش ادائی سے بے حد متاثر ہوئے۔

خالد اختر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ہم یہاں ایک ننھے چرواہے سے ملے۔اس کے گالوں میں گلاب تھے اور اتنا خوش ادا تھا جتنا کوئی تعلیم یافتہ لڑکا۔ہزاروی نے اس سے کہا وہ ہمیں کچھ پلا سکتا ہے لڑکا ہمیں اپنے کنبے کی جھونپڑی میں لے گیا جو گھاس پھونس کا گول کنٹوپ نما گھر تھا ہم نیچے فرش پر ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔لڑکا مٹی کے ایک ڈول میں بکری کا تازہ دودھ لایا اور اس ڈول کو ہم نے باری باری منہ لگایا۔پھر لڑکا اپنی بہن کو گود میں اُٹھا لایا میں نے دیکھا کہ ہمارا خزانچی بچی کے ہاتھ میں کچھ دینے پر مطلق غور نہیں کر رہا ہے۔آخر میں نے دو روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے یہ ان غریب لوگوں کی مسافر نوازی اور تازہ صحت مند دودھ کا حقیر معاوضہ تھا۔"(169)

مہمان نوازی ان کی فطرت ہے اور یوں معاوضہ کا خواہش مند ہونا ان غریب لوگوں کی مجبوری ہے۔یہاں کے لوگ انتہائی غریب ہیں مگر پھر بھی دل کشادہ ہیں۔

مہمان نوازی کا مادہ ان کے خون میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔پورے خیبر پختونخوا میں جہاں بھی پشتو بولنے والا ملے گا۔اس کا باہر سے آنے والے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ کا انداز ہی الگ ہوگا۔گاؤں کے لوگ عموماً سیاحوں کے گرد گھیرا باندھ لیتے ہیں اور انتہائی محبت سے ملتے ہیں۔سیاح جب واپسی کا سفر باندھتا ہے تو میزبان اس کو گاڑی تک چھوڑ کر آتا ہے۔یہ لوگ مہمان نواز ہیں اور سیاحوں کو بہت عزت دیتے ہیں۔ان کی محبت اور خلوص سیاحوں کو بہت محظوظ کرتا ہے۔ماجد فرید ساٹی نے پورے ملک کی سیاحت کی اور ہر علاقے کی ثقافت پر بھر پور روشنی ڈالی۔ٹھنڈ یانی یہاں سے ایک طرف دریائے جہلم اور وادی کشمیر میں پیر پنجال کا پہاڑی سلسلہ نظر آتا ہے تو دوسری طرف کوہستان اور کاغان کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی ہمیشہ یاد رہنے والی چیز ہے۔

بقول ماجد فرید ساٹی:

> ”یہاں سے نیچے اُتریں تو سیال کوٹ نامی گاؤں آجاتا ہے۔جہاں کے معصوم اور مہمان نواز لوگ سیاحوں کو بہت عزت دیتے ہیں۔گاؤں کے باسی عموماً سیاحوں کے گرد گھیرا باندھ لیتے ہیں اور انتہائی محبت سے ملتے ہیں۔“(170)

مالم جبہ کے ٹاپ سے اتر کر اگر آس پاس کے علاقوں کی سیر کی جائے تو سواتی کلچر بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

کیلاش میں بھی مہمان نوازی کا رواج ہے۔مہما ن کی تعظیم یہاں رسم کے طور پر کی جاتی ہے۔سب مل کر اس کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔یہاں عجیب رسم ہے۔جو بھی مہمان کو ملنے آتا ہے روٹی اور پنیر لاکر اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور یہ روٹی کھانا ضروری ہے ، نہیں تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔یہ ان کی روایات کا حصّہ ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

"میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آہستہ آہستہ میرے کمرے کے سامنے آنے لگے ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ روٹیاں تھیں جن پر پنیر رکھا ہوا تھا۔ہر ایک باری باری آتا اور میرے سامنے جھک کر ایک طرف روٹیاں اور پنیر رکھ دیتا۔یہ ان کی رسم تھی جب کہ کوئی معزز مہمان ان کے پاس آتا تو وہ اس طرح اس کی خاطر اور تعظیم کرتے۔مترجم نے کہا کہ آپ ان روٹیوں کو ضرور چکھیں ورنہ ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔"(171)

قبائیلوں کی مہمان نوازی پوری دُنیا میں مشہور ہے۔وہ مہمان سے کس محبت سے پیش آتے ہیں ، کس طرح سے اپنے پورے قبیلے سے متعارف کراتے ہیں اور مہمان کی آمد پر کس طرح جشن کا اہتمام کرتے ہیں۔عبدالحفیظ مرزا نے اپنے سفرنامے "سفر گزشت" میں ہمیں قبائیلی علاقوں کی خوب صورت روایات سے متعارف کرایا ہے۔مرزا عبدالحفیظ مرزا رقم طراز ہیں:

"ناشتہ کر چکے تو میں نے بازار کی سیر کی خواہش کا اظہار کیا ہم دونوں بازار چلے گئے۔وہاں سب اب مجھے بھی جانتے تھے۔ہر دُکان دار مصافحہ کرتا ، حال پوچھتا ، چائے یا قہوے کی پیش کش کرتا۔ہم نے بہت سے پستول ، بندوقیں اور ریوالور دیکھے۔ان سے فائر کیے ، کئی پیالیاں چائے اور قہوہ پیا پھر واپس حجرے میں پہنچ گئے۔"(172)

سوات کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔چاہے وہ میاں دم ہو یا مدین ، بشی گرام ہو یا کوہستان ، چاہے ہو وادی کالام سب میں مہمان داری کی روایات موجود ہیں۔بشی گرام یہاں کے کوہستانی باشندے بہت صاف دل اور مہمان نواز ہیں۔اپنے مخصوص رسم و رواج کے بھی سختی سے پابند ہیں۔مدین کے بھی پکے مسلمان ہیں۔جنگ و جدل کو پسند نہیں کرتے۔امن سے رہنے والے یہ لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔

وادی کالام کے لوگوں کی مہمان نوازی کو فضل ربی راہی اپنے سفرنامے "سوات ، سیاحوں کی جنت" میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہاں کے مکین بہت مہمان نواز ہیں۔اگرچہ مالی طور پر آسودہ نہیں لیکن پھر بھی سیاحوں کو بڑے خلوص اور محبت سے چائے اور کھانے کی دعوت دیتے ہیں ہوئے نظر آئیں گے۔"(173)

کنڈلوڈنڈ جھیل حسین وادی سوات کی خوب صورت اور دل کش جھیل ہے۔یہاں جاتے ہوئے راستے میں ایک آدھ مقام پر مقامی افراد باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو بڑے خلوص اور تپاک کے ساتھ چائے پینے کی دعوت دیتے ہیں۔سر سبز شاداب پہاڑوں کے درمیان چائے پینے کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

اُتروڑ اور گبرال جنت نظیر سوات کی سب سے خوب صورت ،دل فریب اور سحر انگیز وادیاں ہیں۔یہاں کے لوگ مہمان نوازی کو اپنے فرائض کا حصّہ سمجھتے ہیں۔یہاں کے لوگ امن پسند اور انسان دوست ہیں۔دوستی کی خاطر جاں تک قربان کر دیتے ہیں۔اسلحہ کی فراوانی کے باوجود یہ لوگ امن پسند ہیں۔وادی بحرین کے لوگ بھی انہی صفات کے مالک ہیں۔وضع دار اور انسان دوست ہیں۔پورے سوات میں گھومنے کے بعد سیاح یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہاں ہر وادی کے لوگ مہمانوں کی عزت و تکریم اور مہمان نوازی میں بہت آگے ہیں۔

بقول فضل ربی راہی :

"یہاں کے لوگ بہت وضع دار اور انسان دوست ہیں۔مہمانوں کی عزت کو مقدم سمجھتے ہیں۔مذہب کے معاملے میں بہت سخت (مسلمان) ہیں۔یہاں کے باشندے تاریخ کے نام ور اور مجاہد بزرگ میاں قاسم بابا کی تبلیغی مہم کے نتیجے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔مخصوص علاقائی تہذیب و ثقافت پر عمل پیرا یہ لوگ بہت سادہ اور خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں۔"(174)

کافرستان کہنے کو تو پاکستان میں شامل ہے مگر یہاں کے طور طریقے ،طرز بودوباش ،رَسومات سب الگ ہیں۔جب کوئی مہمان کسی کے گھر جاتا ہے تو خاندان کی بوڑھی عورت اس کا استقبال اس طرح کرتی ہے کہ مہمان کے سر اور کاندھوں پر آٹے کی دو چٹکیاں بھر دیتی ہیں۔رزق میں اضافے کے لے یہ عمل کیاجاتا ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

"میں نے وہاں ایک اور رسم بھی دیکھی۔ میں ایک شخص کے ہاں بطور مہمان گیا تو اس خاندان کی سب سے بڑی عورت فوراً میرے پاس آئی اور اس نے میرے سر اور کانوں پر آٹے کی ایک دو چٹکیاں بھر دیں۔ یہ وہاں کی رسم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رزق کی کشائش کے لیے یہ عمل کیا جاتا ہے۔"(175)

پختون بہت مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کمی روا نہیں رکھتے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے پیش کرتے ہیں۔ مہمانوں کے قیام کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ مہمند ایجنسی اور باجوڑ ایجنسی میں جرگہ سسٹم ہے، تھانے نہیں ہیں۔ مقدمات کے فیصلے جرگے میں ہوتے ہیں۔

الحاج زمان کھوکھر اپنے سفر نامے "پشاور سے کوئٹہ تک" میں قبائلی علاقوں میں بسنے والے باشندوں کی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پختون بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان کا قیام حجرہ میں ہوتا ہے۔ مہمان کی اعلیٰ سے اعلیٰ کھانوں سے تواضع کی جاتی ہے۔"(176)

ملک اشفاق نے سفر نامہ "کیلاش (سفر نامہ کافرستان)" میں دل کش اور حسین مقامات کی اس طرح منظر کشی کی ہے کہ قاری ان نظاروں میں کھو جاتا ہے۔ اس سفر نامے میں اس وادی کی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کو بڑے گہرے انداز میں ملک اشفاق نے بیان کیا ہے۔ اس سفر نامے میں اُنھوں نے زیادہ تر ان لوگوں کے رسوم کو بیان کیا ہے۔ کیلاشی لوگوں کی مہمان نوازی پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک اشفاق لکھتے ہیں:

"کیلاش لوگوں میں یہ ایک قدیم رواج ہے کہ جب ان کے ہاں کوئی مہمان ٹھہرتا ہے اور جب وہ اس گھر سے وداع ہوتا ہے تو میزبان اس کے گلے میں خشک میوؤں کے ہار ڈالتے ہیں۔ یہ ہار دراصل ایک قسم کا زادِ راہ ہوتا ہے۔ اگر سفر کے دوران اسے بھوک لگے تو وہ ہار کے ان میوؤں کو کھالے۔"(177)

XV. علاج کے عجب طریقے:

کنڈلوڈنڈ جاتے ہوئے راستے میں انواع واقسام کے جنگلی پھول اور خوشبو دار پودے نظر آتے ہیں۔ بعض قیمتی جڑی بوٹیاں بھی یہاں کے پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگ ان جڑی بوٹیوں سے واقف ہیں۔ اس لیے چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج خود ہی کر لیتے ہیں۔ کون سی جڑی بوٹیاں کھانے سے اور کون سی سونگھنے سے طبیعت بہتر ہو جاتی ہے، یہ سب جانتے ہیں اور ان جڑی بوٹیوں سے مستفید ہوتے ہیں۔

بقول فضل ربی راہی :

> ”بعض قیمتی جڑی بوٹیاں بھی یہاں کے پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ جنھیں مقامی زبان میں جڑئی، تیفان، گوبگہ اور ما میخ کہا جاتا ہے۔ ان میں جڑی نامی پودے کی یہ خاصیت ہے کہ جب پہاڑوں کی بلندی پر چڑھتے ہوئے، آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سر چکرانے، سانس پھولنے اور دل متلانے لگتا ہے تو اس پودے کے چھوٹے چھوٹے گھنے پتے سونگھتے کے بعد، حیرت انگیز طور پر طبیعت فوراً بحال ہو جاتی ہے۔“ (178)

مدین کی وادی بہت سی جڑی بوٹیوں کا مرکز ہے۔ یہاں کے جنگلوں میں بہت سی کار آمد جڑی بوٹیاں ملتی ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں دوائیوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ یہ دوائیاں بیماریوں کے علاج میں استعمال ہوتی ہیں۔

بحرین کی دل کش وادی سیر و تفریح بہترین جگہ ہے۔ یہاں سیاحوں کے لیے بہت سی سہولتیں موجود ہیں۔ بحرین کے قریبی پہاڑ بھی سیر کے لیے دل کش تفریح گاہوں کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بحرین کے قریب لبِ سڑک واقع ”شفا“ نامی چشمہ بہت مشہور ہے۔ مقامی لوگ اس کو بہت معتبر مانتے ہیں اور چشمے کو بیماریوں کے لیے شفا مانتے ہیں۔

بقول فضل ربی راہی:

"بحرین کے قریب لبِ سڑک واقع "شفا" نامی چشمہ بہت مشہور ہے۔مقامی لوگو ں کی روایت ہے کہ اس چشمے کا پانی کئی قسم کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔"(179)

وادی کالام برف پوش چوٹیوں اور اپنی بے پناہ خوب صورتی کی وجہ سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔یہاں قیمتی جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔جو حیاتیات (Botany) کے ماہرین کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔اگر اس سلسلے میں تحقیق کا آغاز کیا جائے تو بہت سی ایسی قیمتی اور نایاب جڑی بوٹیاں ہاتھ میں آسکتی ہیں، جو مختلف دوائیوں اور دیگر مفید کاموں میں مستعمل ہو کر انسانیت کی فلاح وبہبود کا موجب بن سکتی ہے۔

کافرستان میں لوگ اپنا علاج خود ہی کر لیتے ہیں۔وہاں کوئی ڈاکٹر، حکیم نہیں۔اگر کوئی شخص زیادہ بیمار ہو جائے تو ملوش دیوتا کو نذر پیش کی جاتی ہے اور اس کی صحت یابی کی دُعا مانگی جاتی ہے۔پہاڑی علاقوں میں جہاں جدید علاج کی سہولیات نایاب ہیں۔عام طور پر لوگ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے کراتے ہیں:

ہلدی:

اچھی طرح کوٹنے کے بعد زخم بھر دیا جاتا ہے۔

سانپ:

جسے سانپ نے کاٹا ہے۔ایک بھیڑ کا بچہ ذبح کر کے پورا اس کے زخم پر باندھ دیتے ہیں۔

لوہا :

اگر کسی کو نظرِ بد لگ جائے تو اس کے گلے میں لوہا لٹکا دیتے ہیں۔

شیگان :

بچوں کی بیماری پر مذہبی راہ نما بیٹان ان کی صحت یابی کے لیے شیگان کی قربانی دی جاتی ہے۔

پنیر:

مٹی کے بنے ہوئے مٹکے (کواؤ) میں پنیر جمع کرتے ہیں ،جب یہ پنیر کڑوا ہو جاتا ہے ،پنیر کو بہت سی بیماریوں کے علاج کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کِھت:

یہ ایک قیمتی جڑی بوٹی ہے۔اس کو جلا کر اس کی راکھ سے زخم بھرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

بقول پرویش شاہین:

"یہ بڑی قیمتی بوٹی ہے۔اس کا چھلکا اُتارا جاتا ہے اور پھر جلا دیتے ہیں۔جلانے کے بعد راکھ سے زخم کو بھر دیتے ہیں۔اس سے زخم ٹھیک ہو جاتا ہے۔"(180)

کھاس:

اس پودے کو "لاچی" کہتے ہیں۔اس کی جڑ کو اچھی طرح کوٹ کر اس کے پانی کو پھوڑے پھنسی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ناخونک کھاس:

یہ چھوٹا سا پودا آنکھوں کی بیماری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بوئن:

یہ پودا گرم کر کے پیٹ در د کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے پتے خشک کر کے پیس لیتے ہیں پھر اس کو پانی میں اُبال کر پی لیتے ہیں۔

سر درد کا علاج:

سر میں درد ہو تو یہاں کے لوگ خیال کرتے ہیں کہ خون خراب ہو گیا ہے۔چھری سے زخم کر کے تھوڑا سا خون نکال کر گائے کا سینگ لگا کر خون کو منہ سے چوس لیتے ہیں۔زہر کو بھی سینگ لگا کر چوستے ہیں۔

بقول شاہین پرویش:

"چھری سے تھوڑا سا زخم کر کے خون بہا دیتے ہیں یا گائے کا سینگ لگا کر خون کو منہ سے چوستے ہیں۔اسی طرح سانپ کے کاٹے کے لیے بھی سینگ لگا کر زہر کو چُوس کر نکال لیتے ہیں۔"(181)

چترال بازار سے شمال کی طرف گرم چشمہ کا مقام ہے۔یہ قدرتی گرم چشمہ ہے اور اسی گرم چشمے کی مناسبت سے اس مقام کا نام گرم چشمہ ہے۔یہاں کا گرم چشمہ واقعی ایک ثقافتی علامت بن گیا ہے۔اس چشمے کا پانی اس قدر گرم ہوتا ہے کہ زیادہ دیر تک آدمی اس میں ہاتھ نہیں رکھ سکتا۔یہ چشمہ بیماریوں کے علاج کے لیے مشہور ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال :

> "اس مقام پر قدرتی گرم چشمہ ہے ،جس کا پانی گرم ہوتا ہے اور اسی گرم چشمے کی مناسبت سے اس مقام کا نام گرم چشمہ ہے۔یہاں کا گرم چشمہ واقعی ایک ثقافتی علامت بن گیا ہے۔اس چشمے کا پانی اس قدر گرم ہوتا ہے کہ زیادہ دیر تک آدمی اس میں ہاتھ نہیں رکھ سکتا۔"(182)

وادی کیلاش یہاں کے لوگ اگر بیمار ہو جائیں تو اپنا علاج خود ہی کر لیتے ہیں۔یہاں کوئی ڈاکٹر ، حکیم نہیں ہے۔زخم آجائے تو ہلدی پیس کر لگا لیتے ہیں۔یہاں اکثر لوگ ہر وقت کھانستے رہتے ہیں ، تمباکو نہیں پیتے مگر ہر وقت نسوار کھاتے رہتے ہیں۔یہاں کی آب و ہوا کا اثر ہے۔بیماری کی صورت میں فوراً نذرو نیاز کا بندوبست کرتے ہیں۔ان کے ہاں سب سے بڑی دوائی سلاجیت ہے ،جو کہ ایک جڑی بوٹی ہے۔پہاڑوں سے نکلتی ہے۔یہ بڑی طاقت ور دوائی ہے۔یہاں کے لوگ انہی دوائیوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> "یہ لوگ ہر وقت نسوار کھاتے ہیں۔یہ لوگ تمباکو نہیں پیتے۔جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو یہ فوراً نذرو نیاز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ان کے ہاں سب سے بڑی دوا سلاجیت ہے۔وہ بڑی طاقت دینے والی دوا ہے۔وہاں کے پہاڑوں سے عام نکلتی ہے۔یہ لوگ کبھی کبھی اسے کھاتے رہتے ہیں۔"(183)

سلاجیت ایک جڑی بوٹی ہے جو طاقت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔یہ ان پہاڑوں میں پائی جاتی ہے۔کافرستان کے پہاڑوں میں اس کے پودے ہیں۔اس کی تھوڑی سی مقدار بہت صحت بخش ہے۔یہ انتہائی مہنگی ملتی ہے۔پاکستان کے شہروں میں اور وہاں مفت میں پہاڑوں پر پائی جاتی ہے۔

گرم چشمہ چترال سے 45 کلو میٹر شمال مغرب کی طرف ہے۔چترال سے 3 گھنٹے میں بذریعہ جیپ جاسکتے ہیں۔یہ حسین وادی بہت سے خوب صورت مناظر لیے سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔سب سے زیادہ توجہ طلب جگہ یہاں کے گندھک کے اُبلتے ہوئے گرم چشمے ہیں۔ان گرم چشموں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ان سے جلدی بیماریاں رفع ہو تی ہیں۔جوڑوں کے دَرد بھی ان گرم چشموں کے پانی کے استعمال سے دور ہو جاتے ہیں۔

بقول عارف محمود اپل:

> "سب سے زیادہ توجہ طلب جگہ یہاں کے گندھک کے اُبلتے ہوئے گرم چشمے ہیں۔ان گر م چشموں کی خاصیت ہے کہ جلدی بیماریاں دور ہوتی ہیں۔جوڑوں کے درد اور پرانی سر درد بھی ان گرم چشموں کے پانی کے استعمال سے دور ہو جاتی ہے۔چشموں کے نزدیک غسل خانے بنائے ہوئے ہیں تاکہ سیاح لوگ اور دیگر جو لوگ یہاں کے پانی سے غسل کرنا چاہیں ،آسانی ہو سکے۔"(184)

یہ چشمے یہاں کے لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ان چشموں کے پانی میں اللہ نے شفارکھی جس سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

xvi. ثقافتی کھیل:

مردان ،سوات ، نوشہرہ ،کوہاٹ ،صوابی ،چارسدہ ،خیبر ایجنسی ، مالاکنڈ ایجنسی وغیرہ پشاور کے قدیم مقامات ہیں اور اپنی اپنی روایات میں ایک جہان رکھتے ہیں۔ان کو سب کو ایک لڑی میں پرونے والا ہمارا مذہب اسلام ہے۔سب مسلمان ہیں۔صرف چترال کافرستان کے لوگ تھوڑے مختلف ہیں۔چترال میں ایک تہائی اسماعیلیہ فرقہ ہے۔جن کے عادات ورسوم و رواج مختلف ہیں۔کافرستان دو حصّوں میں تقسیم ہے۔سرخ کافرستان جو کہ مسلمان ہیں ،جو افغانستان کی سرحد کے ساتھ لگتے ہیں۔اس لیے انھیں مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کرنے میں آسانی رہی۔دوسری طرح سیاہ کافر ہیں ،جو کہ اسلام سے دور اپنے الگ مذہب کے پیروکار ہیں۔

ضلع سوات کی تمام وادیاں ، مانسہرہ ، بٹ گرام وغیرہ سب پختون معاشرے کے زیر اثر ہیں۔سب کے رسم و رواج تقریباً ایک ہیں۔تھوڑا تھوڑا فرق جو انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ان کے ثقافتی کھیل ،شادی کی رسوم،موت کی رسمیں ،پیدائش کی رسمیں سب ان کی ثقافت کو رنگا رنگ بناتی ہیں۔

انگر گشتے:

شانگلہ کا معاشرہ سوات کے دیگر علاقوں کی طرح پختون معاشرہ ہے۔کالام کی وادی کا ایک مشہور کھیل انگر گشتے :برف باری کے دنوں میں مکانوں کی چھتوں پر اس طرح کھیلتے ہیں کہ دونوں نوجوان اپنا بایاں پاؤں پیچھے کی طرف اکٹھا کر کے دائیں ہاتھ کو بازو کی طرف موڑ کر پکڑتے ہیں۔جو پہلے پکڑلے وہ جیت جاتا ہے۔

بزل:

بھینس کی پسلی کی ہڈی یا بھینس یا گائے کے ناخن سے ایک اسگر نما چیز بناتے ہیں۔چار گر کے فاصلے پر ایک پتھر رکھ دیتے ہیں ، جسے باکڑی کہتے ہیں اور پھر اس اسگر سے اس پتھر کا نشانہ بناتے ہیں۔جو ٹھیک نشانے پر مارتا ہے ،وہ جیت جاتا ہے۔

اب دورِ جدید کے کھیل ہاکی ،فٹ بال اور کرکٹ بھی کھیلا جاتا ہے۔

تالاش کے لوگوں کا قدیمی کھیل ”ڈمے“ ہے۔اس کھیل میں دونوں پارٹیاں نشانہ لگاتی ہیں۔جو پارٹی جیت جاتی ہے ،اسے ہاری ہوئی پارٹی کے نوجوان کندھوں پر اُٹھا کر ایک مخصوص مقام تک لے جاتے ہیں۔

چترال کا روایتی کھیل ”پولو“ ہے۔یہ پولو کا کھیل ماہر گھڑ سوار گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلتے ہیں۔

بتکر:

یعنی پتھر اُٹھانا۔یہ کھیل ایبٹ آباد اور مضافات میں کھیلا جاتا ہے۔ہری پور، ہزارہ میں یہ کھیل کھیلے جاتے ہیں۔یہ بڑا مقبول کھیل ہے۔مختلف میلوں اور موقعوں پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔اس کھیل میں نوجوانوں میں پتھر اُٹھانے کا مقابلہ ہوتا ہے۔جسے ”پڑ“ کہتے ہیں۔پتھر بیضوی شکل کا ہوتا ہے

،جس کا وزن دو من سے لے کر پونے چار من تک کا ہوتا ہے۔جو اُٹھانے میں کام یاب ہوتا ہے ،وہ جیت جاتا ہے۔مانسہرہ یہاں کے ثقافتی کھیلوں میں گتکہ ،کبڈی ، فصل کی کٹائی کے موقع پر بیل دوڑ مشہور ثقافتی کھیل ہیں۔گلی ڈنڈا بھی بہت مقبول ہے۔کرک ایک ضلع ہے اور کوہاٹ سے سترہ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔یہاں کا مقامی کھیل "ینڈہ" ہے۔اس کے علاوہ یہاں تیتر ، بٹیر ،خرگوش وغیرہ کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔لکی مروت یہ بنوں ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔یہاں کا قدیم اور روایتی کھیل "جی تاڑی" ہے۔پچاس یاساٹھ گز کے فاصلے پر کیل ٹھونک کراس پر پتھر پھینکا جاتا ہے۔کیل پر لگ جائے تو جیت جاتے ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> "مدتوں کے قدیم اور روایتی کھیل میں "جی تاڑی" نامی کھیل بہت مشہور ہے۔یہ زمین میں پچاس یاساٹھ گز کے فاصلے پر کیل ٹھونک دیتے اور پھر اس کیل پر چپٹا پتھر پھینکا جاتا اگر یہ پتھر کیل پر لگ جاتا تو پتھر پھینکنے والا جیت جاتا۔"(185)

ڈیرہ اسماعیل خان کے کھیل کت کت ، پنجری ، گھسنی ، انڈے توڑ ، سوکڑ ہیں۔

کت کت:

کبڈی ہے۔دوسرے علاقوں کی طرح کھیلا جاتا ہے۔سرائیکی میں کبڈی کت کت کہلاتی ہے۔

پنجری:

اس میں طاقت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔وزن اُٹھا کر طاقت دکھائی جاتی ہے۔

گھسنی:

دو اشخاص میں کلائی پکڑنے اور چھڑانے کا مظاہرہ سرائیکی میں گھسنی کہلاتا ہے۔

انڈے توڑ:

ایک ہاتھ کی ہتھیلی کے نرم حصّے میں انڈہ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔سرائیکی میں اسے آنڈاتوڑ کہا جاتا ہے۔

سوکٹر:

اس کھیل میں ایک جوان اپنی مٹھی بند کرتا ہے ،دوسرا کھلونے کی کوشش کرتا ہے۔

کافرستان کی طرف نکل جائیں تو وہاں کے رسوم و رواج کھیل ، تہوار ، میلے سب الگ ہیں۔ان علاقوں کی سیر اُردو سفر نامہ نگاروں نے اس طرح کرائی ہے کہ ان خطوں سے قاری کو صرف شناسائی نہیں بلکہ انسیت ہوگئی ہے۔بنا ملے بنا دیکھے ان لوگوں سے ان خطوں سے ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے اور یہی ان سفر نامہ نگاروں کا کمال ہے۔

چترال کے لوگ زندہ دل ہیں۔پولو ان کا قومی کھیل ہے۔کھیل کود کے بہت شوقین ہیں۔چوگان بازی ان کا مشہور کھیل ہے۔شکار کے بھی شوقین ہیں۔گھڑ سواری کے بھی شوقین ہیں۔اس میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔موسیقی ، کھیل کود ان کے کلچر کا حصّہ ہیں۔آزاد طبیعت کے مالک ہیں۔

لوگ خوش حال ہیں اور خوش گوار زندگی گزارنے کے شائق ہیں۔

بقول منشی محمد عزیز الدین:

> ”چترالی آزاد منش ہیں۔حکم کی تعمیل اور پابندی ان کے لیے موت ہے۔کھیل کود کے بڑے شائق ہیں۔چوگان بازی اور شکار پر جان دیتے ہیں۔گھوڑے کی سواری میں جو ایک اعلیٰ ہُنر ہے ، مہارت تام رکھتے ہیں۔“(186)

پختونوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ مینڈھے اور بٹیر لڑانے میں مہارت رکھتے ہیں۔اصیل مرغے لڑانا بھی پٹھانوں اور کشمیریوں کے شوق ہیں۔اس کے علاوہ یہاں ایک کھیل سخے(Skhai) بہت شوق سے کھیلا جاتا ہے۔اس میں ایک پاؤں موڑ کر ہاتھ میں پکڑ کر اچھل اچھل کر مقابلہ کیا جاتا ہے۔پختونوں میں کھیل کود تفریح بہت شوق سے کی جاتی ہے۔

بقول جی سی واکر ایسکوائر:

> ”یوسف زئی اور ہشت نگر میں سخے(Skhai) ایک کھیل بہت عام ہے ؛ اس میں بایاں پاؤں دائیں ہاتھ میں پکڑ کر ایک ٹانگ پر مقابل

کے سامنے اُچھلتے ہیں ؛ اور مقابلہ کیا جاتا ہے۔ مینڈھے اور بٹیر لڑانے
کی تفریحات کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"(187)

کالام قدرت کا حسین شاہکار ہے جو اپنے اندر حسین و دل کش وادیاں سمیٹے ہوئے چوٹیوں کے قریب بیہوں گاؤں ہے۔ بنٹر کا میدان و جنگل جہاں کالام سے اوشو جاتے ہوئے گھنے جنگلات میں لب سڑک بنٹر کا میدان ہے۔ جہاں بچے مختلف کھیل کھیلتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بچے درختوں پر رسیا ڈال کر جھولا جھولتے ہیں۔ یہاں بچے بھاگتے دوڑتے کھیلتے کودتے ہیں۔

فضل ربی راہی رقم طراز ہیں:

"یہاں گیارہ بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک سیاحوں کا ایک جم غفیر رہتا ہے۔ بچے مختلف کھیلوں سے محظوظ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ درختوں پر رسیاں ڈال کر جھولا جھولنے، گھنے درختوں میں چہل قدمی اور چھوٹے چھوٹے کیبنوں (Cabins) میں چائے اور دیگر اشیائے خوردونوش عجب لُطف و انبساط دیتی ہیں۔"(188)

کافرستان میں لوگ زیادہ تر تقریبات میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس کھیل کود کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ بالغ افراد برف میں پولو کھیلتے ہیں۔ یا تیر و کمان میں دل چسپی لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ برفانی ہاکی کھیلتے ہیں۔ ہاکی کے کھیل کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا ہے۔

بقول پرویش شاہین:

"کالاش لوگوں کا ایک ہی بڑا کھیل یعنی برفانی ہاکی ہے۔ موسم سرما میں تندرست و توانا کالاش لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ہاکی کے کھیل کے مقابلے کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا ہے۔"(189)

باسکٹ بال، والی بال اور ہاکی بھی زمانہ قدیم سے پشاور میں کھیلے جاتے ہیں۔ کبوتر بازی بھی ایک کھیل ہے۔ اسی طرح بٹیر بازی بھی ان علاقوں کا مشہور کھیل ہے۔ لوگ مقابلے بازی کرتے ہیں اور انعام و اکرام بھی طے کیے جاتے ہیں۔ یوں یہ کھیل شہرت رکھتے ہیں۔

بقول قاری جاوید اقبال:

"پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں اور شہروں میں کبوتر بازی کا مشغلہ بڑھتا رہا لیکن پشاور کی تہذیبی اور روایتی زندگی جس میں قدرے زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے۔یہاں کے لوگوں نے کبوتر بازی کو اپنی روایتی اور تہذیبی زندگی کا حصّہ بنا لیا ہے۔"(190)

تیر اندازی:

کافرستان کے لوگوں کا بین الاقوامی کھیل ہے۔ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔کافرستانی اس کھیل میں مشتاق نہ ہوں تو کون ہو۔کیوں تیر اندازی میں مہارت ان کی بقا ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"یہ ان کا قومی کھیل ہے اور انھیں اس بات کا یقین ہے کہ اگر کافرستانی تیر اندازی میں مشتاق نہ رہیں گے تو باہر کے لوگ انھیں ختم کر سکتے ہیں۔"(191)

بچے اخروٹوں سے کھیلتے ہیں۔لڑکے زمین میں چار انچ کے قریب گول سوراخ کر لیتے ہیں اور پھر دور جا کر سوراخ میں اخروٹ پھینکتے ہیں جو اندر چلا جاتا ہے۔اندر جانے والے اخروٹ پھینکنے والے کے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ لڑکیاں آنکھ مچولی بھی کھیلتی ہیں۔

خطرناک کھیل:

کافرستان اور چترال میں لڑکے ایک خاص قسم کا خطرناک کھیل کھیلتے ہیں۔کچھ لڑکے دور کھڑے ہو جاتے ہیں اور اچانک ایک لڑکا لپکتا ہے اور بے دھیان کھڑے لڑکے کو زور سے دھکا دے کر نیچے گرا دیتا ہے۔بعض اوقات پندرہ بیس فٹ کی بلندی سے نیچے گرا دیتا ہے اور گرنے والے کو سخت چوٹ آجاتی ہے ،خون بہہ رہا ہوتا ہے تب بھی کھیل میں شامل ہو جاتا ہے۔بعض اوقات اسی طرح موت بھی واقع ہو جاتی ہے لیکن ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ان کے لیے یہ صرف کھیل کا حصّہ ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"وہ لہولہان ہو جاتے ہیں لیکن بولتے نہیں ،نہ ہی آپس میں جھگڑتے ہیں۔بڑی خاموشی سے اپنے کھیل میں مصروف رہتے ہیں۔میں نے

پوچھا کبھی اس کھیل میں کوئی لڑکا مر تو نہیں جاتا۔استانلی نے مجھے بتایا
کبھی کبھی لڑکا مر جاتا ہے لیکن یہ کوئی بات نہیں۔"(192)

اس کے علاوہ ایک کھیل یہ کہ ایک نشان لگا دیا جاتا ہے او ر وہاں تنومند آدمی دور دور تک پتھر پھینکتے ہیں۔جس کا پتھر سب سے دور جاتا ہے وہ فاتح ہے۔اس کو کاندھے پر اُٹھا لیا جاتا ہے۔بستی کے تمام لوگ اس کھیل کو دیکھنے کے لیے اکھٹے ہوتے ہیں۔

چوگان کافرستان میں کھیلا جاتا ہے۔اس کے علاوہ یہ کھیل پشتونوں کے قبائلی علاقوں میں بھی کھیلا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ افغانوں کا ایک کھیل "بزکشی" ہے۔جس میں بکری کو مار کر میدان میں پھینک دیا جاتا ہے اور 50 گھڑ سوار ایک طرف اور 50 ایک طرف اس کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔جس کے ہاتھ لگ جائے وہ لے کر بھاگتے ہیں اور دوسرے گھڑ سوار ان سے چھیننے کے لیے پیچھے بھاگتے ہیں۔واپسی تک جس کے ہاتھ میں بکری رہتی ہے ،وہی فاتح کہلاتا ہے۔افغانستان میں بھی یہ کھیل مستعمل ہے۔یہ کھیل عموماً خاص موقعوں اور تہواروں جسے نوروز کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔یہ کھیل کیلاش اور پشتونوں کے قبائلی علاقوں میں عموماً کھیلے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ پولو بھی یہاں کا خاص کھیل ہے اور یہاں بڑے بڑے پولو گراؤنڈ ہیں۔

ماجد فرید ساٹی ان کھیلوں سے متعلق اپنے سفر نامے "مناظرِ پاکستان" میں رقم طراز ہیں :

"زیادہ تر یہاں کے لوگ افغان کھیل "بزکشی" کھیلتے ہیں۔جس کے معنی بکری کھینچنا ہے۔اس کھیل میں گھوڑے پر سوار کھلاڑی ایک مردہ بکری کو پورے میدان میں لے کر دوڑتا ہے اور پھر اسے بیچ میں بنے دائرہ میں ڈال دیتا ہے۔دوسرے کھلاڑی اس سے بکری چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔"(193)

پشاور کے روایتی اور ثقافتی کھیلوں میں گلی ڈنڈا ،چینجو ،توپ ڈنڈہ ، نو نماڑیں ،یاؤں گی ، آنہ چھپانڑی ، جمعرات آئی اے جی آئی اے جی کل آئی اے ، کبڈی اور کشتی مشہور کھیل ہیں۔جو مقابلوں کی صورت میں کھیلے جاتے ہیں۔ان میں سے بعض کھیلیں صرف بچوں سے متعلق ہیں جب کہ کشتی صرف بڑوں کا کھیل ہے۔روایتی کھیلوں کی جگہ موجودہ دور کے کرکٹ نے لے لی

ہے۔موجودہ کھیلوں میں فٹ بال اور کرکٹ ہیں۔ اس کے علاوہ کافرستان میں بچیاں مختلف کھیل کھیلتی ہیں۔ میوماؤ، تولک ،چوم چومونک گرین ،پٹک ، ھاؤزولی وغیرہ۔

میوماؤ:

بچیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کا ہاتھ کھینچتی ہیں۔ یہ کھیل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ایک فریق گر نہ جائے۔

تولک:

لڑکیاں جمع ہو جاتی ہیں ان میں سے جو پہلے پتھر کو ہاتھ لگائے گی وہ ملکہ بن جائے گی اور ایک فاصلے پر بنایا ہوا قلعہ اس ملکہ کا فرضی تھا۔ جو پہلے ہاتھ لگائے گا ، اس محل کو اس کی جنت ہوگئی۔

بقول پرویش شاہین:

> "نوغور ان کی زبان میں قلعے کو کہتے ہیں۔ دوسری لڑکیاں اب یہ کوشش کرتی ہیں۔ اسے ہاتھ لگائیں تا کہ اس کی یہ پوزیشن ختم ہو جائے گی لیکن وہ ملکہ ان سے بھاگتی ہے مگر بھاگتے وقت کوشش کرتی ہے کیوں کہ ہاتھ لگے سے اس کی برتری ختم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ لگائے بغیر قلعے تک پہنچ گئی تو اس کی برتری برقرار رہے گی۔"[194]

چُوم چومونک گرین:

لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر نہایت تیزی سے رگیں کھینچتی اور گانا گاتی ہیں۔

پٹک:

زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا "کوت" بنا لیتے ہیں اور باری باری اخروٹوں سے کھیلتے ہیں اور جب تک اخروٹ ختم نہ ہو جائیں کھیل چلتا رہتا ہے۔ جیتے ہوئے اخروٹ واپس نہیں کیے جاتے۔

ھاؤزولی:

بچے پتھر اور ٹیکری سے گول گول ٹکی بنا لیتے ہیں اور "کوت" یعنی گڑھا بنا کر کھیلتے ہیں۔ اس میں بھی ٹکیاں واپس نہیں کی جاتیں۔

xvii. تہوار و جشن:

صوبہ خیبر پختونخوا پاکستان کا ایک قدیم صوبہ ہے اور یہاں رہنے والے سب مسلمان ہیں۔ان کا تعلق مذہب اسلام سے ہونے کی وجہ سے ان کے تہوار بھی باقی ملک کے تمام صوبوں جیسے ہیں۔

چترال کافرستان خیبر پختونخوا کے حسین و دل فریب علاقے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک مُنفرد ثقافت سموئے ہوئے ہیں۔چترال کی ایک چوتھائی آبادی کا اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بہت سی منفرد رسومات سامنے آئیں۔اسی طرح کافرستان جہاں کافروں کی تعداد زیادہ ہے۔ان کے جشن و تہوار، رسومات ان کی منفرد ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔

جشن نوروز:

جشن نوروز بڑی شان سے منایا جاتا ہے۔لوگ کئی کئی دن اس کی تیاریاں کرتے ہیں۔گھروں کو صاف کر کے ہر چیز کو بڑے قرینے سے سجاتے ہیں۔چوگان بازی اور دوسرے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ناچ اور گانے کے مناظر دیکھنے کو آتے ہیں۔باشندوں کی طرف سفید ریش بزرگوں میں سے ایک کو سردار منتخب کر کے خلعت دی جاتی ہے اور پھر چند منتخب لوگ قلعے میں جاتے ہیں۔وہاں کئی جگہوں پر آگ روشن کر کے اس پر آٹا چھڑکا جاتا ہے۔پانی کو میدے میں گھول کر اس سے شہر میں ، دروازوں اور گھروں میں بیل بُوٹے بنائے جاتے ہیں۔یہ غالباً بہت قدیم رسوم ہیں اور اب تک چلی آ رہی ہیں۔نئے سال کے آغاز کی خوشی میں وہاں جی کھول کر مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔سفید ریش بزرگ ایک بلند کوٹھے پر کھڑا ہو کر کہتا ہے:

> ”سال بد چلا گیا خوشیوں سے بھرا ہوا نیا سال آگیا یہ اپنے ساتھ ہمارے لیے نئی مسرتیں لائے گا۔دُلھنوں کے لیے اچھے نوجوان اور اچھے نوجوانوں کے لیے دُلھنیں لائے گا۔اس سال غلہ بھی بڑی کثرت سے ہو گا۔“(195)

نوروز کی رات ہر گھر میں حلوا بنتا ہے اور پھر ایک دعوت عام ہوتی ہے۔جہاں سب مل کر اکھٹے بیٹھ کر حلوا کھاتے ہیں۔نوروز کے موقع پر چوگان اور دوسرے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

”چترال میں ابھی بھی نوروز کا جشن منایا جاتا ہے اور ریاست کے تما م لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں۔اپنے اپنے گھروں میں خوب صفائی کی جاتی ہے۔ہر چیز کو بڑے قرینے سے سجایا جاتا ہے۔دُنبے زبح کیے جاتے ہیں اور عید کے جشن کی طرح پوری آن بان سے یہ دن منایا جاتا ہے۔چوگان بازی اور دوسرے کھیل بھی ہوتے ہیں۔“(196)

اس موقع پر کالاش مرد اور عورتیں کچھ وقت کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور پھر واپس اکھٹے ہو جاتے ہیں۔جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے گہرے تعلقات کو نئے سرے اور نئے جوش وجذبے سے ایک مرتبہ پھر قائم کرلیا ہے۔اس موقع پر یہ جشن جستاکن (یا خستگان) کے اندر منایا جاتا ہے۔کیوں کہ ان دنوں کافرستان میں سخت سردی پڑتی ہے۔یہ وہی دن ہیں جب مہذب دُنیا بڑادن منارہی ہوتی ہے۔اسی طرح یہ جشن کافروں کی کیف ومستی کا سب سے بڑا دن ہے۔اس جشن میں مردم شماری ،بالغوں کا حساب اور شادیاں کرتے ہیں۔یہ جشن پانچ دن جاری رہتا ہے۔شراب کی ایک ایک بوتل لے کر جستگان کی طرف جاتے ہیں اور وہاں دیودار کی ٹہنیاں روشن کر کے ان کے گرد ناچتے ہیں اور عجیب وغریب گیت گاتے ہیں۔ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس طرح ان کی پلیدی دور ہو جاتی ہے۔رات بارہ بجے تک رقص کرتے ہیں۔اس کے بعد گھر وں کو جاتے ہیں۔اس رات پلاؤ ضرور کھاتے ہیں۔

محمود دانش ور ایرانی لکھتے ہیں:

”جس طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھو لوگ ہاتھوں میں مشعلیں لے کر پھر رہے ہیں۔وہ مقدس ہال میں جانے سے پہلے دیوداروں کی ٹہنیاں روشن کر لیتے ہیں اور جستگان میں ایک جگہ پر وہ جلتی ہوئی مشعلوں کو پھینک دیتے ہیں۔یہ مقدس فریضہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

جستگان میں جب لوگ پہنچتے ہیں تو اس وقت پورے جوش وخروش کے ساتھ وہ رقص شروع کر دیتے ہیں۔ان میں اس وقت اس قدر زیادہ جوش ہوتا ہے کہ ان کے مذہبی عقیدے کا پتہ چلتا ہے۔عورتیں ،مرد ، بوڑھے ،بچے سب اس جشن میں حصّہ لیتے ہیں۔“(197)

ستوبن:

ستوبن (Sastso) جاپانیوں کے نزدیک تاریخی اہمیت کے ساتھ اس کی حیثیت ایک مذہبی تہوار کی سی ہے۔ چناں چہ پورے جاپان کے گھروں اور مندروں میں منایا جاتا ہے۔ چترال اور کافرستان میں بھی اس کھیل کو رواج حاصل ہوا ہے۔

پور:

یہ کھیل کافرستان اور چترال میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ جشن انگور اور اخروٹ توڑنے کے موقع پر ہوتا ہے۔ یہ جشن ستمبر کے مہینے میں تین دن منایا جاتا ہے۔ پھل، پھول، مکھن، دودھ اور پنیر اکٹھا کیا جاتا ہے۔ بڑا جشن ہوتا ہے۔ خوب رقص ہوتا ہے اور خوشیاں منائی جاتی ہیں۔

بقول پرویش شاہین:

> "یہ جشن پھل اور خصوصاً انگور اور اخروٹ توڑنے کے وقت ہوتا ہے۔ جو ستمبر کے مہینے میں تین یوم تک جاری رہتا ہے۔ بڑا جشن منایا جاتا ہے اور خوب ناچتے اور خوشیاں مناتے ہیں اور اس موقع پر بوڑ الک کا استقبال کیا جاتا ہے اور اس کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے۔"(198)

پور کا میلہ 19 ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ اس میلے میں یہ لوگ خوب ناچتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔ یہ لوگ ناچ کے بہت شوقین ہیں۔ رقص ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ لوگ ناچ شراب کے شوقین ہیں۔ مہمان نوازی کے قائل ہیں۔ سارا سال ان کے ہاں تہوار جاری رہتے ہیں۔

کیلاشی خوش مزاج، مست لوگ ہیں۔ خوشی منانے کے لیے جشن، تہوار ان کی ثقافت کا حصہ ہیں۔

بقول ماجد فرید ساٹی:

> "ستمبر میں یہاں پور کا میلہ لگتا ہے جو تین دن تک جاری رہتا ہے۔ 19- ستمبر سے میلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس میلے میں یہ لوگ خوب ناچتے ہیں۔ یہ لوگ ناچ، شراب کے شوقین اور مہمان نوازی کے قائل ہیں۔"(199)

چترماس:

یہ جشن چاؤ موس بھی کہلاتا ہے۔یہ جشن نہایت احترام ،عقیدت اور سرگرمی سے منایا جاتا ہے۔یہ ان کا سب سے بڑا جشن ہے۔25دسمبر کو یہ جشن منایا جاتا ہے۔یہ جشن نئے سال کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔اس موقع پر صفائی کا خاص انتظام کیا جاتا ہے۔عبادت کی جاتی ہے۔قربانیاں دی جاتی ہیں۔ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارک باد دیتے ہیں۔آپس میں تحفے تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں۔نئے سال کے لیے دُعائیں کی جاتی ہیں۔رقص اور موسیقی کا اہتمام ہوتا ہے۔اسی موقع پر مذہبی راہ نما بٹیان آئندہ سال کے لیے پیشن گوئیاں کرتا ہے۔

سوات میں اس موقع پر کوئی جشن تو نہیں منایا جاتا لیکن دیواروں پر لکیریں کھینچ کر سورج ٹلنے کا دن معلوم کیا جاتا ہے۔جسے پشتو میں ''نور جاروتل'' سورج کا ٹلنا کہتے ہیں۔اس سے موسم کا آئندہ اندازہ اور اپنی کھیتی باڑی کے اوقات مقرر کرلیتے ہیں۔

پرویش شاہین اس جشن کے وقت کے بارے میں بتاتے ہوئے سفر نامے ''کافرستان'' میں لکھتے ہیں:

> ''جب سورج پہاڑوں کے اُوپر اس خاص مقام پر سے گزرتا ہے ، جسے بزرگوں اور ماہرین نے صدیوں کے تجربات کے پیشِ نظر اس بارے میں مقرر کیا ہوتا ہے تو اس جشن کا آغاز کیا جاتا ہے۔''[(200)]

قریہ کا تہوار /رسم :

قریہ کی یہ رسم ہے کہ جب کوئی نیا مہمان آتا ہے تو وہ اس کا استقبال ایسے کرتے ہیں جیسے کوئی تہوار منایا جارہا ہو۔طبل بجتے ہیں۔عورتیں اور مرد دو دو تین تین ہو کر اکٹھے ہونے لگتے ہیں۔چہروں پر مسرت ہوتی ہے۔جو بھی کافر مہمان کے نزدیک جاتا ہے ، تعظیم سے جھک جاتا ہے۔سب لوگ ایک چھوٹے سے میدان میں جمع ہو کر تین تین عورتیں باہم ٹولیاں بنا کر رقص کرتی ہیں۔ساتھ ساتھ گیت گاتی ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

"یہ تین تین ٹولیاں کافی دیر تک رقص کرتی رہیں۔اس کے بعد سب
نے مل کر ایک حلقہ بنالیا اور میرے اعزاز میں یہ ناچ ہوتا رہا کچھ
لوگ پہلے تو اس طرح آوازین نکالتے رہے گویا چوپایوں کو ہانک رہے
ہوں پھر اسی آہنگ میں اُنھوں نے گیت گانا شروع کر دیا۔رسم کوئی
ایک گھنٹہ تک باقی رہی اور میں نے بے حد لُطف محسوس کیا۔" (201)

سب سے بڑا تہوار "جوشی" ہے۔اس میں یہ لوگ خوب شراب پیتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔خوب رقص ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ عجیب وغریب آوازیں نکالتے ہیں۔ماجد فرید ساٹی سفر نامے "مناظرِپاکستان" میں کیلاشی تہواروں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سب سے بڑا تہوار "جوشی" مئی کے مہینے میں ہوتا ہے۔اس دوران
یہ لوگ خوب شراب پیتے ہیں اور مخصوص رقص کرتے ہیں جس میں
تین تین لڑکیاں ایک دوسرے کے شانوں پر ہاتھ رکھے دائرے کی
شکل میں گھومتی ہیں۔درمیان میں ایک شخص آہستہ آہستہ ڈھول بجاتا
ہے۔جس کی گونج پوری وادی میں پھیلتی ہے۔جوں جوں ڈھول کی
دھمک بڑھتی جاتی ہے۔رقص بھی تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ناچتے وقت یہ
لوگ منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکالتے ہیں۔"(202)

یوں تو سرخ کافر مسلمان ہوگئے ہیں مگر رسم ورواج ابھی بھی کافی حد تک سیاہ کافروں کی طرح ہیں۔ان کے کچھ رسوم تو ہندوؤں کے جیسے ہیں ۔جیسے ہولی ،دسہیرہ وغیرہ۔

جوشی :

یہ جشن موسم بہار میں مئی کے مہینے میں منایاجاتا ہے۔جب نئے پھول نکلتے ہیں۔پھولوں کے گل دَستے بنا کر تحفتاً دیئے جاتے ہیں۔ان دنوں پنیر اور دودھ تقسیم کیاجاتا ہے۔بکریوں کو ذبح کرکے مل جل کر کھاتے پیتے جشن مناتے ہیں۔

اس جشن کے متعلق پرویش شاہین لکھتے ہیں :

"وہ جشن ہے جو موسمِ بہار میں منایاجاتا ہے جو مئی کے مہینے میں تین
دنوں تک جاری رہتا ہے۔مرغزاروں ، پہاڑوں اور کہساروں سے

پھول چُن چُن کر جمع کیے جاتے ہیں اور ان کے ہار اور گُل دستے بنا لیتے ہیں۔"(203)

مئی کا مہینہ یہ موسم بہار کا خوش گوار موسم ہے، جس میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔لگتا ہے زندگی ہر شے میں دوڑ رہی ہے۔پُر رونق ماحول نظر آتا ہے۔سردی کے بعد بہار کی رنگینی طبیعت کو بھی رنگین کر دیتی ہے۔

محمود دانش ور ایرانی اپنے سفر نامے "کافرستان" میں لکھتے ہیں :

"یہ لوگ بہت سے جشن مناتے ہیں۔ایک جشن مئی کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔کیوں کہ ان دنوں درختوں میں شگوفے پھوٹتے ہیں۔"(204)

اوچل:

جب گندم کی کٹائی کی جاتی ہے۔تب یہ تہوار منایا جاتا ہے۔کٹائی کے دوران رقص اور گانے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔کٹائی شروع کرنے سے پہلے قربانی دی جاتی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"اوچل" اور "پول" دونوں اگست کے مہینے میں منائے جاتے ہیں۔"(205)

xviii. میلے اور تہوار:

میلے ٹھیلے ، تہوارات ثقافت کا حصّہ ہیں۔کسی علاقے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں یہ عناصر معاون ثابت ہوتے ہیں۔

میلہ بری سرکار کا:

حضرت عبدالطیف بریؒ کے سالانہ عرس کو پشاور کے لوگ نہایت جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں۔اگرچہ یہ اسلام آباد کے قصبے نور پور شاہاں میں بری امام کے مزار پر عرس کے دنوں میں میلہ لگتا ہے۔مگر یہ پشاور یوں کے دم خم سے آباد ہے۔پشاور میں جہاں گور گٹھڑی کے عقب میں بری سرکار نے چلہ کاٹا تھا۔عرس مبارک سے ہفتہ پہلے یہاں سے پشاور کے عقدیت مند ڈالی نکالتے ہیں۔یہ ڈالی شہر کے بڑے بڑے بازاروں سے گزاری جاتی ہے۔ڈھولک بجاتے ، قوالیاں کرتے

بازاروں سے گزرتے ہیں۔بری امام کے نعرے لگتے ہیں۔یہ بہت بڑا جلوس ہوتا ہے اور یہیں سے یہ ڈالی بری سرکار کے مزار کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال :

> "پشاور کے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ علاوہ ملنگ اور فقیر لوگوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے ، جنھیں عرفِ عام میں بری امام کے فقیر کہا جاتا ہے۔یہ روایت سال ہا سال سے قائم ہے جو آج تک جاری و ساری ہے۔حضرت بری امام کا یہ میلہ دراصل پشاوریوں کے جوش و خروش سے وابستہ ہے۔جس کی ابتدا پشاور ہی سے ہوتی ہے۔اس لیے اسے بھی پشاوریوں کے میلے سے منسوب کیا جاتا ہے۔"(206)

عیدین:

عیدالفطر اور عید الضحیٰ دونوں مواقع پر مذہبی تہوار پشاور کے لوگ بڑی گرم جوشی کے ساتھ مناتے ہیں۔عید الفطر کا تہوار رمضان کے مہینے کے بعد شوال کی پہلی تاریخ سے تین روز تک جاری رہتا ہے۔جب کہ عید الضحیٰ کا تہوار ذوالحج کی دس تاریخ کو شروع ہوتا ہے اور تین دن تک مسلسل میلا لگا رہتا ہے۔پشاور کے لوگ عید قربان پر قربانی کا گوشت مساکین و غربا کے علاوہ رشتے داروں کے ہاں ضرور بھجواتے ہیں ،چاہے یہ رشتہ دار کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں۔

ساکھی اور بسنت:

بنیادی طور پر یہ تہوار ہندوؤں کا ہے جو تقسیم قبل یہاں بھی رائج تھا۔بسنت کے نام سے پتنگ بازی کا شوق اب بھی باقی ہے۔مگر یہ معمولی نوعیت کا ہے۔اصل بسنت تو پنجاب میں منائی جاتی ہے۔

کرسمس:

ملک کے دوسرے حصّوں کی طرح پشاور میں بھی یہ رسم دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے اس دن عبادت گاہ گرجا گھروں کو خوب سجایا جاتا ہے۔رات گئے

تک عبادت کی جاتی ہے۔عیسائی آبادیوں میں میلہ لگتا ہے۔عید کی طرح جشن منایا جاتا ہے۔یہ اصل میں عیسائیوں کی عید کا دن ہے۔

ایسٹر:

عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ ؑ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی یاد میں عیسائی یہ تہوار مناتے ہیں۔گرجا گھروں میں عبادت کرتے ہیں۔خدا کے حضور نذرانے پیش کرتے ہیں۔کھانے بناتے ہیں اور ڈرامے (تمثیل) پیش کرتے ہیں۔پشاور کے مختلف مقامات پر عیسائی یہ دن مناتے ہیں۔

شیخ پنجو کا میلہ:

عیدالفطر کے چوتھے روز جی ٹی روڑ کے پاس اکبر پوری گاؤں میں حضرت شیخ پنجو کے مزار پر یہ میلہ لگتا ہے۔لوگ ٹولیوں کی شکل میں اس مقام تک پہنچ کر مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

چمکنی کا میلہ:

عید الفطر کے تیسرے روز پشاور سے کچھ کلومیٹر فاصلے پر جی ٹی روڑ کے پاس مزار میاں عمر کے پاس چمکنی گاؤں میں یہ میلہ لگتا ہے۔جہاں دُکانیں سجتی ہیں اور میلے کا سماں ہوتا ہے۔لوگ چمکنی پہنچ کر مزار حضرت میاں عمر پر حاضری دیتے ہیں۔

ان اہم تہوارں اور میلوں کے علاوہ بھی اہلیان پشاور ، پشاور اور مضافات میں بزرگوں کے مزاروں پر منعقد ہونے والے میلوں اور عرسوں میں بڑی گرم جوشی دکھاتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔

xix. کافرستان کی عجیب وغریب رسمیں :

نسل کشی سے متعلق رسم:

کافروں میں ایک خاص رسم بھی موجود ہے اور یہ صرف بریر میں ہوتی ہے۔اس جشن کو نسل کشی کہتے ہیں۔اس جشن کے لیے اگست یا ستمبر کا موسم اچھا خیال کیا جاتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ جب اس موسم میں نسل کشی کا آغاز ہو گا تو بچے مئی جون میں پیدا ہوں گے گرمی نہیں ہو گی۔ پھل ،

پھول وافر مقدار میں ہوں گے۔اس لیے بچے کی اچھی پرورش ہوسکے گی۔یہ رسم بہت مدت سے چلی آرہی ہے۔یہ لوگ زیادہ امیر نہیں ہیں۔ان کے پاس جو بھی کچھ ہے۔اس سے وہ مطمئن ہیں۔اچھی اور مقوی غذا بھی انھیں نہیں مل سکتی۔اس لیے مضبوط انسان سے نسل کشی میں کوئی قباحت نہیں ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ رسم یونان قدیم میں موجود تھی ،وہاں ایک بہت مضبوط انسان کے ذریعے نسل کشی کی جاتی تھی۔یہ لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ وہ مقوی غذا حاصل نہیں کرسکتے۔ان کی خواہش ہے کہ ان کی اولاد بڑی مضبوط اور اعلیٰ قسم کی ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک انھیں اچھی غذا نہ ملے۔چناں چہ وہ اس جشن کو منانے کے لیے ایک مضبوط ترین انسان کی پرورش کرتے ہیں۔عموماً تاکہ حیوانوں اور انسانوں کی اولاد بڑی طاقت ور اور مضبوط ہو۔کیوں کہ انہی دو جنسوں پر قومی زندگی کا انحصار ہے۔دو تین سانڈ پالے جاتے ہیں۔انھیں اچھی خوراک دی جاتی ہے۔ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔صرف حیوانوں کی نسل کشی کے لیے ان کی پرورش کی جاتی ہے۔جس کا سانڈ ہو وہ ان کے پیسے وصول کرتا ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> ”کافرستان کا علاقہ ایسا ہے کہ یہاں ابھی تک انسانوں میں نسل کشی کی رسم باقی ہے۔میں نے قدیم آریاؤں کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ ان کے ہاں اس قسم کی ایک مذہبی رسم تھی۔جس میں اس اَمر کی اجازت ہے کہ عورت صحت مند اور اعلیٰ نسل کے لیے غیر مرد سے مضبوط بچے حاصل کرے۔“(207)

مسلمانوں کو ہلاک کرنے کی رسم :

سرخ کافروں میں یہ رسم تھی کہ وہ مسلمانوں کو ہلاک کردیتے تھے۔اب جب سے وہ مسلمان ہوئے ہیں۔یہ رسم اب تقریباً متروک ہوگئی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> ”میں نے سیاہ کافروں سے یہ سن رکھا تھا کہ سرخ کافر مسلمانوں کو مارنا پیٹنا ،اپنا مذہب خیال کرتے ہیں۔چناں چہ میں نے اس کے متلق سفید ریش بزرگ سے استفسار کیا۔اس نے جواب دیا : ”ہاں ایک وقت

تھا کہ ہمارے لیے ضروری تھا کہ ہم میں سے ہر ایک شخص کم از کم
ایک مسلمان کو ضرور قتل کرے۔"(208)

جب سے یہاں کے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ، یہ رسم چھوڑ دی گئی ہے۔جب کوئی شخص مسلمان کو قتل کرکے آتا تھا ،ہم رقص کرتے تھے ،خوشی مناتے تھے۔جس شخص نے مسلمان کو قتل نہ کیا ہو ،اس کو رقص کی محفل میں رقص کرنے کی اجازت نہیں تھی۔اگر ایک کافر نے ایک سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کیا ہو تو ہم اس کی بہت عزت اور احترام کیا کرتے تھے۔اس کے گھر پر ایک جھنڈا نصب کیا جاتا تھا اور اس کے سر پر ایک سرخ رنگ کی اُون کی ٹوپی پہنائی جاتی تھی۔

بکری کا سینگھ مقدس چیز:

کیلاش کے لوگ بکری کے سینگھوں کو بہت معتبر اور مقدس چیز سمجھتے ہیں۔ان کے گھر کے ہر کمرے میں ایک سینگھ لٹک رہا ہوتا ہے۔وہ سنگھ کو بہت مقدس چیز سمجھتے ہیں۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"ان کے ہر کمرے میں بکری کا ایک سینگھ آویزاں ہوتا ہے۔اس کو
یہ مقدس چیز سمجھتے ہیں۔کیوں کہ ان کے نزدیک وہ سینگھ ملوش کا
نمائندہ ہے۔"(209)

ملوش ان کا دیوتا ہے۔سینگھ لٹکانے سے انھیں یہ تسلی ہے کہ اپنے نمائندے کی صورت میں ملوش دیوتا کا ان پر سایہ ہے۔

درخت نہ کاٹنے کا رواج:

یہ لوگ قبرستان میں درخت کاٹنے نہیں دیتے کیوں کہ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ ان درختوں پر بعض روحیں رہتی ہیں۔درخت کاٹنے سے انھیں تکلیف نہ ہو جائے۔اس ڈر سے درختوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔کبھی ایک ٹہنی تک نہیں توڑتے۔بعض درخت بوڑھے ہو کر خود ہی سوکھ جاتے ہیں۔

محمود دانش ور ایرانی "کافرستان" میں کافروں کے رسوم و رواج کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان لوگوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ وہ قبرستان میں کوئی درخت نہیں کاٹتے۔ان کا خیال ہے کہ بعض روحیں ان درختوں میں رہتی ہیں۔اگر ان درختوں کوکاٹ دیاگیاتوروحوں کوبہت زیادہ تکلیف ہوگی۔“(210)

کافرستان میں مرغ حرام ہے:

کافرستان میں مرغ حرام ہے۔نہ وہ اسے پالتے ہیں ،نہ کھاتے ہیں۔کیوں کہ ان کے دیوتا کی شکل مرغ سے ملتی ہے۔ملوش دیوتا مرغ کی شکل کا ہے۔

محمود دانش ور ایرانی لکھتے ہیں:

”ہم مرغ نہ ہی کھاتے ہیں ،نہ پالتے ہیں۔ہمارے مذہب میں مرغ بالکل حرام ہے۔“(211)

ساہ کافر مرغ سے پرہیز کرتے ہیں البتہ سرخ کافر جو مسلمان ہوچکے ہیں وہ پھر بھی مرغ کھانے لگے ہیں۔

حرام کھاتے ہیں:

یہ لوگ گائے ، بھینس ، بکری ،بھیڑ بہت شوق سے مزے لے کر کھاتے ہیں۔یہاں تک کہ مردار بھی کھالیتے ہیں۔مگر یہاں سب کچھ حلال کیے بغیر کھاتے ہیں۔وہاں حلال کرنے کی رسم نہیں ہے۔

تیراکی مذہب کاحصّہ:

تیراکی میں بہت زیادہ ماہر ہیں۔یہ کافر تیز دھارے والی ندی میں بالکل ننگے نہاتے ہیں۔ان ندیوں کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہوتا ہے۔کئی کئی گھنٹے ندیوں میں تیرتے رہتے ہیں۔تیرنا ان کے مذہب کاایک جزوہے۔

رقص:

رقص ان کا مقدس فرض ہے۔اس لیے اُنھوں نے اپنی زندگی کے ہر شعبے میں رقص کوشامل کر رکھا ہے۔موت ہویاشادی ، پیدائش ہویاکوئی اور موقع وہ رقص کے لیے جواز پیدا کرلیتے ہیں۔

سرخ کافر اگرچہ مسلمان ہوگئے ہیں۔افغانستان کی سرحد پر یہ لوگ نورستان کے باڈر پر ہیں ، وہ مسلمان قبائل ہیں۔ان کی صحبت کے اثر نے انھیں مسلما ن ضرور کیاہے مگر آج بھی ان کی کچھ رسمیں سیاہ کافروں سے ملتی ہیں۔

ہندوؤں سے مشابہت:

یہاں کے کافروں کے طور طریقے اور رسوم ہندوؤں سے مشابہہ ہیں۔جیسے ہولی ، دسہرہ وغیرہ۔

قربانی:

یہ لوگ مینڈھوں کی کئی موقعوں پر قربانی کیا کرتے تھے۔اس رسم کا اسلامی شعائر سے کوئی تعلق نہیں۔مینڈھوں کو اسلامی طریقے سے ذبح نہیں کیا جاتا تھا بلکہ چھری گردن میں چبھو کر ایک طرف چلائی جاتی تھی۔

بشالینی:

کافرستان میں ایک عجیب سی رسم ہے کہ عورتیں ایام زچگی اور دورانِ حیض ایک الگ مکان میں گزارتی ہیں۔بشالینی میں قیام کے دوران بیمار خاتون کے رشتے دار خواتین ان کے لیے سبزیاں ، گوشت اور آٹا وغیرہ پہنچاتی ہیں۔جہاں وہ خود اپنے لیے کھانا بناتی ہیں۔بشالینی سے باہر نکلنے پر سخت پابندی ہوتی ہے اور کوئی مرد غلطی سے بھی ادھر سے نہیں گزرتا کیوں کہ اس جگہ کوناپاک تصور کیا جاتا ہے۔اگر کوئی غلطی سے وہاں سے گزر جائے تو اپنے آپ کو پاک کرنے کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے۔

بقول ماجد فرید ساٹی :

> "بشالینی عورتوں کے لیے مخصوص کی گئی اس جگہ کا نام ہے ، جہاں
> عورتیں ایامِ زچگی کے دوران قیام کرتی ہیں۔"(212)

ایامِ زچگی اور دورانِ ماہواری عورتیں گھر سے دور ایک الگ مقام پر رہتی ہیں۔ان ایام میں وہ عورت کو ناپاک تصور کرتے ہیں اور پھر گھر سے دور ایک جگہ بنالیتے ہیں اور یہ عورتیں اپنے ایام وہیں گزارتی ہیں اور پھر وہ یہ دن گزار کر گھر جاتی ہیں۔اس جگہ کو بشالینی کہتے ہیں۔

پرویش شاہین لکھتے ہیں :

"ایامِ زچگی اور دورانِ ماہواری گھر میں نہیں رہ سکتی بلکہ بشالینی میں جاکر یہ ایام گزارے گی۔"(213)

اگران ایام میں عورت کا کسی مرد سے سامنا ہو جائے تو یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ پھر دیوتا کو نذر چڑھانا پڑتا ہے۔اس لیے بشالینی ایسی جگہ پر بنائی جاتی ہے ، جہاں کسی کا گزر بسر نہ ہو۔ تھوڑا الگ کر کے یہ ٹھکانا بنایا جاتا ہے۔ جو ذرا گھروں سے دور ہو اور اِدھر جانے کی سختی سے پابندی ہے۔اگر کوئی آدمی ادھر سے گزر بھی جائے یا اس کی بشالینی میں موجود عورت پر نظر پڑ جائے تو پھر دیوتا کے آگے قربانی دینی پڑتی ہے۔اس لیے لوگ بشالینی سے دور رہتے ہیں۔بشالینی کے اندر زچہ اپنی مخصوص جگہ جو دروازہ کے بائیں طرف ہوتی ہے ، لیٹتی ہے۔جب کہ ماہواری والی پچھلے حصّے میں دروازہ کی طرف منہ کر کے آگ کے قریب جو کہ وہاں جلائی جاتی ہے ، بیٹھتی ہے۔بشالینی کے اندر کوئی چیز چارپائی یا کرسی وغیرہ نہیں ہوتی صرف زمین پر ہی گھاس پھوس بچھی ہوئی ہوتی ہے۔پتھروں کا بنا چولہا ہوتا ہے جب کہ اوڑھنے کے لیے بھی کوئی خاص چیز نہیں ہوتی۔

XX. پیدائش کی رسومات:

پٹھان رسوم ورواج میں قبائلی روایات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور رواج کی پابندی لازمی خیال کی جاتی ہے۔ملک کے دوسرے حصّوں کی طرح تعلیم یافتہ طبقہ مہذب اور شائستہ ہے۔لیکن ان پڑھ طبقہ انتہائی قدامت پسند ہے یہ عورت کو ہسپتال لے جانا تک معیوب سمجھتے ہیں۔بعض تو اتنے کٹر قبائل ہیں کہ اگر زچہ بیمار ہو تو تب بھی اس کو ہسپتال نہیں لے کے جاتے۔

بچے کی پیدائش

کافرستان میں تو یہ ماحول ہے کہ جب عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو اسے تنہا نہیں چھوڑتے کیوں کہ ان کا ماننا یہ ہے کہ اگر عورت کو تنہا چھوڑا تو "آل" چمٹ جائے گا۔ایران میں بھی ایسی ہی رسمیں ہیں۔البتہ جب بچہ پیدا ہونے کا وقت آتا ہے تو اسے باشلنی یا بشالینی بھیج دیتے ہیں۔وہاں دو تین عورتیں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہیں اور اس کا خیال رکھتی ہیں۔زرتشتیوں میں بھی یہ رسوم پائی جاتی

ہیں۔بچے کی پیدائش کے بعد 12دن زچہ باشلنی میں رہتی ہے۔اس دوران عورت کی خوراک کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

محمود دانش ور ایرانی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

”اگر حاملہ عورت کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو آل چمٹ جائے گا۔ایران میں آل جن یا سایہ کے مترادف ہوتا ہے۔کافر لوگ بھی اپنی عورتوں کو تنہا نہیں چھوڑتے البتہ جب بچہ جننے کا وقت قریب آتا ہے تو اس وقت اسے باشلنی بھیج دیا جاتا ہے۔“[214]

دیہاتوں میں دائیاں زچگی کا کام کرتی ہیں۔یہ عموماً ڈومن یا نائن ہوتی ہیں۔دائیاں ہی اس کام کو عموماً انجام دیتی ہیں۔شہروں میں اس عمل کا رجحان قدرے کم ہے۔البتہ دائیاں اور نائن ہی زچگی کا کام کرتی ہیں اور بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔

بقول شاہد حسن رزاقی:

”یہ دائیاں ہوشیار اور تجربہ کار ہوتی ہیں۔زچگی کے وقت دایہ کے علاوہ بعض رشتہ دار عورتیں بھی زچہ کے پاس رہتی ہیں۔“[215]

ہرمل جلانا:

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو خشک کی ہوئی ہرمل جلائی جاتی ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جڑی بوٹی کی بدبو سے بدروحیں بھاگتی ہیں۔

اذان دینا :

پاکستان کے تمام صوبوں میں مسلمان ہونے کے ناطے پہلی آواز اذان کی پہنچائی جاتی ہے۔اس مقصد کے لیے گاؤں کا ملا بچے کا باپ یا دادا کا کوئی عزیز رشتہ دار اذان دینے کے فرائض انجام دیتا ہے۔

بقول شاہد حسن رزاقی :

”بچہ پیدا ہوتے ہی گاؤں کا ملا بلایا جاتا ہے جو اس کے کان میں اذان دیتا ہے۔ملا کو روپے اور مٹھائی دیتے ہیں۔“[216]

اس کے بعد بچے کی دادی یا کوئی اور بزرگ عورت بچے کو شہد چٹاتی ہیں یا گھٹی پلاتی ہے۔

برف پر لٹانا:

بعض قبائل میں یہ رواج ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کو برف پر لٹا دیتے ہیں تا کہ وہ بچپن سے مضبوط ہو اور مشکلات سے نبٹ سکے۔اس نظریے کے تحت وہ بچے کو ٹریننگ دیتے ہیں۔

شاہد حسن رزاقی لکھتے ہیں:

> "بعض قبائل میں یہ رواج ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کو برف پر لٹا دیتے ہیں۔ان لوگوں کا خیال ہے کہ بچے کی پرورش اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ سختیاں برداشت کرنے اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنے کی طاقت پیدا کر سکے۔"(217)

لڑکے اور لڑکی میں امتیاز:

کافرستان میں لوگ لڑکا پیدا ہونے کا جشن مناتے ہیں اور لڑکی پیدا ہو تو کسی قسم کا رواج نہیں ہے۔لڑکے کے پیدا ہونے پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ایک دو دُنبے ذبح کرتے ہیں۔لوگ شراب پیتے ہیں ،رقص کرتے ہیں۔لڑکی پیدا ہو تو ہر طرف خاموشی ہوتی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> "اگر لڑکا پیدا ہو تو اس وقت گھر والے خوشیاں مناتے ہیں۔ایک دو دُنبے ذبح کیے جاتے ہیں۔لوگ پھر چشتگان میں جاتے ہیں۔شراب پیتے ہیں ،رقص کی محفل سجاتے ہیں اور اگر لڑکی پیدا ہو تو اس قسم کا جشن نہیں منایا جاتا۔"(218)

زمانہ قدیم سے لڑکے کی پیدائش کو معتبر اور خوش نصیبی سمجھا جاتا رہا ہے۔لڑکے کی پیدائش پر خوش قسمت ماں کی سہیلیوں میں بہت خوشی اور جشن منایا جاتا ہے۔ماں خود اس جشن میں (چالیس دن) پورا ہونے تک حصّہ نہیں لے سکتی۔اسے بالکل الگ رکھا جاتا ہے۔غسل کے بعد وہ روز مرہ زندگی کے معاملات سے جڑ پاتی ہے۔لڑکی کی پیدائش کو بد نصیبی سمجھا جاتا ہے۔پٹھان معاشرے میں عورت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

بقول جی سی واکر ،ایسکوائر:

"بیٹے کی پیدائش خوش قسمتی ماں کی سہیلیوں میں بہت خوشی اور جشن کا موقعہ ہوتا ہے تاہم وہ خود تطہیر کا چلہ (چالیس دن) پورا ہونے تک اس جشن میں خود حصّہ نہیں لیتی کیوں کہ اسے بالکل الگ تھلگ رہنا پڑتا ہے۔سہیلیاں اس کا خیال رکھتی ہیں اور غسل کرنے تک نہایت لغو توہماتی رسوم سے گزارتی ہیں۔ غسل کے بعد وہ دوبارہ معاشرے کا جزو بن جاتی ہے۔"(219)

چالیس دن جسے "چھلہ" کہا جاتا ہے اس کے بعد عورت نہا کر پاک صاف ہو جاتی اور معمولات زندگی کی طرف آجاتی ہے۔آخری دعوت ہوتی ہے۔کہیں ختنے سے پہلے اور کہیں اس کے بعد جب مہمان کھانا کھا چکتے ہیں تو مٹی کا ایک برتن رکھا جاتا ہے۔اور سب لوگ حسبِ حیثیت اس میں روپے ڈالتے ہیں۔دینے والوں کی ایک فہرست بنائی جاتی ہے اور مناسب موقع پر اس کا بدلہ دیا جاتا ہے۔

عجیب وغریب رسم:

کافرستان میں یہ رواج ہے کہ اگر کوئی اجنبی سیر وسیاحت کے لیے آئے اور عورت کے ساتھ مراسم بنا لے تو کافر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس عورت کو صرف تنبیہ کر دی جاتی ہے کہ جب بچہ پیدا ہو گا تو اس کو دریامیں پھینک دیا جائے گا۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

"اگر کسی اجنبی شخص کا ادھر سے گزر ہو ااور وہ جنگلی پھول کو جاتے جاتے چن لے تو پھر کافر مجبور ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ شخص صرف سیر وسیاحت یا چند روز کے لیے آیا تھا۔اس صورت میں اس عورت کو صرف تنبیہ کر دی جاتی ہے اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو قریہ کے کچھ لوگ مل کر اس بچے کو دریا میں پھینک دیتے ہیں۔"(220)

بچے کا نام رکھنا:

یہ کافر بچے کا ختنہ نہیں کرتے۔ تین سال کا جب بچہ ہوتا ہے تو دھوم دھام سے یہ دن مناتے ہیں۔ بچے کا نام رکھتے ہیں ، جشن مناتے ہیں۔ بچوں کے نام اکثر جانوروں کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔ کیوں کہ جانور ان کے لیے بہت اہم ہیں۔

محمود دانش ور ایرانی اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

> "یہ لوگ بچوں کا ختنہ نہیں کرتے اور جب بچہ تین برس کا ہو جاتا ہے تو اس وقت ایک جشن مناتے ہیں اور اور اس جشن میں بچے کا نام رکھتے ہیں۔"(221)

کافروں کا رواج :

بچہ پیدا ہونے پر عورت چہرے کو سیاہ کر لیتی ہے۔ کاجل کی طرح ایک سیاہی ہوتی ہے۔ یہ عورتیں اپنے چہرے اور گالوں پر مل لیتی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بچہ ہوا ہے وہ اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کے سنگھار سے کرتی ہیں۔

پٹھانوں اور بلوچوں میں لڑکی، کی قیمت وصول کرنے کا رواج ہے اور ان کے لیے لڑکی ایک معاشی بوجھ نہیں ہوتی لیکن وہ لڑکی کی پیدائش کو بد نصیبی تصور کرتے ہیں اور اس کی پیدائش پر کوئی مبارک باد بھی نہیں دیتا نہ ہی کوئی جشن ہوتا ہے نہ ہی کوئی خوشی منائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس لڑکے کی پیدائش کو بہت دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ ہوائی فائرنگ کرتے ہیں۔ ڈھول بجتے ہیں ، مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ زچہ کی سہیلیاں مبارک باد دینے آتی ہیں اور ان کی خوب خاطر مدارت ہوتی ہے۔

بقول شاہد حسن رزاقی :

> "عزیز اور دوست مبارک باد دینے آتے ہیں۔ گاؤں بھر کے لڑکے اور نوجوان اپنی بندوقیں لے کر جمع ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں بندوقیں چلاتے ہیں۔ گانے والے ڈھول بجا کر خوب گاتے ہیں۔ سب لوگوں میں مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔"(222)

چلہ:

بچے کی پیدائش کے چالیس دن بعد چلہ ہوتا ہے۔چلے تک زچہ باہر نہیں جاسکتی۔عورتیں اس کا خیال کرتی ہیں۔پانچویں یاساتویں دن سے گھر کے کام کرنے لگتی ہیں۔لیکن گھر سے باہر نہیں جاتیں۔چالیس دن کے بعد چلہ نہاکر وہ گھرسے باہر جاسکتی ہے۔

عقیقہ اور ختنہ :

بچے کی پہلی تقریب عقیقہ یاسر مونڈنا ہے۔جس کو سر قعلی کہتے ہیں۔رشتہ دار اور دوست احباب آتے ہیں۔بچے کا سر مونڈا جاتا ہے۔حجام کو انعام دیاجاتا ہے اور مہمانوں کی دعوت ہوتی ہے۔بچے کے بال محفوظ کرکے رکھ لیے جاتے ہیں۔پختونستان میں ختنہ جس کو سنت کہتے ہیں یہ بہت اہم رسم ادا کی جاتی ہے۔عموماً یہ تقریب بچے کی آٹھ سال کی عمر میں منائی جاتی ہے۔یہ رسم کئی دن تک منائی جاتی ہے۔گانا بجانا ہوتا ہے ،دعوتیں ہوتی ہیں اورلوگ خوشی مناتے ہیں۔نائی ختنہ کرتاہے اوراس تقریب میں شامل لوگ کھانا کھانے کے بعد حسبِ حیثیت روپے دیتے ہیں۔بعض جگہ یہ رواج ہے کہ اس تقریب کے اخراجات کے لیے مہمان روپے دیتے ہیں۔

بقول جی سی واکر،اسکوائر:

> ”عمر کے تقریباً آٹھویں سال میں لڑکے کے ختنے کرنے کے ذریعے باقاعدہ اسلامی معاشرے کارکن بنایا جاتاہے۔اس تقریب میں کئی روز تک گانا بجانا اور ضیافت ہوتی ہے۔حتمی کھانے کے بعد مہمان اپنی استطاعت کے مطابق رقم دیتے ہیں تاکہ تفریح کے اخراجات اداہو سکیں۔“(223)

پٹھانوں میں آٹھ سال کی عمر میں ختنے کی رسم باقاعدہ اسلامی طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔پھر اسے اسلامی معاشرے کا رکن بناکر نماز اور اسلامی عقائد سکھائے جاتے ہیں۔باقاعدہ تقریب منائی جاتی ہے۔یوں یہ بچہ اسلامی معاشرے کاحصّہ بن جاتاہے۔

xxi. تدفین کی رسومات :

پٹھانون میں بھی رسومات تدفین اسلامی اُصولوں کے مطابق ہے۔خاندان میں کوئی موت ہوجائے تو عورتیں اس سوگ کو خصوصی فریضہ سمجھ کر مناتی ہیں۔مردے کوصحن میں چارپائی پر لٹاکر

عورتیں اس کے ارد گرد جمع ہو کر بین کرتی ہیں۔اونچی آواز سے روتی جاتی ہیں۔ہائے ہائے کرتی ہیں اور پاؤں زمین پر پٹختی ہیں۔باقی عورتیں بھی ان کی دیکھا دیکھی یہی عمل دہراتی ہیں۔دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پیٹتی ہیں۔یہاں تک کہ ان کے چہرے پیٹ پیٹ کر سوج جاتے ہیں۔بال ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔بین کرنے والی عورتیں نڈھال ہو جاتی ہیں۔گریہ ختم ہونے پر عورتیں وہاں سے چلی جاتی ہیں۔مردے کو باضابطہ طریقے سے غسل دے کر کفن پہنایا جاتا ہے جو دو حصوں پر مشتمل چادر ہوتی ہے۔ایک چادر لاش کے گرد لپٹتے ہیں اور دوسری سر سے لے کر پاؤں تک آگے اور پیچھے پھیلا دیتے ہیں۔مردے کو چارپائی پر لیٹا کر چادر سے ڈھک کر قبرستان لے جاتے ہیں۔جنازہ قبر کے قریب رکھ کر لواحقین اور لوگ جو جنازے کے ساتھ آئے تھے۔مشرق میں کھڑے ہو کر مغرب کی طرف رخ کر کے صفیں باندھ لیتے ہیں۔ملا چند قدم آگے بڑھ کر اُونچی آواز میں جنازہ پڑھاتا ہے اور مجمع اس کی پیروی کرتا ہے۔نماز مکمل کر کے مردے کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے۔جس کا رخ شمالاً جنوباً ہوتا ہے اور پھر لحد میں مغرب کی طرف منہ کر کے لٹا دیا جاتا ہے۔قبر اس طرح بنائی جاتی ہے کہ مردہ اُٹھ کر بیٹھ سکے اور اپنی زندگی کا حساب کتاب دے سکے۔

بقول جی سی واکر ،ایسکوائر:

> ”جنازہ قبر کے قریب رکھ کر مجمع اس کے مشرق میں کھڑے ہو کر مغرب کی طرف رخ کر کے صفیں باندھ لیتا ہے۔تب ملا چند قدم آگے بڑھتا اور اُونچی آواز میں نماز جنازہ پڑھاتا ہے اور پھر مجمع اس کے پیچھے پیچھے پڑھتا جاتا ہے۔نماز جنازہ مکمل ہونے پر مردے کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے۔جس کا رخ شمالاً جنوباً ہو تا ہے اور پھر لحد میں مغرب کی طرف منہ کر کے لٹا دیا جاتا ہے۔“(224)

قبریں اتنی بڑی بنائی جاتی ہیں کہ مردہ اُٹھ کر بیٹھ سکے اور منکر اور نکیر کے سوالوں کے جواب دے سکے۔قبروں پر پھول لگانے کا رواج ہے۔مردے کو دفنانے کے بعد خیرات تقسیم کرنے کا بھی رواج ہے۔جو ملا او رنہلانے والے کو عموماً دی جاتی ہے۔اس کا مقصد مردے کو ثواب پہنچانا اور اس کے درجات کی بلندی کے لیے کوشش ہے۔دفنانے کے بعد رشتہ دار کھانے کا انتظام کرتے ہیں اور

لواحقین اور جنازے میں شرکت میں آئے لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔پنجاب میں اسے کڑوا کھانا کہا جاتا ہے۔

شاہد حسین فاروقی اس ضمن میں لکھتے ہیں :

”مردے کو دفن کرنے کے بعد خیرات تقسیم کی جاتی ہے۔ایک چوتھائی خیرات ملا کو اور تین چوتھائی غریبوں کو دی جاتی ہے۔“(225)

کافرستان میں تدفین کی رسومات ذرا الگ ہیں۔جب کوئی مرتا ہے ، اسے نہلا کر بہت اعلیٰ قسم کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ایک خاص قسم کی ٹوپی اسے پہنائی جاتی ہے۔اس کے بعد مردے کو چارپائی پر لٹا کر لوگ میت کے گرد اپنے رواج کے مطابق رقص کرتے ہیں اور گھر والے گریہ زاری کرتے ہیں۔لاش کو اُٹھا کر ایک بڑے ہال میں لے جاتے ہیں جو اس کام کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

بقول سلمیٰ اعوان:

”وادی کی اس ہنگامی حالت پر بات چیت سے معلوم ہوا کہ کالاش قبیلہ مردے کو اس کی موت کے فوراً بعد چارپائی پر ڈال کر ڈانس ہال لے جاتا ہے۔“(226)

اس ہال میں مردے کے اعزہ ، دوست اور تمام قریہ کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔کچھ بیٹھ جاتے ہیں ، کچھ وہاں رقص کرتے ہیں۔یہ رقص رات بھر جاری رہتا ہے۔یہ رقص صرف مرد کی میت کے لیے ہوتا ہے۔عورت کے لیے نہیں۔کافر لوگ جب رقص کرتے ہیں تو مرثیہ کی قسم کے گیت بھی گاتے ہیں۔اس گیت میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔

محمود دانش ورایرانی لکھتے ہیں:

”مجھے یہ دیکھ کر ایران کا ایک خطہ یاد آگیا۔جہاں میت کے لیے مرثیہ پڑھا جاتا ہے اور جنازے کے آگے آگے لوگ مرثیہ پڑھتے جاتے ہیں اور مرنے والے کا لباس ایک لاٹھی پر لٹکا کر آگے آگے جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ٹوپی مرنے والے کی ہے جس نے تمام عمر نیک راہ اختیار کی وغیرہ وغیرہ۔“(227)

کافروں کی یہ رسم بڑی دل چسپ ہے۔رات بھر کوئی شخص نہیں سوتا اور میت کے ارد گرد ناچتے اور گاتے ہیں۔سرد علاقے کے باعث وہاں لاش بہت جلد خراب نہیں ہوتی۔مرنے والا اگر غریب ہو تو ایک دن اور ایک رات یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔اگر دولت مند ہو تو تین دن تک یہ رسوم جاری رہتی ہیں۔

کھانے پینے کی رسم:

اسی رات چالیس من گندم کے آٹے کی روٹیاں پکتی ہیں اور کئی بکرے ذبح کیے جاتے ہیں اور یہ لوگ خوب مزے سے کھاتے ہیں۔اگر ایک قریہ میں موت ہو تو تین قریوں کے لوگ جمع ہو کر یہ جشن پوری آب و تاب کے ساتھ مناتے ہیں۔اگر مرنے والے کے گھر والے استطاعت نہ رکھتے ہوں تو تمام قریہ کے لوگ چالیس من گندم اور کئی بکرے بطور چندہ جمع کرتے ہیں۔

جنازہ سب سے پہلے مرنے والے کے رشتہ دار اُٹھاتے ہیں۔جب جنازہ روانہ ہوتا ہے تو بہت سی بندوقیں داغی جاتی ہیں۔

سلمیٰ اعوان لکھتی ہیں:

> ”میں نے لڑکے کو سنا تین دن یہ میلہ چلے گا۔پنیر ،گوشت ، چاول منوں کے حساب سے اُڑے گا۔کالاش موج میلے والا مذہب ہے۔کھاؤ پیو موج اُڑاؤ اس کا سلوگن ہے۔“(228)

طریقہ تدفین:

جنازہ جب قبرستان پہنچتا ہے تو وہاں پہلے سے تیار صندوق میں قیمتی لباس سمیت لاش کو رکھ دیتے ہیں اور اس کے دائیں بازو کے ساتھ دو روٹیاں اور تھوڑا سا گھی رکھ دیتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ یہ خوراک جن اور پریاں کھاتے ہیں۔کیوں کہ جب جن اور پریاں مردے سے کچھ نہ کچھ مانگنے کے لیے آئیں گے تو وہ یہ کھالیں گے۔یہ ایک باقاعدہ کافرستان کی رسم ہے۔یہ ”اشیبری “ کہلاتی ہے۔

محمود دانش ور ایرانی رقم طراز ہیں:

> ”میت کو تمام قیمتی لباس سمیت صندوق میں ڈال دیا جاتا ہے۔اس کے بعد دو روٹیاں اور تھوڑا سا گھی میت کے دائیں بازو کے قریب رکھ

دیتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ جن اور پریوں کے لیے یہ خوراک ہے۔"(229)

یہ لوگ میت کو صندوق میں ڈالنے کے بعد چارپائیاں وہیں پھینک دیتے ہیں۔صرف وادی رمبور میں مردے کو دفن کرنے کارواج ہو گیا ہے۔وہاں ایک سیاح جرسن آیا۔اس نے سمجھایا کہ یہ بدبو ان کے لیے نقصان دہ ہے۔اس لیے مردے کو زمین میں دفن کردیا کروتب سے وہاں دفنانے کارواج ہو گیا ہے اور یہ قبرستان سے چارپائیاں بھی واپس لے جاتے ہیں۔میت کو تابوت میں ڈالنے کو "شرنٹ" کہتے ہیں۔

عورت کی میت پر رقص نہیں ہوتا اور آٹھ سالہ بچہ مرجائے تو اس پر بھی رقص نہیں کیاجاتا اگر تین ماہ کا بچہ مرجائے تو اسے فوراً دفنا دیتے ہیں۔اگر کوئی بوڑھا مرجائے تو کوئی گریہ زاری نہیں کرتا۔تمام قریہ کے لوگ مل کر رقص کرتے ہیں اور خوب ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ اپنی پوری طبعی عمر کر کے مرا ہے۔قیام پاکستان سے پہلے یہاں ہندو بھی بوڑھے آدمی کی موت پر شادیانے بجاتے تھے۔

تدفین کے بعد کی رسوم:

تدفین مکمل ہونے کے بعد تمام لوگ اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں اور کسی کو مرنے والے کو یاد کر کے رونے کی اجازت نہیں اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں۔ایک سال بعد یعنی برسی کے موقع پر اس کا بت تیار کر کے اس کے اردگرد دوبارہ ناچ اور گانے کی رسم پوری کی جاتی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی:

> "جب تجہیز و تکفین مکمل ہو جاتی ہے تو لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔پھر کسی شخص کو اجازت نہیں کہ وہ مرنے والے کو یاد کر کے روئے۔اسی روز سے یہ لوگ اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔"(230)

ان لوگوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ لوگ تجہیز و تکفین میں متحد ہو کر حصّہ لیتے ہیں اور جنازے میں تین قریہ کے تمام لوگ شامل ہو جاتے ہیں اور یہ سب لوگ اسی طرح محسوس کرتے ہیں گویا ان کا اپنا عزیز انتقال کر گیا ہے۔خوب رقص و سرور کی محفل جمتی ہیں۔عورتیں جنازے

کے ساتھ نہیں جاتیں۔کافرستان کے علاوہ بھی پوری دُنیا میں کہیں بھی عورتیں جنازے کے ساتھ قبرستان نہیں جاتیں۔انسان کا یہ دستور بہت پرانا ہے جس پر آج تک انسان عمل پیرا ہے۔

xxii. شادی بیاہ کی رسومات :

ہر علاقے کی اپنی کچھ مخصوص رسومات ہوتی ہیں۔جو ان کی ثقافت کی غمازی کرتی ہیں۔صوبہ سرحد پاکستان کا ایک قدیم صوبہ ہے۔یہاں کی ثقافت ،تہذیب اور تاریخ بہت قدیم ہے اور ان کی یہی قدامت ان کے سوم و رواج میں بھی نظر آتی ہے۔یہاں کے رسوم و رواج دل کش اور منفرد ہیں۔شادی بیاہ کی رسومات بھی انفرادی ہیں۔جن کو تاریخ دانوں اور سفر نامہ نگاروں نے اپنی محنت اور کاوش سے کھوجا اور دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ورنہ ان قدیم علاقوں کو جاننا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔مگر سفر نامہ نگاروں کے مشقت نامہ نے انھیں صفحہ قُرطاس پر موتیوں کی طرح بکھیر دیا۔اور یہاں کا چپہ چپہ دُنیا کی نظروں کے سامنے آگیا۔یہاں کے حسین پہاڑی سلسلے رسومات ،ثقافت ، تاریخ سب کچھ عیاں ہوگیا۔یہ بلاشبہ سفر نامہ نگاروں کا عظیم کارنامہ ہے۔

صوبہ خیبرپختونخواہ کے تمام علاقوں میں شادی کی رسومات کا احوال کچھ یوں ہے:

کالام کوہستان دوطریقے شادی کے رائج ہیں۔ایک لڑکے لڑکی والوں کے درمیان باہمی رضا مندی ہے۔

1. سنتی طریقہ جس میں لڑکے کے والدین شریک ہوتے ہیں۔
2. رواجی طریقہ اس طریقے کے مطابق جرگے کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔سنتی طریقے میں لڑکی کی ماں اور بھائی وغیرہ رات کے اندھیرے میں لڑکی کو لڑکے کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔یہ طریقہ اب بھی کوہستانیوں میں رائج ہے۔

کوہستانیوں کے ہاں جب شادی ہوتی ہے تو لڑکے والے مہمان جب دُلھن کے گھر پہنچتے ہیں تو شام کو مردوں کی خاطر تواضع بکرے کے گوشت کے سالن سے کرتے ہیں۔جب کہ عورتوں کے لیے سرخ چاول پکا کر 12 بجے کے بعد مہمانوں کو کھلائے جائے ہیں۔دُلھے کے گھر سے آئے ہوئے مہمان رات دُلھن کے گھر گزارتے ہیں۔صبح ان تمام لوگوں کو ناشتہ دے کر دُلھن کے ساتھ رُخصت کر دیتے ہیں۔اس کے بعد اگلے روز دُلھا کے گھر ولیمہ کا اہتمام ہوتا ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

> ”قدیم زمانے میں کوہستانیوں کے ہاں ولیمے کی روٹی میں مکئی کی روٹی اور سالن ہوتا تھا۔جو مہمانوں کو پیش کیا جاتا تھا۔لیکن اب عام طور پر چاولوں ہی سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے اور بھینس اور بکرے کا گوشت چاولوں میں ڈالا جاتا ہے۔“(231)

تالاش میں شادی کے موقع پر ان لوگوں کی رسم یہ ہے کہ جب دُلھن کو دُولھا والے اپنے گھر لے جاتے ہیں تو گدھے پر مختلف رنگوں کے کپڑے ڈال کر گدھے کو نچاتے ہیں اور خود بھی رقص کرتے ہیں۔یہ سلسلہ کچھ دیر تک قائم رہتا ہے جس سے شادی والے گھر میں خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔ایبٹ آباد ،ہزارہ اس پورے علاقے میں شادی کی قدیم رسوم ورواج تمنتر ،کوڈی ، نیزہ بازی وغیرہ ہوتی تھی جو لڑکے کے گھر میں کھیلی جاتی تھی۔یہ رَسوم اب بھی زندہ ہیں اور قدیم ثقافت کا نشان ہیں۔

مانسہرہ میں شادی کے موقع پر ماہیوں کی رسم بڑی دل چسپ ہے۔جب شادی کی تاریخ طے پا جاتی ہے تو دلھن کو قریبی رشتہ دار اپنے گھروں میں مدعو کرتے ہیں اور پھر دُلھن اپنے گھر ماہیاں کی رات واپس آتی ہے۔اس وقت اس کے ساتھ اس کی دو سہیلیاں بھی ہوتی ہیں اور رات کو پھر ماہیاں کی رسم ادا کی جاتی ہے۔دُلھن کی ڈولی جب دلھا کے گھر پہنچتی ہے۔تو ڈولی اُتار نے کی رسم پوری کرنے کے لیے حسب استطاعت دولھن کو کچھ رقم دی جاتی ہے جو دُلھن کی مالیت ہوتی ہے بعد میں یہ رقم دُلھن دولھا کو واپس دے دیتی ہے ، اسے دول لڑاوی کی رسم کہتے ہیں۔جب رخصت ہو کر دلھن سسرال پہنچتی ہے تو سب سے پہلے ایک شیر خوار بچہ دُلھن کی گود میں بٹھایا جاتا ہے۔دُلھن اپنی طرف سے اس بچہ کو کچھ رقم بھی دیتی ہے۔پھر ساس یا قریبی لڑکیاں دُلھن کی مٹھی میں کچے چاول دیتی ہیں اور پھر دُلھن کا ہاتھ کلائی تک دیسی گھی میں ڈبویا جاتا ہے۔اس کے بعد دُلھن کو دیکھنے کی رسم شروع ہوتی ہے۔وہ شخص دلھن کو سب سے پہلے دیکھتا ہے جو صاحبِ حیثیت ہوتا ہے۔وہ دُلھن کو اپنی طرف سے کچھ رقم ادا کرتا ہے۔اس رسم کو دستور بٹا کہتے ہیں۔

ان لوگوں کے ہاں لڑکی رائے کو اہمیت حاصل نہیں ہے۔شادی کا معاملہ اس کے ماں باپ کے سپرد ہوتا ہے۔بچپن سے ہی لڑکی کا رشتہ کسی نہ کسی رشتہ دار کے ساتھ ہوا ہوتا ہے۔

بقول قاری جاوید اقبال:

”ان کے ہاں لڑکی کو کسی صورت میں بھی بااختیار نہیں سمجھا جاتا۔شادی کے موقع پر لڑکی کی رائے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔شادی کا معاملہ والدین کے سپرد ہوتا ہے۔“(232)

خاندان میں شادی :

صوبہ سرحد میں شادیاں خاندان میں کرنے کا رواج ہے۔ورنہ گاؤں یا قبیلے میں شادی کی جاتی ہے۔چچا ،ماموں ، پھوپھی یا خالہ کی لڑکی یا بیوہ بھاوج سے شادی کرنا یہ لوگ اپنا حق سمجھتے ہیں ،جو عام طور پر رائج ہے۔

بقول کیمی پوا :

”پٹھان اپنے خاندان میں ہی شادی کرتے ہیں۔قبیلوں میں اکثر جوان لڑکیوں کی کمی ہوتی ہے۔اس صورت میں لڑکی کی تلاش باہر کے قبائل میں کی جاتی ہے۔“(233)

وینا:

چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔عموماً سترہ ،اٹھارہ سال میں لڑکے کی پندرہ سولہ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کی جاتی ہے۔بعض لوگ تعلقات کی وجہ سے رشتہ طے کر لیتے ہیں اور شادی بالغ ہونے کے بعد ہی کرتے ہیں۔یہ منگنی نہیں ہوتی صرف زبان کا پاس رکھا جاتا ہے اور نسبت توڑنا معیوب اور روایات کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔اس قسم کی نسبت کو”وینا یا اقرار“ کہتے ہیں۔

منگنی :

عام طور پر خاندان اور قبیلے کے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔اس لیے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور چھان بین کی ضرورت نہیں ہوتی۔پیام لے کر لڑکے کا باپ یا ولی اپنے گاؤں کے چند معزز لوگوں کے ساتھ لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور لڑکی کے باپ کو رضا مند کر کے رشتے کی کام یابی اور خیر و برکت کے لیے دُعا کرتے ہیں۔پھر مٹھائی تقسیم کر کے منگنی کا تین بار اعلان

کیاجاتا ہے کہ سب سن لیں کہ تا کہ منگنی ٹوٹ نہ سکے۔ منگنی کرنے والے والدین اپنے وعدہ کا پاس کرتے ہیں۔

بقول شاہد حسن رزاقی :

"سب لوگ اس رشتے کی کام یابی اور خیر وبرکت کے لیے دُعا کرتے ہیں پھر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے اور سب لوگ صرف لڑکے والوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ منگنی طے پانے کے بعد بلند آواز سے تین بار اس کا اعلان کیا جاتا ہے تا کہ سب کو اس کا علم ہو جائے اور یہ منگنی ٹوٹ نہ سکے۔"(234)

لڑکی کے والد جب رضا مند ہو جاتے ہیں تو لڑکے کی چند قریبی عورتیں لڑکی کے لیے زیور ، کپڑے اور مٹھائی لے کر اس کے گھر آتے ہیں اور لڑکی کے والدین کو پیش کی جاتی ہیں ،ان کو "خوگہ" کہا جاتا ہے۔ چیزیں قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ منگنی قطعی طور پر طے ہو گئی ہے۔ منگنی کو "کوژدن" کہا جاتا ہے۔

گھی اور چاول :

ان علاقوں کے باشندوں میں عام رواج یہ ہے کہ لڑکی کی شادی کے اخراجات اور بارات کے اخراجات لڑکا ادا کرتا ہے۔ جب شادی کی مقررہ تاریخ طے ہو جاتی ہے۔ لڑکے سے معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ اس مطالبے کو "غوڑی" اور "اتبے" یعنی گھی اور چاول کا مطالبہ کہا جاتا ہے۔ گھی ، چاول کے علاوہ ، گوشت ،نمک ،شکر ، گڑ ، مسالے وغیرہ بہت سی چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔

بقول جی سی واکر ،ایسکوائر:

"چاول ، گھی اور شکر کی مخصوص مقدار بھی طلب میں شامل ہوتی ہے۔"(235)

مائیوں :

منگی ہونے کے بعد دونوں پر پابندی ہے اور وہ نکاح ہونے تک ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ عموماً منگنی کے چند ماہ بعد نکاح کیا جاتا ہے اور نکاح سے چند روز پہلے لڑکی کو "مایوں" بٹھایا جاتا ہے۔

نسبت طے کرنے کا طریقہ:

ضلع چترال میں لڑکا جس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔اس کے گھر دور دور کے پہاڑی مارخور جانوروں کا شکار کر کے بھی لاتا ہے اور اس کے گھر بھیجتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی مصری یا لونگ جسے ’’شہکورو کلاحور‘‘ کہتے ہیں اور یہاں کی عورتوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہی اس کے گھر بھیج دیتا ہے۔لڑکی کو اپنے خواہش مند کی طرف سے تسلی ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ لڑکا لمبے لمبے بال رکھتا ہے اور بناؤ سنگھار کر کے چوگان بازی کرتا ہے۔لڑکی کو تسلی ہو جاتی ہے کہ لڑکا بہادر ہے اور ہر ایک بات میں شہرت رکھتا ہے۔

بقول منشی محمد عزیزلدین:

> ’’یہ عام دستور ہے کہ جب لڑکا ذرا سیانا ہو جاتا ہے اور کسی لڑکی کو اپنے لیے پسند کرلیتا ہے تو وہ لمبے لمبے بال رکھ لیتا ہے اور بناؤ سنگھار کر کے میدان میں چوگان بازی کرتا ہے اور اپنے اس ہُنر کی شہرت اپنی معشوقہ کے کان تک پہنچاتا رہتا ہے۔‘‘(236)

جب بات ثابت ہو جاتی ہے کہ لڑکا ہر طرح سے اچھی شہرت کا مالک ہے تو ان دونوں کے والدین کے ذریعے ان کی نسبت قرار پا جاتی ہے۔مرد بھی عورت کی نسبت اس امر کی تسلی کرلیتا ہے کہ وہ سینا پرونا جانتی ہے۔

بچپن کی شادیاں:

بچپن کی شادیاں کرنے کا بھی یہاں رواج ہے۔بچہ پیدا ہوتے ہی اس کے والدین کو اس کی نسبت کی فکر لگ جاتی ہے۔لڑکے لڑکیاں نابالغ ہوتے ہیں تو چترالیوں میں ان کی شادیاں کرنے کا رواج پایا جاتا ہے۔

بقول منشی محمد عزیزالدین:

> ’’ابھی لڑکے لڑکیاں نابالغ ہی ہوتی ہیں کہ ان کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔‘‘(237)

عورتوں کے کثیر نکاح:

عورتوں کو نکاح ثانی کرنے کی کوئی ممانعت نہیں رانڈ (بیوہ) جب تک زندہ رہے نکاح کر سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں بعض عورتوں نے درجنوں نکاح کیے ہیں۔

نکریزے:

شادی سے ایک دن پہلے مہندی کی رسم ہوتی ہے۔یہ رسم رات کے وقت ادا کی جاتی ہے۔دُلھن کی بہنیں اورچند قریبی رشتہ دار عورتیں دولھا کے لیے مہندی لے کراس کے گھر جاتی ہیں اور دولھا کو مہندی لگانے کی رسم کرتی ہیں۔مہندی کی رسم کے بعد دولھا اس جگہ جاتا ہے۔جہاں مہمان اسے نیوتا یا سلامی (کہہ سکتے ہیں) دیتے ہیں جو چند روپوں کی شکل میں ہوتی ہے۔یوں ہی مہندی کی رسم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

بقول شاہد حسین رزاقی:

> ”دُلھن کی بہنیں اورچند قریبی رشتہ دار عورتیں دولھا کے لیے مہندی لے کراس کے گھر جاتی ہیں اوراس کو چوکی پر بٹھاکر اس کی انگلی مہندی کے کٹورے میں ڈالتی ہیں۔اس موقع پر دولھا دُلھن کے لیے کچھ روپے دیتاہے اس کے بعد دولھا کے گھر سے چند عورتیں گھر گھر جاتی ہیں اور دولھن کو مہندی لگانے کی رسم ہوتی ہے۔“(238)

بارات:

جس روز دُلھن کے گھر بارات جاتی ہے ،اس روز شادی کے مہمانوں کے علاوہ گاؤں یامحلّے کے تمام لوگوں کو بھی کھانے پر مدعو کر لیاجاتا ہے اور دولھا والے ان سب کو پلاؤ کھلاتے ہیں۔پیر کے مزار پر دولھا کو سلام کرا کر بارات روانہ ہوتی ہے۔شوال کے مہینے کو مبارک سمجھا جاتا ہے۔محرم میں توشاذو نادر ہی کوئی شادی کبھی ہوئی ہو۔رمضان کے دوران تو کبھی شادی نہیں ہوتی۔اس کے علاوہ عید الضحیٰ وغیرہ کے درمیان مہینوں میں بھی شادیاں نہیں کرتے۔شادی کے تمام اخراجات دولھا ادا کرتا ہے۔جس میں خدمت گاروں کا معاوضہ بھی شامل ہوتا ہے۔یوسف زئی شادی پر بہت خرچہ کراتے ہیں۔زیادہ ترلوگ دوشادیاں کرتے ہیں۔سردار اورامیر کبیر لوگ چارشادیاں کرتے ہیں۔

بقول جی سی واکر ،ایسکوائر :

"یوسف زئی میں شادیاں اور دلھن کے لیے تحائف پر بڑے اخراجات اس علاقے میں رہن کی بڑی وجہ ہیں۔زیادہ تر رسوم اور بندھن اسلامی شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔لیکن اس معاملے میں قبیلے کے مختلف حصوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔اکثریت ایک وقت میں ایک ہی بیوی پر قناعت کرتی ہے۔متعدد لوگ دو شادیاں کرتے ہیں۔سردار اور امیر کبیر لوگ پوری چار شادیوں کے علاوہ حسبِ استطاعت داشتائیں بھی رکھتے ہیں۔"(239)

سہرا باندھنا:

دولھا اس مکان میں جاتا ہے۔جہاں دُلھن کا جہیز رکھا ہوتا ہے۔جہیز کے پلنگ پر دُلھن کا بستر بچھا دیا جاتا ہے۔دولھا اس پلنگ پر بیٹھ کر شادی کا جوڑا پہنتا ہے۔یہ جوڑا دُلھن والے دولھا کو مہندی کے دن دیتے ہیں اور باراتی اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔اس کے بعد دولھا کے سہرا باندھا جاتا ہے۔

پلنگ جھلائی :

جب دولھا تیار ہوتا ہے تو پلنگ جھلانے کی رسم ہوتی ہے۔دولھا پلنگ پر بیٹھا رہتا ہے اور اس کے کچھ دوست اور بھائی اس پلنگ کو اُٹھا کر جھلاتے ہیں۔اس طرح کہ دولھا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور دولھا یہ کوشش کرتا ہے کہ پلنگ پر اپنا توازن قائم رکھے۔سب لوگ اس رسم سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔پلنگ پر رکھ کر دولھا کو مبارک باد دی جاتی ہے اور ہوائی فائر کیے جاتے ہیں۔

شاہد حسین رزاقی رقم طراز ہیں:

"مہمان اس رسم سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔جب پلنگ زمین پر رکھ دیا جاتا ہے۔تو دولھا کو مبارک باد دی جاتی ہے اور ہوا میں بندوقیں چھوڑی جاتی ہیں۔"(240)

تھال:

خیبر پختونخوا کے کچھ علاقوں میں یہ رسم اب بھی جاری ہے ۔ دلھن کے گھر ایک رسم جسے " تھال " کہتے ہیں۔ اس رسم میں ایک طرف باراتی اور ایک طرف دلھن کے گھر والے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان حجام ایک بڑی سینی رکھ دیتا ہے ، جس کو تھال کہتے ہیں۔ دولھا والے دُلھن کے لیے جو زیور اور روپیہ لاتے ہیں۔ وہ اس میں رکھ دیے جاتے ہیں اور حجام وہ سب چیزیں دُلھن کی ماں کو دے آتا ہے۔ اس کے بعد وہ خالی تھال لاکر پھر رکھ دیتا ہے اور پھر اسے بھرنے کا مطالبہ کرتا ہے ، جس سے دولھا والے انکار کرتے ہیں اور دلھن والے مسلسل اصرار کرتے رہتے ہیں۔ آخر کار دولھا اور باراتی تھال میں روپے ڈال دیتے ہیں۔ دلھن کی ماں زیادہ رکھ لیتی اور تھوڑا سا چھوڑ دیتی ہے۔ بعض لوگ یہ رقم دلھن کو زیور بنانے کے لیے دیتے ہیں۔ ورنہ عموماً دلھن کا باپ لے لیتا ہے۔

بقول شاہد حسین رزاقی:

> "بعض جگہ بارات کے آنے کے بعد دلھن کے گھر میں ایک رسم ہوتی ہے جس کو "تھال" کہتے ہیں۔ جب بارات آتی ہے تو ایک طرف باراتی بٹھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف دلھن کے گھر والے بیٹھتے ہیں او ران دونوں کے درمیان حجام ایک بڑی سی سینی رکھ دیتا ہے ، جس کو "تھال" کہتے ہیں۔"(241)

نکاح:

تھال کی رسم کے بعد باراتیوں کو شربت پلا کر نکاح ہوتا ہے۔ نکاح شرعی طریقے پر ہوتا ہے۔ قبیلے کا پیر یا ملا نکاح پڑھتا ہے۔ جس میں وکیل اور دو گواہ ہوتے ہیں۔ نکاح سے پہلے بلند آواز سے ہر کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد سب لوگ اس رشتے کی کام یابی ، خوش حالی اور خیر و برکت کے لیے دعا مانگتے ہیں اور فائرنگ کر کے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بعض قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ دلھن کو دولھا کے گھر لا کر نکاح کیا جاتا ہے۔

شاہد حسین رزاقی رقم طراز ہیں :

> "بعض قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ دلھن کو دولھا کے گھر لے آتے ہیں اور وہاں نکاح پڑھا جاتا ہے بہت سے لوگ نکاح مسجد میں پڑھواتے ہیں۔ رات گئے سب لوگ مسجد چلے جاتے ہیں۔"(242)

چترالیوں میں شادی کی رسم ادا کرنے کے لیے ایک گواہ کے سامنے جو اکثر قاضی یا مولوی ہوتا ہے۔نسبت طے کی جاتی ہے۔پھر نکاح کے وقت لڑکے والے بہت سامال یعنی بیل ،لوہا ،گھوڑا اور تلوار وغیرہ لے کر لڑکی والے کے گھر جاتے ہیں اور ساتھ پکے ہوئے چاول لے کر جاتے ہیں جو لڑکی والوں کے کھانے کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ان کی رسمیں قریب قریب بلتستان کے لوگوں جیسی ہیں۔لڑکے والے ایک دن لڑکی کے گھر رہتے ہیں اور نکاح کے بغیر ہی اپنے گھر لے آتے ہیں۔لڑکی کا باپ یا کوئی اور رشتہ دار بھی ان کے ساتھ آتا ہے۔یہاں سب مہمانوں کو رُخصت کرکے قاضی کو بلا کر نکاح کر دیا جاتا ہے۔

بقول منشی محمد عزیزالدین:

> "وہاں پہنچ کر لڑکی کے گھر کا کھانا کھا کر اور ایک دن ٹھہر کر لڑکی کو نکاح بغیر ہی اپنے گھر لے آتے ہیں۔لڑکی کا باپ یا کوئی اور نہایت قریبی رشتہ دار بھی ان کے ساتھ آتا ہے۔یہاں سب مہمانوں کو رُخصت کر کے قاضی کو بلا کر نکاح پڑھا دیا جاتا ہے۔"(243)

سلامی:

نکاح کے بعد دولھا کو اندر بلالیا جاتا ہے اور دُلھن کی رخصتی کی تیاری کی جاتی ہے۔اندر آنے پر سلامی کی رسم ہوتی ہے۔دولھا سب سے پہلے اپنی ساس کو اور پھر دُلھن کے خاندان کی تمام بزرگ خواتین اور مہمانوں کو جھک کر سلام کرتا ہے۔دولھے کی سالی اسے شربت کا گلاس دیتی ہے۔جسے وہ گھونٹ بھر پی کر شہہ بالا کو دے دیتا ہے۔پھر دولھا شہبالا دونوں اس گلاس میں روپے ڈالتے ہیں۔مہمانوں کی دل چسپی کے لیے ناچ گانا ہوتا ہے۔شادیوں میں ناچنے کے لیے کم سن لڑکے بلائے جاتے ہیں۔کیوں کہ یہاں عورتوں کا ناچنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

رخصتی:

شادی کے بعد دلھن کو رخصت کیا جاتا ہے۔اسلامی رسم کے بعد دلھن کو کوڈولی یا پالکی میں بٹھا کر دولھا کے حوالے کر دیتے ہیں اور باقی باراتی دلھن کو لے کر دولھا کے گھر روانہ ہو جاتے

ہیں۔باراتی تین روز تک دولھا کے مہمان ہوتے ہیں۔خوب گانا بجانا ہوتا ہے اور تیسرے روز بڑی دعوت کر کے مہمان رخصت کیے جاتے ہیں۔

رونمائی :

باراتی جب دلھن کو لے کر آتے ہیں توبڑی گرم جوشی سے دلھن کا استقبال کرتے ہیں۔ڈولی سے اتارنے کے لیے تمام عورتیں جمع ہوجاتی ہیں اور اس کوگھر کے اندر قالین پر بٹھا کر منہ دکھائی کی رسم کرتی ہیں۔

بقول شاہد حسین رزاقی:

> ”تمام عورتیں دلھن کوڈولی سے اتارنے کے لیے جمع ہو جاتی ہیں اور اس کو گھر کے اندر قالین پر بٹھا کر رو نمائی کی رسم کرتی ہیں۔سب سے پہلے دولھا کی ماں اور دوسری بزرگ عورتیں دلھن کا منہ دیکھتی ہیں اور روپے دیتی ہیں۔ان کے بعد دوسری تمام عورتیں دلھن کا منہ دیکھ کر روپے اورتحفے دیتی ہیں۔“(244)

دولھا اس روز دلھن کا منہ نہیں دیکھتا تین دن کے بعد سب مہمان رخصت کر دیئے جاتے ہیں اور مہمانوں کے جانے کے بعد دولھا دلھن کے چہرے سے نقاب ہٹاکراس کی صورت دیکھتا ہے۔

آرسی مصحف :

منہ دکھائی کے بعد آرسی مصحف کی رسم کی جاتی ہے۔دولھا کو دلھن کے ساتھ بٹھا دیتے ہیں۔قرآن پاک کاایک نسخہ دے کر ان کے درمیان آئینہ رکھ کر پہلے قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں پھر آئینے میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہیں۔سب عورتیں خیروبرکت کے لیے دُعا کرتی ہیں۔

بقول شاہد حسین رزاقی:

> ” رونمائی کے بعد آرسی مصحف کی رسم ہوتی ہے۔دولھا کو اندر بلا کر دلھن کے قریب بٹھا دیتے ہیں۔دولھا اور دلھن دونوں کے ہاتھوں میں قرآن پاک کا ایک ایک نسخہ دے کران کے درمیان آئینہ رکھ دیتے

ہیں۔یہ پہلے قرآن پاک کھول کر اس کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں۔پھر آئینے میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہیں۔"(245)

حلوہ کھلانا:

آرسی مصحف کے بعد دولھا دلھن کو حلوہ کھلانے کی رسم ہوتی ہے۔ایک تھالی میں حلوہ لا کر دولھا دلھن کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔تمام عورتیں دو گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ایک پارٹی دولھا اور ایک دلھن کی طرف ہوتی ہے۔دلھن کی پارٹی کہتی ہے۔پہلے دلھن دولھا کو کھلائے اور دولھا کی پارٹی دلھن کو کھلانے پر اصرار کرتے ہیں۔جو پارٹی زیادہ مضبوط ہوتی ہے ،وہ اپنی بات منوالیتی ہے۔

جہیز کی نمائش:

پٹھانوں میں یہ رواج ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے بھی لڑکا خرچہ برداشت کرتا ہے۔ان کے ہاں رواج ہے کہ کچھ جہیز دلھن کے ساتھ دولھا کے گھر آتا ہے اور باقی 3 دن بعد دلھن کی ماں لے کر آتی ہے اور سب کو دکھا کر بتاتی ہے کہ یہ لڑکے والوں نے دی ہیں اور یہ لڑکی کے والدین نے دی ہیں۔جہیز کی نمائش کے بعد دلھن ماں کے ساتھ اپنے میکے چلی جاتی ہے۔

بقول شاہد حسین رزاقی:

"دولھا کے گھر میں جہیز کی نمائش کرنے کی بھی رسم ہوتی ہے کچھ جہیز دلھن کے ساتھ آجاتا ہے اور کچھ تین روز کے بعد ماں اور چند بزرگ رشتہ دار عورتیں لے کر آتی ہیں جب پورا جہیز یک جا ہو جاتا ہے۔تو اس کو سلیقے سے سجاتے ہیں اور تمام عورتوں کو بلا کر جہیز دکھلاتے ہیں۔"(246)

مہر:

ان علاقوں میں شادی سے متعلق جو رسم ورواج پائے جاتے ہیں ان میں مہر کی بڑی اہمیت ہے۔مہر کا فیصلہ منگنی طے ہونے سے پہلے ہی کر لیا جاتا ہے اور نکاح سے پہلے بلند آواز سے مہر کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔مہر فوراً ادا کرنے کا رواج نہیں ہے۔مہر کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں۔بعض جگہ یہ رواج ہے کہ دولھا دلھن کو گھر لانے کے بعد اسے کوئی تحفہ ،زیور یا دودھ دینے والی گائے یا بھینس دیتا

ہے اور چند دن بعد پورا مہر معاف کرالیتا ہے۔بعض لوگ مہر کے معاوضے میں زمین دے دیتے ہیں جو ہر طرح بیوی کی ملکیت ہوتی ہے۔

کافرستان میں باقی رسوم کی طرح شادی کی رسومات بھی الگ ہیں۔

شادی کی دو منزلیں:

کافرستان میں شادی کی دو منزلیں ہیں : منگی اور شادی۔لڑکے کے باپ کی طرف سے چند لوگ لڑکی کے گھر مذاکرات کے لیے جاتے ہیں۔اگر رضامندی ہوجائے تولڑکے کا باپ ایک چولھا، ایک دیگچہ ،ایک بندوق ،ایک گائے بھجواتا ہے۔اگر لڑکے کا باپ استطاعت نہ رکھتا ہوتو گائے کی جگہ بکری بھجوا دی جاتی ہے۔یہ منگنی کی رسم کا آغاز ہے۔لڑکی کا باپ جواب میں کچھ روٹیاں اور پنیر بھجواتا ہے۔اس رسم کو لوگ "اشپری" کہتے ہیں۔اس کے بعد بکرے ذبح کیے جاتے ہیں جو دونوں گھرانوں میں رواج ہے۔یہ منگنی کی رسم کا اعلان ہے۔

محمود دانش ور ایرانی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "جب یہ اعلان ہوجاتا ہے توپھر دونوں گھروں میں بکرے ذبح کیے جاتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی منگنی ہوگئی ہے۔اس کے بعد لڑکی کا باپ داماد کے گھر پر جاتا ہے۔وہاں داخل ہونے سے پہلے دروازے میں اس کے قدموں میں ایک بکرا ذبح کیا جاتا ہے اور نصف قریہ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔اس گوشت کا کوئی حصّہ داماد کے گھر نہیں رہ سکتا۔ان کی یہی رسم ہے۔"(247)

شادی:

جب لڑکی کی عمر سات آٹھ سال ہوتی ہے تب منگنی کی جاتی ہے اور جب وہ بلوغت کو پہنچتی ہے ،تواس وقت شادی کی رسم ادا ہوتی ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

> "جونہی لڑکی کو حیض آتا ہے تولڑکی کا باپ فوراً داماد کے باپ کو مطلع کر دیتا ہے اور شادی کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔"(248)

نکاح کی عجیب رسم:

کافرستان میں عجیب طرح کی رسومات ہیں۔ دلھن دولھا کو لایا جاتا ہے۔لوگ اکھٹے ہو کر جشن مناتے ہیں۔مردوں کو بلایا جاتا ہے اور لوگ وہیں کھانا کھاتے ہیں۔شام ہی سے مذہبی پیشوا آجاتا ہے۔ تین بکرے ذبح کرنے کے لیے سات آٹھ سالہ بچے لائے جاتے ہیں یہ نابالغ بچے بکرے ذبح کرتے ہیں۔ایک بکرا "چشتگان" دوسرا "چارسو" اور تیسرا دولھا دلھن کے درمیان ذبح کر کے بکرے کا خون یہ نابالغ بچہ دولھا دلھن کے منہ پر ملتے ہیں۔یہی نکاح کی رسم ہے ، نکاح ہو جاتا ہے۔اس کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف رخصت ہو جاتے ہیں۔اب دولھا دلھن کے سونے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔

اس ضمن میں محمود دانش ور ایرانی لکھتے ہیں:

> "پہلے یہ بچے سب کے سامنے گندم کے آٹے کی روٹیاں پکاتے ہیں اور پھر دولھا کے قدموں میں تیسرا بکرا ذبح کر دیتے ہیں اور جب خون کا فوارہ چھوٹتا ہے تو وہ بالغ بچے اپنے ہاتھوں کو خون سے رنگ کر دولھا دلھن کے منہ پر ملتے ہیں۔پس اسی کو نکاح کی رسم کہا جاتا ہے۔اس کے بعد لوگ اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔"(249)

کافرستان میں شادی بیاہ کی رسم ایک تہوار کی طرح منائی جاتی ہے اور ایک وقت میں بیس تیس لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے۔یہاں اسی طرح اجتماعی شادیوں کا رواج ہے۔بارات کے ساتھ عورتیں نہیں جاتیں۔ بکرے ذبح کر کے خون کا فوارہ نکلتا ہے اسے نابالغ بچے دلھا دلھن کے منہ پر ملتے ہیں۔یہی نکاح کی رسم کہلاتی ہے۔

بقول پرویش شاہین:

> "لڑکی کا کوئی خاص لباس نہیں ہوتا صرف روایتی زیورات ہوتے ہیں۔بارات کے ساتھ عورتیں نہیں جاتیں۔ بکرے ذبح کر دیئے جاتے ہیں اور جب خون کا فوارہ چھوٹتا ہے تو دو نابالغ بچے اپنے ہاتھوں کو خون سے رنگ کر دولھا دلھن کے منہ پر ملتے ہیں ،اسی کو نکاح کی رسم کہا جاتا ہے۔"(250)

شادی کی رات کی رسوم:

کافرستان کے لوگوں کی یہ رسومات بہت پرانی ہیں اور عجیب وغریب ہیں۔کنبے کے تمام لوگ ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ماں ،بہن ،بھائی ، باپ سب بالکل ننگے سوتے ہیں۔یہ ان کی پرانی رسم ہے۔اس کو یہ بہرحال نبھانا چاہتے ہیں۔یہاں عورت اپنا لمباچُغہ پہن کر سوتی ہے۔شوہر اپنے تمام تر حقوق اسی طرح پورے کرتا ہے۔

بقول محمود دانش ور ایرانی :

"شادی کے تقدس کا خیال رکھتے ہوئے وہ عورت چُغہ پہنتی ہے اور گل چینی کے لیے دولھا اس کے چغے میں گھس جاتا ہے۔اس طرح شب اوّل تمام ہو جاتی ہے اور اس کی داستان صبح کو دہرائی جاتی ہے۔"

(251)

ان کے ہاں ایک رسم یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کی بیوی مر جائے تو وہ ایک سال تک دوسری شادی نہیں کر سکتا۔اسی طرح بیوہ بھی ایک سال تک انتظار کرتی ہے۔ہندوؤں اور یہودیوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے نزدیکی رشتہ داروں میں شادی نہیں کرتے۔

رسم شادی:

کافرستان میں شادی کی عجیب طرح کی رسمیں ہیں۔ان کی یہی رسمیں انھیں دوسروں سے انفرادیت بخشتی ہیں۔شادی کی رسم بکرے کو ذبح کر کے اس کی زبان دلھن دلھا کو کھلائی جلاتی ہے۔یہاں کا مذہبی رہ نما اس موقع پر ایک خاص قسم کا شربت تیار کرتا ہے۔جو دولھا دلھن کو پلایا جاتا ہے۔اسے کچھ تحائف اور رقم ادا کی جاتی ہے اور وہ رہ نما تمام لوگوں کی بھلائی کے لیے دُعائیں کرتا ہے۔شادی کے دن دلھن خود پیدل آتی ہے نہ گھوڑے پر نہ ڈولی میں بٹھائی جاتی ہے۔لڑکے کے والدین اس کا استقبال کرتے ہیں۔دلھن اپنے ساتھ میٹھی روٹیاں لاتی ہے جو صرف بچوں کو کھلائی جاتی ہیں۔جس کا مقصد ہوتا ہے لڑکی بانجھ نہ رہے۔

بقول پرویش شاہین :

”رسم شادی چند لوگوں کی موجودگی میں بکرے کو ذبح کر کے اس کی زبان دولھا دُلھن کو کھلا کر ادا کی جاتی ہے۔اس موقع پر دیہار (مذہبی رہ نما) ایک قسم کا شربت تیار کرتا ہے۔پہلے دلھن پھر دولھا کو پیش کیا جاتا ہے۔“ (252)

سرخ کافروں کی شادی کی رسوم:

سرخ کافروں کی شادی کی رسوم بھی سیاہ پوش کافروں سے مشابہ ہے۔دو چار آدمی لڑکی کے گھر جاتے ہیں۔اگر وہ رشتہ قبول نہ کرے تو اس سے دگنے یہاں تک کہ کبھی کبھی پورا گاؤں رشتے کے لیے چلا جاتا ہے اور لڑکی کے باپ کو یہ رشتہ قبول کرنا پڑتا ہے۔جب رشتے کا اعلان ہو جاتا ہے تو باپ کی طرف سے ایک مینڈھا اور لڑکی کا باپ بھی شادی میں کئی مینڈھے لے کر جاتا ہے۔سارا گاؤں شادی میں شریک ہوتا ہے۔حق مہر زیادہ نہیں ہوتا اور اسی وقت ادا کر دیا جاتا ہے۔شرع کے مطابق چار شادیاں جائز ہیں مگر یہ پانچ بھی نکاح میں لے لیتے ہیں۔سرخ کافر جب سے مسلمان ہوئے ہیں۔ان کے طور طریقے کچھ تبدیل ہوئے ہیں مگر ابھی بھی سیاہ کافروں کے کچھ رنگ ان کی ثقافت میں گھلے ملے نظر آتے ہیں۔

سارے خیبر پختونخوا میں شادی کی رسومات دل چسپ اور منفرد ہیں مگر کافرستان کی ثقافت تو بالکل الگ سے ہے اور یہی ثقافت انھیں دوسرے صوبوں سے منفرد بناتی ہے۔پشتونوں کی ثقافت تمام صوبوں سے الگ ہے۔آج بھی اپنے قدیم رسوم ورواج پر قائم ہیں۔غیرت مندی اور خود داری جیسے وصف آج بھی ان کی پہچان ہیں۔خیبر پختونخوا کی ثقافت بہت جان دار ہے۔

حوالہ جات

1. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص: 15
2. رضا علی عابدی ، جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1995ء،ص:34
3. الحاج ایم زمان کھوکھر ،یاسر اکیڈمی بالمقابل سیشن کورٹ کچہری روڈ، گجرات ،ص: 151
4. سید جمال الدین شاہ ،جنگ سنڈے میگزین ، راولپنڈی ،یکم اپریل 2012ء
5. انور رومان ،پروفیسر ، (ترجمہ) پشتونوں کی تاریخ ،گوشۂ اَدب ، جناح روڈ ،کوئٹہ پاکستان ،ص: 33
6. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص: 14
7. ایضاً،ص:13
8. رضی الدین ،کیلاش کتھا از ڈاکٹر عباس برمانی ، بیک فلیپ
9. شاکر حسین شاکر ، کیلاش کتھا از ڈاکٹر عباس برمانی ، بیک فلیپ
10. انور سدید ،ڈاکٹر ، دوسفر از محمد خالد اختر ،ص: 11
11. غفور شاہ قاسم ،سفر نامہ ،مشمولہ: پاکستانی اَدب شناخت کی نصف صدی ،ریز پبلی کیشنز ، راولپنڈی ، 2000ء،ص:265
12. مستنصر حسین تارڑ ، مناظرِ پاکستان از ماجد فرید ساٹی، ص: 11
13. محمد افسر ساجد ، مستنصر حسین تارڑ اور دو بہاؤ ، مشمولہ: ماہِ نو ،جون 1993ء،ص:93
14. غفور شاہ قاسم ،سفر نامہ ،مشمولہ: پاکستانی اَدب شناخت کی نصف صدی ،ریز پبلی کیشنز ، راولپنڈی ، 2000ء،ص:272
15. محمد ابن الحسین ،سید ،سہ ماہی ادبیات ،اکادمی ادبیات پاکستان ،اسلام آباد ، جولائی تا ستمبر ، 1987ء،ص:82

16. مظہر فریدی ، سلمیٰ اعوان اور محمود دانش ور ایرانی کے سفر ناموں میں تہذیبی و تمدنی اظہار، (مضمون)، مطبوعہ: سہ ماہی الزبیر ،شمارہ : 3 – 2 – 1، 98 - 1997ء ،اُردو اکادمی ،بہاول پور ، ص: 93 – 92

17. قاسم محمود ،سید ، سوات ،سیاحوں کی جنت از فضل ربی راہی ، بیک فلیپ

18. مستنصر حسین تارڑ ، سوات ،سیاحوں کی جنت از فضل ربی راہی ،بیک فلیپ

19. ڈاکٹر صابر کلوروی ،کافرستان (تاریخ وثقافت) از پرویش شاہین ، بیک فلیپ

20. کیمی میرپوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ،حاجی حنیف پرنٹرز ،لاہور ، 2005ء،ص: 150

21. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:22

22. احمد پراچہ ،تاریخ کوہاٹ ،بک سنٹر 32حیدر آباد ،راولپنڈی کینٹ ،پاکستان ،ص: 21

23. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:151

24. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:52

25. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ،ص: 118

26. ایضاً،ص:169

27. ایضاً،ص:177

28. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ، سوات ،ص:99

29. ایضاً،ص:124

30. ایضاً ،ص:156

31. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:4

32. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ، آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:78
33. مستنصر حسین تارڑ ،سفر شمال کے ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2007ء،ص:81
34. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص: 230
35. جمیل جالبی ،ڈاکٹر ،پاکستانی کلچر ،طبع پنجم نیشنل بک فاؤنڈیشن ، اسلام آباد ، 1992ء،ص:69
36. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:18
37. شاہ محمد مدنی عباسی ، پشتو زبان اور اَدب کی تاریخ - ایک جائزہ ، مرکزی اُردو بورڈ ، لاہور ، 1969ء،ص:3
38. ایم زمان کھوکھر ،ایڈووکیٹ ،(نشانِ گجرات)،پشاور سے کوئٹہ تک ، یاسر اکیڈمی بالمقابل سیشن کورٹ ،کچہری روڑ ،گجرات ، ص:143
39. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ، سوات ،ص:17
40. ایضاً،ص:138
41. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:17
42. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ، آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:76
43. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:234
44. رضا علی عابدی ، جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1995ء،ص:27
45. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:153
46. جیمس ڈبلیو اسپین ،ترجمہ: انور رومان ،پشتونوں کی تاریخ ، گوشۂ اَدب ، جناح روڑ ،کوئٹہ پاکستان ، ص: 37
47. امتیاز اے قریشی ،گڈبائی شہر نو ، ریز پبلی کیشنز ، راولپنڈی ، 2002ء،ص:31

48. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:98

49. سلمیٰ اعوان ،سندر چترال ، مارچ 2004ء،تعریف پرنٹرز ،لاہور ، 2007ء،ص:13

50. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:100

51. ایضاً،ص:101

52. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:283

53. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:171

54. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:139

55. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:177

56. مستنصر حسین تارڑ ،سفر شمال کے ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2007ء،ص:95

57. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:156

58. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:108

59. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ، سوات ،ص:72

60. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:102

61. ایضاً،ص:102

62. ایضاً،ص:103

63. ایضاً،ص:105

64. عبدالحفیظ ،مرزا ،سفر گزشت ، پلس کمیونی کیشنز ،لاہور ، 2003ء،ص:14

65. ایضاً، ص:12
66. مستنصر حسین تارڑ ،جو کالیاں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، ص:102
67. ایضاً، ص:135
68. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:51
69. حافظ عمار وحید سلیمانی ، نوائے وقت سنڈے میگزین ، 10 جولائی 2005ء
70. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:23
71. ایضاً، ص:358
72. ایضاً، ص:375
73. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:23
74. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:164
75. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:73
76. ایم زمان کھوکھر ،ایڈووکیٹ ،(نشانِ گجرات)، پشاور سے کوئٹہ تک ، یاسر اکیڈمی بالمقابل سیشن کورٹ ،کچہری روڑ ، گجرات ، ص:323
77. محمد خالد اختر ،دوسفر ، میٹرو پرنٹر ،لاہور ، 1984ء، ص:42
78. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:164
79. ایضاً، ص:165
80. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ، آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:91
81. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:63

82. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:155

83. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:33

84. ایضاً،ص:34

85. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ، سوات ،ص:17

86. ایضاً،ص:122

87. محمد خالد اختر ،دوسفر ، میٹرو پرنٹر ،لاہور ، 1984ء،ص:45

88. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:165

89. ایضاً،ص:145

90. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:97

91. ایضاً،ص:98

92. ایضاً،ص:100

93. محمود دانش ورایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ، آتش فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:47

94. ایضاً،ص:49

95. ایضاً،ص:134

96. مستنصر حسین تارڑ ،جوکالیاں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:78

97. احمد پراچہ ،تاریخ کوہاٹ ،بک سینٹر 32حیدرروڑ کینٹ ،پاکستان

98. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:173

99. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:21

100. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:176

101. ایضاً،ص:143

102. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:57

103. عبدالحفیظ ،مرزا ،سفر گزشت ، پلس کمیونی کیشنز ،لاہور ، 2003ء،ص:14

104. رضا علی عابدی ، جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 1995ء،ص:26

105. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڈ ، منگورہ ،سوات ،ص:261- 260

106. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:112

107. ایضاً،ص:114

108. ایضاً،ص:114

109. ایضاً،ص:115

110. ایضاً،ص:117

111. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:29

112. ایضاً،ص:82

113. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:68

114. ایضاً،ص:78

115. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:88

116. رضا علی عابدی ، شیر دریا،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:120

117. محمد خالد اختر ،دوسفر ، میٹرو پرنٹر ،لاہور ، 1984ء،ص:85

118. ایضاً،ص:51

119. عباس برمانی ، ڈاکٹر ،میر اسد ھو سائیں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:89
120. مستنصر حسین تارڑ ،سفر شمال کے ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2007ء،ص:81
121. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:23
122. کیمی میر یوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:176
123. ایضاً،ص:160
124. سلمیٰ اعوان ،سندر چترال ، مارچ 2004ء،تعریف پرنٹرز ،لاہور ، 2007ء،ص:69
125. ایضاً،ص:69
126. کیمی میر یوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:143
127. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:152
128. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ،سوات ،ص:27
129. ایضاً،ص:156
130. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:117
131. محمد خالد اختر ،دوسفر ، میٹرو پرنٹر ،لاہور ، 1984ء،ص:51
132. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:87
133. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ،سوات ،ص:70
134. کیمی میر یوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:134

135. مولانا عبدالقادر ، بحوالہ: پشتون کون؟ مصنف : پروفیسر پریشان خٹک ، پشتو اکیڈمی ،پشاور یونی ورسٹی ، پشاور ، 1984ء،ص:136 – 135
136. سلمیٰ شاہین،ڈاکٹر ،پشاور یونی ورسٹی ،جرنل 2000ء – 1999ء ،ص:82
137. آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک ،سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور ، ص:69
138. مستنصر حسین تارڑ ،جوکالیاں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:81
139. محمد خالد اختر ،دوسفر ، میٹرو پرنٹر ،لاہور ، 1984ء،ص:34
140. ایم زمان کھوکھر ،ایڈووکیٹ ،(نشانِ گجرات)،پشاور سے کوئٹہ تک ، یاسر اکیڈمی بالمقابل سیشن کورٹ ،کچہری روڑ ، گجرات ، ص:358
141. رضاعلی عابدی ، شیر دریا،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ،ص:209
142. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:31
143. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:325
144. ایضاً،ص:324
145. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:127
146. امتیاز اے قریشی ،گڈبائی شہر نو ، ریز پبلی کیشنز ، راولپنڈی ، 2002ء،ص:31
147. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ،سوات ،ص:156
148. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:69
149. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:176
150. راج ولی شاہ خٹک ،ڈاکٹر ،پشتون ولی ، پشتو اکیڈمی پشاور یونی ورسٹی بہ اشتراک لوک ورثہ ، اسلام آباد ، 2008ء،ص:82

151. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:163
152. ایضاً،ص163
153. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:178
154. ایضاً،ص:157
155. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:163
156. راج ولی شاہ خٹک ،ڈاکٹر ،پشتون ولی ، پشتو اکیڈمی پشاور یونی ورسٹی بہ اشتراک لوک ورثہ ، اسلام آباد ، 2008ء،ص:78
157. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:31
158. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:159
159. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:69
160. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:112
161. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:157
162. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:108
163. جیمس ڈبلیو اسپین ،ترجمہ: انور رومان ،پشتونوں کی تاریخ ، گوشۂ اَدب ، جناح روڈ ،کوئٹہ پاکستان ،ص:131
164. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:154

165. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:30
166. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:151
167. مستنصر حسین تارڑ ،سفر شمال کے ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2007ء،ص:92
168. ایضاً،ص:93
169. محمد خالد اختر ،دوسفر ، میٹرو پرنٹر ،لاہور ، 1984ء،ص:90
170. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:118
171. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:89
172. عبدالحفیظ ،مرزا ،سفر گزشت ، پلس کمیونی کیشنز ،لاہور ، 2003ء،ص:14
173. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڈ ، منگورہ ،سوات ،ص:141
174. ایضاً،ص:128
175. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:65
176. ایم زمان کھوکھر ،ایڈووکیٹ ،(نشانِ گجرات)،پشاور سے کوئٹہ تک ، یاسر اکیڈمی بالمقابل سیشن کورٹ ،کچہری روڑ ،گجرات ، ص:277
177. ملک اشفاق ، کیلاش ، اے این پرنٹرز ،لاہور ، 2005ء،ص:17
178. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڈ ، منگورہ ،سوات ،ص:151
179. ایضاً،ص:127
180. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:144
181. ایضاً،ص:144

182. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیراہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:316

183. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:110

184. عارف محمود اپل ،سنڈے میگزین ، راولپنڈی ، 8جون2003ء

185. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیراہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:366

186. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردوبازار ،لاہور ، ص:29

187. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردوبازار ،لاہور ، ص:158

188. فضل ربی راہی ، سوات ،سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ،پبلشرز اینڈ بک سیلرز جی ٹی روڑ ، منگورہ ،سوات ،ص:142

189. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:101

190. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیراہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:160

191. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:142

192. ایضاً،ص:143

193. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:71

194. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:102

195. ایضاً،ص:149

196. محمود دانش ور ایرانی، کافرستان، مترجم: خلیل احمد، بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار، لاہور، ص:64

197. ایضاً،ص:85

198. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:150

199. ماجد فرید ساٹی، مناظرِ پاکستان، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار، کراچی، ص:74 – 73

200. پرویش شاہین، کافرستان (تاریخ وثقافت)، گندھارا ریسرچ پراجیکٹ، سوات، ص:192

201. محمود دانش ور ایرانی، کافرستان، مترجم: خلیل احمد، بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار، لاہور، ص:64

202. ماجد فرید ساٹی، مناظرِ پاکستان، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار، کراچی، ص:74 – 73تا74

203. پرویش شاہین، کافرستان (تاریخ وثقافت)، گندھارا ریسرچ پراجیکٹ، سوات، ص:149

204. محمود دانش ور ایرانی، کافرستان، مترجم: خلیل احمد، بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار، لاہور، ص:149

205. ایضاً،ص97

206. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیراہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:134

207. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:121

208. ایضاً،ص:152

209. ایضاً،ص:146

210. ایضاً،ص:96

211. ایضاً،ص:96

212. ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان اُردو بازار ، کراچی ، ص:73

213. پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:156

214. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:105
215. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:65
216. ایضاً،ص:65
217. ایضاً،ص:65
218. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:105
219. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:158
220. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:109
221. ایضاً،ص:102
222. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:66
223. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:158
224. ایضاً،ص:158
225. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:423
226. سلمٰی اعوان ،نوائے وقت سنڈے میگزین ، 19 اگست 2007ء
227. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:94
228. سلمٰی اعوان ،نوائے وقت سنڈے میگزین ، 19 اگست 2007ء
229. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:95
230. ایضاً،ص:95

231. قاری جاوید اقبال ، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں ، زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام لوک ورثہ ادارہ اسلام آباد ،پاکستان ، ناشران اُردو بازار ،لاہور ،ص:343
232. ایضاً،ص352
233. کیمی میر پوا ، (ترجمہ) محمد حسن ، سفر نامہ پاکستان ، حاجی حنیف پرنٹرز ، لاہور ، 2005ء،ص:163
234. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:150
235. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:159
236. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:31
237. ایضاً،ص:32
238. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:238
239. جی سی واکر ،ایسکوائر ،ترجمہ: یاسر جواد ، ضلع پشاور گزیٹیئر ،الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار ،لاہور ، ص:161
240. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:153
241. ایضاً،ص:151
242. ایضاً،ص:155
243. منشی محمد عزیز الدین ،تاریخ چترال ،سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ، ص:32
244. شاہد حسن رزاقی ،پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ، اداہ ثقافت اسلامیہ ،لاہور ، ص:156
245. ایضاً،:157
246. ایضاً،ص:104
247. محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار ،لاہور ،ص:103
248. ایضاً،ص:103
249. ایضاً،ص:104

250. پروفیسر شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت) ،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات ،ص:118
251. محمود دانش ور ایرانی، کافرستان، مترجم: خلیل احمد، بک ہوم آتشِ فشاں پبلی کیشنز چوک اُردو بازار، لاہور، ص:103
252. پروفیسر شاہین، کافرستان (تاریخ وثقافت)، گندھارا ریسرچ پراجیکٹ، سوات، ص:110

باب ششم:

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

سفر نامہ ایک ایسی صنفِ اَدب ہے جو بیک وقت کہانی، تاریخ، خود نوشت اور انشائیہ کا مرکب ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار تاریخ کو من و عن بیان کرنے کی بجائے اسے جزئیات اور جذبات نگاری سے اس طرح آراستہ کرتا ہے کہ فکشن کی ساری جمالیات سمٹ کر سفر نامے کا حصّہ بن جاتی ہیں۔

سفر تجربے کی وسعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ سیر و سیاحت میں نئے نئے اشخاص سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان کی خوبیاں دیکھ کر اپنی خامیوں پر نظر پڑتی ہے۔ عظیم شخصیتوں اور مشہور و معروف لوگوں سے ملاقات کرنے اور فیض حاصل کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے اور انسانی تعمیر و ترقی کے کارناموں سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے سفر سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ سفر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ انسانی قدر و منزلت میں اضافہ کرتا ہے۔ سفر ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو جسمانی اور دماغی اعتبار سے متحرک و بیدار رکھتا ہے۔ سفر انسان کو تساہل پسندی، تنگ نظری اور تنگ دلی جیسی خرابیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

اُردو کے ابتدائی دور میں جو سفر نامے لکھے گئے ان میں تاریخ اور جغرافیے کا غلبہ ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو سفر نامے قلم بند کیے گئے ان میں اگرچہ معلومات فراہم کرنے کا رجحان غالب ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سفر ناموں کا دامن وسیع ہوتا گیا اور صرف جغرافیہ اور تاریخ ہی موضوع نہ رہے بلکہ ہر قسم کی تہذیبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور سماجی معلومات کی طرف بھی سفر نامہ نگاروں نے توجہ دی اور یوں اُردو سفر ناموں کا دامن وسیع تر ہو گیا ہے اور آج کے دور میں سفر ناموں میں صرف معلومات ہی نہیں بلکہ جغرافیہ، تاریخ، ثقافت، مذہب، معاشی، سیاسی اور سماجی معلومات کو بھی سفر نامے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یوں تو اس مقالے کا موضوع بہت وسیع ہے۔اس میں تمام صوبوں کا ثقافتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس مقالے کا مقصد پاکستان کے تمام صوبوں کی ثقافت کو اُردو سفر ناموں کے تناظر میں سامنے لانا ہے۔اُردو سفر ناموں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے پاکستان کے صوبوں میں بکھرے ہوئے ان ثقافتی رنگوں سے اَدب کے دامن کو رنگینی بخشی۔

مقالہ نگار نے اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔باب اوّل میں بلحاظ صنف سفر نامہ کا تعارف ، آغاز وارتقا ، روایت اور سفر نامے کے فن کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کے بعد ثقافت کے موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ثقافت کیا ہے؟ اس کے عناصر کیا ہیں ؟ اُردو سفر نامہ نگاروں نے ان ثقافتی عناصر کو کس طرح سفر ناموں میں پیش کیا ہے؟ یہ سب اس باب میں تفصیلاً موجود ہیں۔صنف سفر نامہ اور ثقافتی عناصر اَدب کے دامن کو وسعت دیئے جارہے ہیں۔یہ صنف اَدب ، اَدب کے لیے ایک خزینہ ہے۔

سفر نامے کی تعریف اس کا فن ،روایات اور ثقافتی عناصر کی وضاحت باب نمبر 1 کا لب لباب ہے۔ثقافتی عناصر تین چیزوں مذہب ، تاریخ اور جغرافیہ سے عبارت ہیں۔ثقافت ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا ، خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی ، خارجی ہوں یاداخلی ، احاطہ کر لیتا ہے۔پاکستانی ثقافت بھی بہت جان دار ہے اور اپنے اندر ثقافتی عناصر کا بھرپور اظہار رکھتی ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے سچائی پر مبنی سفر ناموں سے اَدب کو متعارف کرایا ہے۔سفر نامہ قلبی تاثرات و کیفیات کا بہترین آئینہ دار ہے۔سفر نامے کو محض تفریح کی سطح تک لے جانا مناسب نہیں ہے۔سفر نامہ میں سچائی ضروری ہے۔خصوصاً واقعات اور مشاہدات کے سلسلے میں مصنف کا طرز بیان افسانوی ہو سکتا ہے۔لیکن حقائق کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا یا افسانوی بنانا درست نہیں۔اس سے صداقت مجروح ہوتی ہے۔اس حوالے سے اُردو سفر ناموں کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ تمام صوبوں کے ثقافتی عوامل درست حقائق کے ساتھ منظرِ عام پر آ جائیں۔

دوسرا باب ”اُردو سفر ناموں میں صوبہ بلوچستان کی علاقائی ثقافت کی پیش کش “ کے عنوان سے ہے۔اس باب میں بلوچستان کی ثقافت کے تمام پہلوؤں کو اُردو سفر ناموں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں شامل سفر نامے صرف پاکستانی سیاحوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ غیر ملکی سیاحوں کے سفر ناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے اور بلوچستان جیسا پر افتادہ اور غیر ترقی یافتہ خطہ ، جس کو اُردو سفر

نامہ نگاروں نے اس طرح بیان کیا کہ قاری محو حیرت میں پڑ گیا کہ بلوچستان کا اصل چہرہ یہ ہے۔اس باب میں ان سفر ناموں کو شامل کیا گیا ہے جس میں بلوچستان کی ثقافت کے تمام پہلوؤں کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا ہے۔اس باب میں شامل سفر ناموں کا اسلوب شگفتہ اور رواں ہے۔"آئینہ بلوچستان" بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی کا یہ سفر نامہ انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔"اجنبی اپنے دیس میں" سید شوکت علی کا لکھا سفر نامہ ہے۔چارلس میسن کا سفر نامہ "سفر نامہ قلات"، ہنری پوٹنگر کا سفر نامہ" بلوچستان وسندھ"، کیمی پوا کا سفر نامہ "سفر نامہ پاکستان" ماجد فرید ساٹی کا لکھا سفر نامہ "مناظرِ پاکستان" اور ایم زمان کھوکھر کا لکھا سفر نامہ "پشاور سے کوئٹہ تک" ہیں۔ان سفر نامہ نگاروں نے بلوچستان کے تمام ثقافتی پہلو تفصیلاً بیان کیے ہیں۔یہاں کی آب وہوا ،زبان ،خوراک ،لباس ،پیشے ،طرز رہائش ، مذہب ،رسوم ورواج کو مفصل انداز میں پیش کیا ہے کہ بلوچستان کی ثقافت کے رنگوں نے اُردو سفر ناموں کو دل چسپی کا موجب بنادیا ہے۔اسماعیل صدیقی ،سید شوکت علی شاہ ، نے صوبہ بلوچستان کے تمام رسوم ورواج ،لوگوں کے طرزِ زندگی ، محرومیاں ،جہالت ،تہذیب وتمدن ،مذہب ،تاریخ ، ثقافت اور زندگی کے مختلف شعبوں کا عمیق مشاہدہ کر کے سفر نامے کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔"سفر نامہ قلات "چارلس میسن کی تحریر ہے۔یہ سفر نامہ چارلس میسن کی ذاتی دل چسپی کا مظہر ہے۔اس نے جن خطوں کا مشاہدہ کیا۔ایمان داری سے انھیں من وعن بیان کرتا چلا گیا۔اس نے جس خطے کی سیاحت کی وہاں کی سیاحت کے پیچھے اس کی تخلیقی اور مثبت سوچ تھی۔وہ اپنے سفر نامے کو با مقصد بنانا چاہتا تھا۔اس نے جس طرح بین باریکی سے بلوچستان کی ثقافت کو اُجاگر کیا ہے ،اس سے اس کی ذاتی دل چسپی واضح ہوتی ہے۔اسی طرح ہنری پوٹنگر نے سفر نامہ "بلوچستان وسندھ" میں بلوچستان اور سندھ کی تاریخ وثقافت کو بھرپور طرح سے اُجاگر کیا ہے۔اگرچہ اس سفر نامے میں ثقافتی عناصر کم ہیں۔ان انگریزوں کی کتب کے تراجم انور رومان نے کیے ہیں۔ان کا اُسلوب شگفتہ ہے۔بلوچیوں کی طرزِ زندگی ، رسم ورواج ،زبان ،لباس ،طرزِ رہائش ،روزگار ،آب وہوا کو وضاحت سے بیان کرنے میں سفر نامہ نگاروں کا مثبت کردار شامل عمل ہے۔ماجد فرید ساٹی کا "مناظرِ پاکستان" جس میں اُنھوں نے پورے پاکستان کی سیاحت کرتے ہوئے تمام صوبوں کی ثقافت کو بے نقاب کرنے میں چنداں حصّہ ڈالا ہے۔کیمی پوا نے "سفر نامہ پاکستان" کے نام سے اپنے خیالات قلم بند کیے اور تمام ثقافتی پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ایم زمان کھوکھر کا سفر نامہ "پشاور سے کوئٹہ تک" میں تاریخی وثقافتی پہلو ملتے ہیں

ان سفر ناموں کے علاوہ گزیٹیئر بلوچستان پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج ،بلوچ اضلاع اور تاریخ ، بلوچستان کے قبائل ،قدیم بلوچستان وغیرہ۔ان تمام کتب نے بلوچستان کے چپے چپے کی روداد کو جاننے میں آسانی فراہم کی۔بلوچستان کا ہر فرد ایک داستان ہے۔یہاں کے لوگ جھونپڑیوں میں زندگی گزارتے ہیں۔معیشت کا دارومدار مویشیوں پر ہے۔ سسکتی زندگی ہے۔عورت کی بے چارگی اور کم مائیگی ان سفر نامہ نگاروں ہی کی بدولت منظر عام پر آئی ہے۔یہاں کی عورت مظلومیت اور بے چارگی کی تصویر ہے۔بلوچستان کے لوگوں کی طرزِ زندگی کے خدوخال اُبھارنے میں اُردو سفر نامہ نگاروں کی کاوشیں ہیں۔سفر نامہ نگاروں نے طرزِ معاشرت ،معیشت ،صنعت و حرفت ، تجارت ، ،زراعت ، شادی بیاہ کے رسوم ورواج ، خوشی وغمی کی رسومات وغیرہ کو اُجاگر کیا ہے۔

بلوچستان کی ثقافت بہت منفرد اور دلچسپ ہے۔بلوچستان کے طول وعرض میں بلوچ، براہوئی ، پشتون، جٹ اور دہوار وغیرہ کے نام سے یہ مختلف طبقے اور آبادیاں زمانہ قدیم سے یہاں بودوباش رکھتی ہیں۔اگرچہ یہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔مگر بلوچستان کی سب سے بڑی زبان بلوچی ہے۔زراعت اور گلہ بانی یہاں کے پیشے ہیں۔خوراک سادہ ہے ،بلوچی سجی، یخ شیریں،روسٹ ،دُنبہ یا بکرا، لسّی ،اُونٹ کا دودھ بھی استعمال کرتے ہیں۔بلوچیوں کا طرزِ زندگی سادہ ہے۔وفادار ، مہمان نواز ،وعدے کے پکے ہیں۔یہاں کے لوگوں میں غیرت کے نام پر جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔بلوچستان دورِ افتادہ خطہ ہونے کے باوجود جان دار ثقافت رکھتا ہے۔یہاں کے رسوم ورواج ،عادات واطوار ،رہن سہن منفرد ہیں۔بلوچستان کا خطہ پس ماندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد ثقافت کا امین ہے۔

اس باب میں بلوچستان کی ثقافت کو بھرپور انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس صوبے کے تمام ثقافتی عوامل کو اس باب میں پوری طرح سمونے کی کوشش کی ہے۔

باب سوّم " اُردو سفر ناموں میں صوبہ سندھ کی علاقائی ثقافت کی پیش کش " کے عنوان سے ہے۔صوبہ سندھ ایک قدیم تاریخ اور ایک قدیم تہذیب و ثقافت رکھتا ہے وادیٔ سندھ جو کہ موہن جوداڑو کی قدیم تہذیب کی وجہ سے جانا جاتا ہے ،ایک عظیم تہذیب و ثقافت کا علم بردار ہے۔صوبہ سندھ 30 -اضلاع پر مشتمل ہے۔سندھ اپنی قدامت کی وجہ سے مشہور ہے۔اس باب میں جن سفر ناموں کو شامل کیا گیا ہے۔ان میں "سفر نامہ پاکستان "،"مناظرِ پاکستان " ،"یاترا" ،"اور سندھ بہتا رہا " ، "میرا سندھو سائیں " ، "شیر دریا" ، "بلوچستان وسندھ" ، "ماروی کے دیس میں " ، "سندھو کنارے

"۔یہ سفر نامے اور صوبہ سندھ سے متعلقہ کتب "وادی سندھ -ایران اور میسو پوٹامیہ کی قدیم شاہراہیں " ، "تاریخِ سندھ" اور "گزیٹیر سندھ" ہیں۔ان کتب نے صوبہ سندھ جیسے قدیم اور عظیم صوبے کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔"اور سندھ بہتا رہا" مستنصر حسین تارڑ جیسے منُجھے ہوئے سفر نامہ نگار کا کارنامہ ہے۔ان سفر ناموں میں آب وہوا ، خوراک ، زبان ، لباس ، طرزِ رہائش ،روزگار یہ وہ عوامل ہیں ،جو کسی علاقے کی ثقافت کو سامنے لاتے ہیں۔سندھ کے تمام اضلاع ایک ثقافتی عمل کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس باب کا مقصد صوبہ سندھ کے ثقافتی عوامل تک رسائی ہے۔وادی سندھ کی تہذیب موہن جو داڑو کے ذکر کے بغیر اُدھوری ہے۔ان کا لباس ،ظروف ،زیورات ،انداز رہائش ان کی منفرد تہذیب کا پتہ دیتے ہیں۔وادی سندھ ایک ایسی تہذیب ہے جو اپنے اندر ایک شان دار تہذیب و ثقافت رکھتی ہے۔صوبہ سندھ جو دریائے سندھ کی وجہ سے بھی ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ایک قدیم تہذیب و ثقافت اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔کہا جاتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب تمام تہذیبوں میں سب سے قدیم ہے۔اگر موہن جو داڑو کا حوالہ نہ دیا جائے تو بھی سندھ کی ثقافت منفرد نوعیت کی ہے۔وادی سندھ کا خیال آتے ہی فوراً عظیم اور قدامت پسند تہذیب ذہن میں آتی ہے۔اس تہذیب میں وہ عوامل پنہاں ہیں جو یہاں کی ثقافت کو عیاں کرتے ہیں۔تھر کا ریگستان اپنے اندر بے شمار داستانیں دفن کیے بیٹھا ہے۔ان داستانوں کو اُردو سفر نامہ نگاروں نے نہ صرف کھوجا بلکہ دُنیا کے سامنے سفر ناموں کی شکل میں عیاں کیا ہے۔سفر نامہ "یاترا" تھر کے علاقے اسلام کوٹ کی منفرد ثقافت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔"ماروی کے دیس میں " بھی اسی طرح کا سفر نامہ ہے۔تھر کی سرزمین جو عمر ماروی ، نوری جام تماچی جیسے قصّوں کی وجہ سے مشہور و معروف تھی ،اُردو سفر نامہ نگاروں نے اس کی منفرد ثقافت کو آشکار کر کے اسے اَدب کے اوراق میں نمایاں مقام پر فائز کر دیا ہے۔

موہن جو داڑو ایک ترقی یافتہ علاقہ تھا ،جہاں اس وقت بھی پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں بنائی گئیں تھیں۔مکان دو منزلہ اور سہ منزلہ تھے۔کنویں ، غسل خانے اور لیٹرین بھی بنائی گئی تھیں۔گھر ہو ادار، روشن بنے ہوئے تھے۔صحن گھر کا لازمی حصّہ تھے۔ان کے بنے مکانات بہترین طرزِ تعمیر کا نمونہ تھے۔بہترین فن تعمیر اور بہترین لباس ان کی پہچان تھے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں صوبہ سندھ کے ثقافتی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ہندوستان

چوں کہ کئی تہذیبوں کا مرکز رہا ہے۔وادی سندھ موہن جوداڑو کی وجہ سے مشہور ہے۔پشاور گندھارا آرٹ بدھ مت کے حوالے سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔سفر نامہ "سندھ بہتارہا" مستنصر حسین تاڑ کی ایک اچھی کاوش ہے۔اُنھوں نے صوبہ سندھ کو منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔

"شیر دریا" رضا علی عابدی کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جس نے انھیں شہرت کی بلندیاں عطا کی ہیں۔"شیر دریا"سفر نامہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔جس میں اس نے دریا کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ان کے کناروں پر آباد بستیوں اور علاقوں کے ثقافتی پسِ منظر سے اپنے سفر نامے کو جلا بخشی۔دریا کے کنارے بسنے والے لوگوں کی عادات ، طرزِ زندگی ، طرزِ رہائش سب کو اُنھوں نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔یہ سفر اُنھوں نے لداخ سے شروع کیا اورشاہ بندر کے مقام پر ان کا یہ سفر اختتام پذیر ہوا،جہاں دریا سمندر برد ہوتا ہے ،وہ تمام مناظر اُنھوں نے سفر نامے میں قید کر دیئے ہیں۔ان کا یہ سفر نامہ دریا کے ساتھ ساتھ بسنے والو ں کی زندگی کی داستان سناتا ہے۔اس سفر نامے میں اُنھوں نے ان تمام علاقوں کی ثقافت سے روشناس کرایا ہے ، جہاں جہاں سے دریائے سندھ گزرتا ہے۔

"میرا سندھو سائیں " ڈاکٹر عباس برمانی کا سفر نامہ ہے۔یہ سفر نامہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بسنے والوں کی زندگی کا عکاس ہے۔اس سفر نامے میں ثقافتی عوامل کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ان علاقوں کی آب وہوا ،خوراک ،لباس ،پیشے ، تمام چیزیں جنھوں نے سندھ کی ثقافت کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیاہے۔اس سفر نامے میں موجود ہیں۔

"اور سندھ بہتارہا" مستنصر حسین تارڑ کا ایسا سفر نامہ ہے جس میں سفری احوال کے ساتھ ساتھ تاریخ اور اَدب سے بھی واقفیت ملتی ہے۔یہ سفر نامہ دورانِ مطالعہ قاری کو ان مقامات تک پہنچنے کا شوق اور حسرت دونوں کا بیک وقت احساس دلاتا ہے

"سفر نامہ بلوچستان وسندھ " ایک غیر ملکی سیاح ہنری پوٹنگر کی تحریر ہے اور یہ سفر نامہ تاریخ وجغرافیے پر مشتمل ہے۔اس میں ثقافتی عوامل کا اظہار بہت کم ہے۔

محمد خالد اختر کا سفر نامہ " یاترا" سرزمین تھر کے سفر نامے کی روداد ہے۔اسلام کوٹ کے لوگوں کی طرزِ زندگی منفرد ہے۔مختلف مذاہب کے رہنے والے لوگوں کی ثقافت اور بھائی چارے کی فضا کو سفر نامہ نگار نے موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔

سفر نامہ ''مناظرِ پاکستان'' اور ''سفر نامہ پاکستان'' یہ دونوں سفر نامے سندھ کی ثقافت کو روشن کرنے میں اہم ہیں۔یہ سفر نامے ثقافتی عوامل کو سامنے لانے میں ممدو معاون ثابت ہوئے ہیں۔

''ماروی کے دیس میں'' یہ سفر نامہ تھر کی سرِ زمین ،وہاں کی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔تھر تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے۔

تمام سفر نامہ نگاروں کے ہاں سب سے اہم ثقافتی عنصر آب وہوا ہے۔آب وہوا ہی وہاں رہنے والوں کی طرزِ زندگی کا تعین کرتی ہے۔آب وہوا کے مطابق لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔رہائش اختیار کی جاتی ہے۔خوراک کا تعین کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کی بودوباش مخلوط ہے۔سندھ کی آب وہوا معتدل ہے۔یہاں کے لوگ خوراک ،لباس بھی اسی کے مطابق اختیار کرتے ہیں۔صوبہ سندھ کی آب وہوا موسم گرما میں سخت گرم ہوتی ہے۔یہاں کے تقریباً تمام ہی اضلاع گرمی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔یہ لوگ سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ہر علاقے کے کچھ روایتی پکوان ہوتے ہیں جو خاص موقعوں پر بنتے ہیں۔بالکل ایسا ہی یہاں ہوتا ہے۔سندھ کی سردائی بہت مشہور ہے اور بہت پسند کی جاتی ہے۔یہاں کا مشہور حلوہ جس کی تعریف مستنصر حسین تارڑ نے سفر نامہ ''سندھ بہتا رہا'' میں کی ہے۔سندھ کی تہذیب وثقافت بڑی دل کش ہے۔یہاں مسلمانوں ، ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان مثالی بھائی چارہ قائم ہے۔سندھی محبتی اور ملن سار قوم ہے۔یہاں خوراک میں مچھلی کا بکثرت استعمال ہے۔پلہ مچھلی یہاں مرغوب مچھلی ہے۔اس کے علاوہ کھجوریں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

سندھیوں کا لباس سادہ اور خوش رنگ ہوتا ہے۔تَھر میں تو بیچاری گھونگٹ کر کے سارے کام انجام دیتی ہیں۔مرد بھی سادہ لباس پہنتے اور پگڑیاں باندھتے ہیں۔دیہاتوں اور شہروں کا کلچر قدرے مختلف ہے۔تھر کی خواتین زیورات بہت شوق سے پہنتی ہیں۔ہاتھوں میں لمبے چوڑے اور زیورات پہنے دکھائی دیتی ہیں۔سندھ کا صحرا بھی تہذیب و ثقافت کا حسین مرقع ہے۔اس باب میں شامل تمام سفر نامے اور موضوع سے متعلقہ کتب جن سے راقم نے استفادہ حاصل کیا ان کتب نے اُردو اَدب کو معلومات کا ایک خزانہ بخشا ہے۔اجرک یہاں کا روایتی لباس ہے۔جس کا اظہار ان سفر ناموں کی بدولت ہوا۔یہاں کے لوگ ہُنر مند ہیں ، محنتی ہیں۔یہاں کے لوگ زمین داری کرتے ہیں۔حیدر آباد چوڑیوں کے لیے مشہور ہے۔لوگ ہُنر مند ہیں اور دست کاری ، ، ماہی گیری اور

جانوروں کو چرانے کا کام بھی کرتے ہیں۔لوگ محنتی ہیں ، کراچی کی طرف نکل جائیں تو وہاں فیکٹریاں ، کمپنیاں موجود ہیں۔جہاں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔یہاں کے ثقافتی رنگ رسوم و رواج سے ترتیب پاتے ہیں۔یہاں کی شادی بیاہ کی رسمیں ، پیدائش اور موت کی رسمیں سب یہاں کی ثقافت میں شامل ہیں۔سندھ کی تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے میں" گزیٹیئر سندھ" ،"سندھ کے اضلاع " ، "تاریخِ سندھ" وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام کتب نے سندھ جیسے عظیم اور قدیم صوبے کی ثقافت کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔سندھ کی تہذیب وثقافت اور تاریخ کا ذکر موہن جوداڑو کے بغیر نا مکمل ہے۔موہن جوداڑو کی قدیم تہذیب نے صوبہ سندھ کو دنیا کے سامنے اہم خطہ بنادیا ہے۔اس مقالے میں مجموعی طور پر ہم نے صوبہ سندھ کی ثقافت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ موہن جوداڑو کی قدیم تہذیب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔یوں تو اُردو سفر نامہ نگاروں نے آب و ہوا پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔اُنھوں نے جس طرح باریکی سے آب و ہوا اور پھر اس کے اثرات کو سفر ناموں میں پیش کیا ہے۔یہ اُردو سفر نامہ نگاروں کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔صوبہ سندھ کا ثقافتی احاطہ کرتے ہوئے سفر نامہ نگاروں نے سندھ کے تمام اضلاع تمام علاقوں کی آب وہوا کو بیان کیا ہے اور اس آب وہو ا کے اثرات خوراک اور پیشوں پر سب سے زیادہ مفصل دکھائی دیتے ہیں۔زبانوں کے لہجو ں کو بھی اُردو سفر نامہ نگاروں نے اُجاگر کیا ہے۔معمولی معمولی لہجے کے فرق کے ساتھ صوبہ سندھ کی کئی زبانیں سامنے آئیں۔جیسے کچھی ،اردو ، گجراتی ،پنجابی ، سندھی پشتو ،راجستھانی ،بلوچی ،ہندی ،فارسی ،عربی ، بنگالی ، انگریزی ، کشمیری وغیرہ بولی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ مارواڑی اور سرائیکی جو راجستھانی اور سندھی کی بولیاں ہونے کا شرف رکھتی ہیں یہاں بولی جاتی ہیں۔مگر سندھی زبان صوبے کی سب سے بڑی زبان ہے اور یہاں بسنے والا ہر باشندہ سندھی زبان مہارت سے بولتا ہے۔یہاں بسنے والے ہندوؤں کے مسلمانوں سے آپسی روابط بہت خوش گوار ہیں۔ان کا رہن سہن ، رسم و رواج طور طریقے سب مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں۔سفر نامہ "یاترا" میں محمد خالد اختر نے ایک ہندو دوست لچھن داس کی مہمان نوازی کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔سفر نامہ نگار نے ان کے لباس ، ان کی خوراک اور رہن سہن کو خصوصی طور پر اُجاگر کیا ہے۔یہ سفر نامہ اس لحاظ سے منفرد نوعیت کا ہے۔اُنھوں نے تھر جیسے علاقے کو اپنے سفر نامے کا موضوع بنایا ہے۔اس اُردو سفر نامے نے صحرائے تھر کے علاقے "اسلام کوٹ" سے اس طرح متعارف کرایا کہ یہ خطہ اپنی پوری ثقافت کے ساتھ عیاں ہو گیا ہے۔یہاں کا

لباس بھی منفرد نوعیت کا حامل ہے۔سندھ کی قدامت پسندی ان کے رسوم و رواج میں بھی ملتی ہے۔توہم پرستی ، علاج کے طریقے ، تقدیر لکھنے کی رسم ، حال کی رسم ، قرآن سے نکاح کی رسم ، پیدائش کی رسومات ، موت کی رسومات وغیرہ صوبہ سندھ کی ثقافت کو دوسرے صوبوں کی ثقافت سے انفرادیت بخشتے ہیں۔صوبہ سندھ میں ہر طبقے کا انسان موجود ہے۔تاجر ، صنعت کار ، کاشت کار ، مچھیرے ، ملاح ، چرواہے ، گاڑی بان ،گھر یلو نوکر ، کمہار ، کھلونے ساز ، معمار ،راج ،مزدور ، لکڑ ہارے، دست کار وغیرہ میسر ہیں۔صوبہ سندھ آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا صوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت میں بھی اہم مقام و مرتبے کا حامل ہے۔صوبہ سندھ کا مجموعی جائزہ لیاجائے تو واضح طور پر سندھ عظیم تاریخ وتہذیب اور ثقافت کا اعلیٰ مرقع نظر آتا ہے۔

باب چہارم ”اُردو سفر ناموں میں صوبہ پنجاب کی علاقائی ثقافت کی پیش کش“ کے عنوان سے ہے۔اس باب کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو پنجاب کی انفرادیت اُردو سفر ناموں میں بڑی دل کش نظر آتی ہے۔پنجاب پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔پانچ دریاؤں جیسی خصوصیات نے اس کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔پنجاب کی ثقافت بہت جان دار ہے اور اپنے اندر ایک منفر د تہذیب سموئے ہوئے ہے۔پنجاب جیسی قدیم سر زمین جو 326 ق م سکندر جیسے عظیم فاتح کا سامنا کر چکی ہے۔اس کی قدامت کو ثابت کرنے کے لیے سکندر کا حوالہ ہی بہت ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے پنجاب کے ثقافتی خدو خال اُبھارنے میں بڑا اہم کردار نبھایا ہے۔اس باب کا مقصد پنجاب کے تمام اضلاع کی ثقافت سے بہرور کرنا ہے۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس باب میں ان سفر ناموں کو شامل کیا گیا ہے۔جن سے صوبہ پنجاب کی ثقافت اُبھر کر سامنے آسکے۔اس باب میں شامل سفر ناموں میں ”جو کالیاں“ ،”لاہور آوارگی“ ،”مناظرِ پاکستان “ ، ”جرنیلی سڑک“ ، ”سفر نامہ پاکستان“ ،”ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ “ ،”منزل نہ کر قبول“ ، ”میرا پاکستانی سفر نامہ“ ،”شیر دریا“، ”دیکھا پاکستان “ ہیں۔

ان کے علاوہ ”تاریخ پنجاب“ ، ”تاریخِ ملتان “،”تاریخ خوشاب “،”تاریخِ شیخو پورہ “ ، ”بھاول پور ریاست“، ”چولستان“ وغیرہ۔ان تمام کتب نے پنجاب کی تاریخ ،جغرافیے اور ثقافت کو صفحہ قُرطاس کی زینت بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔پنجاب کی آب وہوا پر اور زبان پر بھی سفر نامہ نگاروں نے خاصی خامہ فرسائی کی ہے مگر خوراک پر سب سے زیادہ مواد ملا ہے۔تمام سفر نامہ

نگار جہاں جہاں سے گزرے وہاں کی خوراک ، آب وہوا ،روز گار ،زبان سب کو اپنے اپنے سفر نامے کا حصّہ بناتے گئے۔

رضا علی عابدی نے "جرنیلی سڑک" میں گجرانوالہ کے لوگوں کی خوراک پر روشنی ڈالی ہے۔یہاں کے لوگ اچھی خوراک کھاتے ہیں۔یہاں کے لوگ گلاس بھر کر دودھ پیتے ہیں ، اس لیے دودھ جیسی رنگت کے مالک ہیں۔

"لاہور آوارگی" میں مستنصر حسین تارڑ لاہور یوں کی خوراک پر لکھتے ہیں۔زندہ دل لوگوں کا شہر ہے۔حلوہ پوری ، آلو چنے ،قیمے کی ٹکیاں ،سری پائے ، مغز ،دہی کی موٹی بالائی ،جگہ جگہ ٹھیلے ، ریڑھیاں ،ڈھابے ،لاہور شہر کی رونقیں دوبالا کرتے ہیں۔لاہور شہر کا ناشتہ ،ہر مقام کا لا جواب ہے۔مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں کہ اگر یہاں کا ناشتہ گاہک کو پسند نہ آئے تو ان کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ذائقہ نہ ہو تو یہ سری پائے کا شوربہ دکان دار کے منہ پر پھینک دیتے ہیں۔یہی حال کھانوں کا ہے۔کہیں جلیبیاں بنتی نظر آتی ہیں ،کہیں سموسے گرم تیل سے نکل رہے ہیں۔لاہور کا کلچر بہت خوب صورت ہے۔جیسی ان کی تہذیب دل کش ہے ، ایسی ہی ثقافت بھی اپنی رنگینی کی وجہ سے دل کش رنگوں سے مزین ہے۔ثقافت دراصل کسی خاص انسانی گروہ کی زبان ،لباس ،رہائش ،رسوم و رواج ، اعتقادات ، شعر و موسیقی ،کھیل ،تہوار ،سامان وزیبائش،دست کاریاں اور آدابِ گفت گو کا احاطہ ہے۔پنجاب کی آبادی کا زیادہ حصّہ دیہاتوں پر مشتمل ہے۔اس لیے لوگ شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔پہلے دو منزلہ مکانات دیہاتوں میں معیوب سمجھے جاتے تھے۔اب تو بکثرت دومنزلہ بلکہ 3 منزلہ مکانات بھی نظر آتے ہیں۔ہڑپہ یہاں کا مرغوب ناشتہ حلوہ پوڑی ہے۔30 کلو میٹر کے فاصلے پر ساہیوال ہے۔ڈیرہ غازی خان کھجوروں کی بہتات کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔یہاں کا حلو ہ بہت مزے دار ہوتا ہے۔سارا پنجاب ثقافت کا گہوار ہ ہے۔اس مقالے میں ،تقریباً تمام علاقوں کی خوراک کو شامل کیا گیا ہے۔جھنگ ،فیصل آباد ،لاہور ، گوجرانوالہ ، گجرات ، ساہیوال ،ہڑپہ ،خوشاب ، چنیوٹ ،شیخوپورہ ، چولستان کی خوراک ایسی ہے جو اسے پورے پنجاب میں منفرد مقام دلاتی ہے۔اس باب میں خوراک میں شامل جڑی بوٹیاں بھی استعمال ہوتی ہیں۔روز گار بھی کسی علاقے کی ثقافت کا پتہ دیتے ہیں۔یہاں ہر قسم کی پیداوار ہے۔زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتیں بھی ہیں۔ہنڈ کے لوگ سونا نکالنے کا کام کرتے ہیں۔مویشی پالتے ہیں۔نسل بڑھا کر فروخت کرتے ہیں۔صوبہ پنجاب میں 70 فیصد لوگ

زراعت سے وابستہ ہیں۔پنجاب کا لباس سادہ ہے۔دیہاتوں میں دھوتی ، کرتہ اور پگڑی ان کا پسندیدہ لباس ہے۔کھُسہ مردوں میں پہننے کا رواج ہے۔

سیدھے سادے لوگ اور ایسی ہی ان کی باتیں ہیں۔پنجاب کے لوگوں کا رہن سہن سادہ ہے۔یہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔دیہاتوں میں اس کا رواج زیادہ ہے۔دیہاتوں میں آدھی رات کو بھی مہمان آجائے تووہ اسے خدا کی رحمت تصور کرکے اس کی خاطر داری کرتے ہیں۔پیدائش اور موت کی رسمیں شادی بیاہ کی رسمیں یہ تمام رسومات پنجاب کی ثقافت کو اُجاگر کرتی ہیں۔اس باب میں پنجاب کی ثقافت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔پنجاب کا کلچر اپنی جگہ انفرادیت کا حامل ہے۔اس پورے باب میں پنجاب کے ہر حصّے کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہمارے اُردو سفر نامہ نگاروں مستنصر حسین تارڑ جیسے منجھے فن کار نے ''لاہور آوارگی '' کے نام سے ایک مُنفرد سفر نامہ قلم بند کیاہے۔یہ ایک ایسے عاشق کی داستان ہے جو اپنے شہر سے عشق کرتا ہے اور اسی عاشقی کا مظاہرہ اُنھوں نے لاہور شہر کی سیاحت کرتے ہوئے ''لاہور آوارگی'' میں کیاہے۔

وہ لاہور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ لاہور کے انگ انگ سے محبت میرے وجود کا ایک اٹوٹ حصّہ ہے۔اس سفر نامے میں پنجاب کی ثقافت کا تاثر ملتا ہے۔

''لاہور آوارگی'' میں مستنصر حسین تارڑ نے لاہور کی خوراک کو سب سے زیادہ اُبھارا ہے۔قدیم رہائش طرز پر بھی قلم فرسائی کی ہے اور منفرد معلومات سے روشناس کرایا ہے۔ان کا سفر نامہ ''جو کالیاں''سٹوپوں کا شہر سوات اور پنجاب کا واٹر چلیانوالہ اور جو کالیاں کی سیر وسیاحت پر مشتمل سفر نامہ ہے۔یہ ایک منفرد انداز کی معلومات پر مبنی سفر نامہ ہے۔ٹلہ جوگیاں اللہ والوں کا مسکن رہا ہے۔پورن بھگت ، ہری بھرتری ، بابا گرونانک اور ہیر رانجھے کی روحیں ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر بھٹکتی پھرتی ہیں۔مستنصر حسین تارڑ نے اس سفر نامے میں مختلف نوعیت کی معلومات سے قاری کو متاثر کیا ہے۔اس سفر نامے میں ثقافتی عناصر قدرے کم اور تاریخی اور معلوماتی عناصر زیادہ ہیں۔

''ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور'' ثقافتی عوامل سے بھرپور سفر نامہ ہے۔احمد ندیم قاسمی ایک ماہر افسانہ نگار ہیں۔اُنھوں نے اس سفر نامے میں ایک فرضی کردار لے کرلاہور شہر کا احاطہ کیا ہے۔لوگوں کی سوچ ،ان کے کردار ،رویے کس طرح کے ہیں ،اس سفر نامے کے ذریعے کافی حد تک عیاں ہوتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ انگریزوں کو گئے ستر سال ہوگئے مگر ہمارے ہاں کے لوگ آج بھی

ان سے بے حد مرعوب ہیں کہ اگر سفید رنگت کے بچے کو دیکھیں تو کہتے ہیں ”او ویکھو انگریز دا پتر “۔اُنھوں نے لاہور کی ثقافت کو ایک غیر ملکی سیاح کے تناظر میں پیش کیا ہے۔اس سفر نامے میں شہر لاہور کی شادی بیاہ کی رسمیں ، مہمان نوازی ،طرز زندگی کو منفرد اور وضاحت سے پیش کیا ہے۔لباس کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔اس سفر نامے سے منفرد قسم کی معلومات قاری کے لیے دل چسپی کا باعث ہیں۔

بلراج ساہنی کا سفر نامہ ”میرا سفر نامہ پاکستان“ کے عنوان سے ہے۔بھیرہ ان کی جنم بھومی ہے۔بھیرہ جانا چاہتے تھے ، لاہور جھنگ ، بھیرہ ،سرگودھا ،لاہور ،راولپنڈی کی سیاحت کی اور اپنے سفر نامے کو پنجاب کی ثقافت سے مزین کیا۔اُنھوں نے پنجاب کی زبان پر بہت لکھا ہے۔اس سفر نامے میں بلراج ساہنی اپنی مادری زبان پنجابی پر بہت ناز کر رہے ہیں۔اُنھوں نے جھنگ کی زبان پر بھی لکھا کہ یہ میٹھی زبان ہے۔بلراج ساہنی نے ثقافتی عوامل میں سب سے زیادہ زبان ،خوراک اور لباس پر روشنی ڈالی ہے۔بلراج ساہنی نے سفر نامے میں پنجاب کے ان علاقوں کے طرزِ رہائش ،مکانات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے اور پنجاب کی ثقافت سے سفر نامے کو رعنائی بخشی ہے۔سفر نامے کے تجزیے سے یہاں کے تمام ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔روز گار کے ذرائع پر بھی بلراج ساہنی نے اپنے سفر نامے میں بات کی ہے۔لباس کسی بھی معاشرے میں ثقافت کا امین ہوتا ہے۔پنجاب کا لباس منفرد ہے اور اس میں پنجاب کی ثقافت کے رنگ نظر آتے ہیں۔دوہتی ،کرتہ ،پگڑی ، کُھسے یہاں کا منفرد لباس ہے۔عورتوں کا لباس بھی منفرد نوعیت کا ہے۔زراعت یہاں کا مقامی پیشہ ہے۔لوگ محنتی ،جفاکش اور ہُنر مند ہیں۔مہمان نوازی ،فراغ دلی ان کی اعلیٰ خصوصیات ہیں۔اس باب میں ان تمام ثقافتی عوامل کو تفصیلاً پیش کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس باب کے ذریعے صوبہ پنجاب کی ثقافت کھل کر عیاں ہو جائے۔

باب پنجم ،یہ باب ” اُردو سفر ناموں میں صوبہ خیبر پختونخوا کی علاقائی ثقافت کی پیش کش“ پر مشتمل ہے۔اس باب کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو خیبر پختونخوا کی روایات ان کی قدامت پسندی ان کی دل کش ثقافت اپنی انفرادیت کے ساتھ اُردو سفر ناموں میں بڑی خصوصیت کے ساتھ عیاں ہے۔ خیبر پختونخوا جس کا پرانا نام صوبہ سرحد ہے۔پہاڑی سلسلوں پر مشتمل یہ صوبہ حُسن کی دولت سے مالا مال ہے۔شمالی علاقہ جات کی خوب صورتی ،تہذیب اور ثقافت نے اس صوبے کو مزید اہمیت کا حامل بنا

دیا ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے اس صوبے کو جس طرح عیاں کیا ہے ، اس نے صوبے کی تہذیب ، ثقافت اور حُسن کو انفرادیت بخشتی ہے۔پشاور خیبر پختونخوا کا صدر مقام ہے۔پشاور کو ایک قدیم ترین شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔یہ شہر تجارتی ، تاریخی ، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔اس صوبے پر جتنا زیادہ اُردو سفر نامہ نگاروں نے لکھا ہے۔شاید ہی کسی اور صوبے پر اتنی نظر ثانی کی گئی ہو۔یہاں کا حُسن سفر نامہ نگاروں کو بے حد متاثر کرتا ہے۔یہ باب تمام ابواب سے زیادہ طوالت اختیار کیا گیا ہے۔اس صوبے کی تاریخ ،تہذیب ، حُسن و جمال ،ثقافت اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہے اور یہی وسعت اس صوبے کو تمام صوبوں سے انفرادیت بخشتی ہے۔اس باب کا مقصد اس صوبے کی ثقافت سے شناسائی ہے۔اس شناسائی کو حاصل کرنے کے لیے اس باب میں چند منتخب سفر ناموں کو شامل کیا گیا ہے۔صوبہ خیبر پختونخوا پر لکھے گئے سفر ناموں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر سب کو شامل کرنا ممکن نہیں۔چند منتخب سفر نامے جو اس صوبے کی ثقافت کو واضح کرتے ہیں۔شامل باب ہیں۔ان میں فضل ربی راہی کا سفر نامہ ”سوات سیاحوں کی جنت“ وادی سوات کے چپے چپے کی ثقافت کو اس سفر نامے میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔وادی سوات کی رنگا رنگ ثقافت سے مزین یہ سفر نامہ معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔وادی سوات اور اس سے ملحقہ علاقوں کی آب و ہوا ،خوراک ،لباس ، طرزِ رہائش ، رسوم و رواج ،عادات و اطوار وغیرہ اس سفر نامے میں منفرد انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ان تمام عوامل نے صوبہ خیبر پختونخوا کی ثقافت کو بھر پو انداز سے واضح کیا ہے۔سفر نامہ پاکستان کیمی پوا کا تحریر کردہ سفر نامہ ہے۔اُنھوں نے پورے ملک کی سیاحت کی اور اس کے اثرات سفر نامے میں قلم بند کیے۔اُنھوں نے منفرد انداز میں اس صوبے کی ثقافت کی عکاسی کی ہے۔

”سفر شمال کے“ ، ”چترال داستان“ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ہیں۔ان سفر ناموں میں تارڑ ان علاقوں کی ثقافت سے روشناس کراتے ہوئے اَدب کے قاری کو مفید معلومات فراہم کر رہے ہیں۔”سندر چترال“ کالاش کی ثقافت کو عیاں کرتا ہے۔یہ سفر نامہ سلمیٰ اعوان کے قلم کا شاہکار ہے۔اُنھوں نے کالاش کی ثقافت کا اپنے اس سفر نامے میں بھر پور اظہار کیا ہے۔”جو کالیاں“ مستنصر حسین تارڑ کا وہ سفر نامہ ہے جس میں اُنھوں نے سوات شہر ،وہاں کے مذہب اور ثقافت کو بیان کیا ہے۔مستنصر حسین تارڑ ایک منجھے ہوئے سفر نامہ نگار ہیں۔شمالی علاقہ جات پر اُنھو ں نے بے شمار سفر نامے لکھے ہیں جو ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔”جرنیلی سڑک“ رضا علی عابدی کا ایک منفرد سفر

نامہ ہے۔جس میں اُنھوں نے سڑک کے ساتھ ساتھ بسے لوگوں کے خدوخال اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔"گڈ بائی شہر نو" اپنی طرز کا ایک منفرد سفر نامہ ہے۔اگرچہ یہ سفر نامہ افغانستان کا ہے مگر سیاح افغانستان کے بارڈر تک پہنچنے کے لیے جن جن علاقوں سے گزرا ،اس نے اس کا خلاصہ اس سفر نامے میں بیان کیا ہے۔ان علاقوں کی ثقافت بھی اس سفر نامے میں بیان ہوئی ہے۔پاڑہ چنار کے لوگوں کا حُسن و جمال ، ان کی تہذیب اور معاشرت میں ایک کشش تھی وہ مہمان نوازی میں بے مثال تھے۔امن پسند اور سادگی پسند لوگ تھے۔یہاں کے لوگ تہذیب یافتہ ہیں۔یہاں شرح خواندگی بھی زیادہ ہے۔یہ سفر نامے صوبہ خیبر پختون خوا کی ثقافت کو بھرپور انداز میں سامنے لانے میں معاون و مدد گار ثابت ہوئے ہیں۔"سفر گزشت" عبدالحفیظ مرزا کے سفر ناموں پر مشتمل کتاب ہے۔یہ سفر نامہ مختلف ملکوں اور شہروں کے سفر کی روداد سناتا ہے۔جب کہ مقالے کا موضوع پاکستان کے سفر نامے ہیں۔اس لیے "سفر سرگزشت" میں صرف پاکستا ن کے خطوں کی سیاحت کے بیان کا جائزہ لیا گیا ہے۔عبدالحفیظ مرزا نے اپنے سفر نامے میں سوات ،پشاور ،درہ آدم خیل اور راولپنڈی سے ایرانی بارڈر تک کے احوال شامل کیے ہیں۔اُنھوں نے اسی سفر نامے میں وادی سوات کے حسین علاقوں مدین اور بحرین کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ ثقافتی عوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔سوات کی سیاحت کے بعد پشاور کے لوگوں کی ثقافت اور تہذیب کو بھی بیان کیا ہے اور یہاں کے تہذیبی اور تاریخی خطوط سے قاری کو بھی روشناس کرایا ہے۔"دوسفر" یہ سفر نامہ محمد خالد اختر کا تحریر کردہ ہے۔اس میں سوات اور خنجراب کی سیاحت کو بیان کیا گیا ہے۔وادی سوات کی دل کشی اور وہاں کے لوگوں کا رہن سہن ،طور طریقے ،رسم ورواج پر وہاں کی ثقافت کی گہری چھاپ ہے۔ان کی دل کش اور رنگین ثقافت ہے جس کو بے نقاب کرنے میں اُردو سفر نامہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اسی طرح "کیلاش کتھا" عباس برمانی کا ہلکے پھلکے انداز میں لکھا ہوا سفر نامہ ہے جس میں ثقافتی عوامل بھی نمایاں ہوئے ہیں۔سفر نامہ "دھمالیک سوات" آغا سلمان باقر نے لکھا ہے ،یہ سفر نامہ سوات کی ثقافت اور حُسن کے اظہار پر مشتمل ہے۔"کافرستان" دوسفر نامے اس مقالے میں شامل ہیں۔یہ دونوں سفر نامے ثقافتی عوامل سے بھرپور بہترین سفر نامے ہیں۔پرویش شاہین اور محمود دانش ور ایرانی دونوں نے کافرستان کی ثقافت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہاں کے تمام ثقافتی عوامل منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔وہاں کے تمام رسوم ورواج ،رہن سہن ، طور طریقے سب بالکل مختلف ہیں۔یہ خطہ کالاش پاکستان کی

سرزمین پرضرور ہے مگر یہاں کی تہذیب و ثقافت بالکل الگ سے ہے۔یہ لوگ مذہبی اعتبار سے بھی بالکل الگ ہیں۔ان کے کثیر تعداد میں پیشوا ہیں جن کی یہ عبادت کرتے ہیں۔کالاش کی ثقافت بالکل الگ اور منفرد ہے۔ایم زمان کھوکھر کا سفر نامہ ”پشاور سے کوئٹہ تک “ یہ ایک معلوماتی سفر نامہ ہے۔جس میں تاریخ اور جغرافیہ بھی شامل ہے۔اس میں ثقافتی عناصر اگرچہ بہت کم ہیں۔”مناظرِ پاکستان “ ماجد فرید ساٹی کا سفر نامہ ہے۔اس سفرنامے میں پورے ملک کی سیاحت کو بیان کیا گیا ہے۔ماجد فرید ساٹی ایک ماہرِ فن کار ہیں۔اُنھوں نے اپنے اس سفر نامے میں صوبہ خیبر پختونخوا کی تہذیب و ثقافت پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔صوبہ خیبرپختونخوا کی ثقافت کو اُردو سفرنامہ نگاروں نے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔یہ سفرنامے صوبے کی تہذیب و تاریخ اور ثقافت کو پیش کرتے ہیں۔یہ سفرنامے اوران سے ملحقہ کتب ”گزیٹیئر پشاور“ ، ”تاریخ چترال“، ” تاریخ پشاور“،” تاریخ کوہاٹ“، ”ثقافت سرحد ،تاریخ کے آئینے میں“ ہیں۔یہ تمام کتب صوبہ خیبرپختونخوا جیسے قدیم اور عظیم صوبے کی تاریخ ،جغرافیے اوران سب سے بڑھ کر ثقافت کو اُجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔تمام ثقافتی عوامل اس صوبے کو انفرادیت بخشتے ہیں۔مجوزہ موضوع کے مطابق سفرناموں کا ثقافتی تجزیہ ہی مقالے کا مقصد ہے۔اُردو سفرنامہ نگاروں کے ثقافتی عوامل سے بھرپور سفرنامے اس باب میں پیش کیے گئے ہیں۔

سفرنامہ نگاروں نے ثقافتی عوامل میں سے آب وہوا کو موضوع بنایاہے۔ کیوں کہ آب وہوا تمام ثقافتی عناصر پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔کیوں کہ جیسی آب وہوا ہوگی ویسا ہی لباس خوراک اور طرز رہائش اختیار کرنی پڑتی ہے۔سوات کی ہی آب وہوا کو لیجیے جوں جوں آگے بڑھتے جائیں آب وہوا بدلتی جاتی ہے۔بحرین ،مدین مالم جبہ ،کالام وغیرہ نہایت ہی سرد علاقے ہیں۔برف باری یہاں کی زندگی کو بھی متاثر کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کی طرز زندگی سوات کے دوسرے علاقوں سے مختلف ہے۔سفرنامہ نگاروں نے خوراک پر سب سے زیادہ لکھاہے۔تقریباً تمام ہی سفرنامہ نگاروں نے یہاں کی خوراک اورروایتی کھانوں کوبیان کیاہے۔پشاور کا کابلی پلاؤ ، افغانی پلاؤ ،افغانستان کا کابلی پلاؤ ، چپلی کباب ،چرسی تکہ ،کڑھائی وغیرہ یہاں کے مشہور پکوان ہیں۔

سلمیٰ عوان نے قصّہ خوانی بازار کے چپلی کبابوں کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس بازار کے چپلی کبابوں کی خوشبو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔پشاور میں میٹھی حلیم کھائی جاتی ہے۔گوشت ، گندم

اجناس سے ملا کر بنتی ہے۔اس پکوان میں دیسی گھی ، چینی ،انڈے ملا کر ناشتے میں کھایا جاتا ہے یہ پشاور کا مقبول اور ہر دل عزیز پکوان ہے۔گائے اور بھینس کے سری پائے پنجاب سے بالکل الگ بنتے ہیں۔مٹی کے مٹکے میں بننے والا یہ مرغوب پکوان ہے۔اس کے علاوہ قدیم بازاروں میں اوجڑی بھی دن کے اوقات میں بکتی ہے۔وادی سوات کے بل دار مکھن کے پراٹھے بے مثال ہیں اور ان کے ساتھ کھیروں کا لاجواب سالن بھوک بڑھا دیتا ہے۔آغا سلمان باقر "دھماکہ لیک سوات " میں یہاں کے کھانوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی اشتہا انگریز خوشبو بھوک چمکا دیتی ہے۔مٹلتان سوات کا آخری کنارا ہے۔یہاں جون جولائی میں بھی برف دکھائی دیتی ہے اور ایسی ٹھنڈی ہوائیں سوا گت کرتی ہیں کہ یہاں کی گرمیاں سردیوں کا منظر پیش کرتی ہیں۔یہاں کی جھیلیں خوب صورتی میں بے مثال ہیں۔یہاں کی ٹراوٹ مچھلی لذت اور غذائیت میں مشہور ہے۔مستنصر حسین تارڑ "سفر شمال کے " میں یہاں کے چپلی کبابوں کی تعریف میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی خوشبو ایسا متاثر کرتی ہے کہ خریدنے پر مجبور کر دیتی ہے۔منگورہ وادی سوات کا خوب صورت اور بارونق شہر ہے۔یہاں کے سیخ کباب ، کڑ اہی تکے ، مرغ کڑاہی ، چکن اور روسٹ چکن ذائقے اور لذت کے لیے خاص مشہور ہیں۔پشاور کا چنا ، میوہ پلاؤ انتہائی لذیذ ہوتا ہے اور خوشی و غمی کے مواقع پر دیگیں بنتی ہیں۔یہی پلاؤ گوشت میں بھی بنتا ہے۔گوشت ہو یا صرف چنے دونوں صورتوں میں یہ ایک لذیذ پکوان ہے۔قہوہ پشاور کا مشہور مشروب ہے۔مہمان داری میں بھی اس کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔یہ وہاں کا روایتی مشروب ہے۔اس کے علاوہ کاچی ، گنے کا شیرا ، فالودہ ، توتیا موتیا ، گاجر کا پانی اہم اور لذیذ مشروب ہیں۔یہاں کھوئے کی قلفی انتہائی لذیذ ہوتی ہے۔یہاں چرسی کڑاہی اور چرسی تکہ انتہائی لذیذ بنتے ہیں۔کالام کا قدرتی پیدا شدہ سچل کا ساگ اور مکئی کی روٹی بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔کوہستان کے لوگ شہد ، دیسی گھی ، مکئی کی روٹی ، ساگ ، میوہ جات بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔اس صوبے کے عوام چوں کہ ان پڑھ ہیں ، اس لیے توہم پرست ہیں۔ضعیف الاعتقادی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔یہاں کے لوگوں کا لباس سادہ ہے۔کھلے پائنچوں کا پاجامہ ، ڈھیلی قمیض اور پگڑی باندھتے ہیں۔کچھ لوگ پگڑیاں بہت اونچی باندھتے ہیں۔چمڑے کی ایک پٹی کمر کے گرد باندھتے ہیں جس کے ساتھ وہ تلوار یا پستول لٹکاتے ہیں۔سردیوں میں پگڑیوں کے نیچے ٹوپی پہنتے ہیں۔عورتیں سادہ لباس اور زیورات پہنتی ہیں۔جب کہ کافرستان صوبہ خیبر پختونخوا کا وہ علاقہ ہے جہاں عورتیں سیاہ

لباس زیب تن کرتی ہیں۔شلوار نہیں پہنتی ہیں بلکہ صرف سیاہ رنگ کا چوغا پاؤں تک لمبا پہنتی ہیں۔یہ سیاہ کافر کہلاتے ہیں جب کہ سرخ کافروں کے مسلمان ہونے سے ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

یہاں کے لوگ غریب محنت کش ہیں جو کام مل جائے اسے پوری لگن سے کرتے ہیں۔چترال کے لوگ تجارت پیشہ ہیں۔وادی سوات میں اسٹوپوں کا کاروبار منافع بخش ہے۔وادی دیر میں بے روز گاری بہت ہے۔جن کے ہوٹل ہیں وہ تو ٹھیک ہیں ، باقی مارے مارے پھرتے ہیں۔اُردو سفر نامہ نگاروں نے یہاں کے لوگوں کے روزگار کو بہت خوب انداز میں پیش کیا ہے۔کھڈیوں پر کپڑے اور پردے بنانے کا کام کرتے ہیں۔یہاں کے لوگ کھیتی باڑی سے بھی منسلک ہیں۔خیبر پاس اور پشاور کے گردونواح میں لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔یہاں مٹی کے برتن ،تانبے کے برتن بنانے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔غرض خیبر پختونخوا اپنی رنگارنگ ثقافت کی وجہ سے منفرد نظر آتا ہے۔یہاں کے لوگوں کے روزگار میں بھیڑ کی اُون سے کپڑے بنتے ہیں۔گائے کے چمڑے سے جوتے بنائے جاتے ہیں۔سنار زیورات بناتے ہیں۔غرض اس صوبے کے لوگ محنتی ، جفاکش ہیں۔صوبے میں لکڑی کے مکانات کا رواج ہے یہ مکانات دو سے تین منزلہ بھی ہیں۔دیہاتوں کے مکانات کچے ہیں۔امیر لوگوں کے مکانات بہترین ہیں۔کاغان ، ناران ، بحرین یہاں پتھر کے مکانات ہیں۔جو دو منزلہ بوسیدہ گھر ہیں۔کوہستان میں لکڑی کے مکانات ہیں۔سوات میں بھی مکانات لکڑی کے ہیں کیوں کہ یہ گھر موسمی اثرات سے بچاؤ کے لیے تعمیر کیے گئے ہیں۔لکڑی کے گھر موسم کی شدت سے بچاتے ہیں۔مٹی کے مکانوں میں بھی لوگ رہتے ہیں۔غاروں میں بھی لوگ رہائش پذیر ہیں۔وادی سوات کے لکڑی کے بنے مکانات کھلے صحنوں پر مشتمل ہیں ، اب یہاں کے لوگوں کے حالات بھی بہتر ہو گئے ہیں۔کاغان میں پہاڑوں پر بنگلہ نما مکانات تک تعمیر ہیں۔کافرستان کے مکانات چھوٹے چھوٹے اور ہر مکان تین منزلوں پر مشتمل ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔غیرت کے نام پر جان دینے اور لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔اس صوبے کے لوگوں کی عادات و اطوار ،خوشی و غمی کی رسومات سب دوسرے صوبوں سے الگ ہیں۔صوبہ خیبر پختونخوا اپنی ایک منفرد ثقافت کے حامل ہیں۔خطہ کافرستان ہر لحاظ سے مختلف ہے اور یہ لوگ پاکستان میں بسنے والے تمام لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ان کی

عبادات ،مذہب سب بالکل الگ ہیں۔لباس ان کا وہ سب سے الگ اور مُنفرد ہے۔ان کا خطہ پُر سکون ہے۔یہ باہر سے آنے والے لوگوں کو اپنے علاقے میں مستقل ٹھہرنے نہیں دیتے۔الغرض یہ تمام ابواب اُردو سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کے ترجمان ہیں اور تمام صوبوں کی انفرادیت کو بیان کرتے ہیں۔یہ مقالہ پاکستان کے تمام صوبوں کا ثقافتی احاطہ پیش کرتا ہے۔

پاکستانی اسفار پر مبنی اُردو سفر نامے پاکستان کے تمام صوبوں کی ثقافت کو سامنے لانے کا موجب بنے ہیں۔یہ سفر نامے جن کی مدد سے مقالہ اختتام پذیر ہوا۔اس موضوع میں تنوع بدرجہ اتم موجود ہے۔مختلف سیاحوں کے ہاں فکر ونگاہ کے مختلف رنگ ہمیں پاکستان کی تہذیب وثقافت ،معیشت و معاشرت ،تاریخ ،مذہب اور سیاست کو سمجھے میں مدد دیتے ہیں۔یہ سفر نامے مختلف خطوں کی ثقافت سے پردہ اُٹھانے کا موجب بنے ہیں۔وہ تمام سفر نامے جو اس مقالے میں شامل ہیں ،یہ اسفار ثقافتی عوامل کو اُبھارنے اور انھیں سامنے لانے کا موجب بنے۔یہ اُردو سفر نامے ہماری پہچان کا باعث بھی ہیں اور شعور و آگہی کی طرف ہماری راہ نمائی بھی کرتے ہیں۔

ان اُردو سفر ناموں کا مطالعہ کر کے ہم تمام صوبوں کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور اپنے پورے ملک کے ثقافتی عناصر سے پوری طرح شناسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ب۔ نتائج:

مجموعی طور پر ہم پاکستانی اسفار پر مبنی سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی کے بعد درج ذیل استخراجی نتائج تک پہنچتے ہیں۔زیرِ نظر مقالہ پاکستان کے تمام صوبوں کی علاقائی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ثقافت ہی کی بدولت کوئی بھی علاقہ یا خطہ اپنے نقوش کے ساتھ واضح طور پر اُبھرتا ہے۔اُردو سفر نامہ نگاروں کا یہ طرہ ہے کہ اُنھوں نے جس خطے کی ثقافت کو پیش کیا وہ پورا علاقہ اپنی مخصوص اور انفرادی خصوصیات کے ساتھ صفحہ قُرطاس کی زینت بن گیا ہے اور اَدب کے قاری کے لیے بیش بہا خزانے کے روپ میں محفوظ ہو گیا ہے۔

- ثقافتی عوامل میں آب و ہوا وہ عنصر ہے جس پر سفر نامہ نگاروں نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔بلوچستان کی ثقافت کے جائزے سے یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ اُردو سفر نامہ نگاروں نے سب سے زیادہ آب و ہوا پر لکھا ہے۔آب و ہوا ہی وہ عنصر ہے جو کسی علاقے کی ثقافت کا تعین کرنے میں سب سے زیادہ اہم ہے۔جغرافیائی صورتِ حال ان ثقافتی عناصر کو ترتیب دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔بلوچستان کے ہر ضلع کی آب و ہوا مختلف ہے۔آب و ہوا تمام ثقافتی عناصر پر اثر انداز ہوتی ہے۔آب و ہوا کے اثرات خوراک ، بود و باش ،رہن سہن ، لباس ، رہائش پر مرتب ہوتے ہیں۔بلوچستان کی آب و ہوا کی وجہ سے یہاں خوراک میں گوشت کا استعما ل زیادہ ہوتا ہے۔سردی کی شدت سے بچنے کے لیے یہ لوگ بھیڑ بکریوں کا گوشت اپنی خوراک میں زیادہ استعمال کرتے ہیں۔متوسط طبقہ گندم کا استعمال کرتا ہے۔نچلا طبقہ معاشی لحاظ سے اتنا زیادہ مضبوط نہیں ہے۔اس لیے وہ جواری اور باجرہ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔سردی سے بچنے کے لیے جڑی بوٹیوں کا نشاستہ بھی بناتے ہیں۔
- بلوچوں کی عادات کو سفر نامہ نگاروں نے متعارف کرایا ہے۔بلوچی وعدے کا پاس رکھتے ہیں۔اپنی جان سے بڑھ کر وعدے کی پاس داری کا احترام کرتے ہیں۔ہمسائے کے ساتھ حُسن سلوک کو اولیت دیتے ہیں۔رسم بجار ایک دوسرے کی مدد کرنے کی رسم بلوچوں کی اخلاقی خوبیوں کی ضامن ہے۔

- بلوچ قوم چوں کہ قبائل پر مشتمل ہے ، عورت کے پردے کا خصوصی طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔اجنبیوں کو گھروں میں نہیں بلاتے۔یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ نگاروں نے لباس اور رہائش پر کم لکھا ہے۔کیوں کہ یہاں تک ان کی رسائی کم ہے۔دور دور سے جتنی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں ، وہ ہی سفر ناموں کا حصّہ بنی ہیں۔بلوچی مہمان کے معاملے میں اتنے فراخ دل نہیں ہیں۔اجنبیوں کو مسجد میں ٹھہراتے ہیں ، نمازی یا سردار ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں۔سفر نامہ نگاروں نے آب و ہوا کے ساتھ ساتھ خوراک اور پیشوں پر بھی تفصیلاً لکھا ہے۔صوبہ بلوچستان کا سب سے بڑا روز گار تجارت ہے۔جس کے لیے وہ بعض غیر قانونی طریقے بھی اختیار کرتے ہیں۔کراچی ، کوئٹہ ، پشاور ، نوشہرہ جیسے مشہو ر شہروں کی باڑہ مارکیٹیں انہی کی مرہونِ منت ہیں۔
- بلوچستان کے تمام اضلاع میں انتقام لینا اور سزا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔یہاں خون بہا کا رواج بھی ہے۔بدلہ نہ لینا بزدلی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔غیرت کے نام پر قتل کرنا یہاں کے لوگوں کا وطیرہ ہے۔یہ رسم نسل در نسل چلتی ہے۔عجیب و غریب طریقے علاج کرنے کے ہیں۔
- بریگیڈئیر اسماعیل صدیقی کا سفر نامہ ثقافت کا بھر پور اظہار ہے۔ثقافتی روداد ہے۔چارلیس میسن ”سفر نامہ قلات“ میں صرف ثقافت ہی نہیں بلکہ تاریخ اور دوسری معلومات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔”سفر نامہ پاکستان “میں کیمی پوا نے صرف کوئٹہ پر ہی لکھا ہے۔اس میں ثقافتی عناصر بہت کم ہیں۔سید شوکت علی شاہ کا سفر نامہ ”اجنبی اپنے دیس میں “ ثقافتی عوامل پر مشتمل ہے۔ماجد فرید ساٹی نے سفر نامے میں پورے ملک کی سیاحت کی روداد بیان کی ہے۔صوبہ بلوچستان کا ثقافتی تجزیہ اُنھوں نے پیش کیا ہے۔”کوئٹہ سے پشاور تک“ ایم زمان کا تاریخی اور معلوماتی سفر نامہ ہے۔اس میں ثقافتی عناصر بہت کم ہیں۔اسی طرح ہنری پوٹنگر کا ”بلوچستان و سندھ“ تاریخ ، جغرافیائی اور معلوماتی نوعیت کا سفر نامہ ہے۔اس میں ثقافتی عناصر بہت کم ہیں۔حصّہ بلوچستان میں تو ثقافتی عاصر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ان تمام سفر ناموں نے بلوچستان کے خدوخال کو اُبھارا ہے۔بلوچیوں کی عادات ورسوم ورواج سامنے آئے ہیں۔
- بلوچی مذہب کے مقابلے میں روایات یا اپنی ثقافت کو زیادہ مانتے ہیں۔چناں چہ ان کے ہاں کلچر بنیادی چیز ہے۔مذہب ذاتی معاملہ ہے۔مذہبی حوالے سے بلوچیوں کا کردار کم زور نظر آتا

ہے۔صوبہ بلوچستان میں بسنے والے ہندو اور مسلمان دونوں کی وضع قطع ،رہن سہن ،زبان ایک جیسی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہاں کے لوگ اپنی روایات اور کلچر کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔یہاں مذہب ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

- صوبہ سندھ کے ثقافتی عناصر کے تجزیے سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ یہاں بھی آب وہوا سب سے اہم ثقافتی عنصر ہے۔تمام عناصر کا دارومدار اسی عنصر پر ہے۔سفرنامہ نگاروں نے سندھ کی ثقافت میں ضلع تھر کو بہت اہمیت دی ہے۔سندھ کے ہر ضلع کی آب وہوا مختلف ہے۔کہیں دریا قریب ہے کہیں سمندر اور کہیں صحرا۔صوبہ سندھ کی آب وہوا کی خاصیت ہے کہ دن چاہے کتنا گرم ہوراتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگو ں کا رہن سہن ،خوراک ،لباس ،طرزِ رہائش ، مزاج ،عادات واطوار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔کراچی کی مرطوب آب وہوا کے باعث یہاں لوگوں کی طبیعت میں سستی وکاہلی پائی جاتی ہے۔تھر پار کر رومانی داستانوں کے حوالے سے بھی شہرت رکھتا ہے۔
- جوار ی و باجری صوبہ سندھ کے بیش تر حصّوں کی اہم خوراک ہے۔صاحبِ استطاعت کی خوراک گندم ہے۔معاشی اعتبار سے پست طبقہ باجری ، فطیری اور جواری کی روٹیاں کھاتے ہیں۔ساحلی اور دریائی علاقوں کے قریب رہنے والے اپنی خوراک میں مچھلی اور جھینگوں کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔مچھلی مفت میں حاصل ہونے والی خوراک ہے۔یہ طبقہ معاشی طور پر بہت پس ماندہ ہے۔کچھ تو اونٹنیوں کے دودھ پر گزر اوقات کرتے ہیں۔سندھ میں نشہ آور اشیا تمباکو نوشی ، بیڑی ، سگریٹ کا استعمال عام ہے۔تھر کے مکین ڈیتھ نامی گھاس کے بیجوں کو قحط کے دنوں میں پکا کر کھاتے ہیں۔چھبڑ کا سالن بنا کر کھاتے ہیں اور باجرے کی روٹی کھاتے ہیں۔چوں کہ ان علاقوں کی آب وہوا گرم ہے۔اس لیے گوشت کا استعمال بہت کم ہے۔
- صوبہ سندھ میں ہندو کافی تعداد میں آباد ہیں۔مگر اپنی وضع قطع اور رہن سہن سے مسلمانوں کے جیسے نظر آتے ہیں۔اس حد تک مشابہ ہیں کہ ان کی شناخت مشکل نظر آتی ہے۔اگرچہ مذہبی حوالے سے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔کلچر بنیادی چیز ہے اور مذہب ثانوی۔مذہب کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔اس لیے مذہب سے زیادہ ان لوگوں کے ہاں روایات کی

پاس داری مقدم نظر آتی ہے۔جو مذہب اور تہذیب پر حاوی ہے۔مسلمانوں اور ہندوؤں کا بھائی چارہ یہاں مثالی ہے۔

- صوبہ سندھ کے باسیوں کا لباس سادہ ہے۔عورتیں چہرہ ڈھانپ کر اجنبیوں سے ملتی ہیں۔تھر کی عورتیں ،رنگین ،شوخ رنگوں کے گھاگھرے پہنتی ہیں۔یہاں کی عورتیں سانولی رنگت کی ہوتی ہیں۔رنگین شوخ رنگوں کے لباس زیب تن کرتی ہیں۔اجرک یہاں کا روایتی لباس ہے۔سندھ میں عورتوں کو دوسرے صوبوں کی نسبت کافی آزادی ہے۔ہر ہفتے میکے جاتی ہیں۔گھومنے پھرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔یہاں کے مرد بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔
- سندھی متعدد پیشوں سے وابستہ ہیں۔بندر گاہوں کی وجہ سے یہاں تجارت ایک مقبول روزگار ہے۔علاوہ ازیں یہاں آپ کو ہر پیشے سے وابستہ لوگ نظر آئیں گے ، جیسے مزدور ، موچی ، کسان ، صنعتوں میں کام کرنے والے وغیرہ وغیرہ۔ہر پیشے سے وابستہ افراد صوبہ سندھ میں بکثرت سے ملتے ہیں۔
- سندھی اُصول کے بہت پکے ہیں۔بد کاری ، بے وفائی معاف نہیں کرتے۔کاروکاری کی رسم سندھیوں میں بہت مقبول ہے۔قرآن سے نکاح کرنا یہ جاہلانا رسم بھی سندھ میں صدیوں سے رائج ہے۔سندھی مہمان نوازی میں زیادہ فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔اپنی قوم کے ساتھ بہت وفادار ہیں۔دوسرے کے لیے ان کا یہ جذبہ قدرے کم ہے۔رسوم و رواج کے پابند ہیں۔سندھیوں میں تو ہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی بہت زیادہ ہے۔حال کی رسم کا سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں میں رواج ہے۔سندھی ایک منزلہ مکان کو فوقیت دیتے ہیں ،دومنزلہ مکانات پڑوسیوں کی بے پردگی کی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔
- پاکستانی اسفار پر مبنی سفرناموں میں ثقافت کے موضوع پر اُردو سفرنامہ نگاروں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔صوبہ پنجاب کی ثقافت کے تجزیے سے یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ صوبہ پنجاب کی ثقافت کو واضح کرنے میں آب وہوا ،خوراک ، پیشوں کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگاروں نے لباس اور طرزِ رہائش پر بھی بہت مفصل لکھا ہے۔پنجاب کی آب وہوا گرم ہے۔مگر سردیوں میں سخت سرد ہوتی ہے۔صوبہ پنجاب کے پہاڑی علاقوں کی آب وہوا اور میدانی علاقوں کی آب ہوا ایک

دوسرے سے مختلف ہے۔ آب وہوا کا اَثر ان کی شخصیت پر بھی پڑتا ہے۔ اندرونِ پنجاب معاشی اعتبار سے بہت کم زور ہیں۔ صاحب استطاعت گوشت ، گندم استعمال کرتے ہیں جب کہ غریب طبقہ سالن بنانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اچار کے ساتھ روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ گرمیوں میں چٹنی کے ساتھ روٹی تناول کرتے ہیں۔ زیادہ غریب تو پیاز پر نمک لگا کر روٹی کھا لیتے ہیں۔ کچھ تو دودھ کے ساتھ روٹی کھا کر پیٹ بھرتے ہیں۔ مکئی ، جوار ، باجرہ ، جو ، منڈوا ، بیسن کی روٹیاں معاشی طور پر پست طبقہ بطورِ خوراک استعمال کرتا ہے۔ چنے اُبال کر نمک ، مرچ ڈال کر کھاتے ہیں۔ شہر کے لوگ ایسی خوراک ہضم نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ دیہاتی محنتی اور جفاکش ہیں۔ معاشی طور پر مستحکم طبقہ گوشت ، گندم اور پر تکلف غذاؤں کا استعمال اپنی خوراک میں کرتا ہے۔ پرُتکلف ناشتے پنجاب کی سوغات ہیں۔ صادق آباد اور خان پور میں مچھلی کا استعمال بکثرت ہے۔ یہاں کے لوگ صحت کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ چولستان کے غریب رہائشی صحرائی چھار ، پھوگ کی سبزی اور کھمبی کا سالن بنا کر کھاتے ہیں۔ جب کہ خوش حال طبقہ چھوٹا گوشت کھاتے ہیں ، بڑا گوشت پسند نہیں کرتے۔ صحرائی پودا لاڈان کو جمع کر کے اس کی روٹی پکا کر کھاتے ہیں۔ پنجاب کی خوراک پر سب اُردو سفر نامہ نگاروں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے اور صوبہ پنجاب کے ہر ضلع پر بلحاظ خوراک روشنی ڈالی ہے۔

- پنجاب کے لوگ قدرے روشن خیال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ نگاروں نے پنجاب کی خوراک اور لباس پر مفصل لکھا ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں لوگ وہاں کی گرم آب وہوا کے باعث دوہتی ، کُرتا پہننا پسند کرتے ہیں۔ یہ ان کا صوبائی لباس ہے۔ میدانی علاقوں کی گرمی کے باعث لوگ کھلے لباس پہننا پسند کرتے ہیں۔ اب تو دوہتی کا رواج تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں بھی لوگ شلواریں پہنتے ہیں۔ شہروں میں لباس فیشن کے مطابق پہنا جاتا ہے جس کا اظہار سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔ جن علاقوں کی آب و ہوا معتدل ہے جیسے پہاڑی علاقے تو وہاں لباس اسی آب وہوا کے مطابق پہنا جاتا ہے۔ صوبہ پنجاب کے پہاڑی علاقے جہاں شدید سردی پڑتی ہے ، وہاں لوگ موٹے کپڑے ، کوٹ ، جرابیں اور تنگ لباس زیب تن کرتے ہیں۔

- پنجاب کی آب و ہوا معتدل ہے۔پنجاب میں شامل پہاڑی علاقے ہونے کی وجہ سے سرد ہیں۔اس لیے ان کا طرز زندگی مختلف ہے۔یہاں کے مکانات ، طرزِ رہائش ، لباس ، خوراک غرض ہر چیز مختلف ہے۔صوبہ پنجاب کے مکانات بڑے بڑے کھلے صحنوں اور کشادہ کمروں پر مشتمل ہوتے ہیں تاکہ موسم کے اثرات کم اثر انداز ہوں۔
- صوبہ پنجاب کے ثقافتی تجزیے سے یہاں کے لوگوں کی خصوصیات سامنے آئیں کہ وہ بہادر ، غیرت مند اور مہمان نواز ہیں۔پنجاب کے لوگ صحت مند ہیں۔ان کی صحت مندی کا راز ان کی اچھی خوراک ہے۔پنجاب کے لوگ محنت کش ،ہنر مند ہیں۔
- ”لاہور آوارگی“ مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ جس میں ثقافتی عناصر بکثرت ملتے ہیں۔سفر نامہ ”ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور“ احمد ندیم قاسمی کا ثقافتی عناصر سے بھر پور سفر نامہ ہے۔اُنھوں نے اس شہر لاہور کی ثقافت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔کیمی پوا کا سفر نامہ ”سفر نامہ پاکستان“ میں پنجاب کے حوالے سے بھرپور ثقافتی عناصر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ماجد فرید ساٹی نے بھی پنجاب کی ثقافت کے مختلف رنگ پیش کیے۔بلراج ساہنی کا سفر نامہ ”میرا پاکستانی سفر نامہ“ میں بھی پنجاب کے کافی حد تک ثقافتی عناصر موجود ہیں۔
- صوبہ خیبر پختونخوا کے ثقافتی تجزیے سے جو ثقافتی عناصر منظرِ عام پر آئے ہیں ،ان میں آب وہوا وہ عنصر ہے جو تمام عناصر کا احاطہ کرتا ہے۔ہر ضلع کی آب وہوا مختلف ہے۔آب وہوا کا اثر لوگوں پر بھی پڑتا ہے۔یہاں کے لوگ سخت کوش ، اکھڑ مزاج ہیں۔چوں کہ یہ پہاڑی علاقہ ہے ،اس لیے اس صوبے کا موسم سرد رہتا ہے۔یہاں لوگ چُست لباس پہنتے ہیں۔چادر اور کھیس اوڑھ کر سردی سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں۔خوش حال لوگ پگڑیاں پہنتے ہیں ،شقہ ،جوتے کا استعمال کرتے ہیں۔اس سے پہاڑوں پر چڑھنے میں سہولت رہتی ہے۔کالاش کی خواتین کالے رنگ کا لباس جو کہ پاؤں تک ہوتا ہے ، پہنتی ہیں۔سردی سے بچنے کے لیے جانوروں کی کھال کا لباس پہنتی ہیں۔بکرے کی کھال کے جوتے پہنتی ہیں۔
- صوبے کی آب وہوا سخت سرد ہونے کی وجہ سے یہاں گوشت کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔بھیڑ، بکریاں ، دُنبے کا گوشت زیادہ کھایا جاتا ہے۔قہوہ یہاں کا معروف مشروب ہے۔

○ صوبہ خیبر پختونخوا پر اُردو سفر نامہ نگاروں نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ یہاں کا حُسن و جمال ، منفرد تہذیب و ثقافت نے سفر نامہ نگاروں کو ان علاقوں کی سیاحت پر اُکسایا۔ ان سفر نامہ نگاروں نے ثقافت کے بیان کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے جانبداری کا رویہ بھی نظر آتا ہے۔ پٹھان زندہ دل ، توہم پرست اور مغرور ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی مہمان نوازی اور بہادری ہے۔ پٹھان بہت غصے والے مانے جاتے ہیں۔ ان کی ایک مخصوص رسم "بدرگہ" ہے یعنی مہمان کو تحفظ دینا۔ جسے پٹھان اپنا سماجی فریضہ مانتے ہیں۔ عزتِ نفس کا احساس پٹھانوں میں بہت زیادہ ہے۔ عزت نفس کے لیے اپنی جان کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ بدلہ لینے میں پٹھان کسی کی پروا نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک قتل کا بدلہ قتل ہے۔ عورتوں کے معاملے میں آ کر اسے قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پٹھان عورت کو مقدس سمجھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بس غیرت کے معاملے میں رعایت نہیں ہے۔ عورت کو وراثت میں حق نہیں دیا جاتا۔ زنا کاری کی سزا موت ہے۔ تہوار و جشن جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ کالاش میں کئی قسم کے تہوار و جشن منائے جاتے ہیں۔ علاج کے منفرد طریقے ہیں۔ جانوروں کی کھالوں سے مختلف امراض کا علاج ہوتا ہے۔ کالاش کی عجیب و غریب رسومات سے شناسائی اس باب کے نتائج ہیں۔

ج۔سفارشات:

"پاکستانی اَسفار پر مبنی اُردو سفر ناموں میں علاقائی ثقافت کی عکاسی " کے موضوع پر تحقیقی کام کے بعد آئندہ تحقیق کے لیے چند سفارشات درج ذیل ہیں :

1. پاکستان کے شمالی علاقہ جات اپنی خوب صورتی اور جغرافیائی خدوخال کے ساتھ ساتھ منفرد ثقافتی خصوصیات کے حامل خطے ہیں۔اس تناظر میں ان علاقوں کے سفر ناموں پر الگ سے تفصیلی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔
2. پاکستان کے صوبوں پر تاریخی اور مذہبی عناصر کے حوالے سے بھی تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔
3. پاکستان کے خوب صورت ترین علاقے گلگت بلتستان کی وادیاں ہیں۔جن پر تاریخی اور ثقافتی حوالوں سے ایک مبسوط مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔
4. پاکستانی مصنفین کے غیر ملکی اسفار پر ایک جامع تحقیقی منصوبے کے تحت کام کیا جانا چاہیے اور پھر پاکستانی اسفار اور غیر ملکی اسفار کے دوران مصنفین کے نقطہ نظر اور ان کے جذبات و احساسات کا تقابلی مطالعہ اور تجزیہ بھی کیا جانا چاہیے۔
5. کسی بھی ملک کے سفر ناموں کا موازنہ اور تقابل بھی تحقیقی کام کے لیے ایک اہم اور دل چسپ موضوع ہو سکتا ہے۔اس سے اس ملک کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں مختلف زاویے سامنے آسکیں گے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

- آغا سلمان باقر ،دھماکہ لیک سوات ، مکتبہ عالیہ ،لاہور
- احمد ندیم قاسمی ،ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور ، نستعلق مطبوعات ، 3 – Fالفیروز سنٹر ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار ،لاہور
- اسماعیل صدیقی ، بریگیڈیئر (ریٹائرڈ)، آئینہ بلوچستان ،جنگ پبلشرز ، 13 سر آغا خان روڑ ، لاہور
- امتیاز اے قریشی ، گڈبائی شہرنو ، ریز پبلی کیشنز ،راولپنڈی ، 2002ء
- ایم زمان کھوکھر ،پشاور سے کوئٹہ تک ، یاسر اکیڈمی بالمقابل سیشن ،کچہری روڑ ، گجرات
- ایم زمان کھوکھر ،گلگت سے کراچی تک - میرا پیارا وطن پاکستان ،امتیاز فیاض پرنٹنگ پریس ،لاہور ، 2009ء
- بلراج ساہنی ، میرا پاکستانی سفر نامہ ، مترجم: یاسر جواد ، سارگ پبلی کیشنز ، الاکو مینشن پٹیالہ گراؤنڈ ، 14 لنک میکلوڈ روڑ ،لاہور
- پرویش شاہین ،کافرستان (تاریخ وثقافت)،گندھارا ریسرچ پراجیکٹ ،سوات
- چارلیس میسن ، ترجمہ: ایم انور رومان ،پروفیسر ،سفر نامۂ قلات ، پبلشرز : بے نظیر انٹر پرائزز ،زرغون روڑ ، کوئٹہ
- خلیل طوق اُر ، ڈاکٹر ، پیارا ملک ہے پاکستان ،بزم تخلیق اَدب ،پاکستان ، 2007ء
- رضا علی عابدی ،شیر دریا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2004ء
- رضا علی عابدی ،جرنیلی سڑک ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور
- سلمیٰ اعوان ، سندر چترال ،تعریف پرنٹرز ،لاہور ، 2007ء
- سید شوکت علی شاہ ، بلوچستان پر ایک رپورتاژ ، گورا پبلشرز ، 25لوئر مال ،لاہور
- شکیل الدین صدیقی ، ماروی کے دیس میں ، ادیب پبلی کیشنز ،حیدر آباد ، 2003ء
- عباس برمانی ،ڈاکٹر ، میرا سندھو سائیں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور

- عبدالحفیظ مرزا ،سفر گزشت ،پلس کمیونی ،لاہور ، 2003ء
- فضل ربی راہی ، سوات ، سیاحوں کی جنت ،شعیب سنز ، پبلشرز اینڈ بک سیلرز ، جی ٹی روڑ ، منگورہ ،سوات
- کیمی پوا ،ترجمہ: محمد حسن ،سفر نامہ پاکستان ،بک ہوم ،بک سٹریٹ ،46 مزنگ روڑ ،لاہور
- مستنصر حسین تارڑ ، اور سندھ بہتا رہا ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2016ء
- مستنصر حسین تارڑ ، لاہور آوارگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور
- مستنصر حسین تارڑ ، جو کالیاں ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور
- مستنصر حسین تارڑ ، سفر شمال کے ،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ، 2007ء
- ماجد فرید ساٹی ، مناظرِ پاکستان ، فضلی بک سپر مارکیٹ ،نزد ریڈیو پاکستان ،اُردُو بازار ،کراچی
- محمود دانش ور ایرانی ،کافرستان ،مترجم: خلیل احمد ،آتش فشاں پبلی کیشنز ،چوک اُردو بازار ، لاہور
- محمد خالد اختر ، دوسفر ،میٹرو پرنٹرز ،لاہور ، 1984ء
- محمد خالد اختر ، مجموعہ خالد سفرنامے ،جلد دوّم:سفر نامے،اوکسفرڈیونی ورسٹی پریس
- محمود علی ،دیکھا پاکستان ،بک پرنٹرز ،لاہور ، 1993ء
- محمد داؤد طاہر ، نئی منزلیں ہیں پکارتی ، فیروز سنز ،لاہور ، 2005ء
- ملک اشفاق احمد ،کیلاش ، اے این پرنٹرز ،لاہور
- ہنری پوٹنگر ،ترجمہ: ایم رومان ،پروفیسر ، سفر نامہ بلوچستان و سندھ ،نسا ٹریڈرز ، 7 جناح کلاتھ مارکیٹ ،کوئٹہ ، 1980ء

ثانوی ماخذات:

- ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ، کشاف تنقیدی اصطلاحات ، مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ، 1985ء
- اثر عبدالقادر شاہواڑی ،ریسرچ اسکالر ،بلوچستان مذہبی ، علمی فکر رجحانات اور مکتبہ درخانی کا کردار ،براہوئی اکیڈمی (رجسٹرڈ)، کوئٹہ ،پاکستان
- احمد غزالی ،چولستان ،لوک ورثہ ،اسلام آباد

- احمد ندیم قاسمی ،(دیباچہ) اجنبی اپنے دیس میں ، سید شوکت علی شاہ ،خزینہ علم واَدب ،2006ء
- احمد پراچہ ،تاریخ کوہاٹ ،بک سنٹر ، 32 حیدر روڈ ،راولپنڈی کینٹ ،پاکستان
- ارشد محمود ناشاد ،ڈاکٹر ،(فلیپ)فرصتِ نگاہ از قلم اعظم خالد ،سرمد اکادمی ،اٹک ،2010ء
- ارشد محمود ناشاد ،ڈاکٹر ، اطراف تحقیق ،الفتح پبلی کیشنز ،راولپنڈی ، 2012ء
- انور سدید ،ڈاکٹر ،آئینہ بلوچستان از اسماعیل صدیقی
- انور سدید ،ڈاکٹر ، دوسفر از محمد خالد اختر
- انعام الحق کوثر ،ڈاکٹر ،بلوچستان میں اُردواَدب کے سوسال
- ایم عثمان حسن بلوچستان اضلاع اور تاریخ ،پبلشرز : سیلز اینڈ سروسز ، تقسیم کار : گوشۂ اَدب ، کوئٹہ

انگریزی کتب:

- Bronislaw Malinowsky, A Scientific Theory of Culture, North Corolina: Chaper Hilb, 1944
- Clyde Kluckhohn, The Science of man in the world crisis, ed. R. Linton, Concept of Culture, Columbia University Press, 1945
- Edward B. Tylor, Primative Culture, Vol.1, London, John Murray, Sixth Edition, June 1920
- Philip Bagby, Culture and History, Berkeley and California: University of Colifornia Press, 1959
- Encyclopedia World Dictiondary, Hamlyn
- Raymond Williams, Keyword: A Vocabulary of Culture and Society, New York, Oxford University Press, Revises Edition, 1983
- T.S. Eliot, Notes Towards the Difition of Culture, Lonon, Faber and Faber,1961

- Tylor F.B. Primition Culture, Londan, 1871, Vol:1

لغات:

- اُردولغت (تاریخی اُصول پر)، جلد:ششم ،کراچی : اُردو ڈکشنری روڑ ، 1983ء
- الحاج مولوی فیروز الدین (مرتب)،رنگین فیروز اللغات اُردو جامع ، فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ ، لاہور،2005ء
- جمیل جالبی ،ڈاکٹر ،قومی انگریزی اُردولغت ، مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد
- مولوی سیداحمد دہلوی ،فرہنگ آصفیہ ،اُردو سائنس بورڈ ،لاہور ، 1987ء
- مولوی نورالحسن نیر ،نوراللغات ،نوراللغات ، نیشنل بک فاؤنڈیشن ،اسلام آباد ،2006ء
- وارث سرہندی ، علمی اُردو لغت جامع ، علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ اُردو بازار ، لاہور ، 2007ء

رسائل وجرائد:

- رفیع الدین ہاشمی ،ڈاکٹر ،جدید سفر ،چند تناظر ،(مطبوعات بازیافت ، شمارہ: 9)،پنجاب یونی ورسٹی ،لاہور ،جولائی تا دسمبر 2006ء ، ص: 9
- حسنین کاظمی ، اوراق فیض ،مشمولہ: ہماری قومی ثقافت ،مرزا ظفرالحسن ،کراچی: ادارہ یادگارِ غالب ،فروری 1976ء
- سہیل احمد خان ،سویرا (20)، چھوتی سہ ماہی ، نیاادارہ ،لاہور ،1993ء
- سید محمد تقی ، مسلم کلچر ، مشمولہ : پشاور یونی ورسٹی ،جرنل 2000ء– 1999ء
- شہزاد منظر ، سفرنامہ نگاری ایک اَدبی صنف ، مشمولہ: سہ ماہی الزبیر سفرنامہ نمبر ،جلد: 36، شمارہ:4-3، بہاول پور اُردو اکیڈمی
- طارق عزیز ،ڈاکٹر ، محمد طفیل کی خاکہ نگاری ، مشمولہ : نئی اَدبی جہتیں ، مقبول اکیڈمی ،لاہور ، 2007ء

- فیض احمد فیض ، تہذیب کیا ہے ؟ مشمولہ :ہماری قومی ثقافت ،مرزا ظفر الحسن ، ادارہ یاد گار غالب ، کراچی ، 1976ء
- مجلہ تاریخ و ثقافت پاکستان ،جنوری -جون 2018ء
- محمد ابن الحسین ،سید ،سہ ماہی ادبیات ، اکادمی ادبیات پاکستان ،اسلام آباد ، جولائی تا ستمبر ، 1987ء
- مستنصر حسین تارڑ ، سفر زندگی ہے -پر ایک ناقدانہ نظر ،مشمولہ : سفر زندگی ہے ؟ ،فیروز سنز ،لاہور ، 2004ء
- محمد خاور نوازش ،اُردو سفر نامہ ، فن اور روایت ،(مطبوعہ) اخبار اُردو، اسلام آباد ، جون 2008ء
- مظہر فریدی ، سلمٰی اعوان اور محمود دانش ور ایرانی کے سفر ناموں میں تہذیبی و تمدنی ،(مضمون)مطبوعہ: سہ ماہی الذبیر ،شمارہ:4 – 3 – 1، 98 – 1997ء ،اُردُو اکادمی بہاول پور
- محمد افسر ساجد ، مستنصر حسین تارڑ اور دو بہاؤ ، مشمولہ : ماہِ نو ،جون 1993ء

اخبارات:

- ایم زمان کھوکھر ،سنڈے میگزین نوائے وقت، 29 جنوری 2006ء
- بشیر محمود ، سنڈے میگزین جنگ ، 29 اگست 1999ء
- پروفیسر خالد بیگ ، نوائے وقت سنڈے میگزین ، 12 -اکتوبر 2003ء
- حمید قیصر (اسلام آباد)، جنگ سنڈے میگزین ، 25 ستمبر 2011ء
- حافظ عمار وحید سلیمانی ،نوائے وقت سنڈے میگزین ، 10 جولائی 2005ء
- سعدیہ قریشی ،جنگ سنڈے میگزین ، 8 جولائی 2007ء
- مسکین مغل ،جنگ سنڈے میگزین ، 29-اپریل 2007ء
- سید جمال الدین شاہ ،جنگ سنڈے میگزین ، راولپنڈی ، یکم اپریل 2012ء
- سلمٰی اعوان ، نوائے وقت سنڈے میگزین ، 19 -اگست 2007ء
- عارف محمود ایل ،سنڈے میگزین ،راولپنڈی ،8 جون 2003ء